



”ٹھکن اتر جائے۔ بہت عظیم راسخو تھے وہ۔“

”میں تو پڑھی لکھی ہوں نہیں، ہم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو گے۔ اب پڑھنے کی اجازت نہیں ملے گی، باقی کل پڑھنا۔ وہ سفر نامہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔“ ہاں، وہ شام کو تمہارے مالک نے کیوں تمہیں اپنے گھر پر بلایا تھا؟“ جاتے جاتے معاہدے یاد آیا تو وہ چوکھٹ پر کھڑے کھڑے بولیں۔

”ایک فائل پر ان کے سائن لینے تھے۔“ اس نے دودھ کا گلاس خالی کر کے رکھتے ہوئے کہا۔

”میں تو ڈری ہی گئی تھی کہ خدا نخواستہ نوکری سے جواب دینے کے لئے تو نہیں بلایا۔ اسی وقت سے میں خیریت کی دعائیں مانگ رہی تھی، پھر تمہیں سکون سے آتے دیکھ کر میری جان میں جان آئی ہے۔ سو جاؤ، شب بخیر۔“ وہ گلاس لے کر چلی گئیں۔

اس کی نگاہوں میں شام کا منظر گھوم گیا جب وہ حسن بیگ صاحب سے ایک اہم فائل پر سائن کر کر پلٹ رہا تھا کہ اچانک لان میں بجلی سی کوندی تھی۔

ریڈمنی اسکرٹ اور بلیک باریک اسٹریپ والے بلاؤز میں اس کی عریاں سڈول ٹانگیں اور بازو چاندی کی کرنوں کی طرح چم چہارے تھے۔ وہ ہاتھ میں پکڑا ریکٹ گھماتی اس طرف ہی آرہی تھی۔

حسن بے نقاب ہو تو بے کشش ہو جاتا ہے۔

بے حجاب ہو تو بے اعتبار ہو جاتا ہے۔ وہ تو ویسے بھی ایسی خواتین سے دور بھاگتا تھا جو ادھالباں پہن کر، حسن کی نمائش کر کے داد و وصول کرنا چاہتی ہیں۔ اس وقت اسے بھی اس سے از حد کراہیت محسوس ہوئی اور سر کو خدا حافظ کہتا ہوا آنکھیں جھکا کر اس کے سامنے سے گزر گیا۔

”لاحول ولا قوۃ.....“ بے ساختہ اٹھنے والی نگاہ کا ایک منظر اس کی نگاہ میں آیا تو بے اختیار اس کی زبان سے نکلا تھا۔

□●□

”مشی میری جان! کیسی ہو؟“ رانجہ بیگم نے اس کے رخسار پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

”آئی ایم فائن! جو جو کہاں ہے؟“

”گھوم کر دیکھو، وہ کھڑا ہے۔“ انہوں نے لپ اسٹک کو آخری ٹچ دیتے ہوئے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

”ہیلو مشی!“ جو جو نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر دھیرے سے کہا۔

”اوہ..... تم ابھی تک تیار بھی نہیں ہوئے، حالانکہ میں نے آنے سے قبل تم سے کال کر کے کہا بھی تھا کہ تیار ہو جاؤ، میں آرہی ہوں، مویو دیکھنے چلنا ہے۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”انہیں اپنی فضول ضدوں سے فرصت ملے تو تیار ہوں۔“

”فضول ضد نہیں ہے مام، مجھے تیس لاکھ کی اشد ضرورت ہے، جو آپ کو مجھے دینا ہوں گے۔“

”کہاں سے؟ چوری کروں یا ڈاکے ڈالوں..... جب کہہ رہی ہوں احمد کو بزنس میں لوں ہو رہا ہے، آدھے سے زیادہ روپیہ مختلف شیمرز میں ڈوبا ہوا ہے، بینک سے جو لون لیا تھا، اس کی بھی ٹاسٹنگ پوری ہونے والی ہے، ایسے میں تو ہمیں خود کروڑوں کی ضرورت ہے، حالات کو سمجھنے کی بجائے تم بے جا ضد کرتے ہو۔“ اسکاٹی ہلوسک کی ساڑھی پر میچنگ سینڈل پہنتے ہوئے انہوں نے خاصے غصے سے کہا تھا۔

”ہونہہ..... یہ بھی ویری انٹرٹیننگ جاک ہے مام! میری ضرورت پر آپ نے قرضوں کی لمبی چوڑی لسٹ دکھادی ہے اور چند روز پہلے جو آپ نے تیس لاکھ کا ڈامینڈ زکا یہیکلس سیٹ خرید لیا تھا، جب کوئی لسٹ آپ کو یاد نہیں آئی تھی۔“ اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”مجھے بتاؤ تو سہی، کیا بات ہوئی ہے؟“ مشعل جو جو کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔

”کچھ نہیں یار، مام نے تمام موڈ ہی چوٹ کر دیا ہے۔“ اس نے مشعل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر کہا۔ اس کے چہرے پر ایک دم ہی مایوسی و اداسی کی دبیز تہہ چڑھ گئی تھی۔

”رقم کی پرابلم ہے؟“

جو جو نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”اوکے چائلڈز! میں جا رہی ہوں۔ سزسمیل کے ہاں پارٹی ہے، وہاں ویٹ ہو رہا ہو گا میرا۔“ وہ شو فر کو آواز دیتی انہیں بائے کہتی وہاں سے چلی گئیں۔

”یہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ چلو پاپا سے لیں گے ہم رقم۔“

”نومانی سویٹ ہارٹ! بار بار انکل سے رقم لے کر میں بہت شیم نیل کرتا ہوں۔“

”کیوں، میں اور تم کیا الگ الگ ہیں؟ تمہاری پرائمر میں سولو نوٹس کر سکتی؟“

”اوہ کم آن ڈیئر! مائنڈ نہیں کرو، خوب جانتا ہوں تمہاری ہارٹ فیلنگز کو۔ مگر انکل کیا سوچیں گے؟“ اس نے اس کے بال بکھیرتے ہوئے کہا۔

”وہ میرے پاپا ہی نہیں تمہارے بھی رینل انکل ہیں۔ تمہیں بھلا کچھ کہہ سکتے ہیں؟“

”ہاں، یہ تو ہے اور جانتی ہوں میں یہ سب تمہارے فیوچر کے لئے ہی کر رہا ہوں۔ آج جو کچھ میں لے رہا ہوں کل اس کے بدلے ہم خوب دل کھول کر انجوائے کریں گے، پھر میں گے، دنیا دیکھیں گے، لائف کے ایک ایک لمحے سے لطف کشید کریں گے۔“

”اوکے، چلو فائنٹ پہلے پاپا کے آفس چلتے ہیں۔“ اس نے اس کے بازوؤں سے نکتے ہوئے کہا۔

حسن بیگ کے شاندار آفس کی عمارت میں داخل ہو کر وہ ان کے آفس روم کی طرف جو جو کو ساتھ لئے بڑھ گئی تھی۔ دروازے کے باہر بیٹھے بیون کے سیلوٹ کا جواب بھی اس نے نہ دیا تھا۔

”پاپا! مجھے ٹوٹی لاکھ روپیہ بھی فوری چاہئے۔“ اس نے اندر داخل ہو کر اطمینان سے کہا۔ جو جو ساتھ خاموش کھڑا تھا۔

اس کی اچانک آمد اور کثیر رقم کے مطالبے پر حسن بیگ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا مگر ان کے مقابل شاہ ویز جو فائلز کھولے بیٹھا تھا نے نگاہیں پیچھے زبردستی نہیں۔

”نہیں لاکھ..... کیوں کیا کرنا ہے؟ چند دن قبل تم نے اس سے ڈبل رقم لی تھی۔“

”پاپا! اب مجھے حساب دینا ہوگا؟“ سامنے ٹیبل پر بکھری فائلز پر جھکے شخص کو دیکھ کر اسے کل کی توہین یاد آگئی تھی۔ وہ اب بھی نگاہیں جھکائے لائق و بے نیازی سے بیٹھا تھا۔ کوپا وہاں اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ مستزاد اس پر، پاپا کے استفسار نے اسے کھولا ڈالا تھا۔

”میں حساب نہیں مانگ رہا، صرف معلوم کر رہا ہوں۔“ انہوں نے نرمی سے کہا۔

”بالآخر یہ سب میرا ہے پاپا! اسے میں کیوں اور کیسے خرچ کروں، یہ میرا ہیڈک ہے۔ آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے خاصی بدتمیزی سے کہا۔

”یہ سب آپ کا کل ہوگا، آج میرا ہیڈک ہے۔“

”جب سب دولت و جائیداد پر میرا ہی حق ہے تو آج اور کل کیوں پاپا؟“

”سرا! میں کچھ دیر بعد حاضر ہو جاتا ہوں۔“ شاہ ویز کو ان کے ذاتی معاملے میں اپنی موجودگی بے معنی لگی۔ وہ اٹھتے ہوئے مودبانہ انداز میں کوپا ہوا۔

”نو، پلیز سٹ ڈاؤن..... آپ یہیں رہیں۔“ انہوں نے اپنائیت سے کہا۔

”یعنی اب ہمارے پرنسپل انجیرز معمولی ورکرز کے سامنے ڈسکس کئے جائیں گے۔ اسپاگل، اے مسٹر! گیٹ لاسٹ فرام ہیئر۔“ وہ غصے سے چیخ کر از حد تھک آمیز لہجے میں بولی۔

”مشی! اپنا لہجہ درست کرو۔ آپ وزینگ روم میں بیٹھیں، میں آرہا ہوں وہاں۔“ شاہ ویز کے تیزی سے سرخ ہوتے چہرے اور کشادہ پیشانی پر ابھرتی شکنوں کے جال دیکھ کر انہوں نے مشعل اور جو جو کو وہاں سے بھیجا تھا۔

”آئی ایم سوسوری شاہ ویز! ریلی سوری۔ دراصل مشی بچپن سے ماں کے سائے و آغوش سے دور رہی ہے۔ شاید اسی لئے یا پھر مختلف کورس سے پرورش پانے کے باعث وہ بہت منہ پھٹ اور گستاخ ہو گئی ہے آئی مین، اسے بات کرنے کا سنس نہیں ہے۔ از حد جذباتی اور تھوڑی بے وقوف بھی ہے۔ بلاسو چے سمجھے ہر بات کہہ دیتی ہے، جیسے ابھی.....“

”اٹس اوکے سرا! آپ ان فائلز پر سائن کر دیں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”کیوں نہ ہم کل ایک مرتبہ پھر ان فائلز کو اسٹڈی کر کے نیو پلاننگ کے بعد سائن کریں؟“ چند لمحے اس کی جانب بغور دیکھنے کے بعد وہ دوستانہ لہجے میں استفسار کرنے لگے۔

”جو آپ بہتر سمجھیں سرا!“ وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کیمین میں آگیا۔

اس بدتمیز و جاہل لڑکی نے اس کے اندر شعلے بھڑکا دیئے تھے۔ تذلیل و توہین کے احساس نے اسے متوحش کر ڈالا تھا۔ کوکہ حسن بیگ نے بار بار اپنی بیٹی کی بدتمیزی کی معذرت کی تھی مگر اس کی انا و خودداری اور عزت نفس پر کاری ضرر میں لگی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا اس مغرور بدتمیز لڑکی کو کوئی ایسا سبق سکھائے کہ اسے ساری زندگی ازبر ہو جائے کہ انسان، انسان ہوتا ہے۔ عزت و وقار، احترام و محترم ہر شخص کی چاہ ہوتی ہے۔ کبھی بھول کر بھی وہ کسی کو کمتر اور برتر کی کینگری میں نہیں رکھ سکے۔

□●□

”اوئے..... یہ کس گدھے کے بچے نے پارک کی ہے؟“ جو جو پارکنگ لائٹ میں آکر چیخا تھا۔

”سرا! یہ کچھ دیر پہلے آپ ہی کھڑی کر کے گئے تھے۔“ واچ مین نے گھبرا کر کہا۔

”میں اس کچرے کی بات کر رہا ہوں۔“ اس نے گیٹ کے قریب کھڑی بانیک کی طرف اشارہ کر کے حقارت سے کہا۔

”وہ صاحب! شاہ ویز صاحب کی ہے۔“

”بلا کر لاؤ اس مان سٹیس کو۔“ جو جو کی دھڑاڑ پر چوکیدار ہوا کی طرح لپکا تھا۔

”شاہ وزیر صاحب ..... واہ، صاحب۔“ مشعل کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

”ان چھوٹے لوگوں کا کیا ہے۔ ان سے ایک روپیہ زیادہ کمانے والا ان کے لئے صاحب ہو جاتا ہے۔“ جو جو نے بھی تہقہوں میں ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

”فرمایہ؟“ شاہ وزیر نے ان کے تہقہوں کو نظر انداز کر کے بخیدگی سے کہا۔

”اوہ..... تو آپ جس صاحب جی۔“ جو جو نے اس کی طرف دیکھ کر تسخرانہ لہجے میں کہا۔

”یواسٹوپ! تمہارے باپ نے تمہیں یہ تمیز نہیں سکھائی کہ گاڑی کس طرح پارک کی جاتی ہے یا تم نے اس پارکنگ لاٹ کو اپنے باپ کی اسٹیٹ سمجھ رکھا ہے؟“ مشعل نے آگے بڑھ کر استہزا نیہ لہجے میں کہا۔

اس کا لہجہ، اس کا انداز، اس کے الفاظ شاہ وزیر جیسے جذباتی، خوددار اور اکھڑ مزاج شخص کو ہتھ سے اکھاڑنے کے لئے کافی تھے۔

”یہ میرے باپ کی سکھائی گئی تمیز کا اعزاز ہے کہ اتنا کچھ کہنے کے باوجود آپ اپنا یہ گنداسا منہ سلامت لئے کھڑی ہیں۔ آپ کی جگہ اس کارٹون نے یہ بکواس کی ہوتی تو ابھی زندہ کہیں اسے دفن کر چکا ہوتا۔“ شدید اشتعال کو ضبط کرنے کی سعی میں وہ انگڑوں کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ مگر شاہ وزیر کے لہجے اور انداز نے لمحے بھر کو ان دونوں کو گنگ کر دیا تھا۔

”مشی! اس نے مجھے کارٹون کہا اور تمہارے ساتھ بھی اس طرح بات کی جیسے تمہارا سر فٹ نہیں باس ہو۔“ جو جو کے لہجے میں حیرت و غصہ پنہاں تھا۔

”چھوڑو شاہ وزیر بیٹا! معافی مانگ لو، یہ ہمارے مالک کی بیٹی ہیں۔“ چوکیدار نے بات آگے بڑھتے دیکھ کر پریشان و خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”نہیں بابا! میں جس کو اپنا مالک مانتا ہوں، وہ وحدۃ لاشریک ہے اور اس واحد ذات کے سوا میں کسی کے آگے جھک نہیں سکتا، مجھے کسی کے باپ کی پروا نہیں ہے۔“

”معافی تو تمہارا باپ بھی مانگے گا مسٹر! تم ہو کیا چیز؟“ اس کے لئے وہ شخص اول روز سے ہی چیلنج ثابت ہوا تھا، اب تو اس کی انا کا سلسلہ بن گیا تھا۔

”یہ خواہش تمہارے باپ کا باپ بھی پورا نہیں کروا سکتا میڈم! میں تمہاری ناقص عقل میں سمجھ آنے والی چیز نہیں ہوں۔“ بات بلاوجہ اس کے مرحوم باپ تک پہنچ گئی تھی اور یہ اسے قطعی منظور نہیں تھا۔ اب نوکری رہے یا جائے، اسے پروا نہیں تھی۔ اس گھنڈی اور بدتہذیب لڑکی کو کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں کہ اپنی عزت نفس و خودداری اسے عزیز ترین تھی۔

”کیوں اس کے منہ لگتی ہوڈا رنگ! جس جاہل شخص کو عورت کی عزت نہ کرنا آتی ہو اس سے بات کرنا تو جین ہے تمہاری۔“ جو جو نے نفرت بھرے لہجے میں شاہ وزیر کی طرف دیکھ کر کہا اور ساتھ مشعل کا بازو تھام کر آگے بڑھنے لگا مگر مشعل آگے نہیں بڑھی۔

”ہونہہ..... عورت اور عزت، سب سے پہلے ان لفظوں کے معنی تو سمجھو۔ عورت وہ ہوتی ہے جسے دیکھ کر ماں، بہن، بیٹی جیسے برتندس و پروتارا احساسات خود بخود دل میں جنم لیتے ہیں۔ جن کی طرف اٹھنے والی نگاہوں میں عزت و احترام ہوتا ہے۔ جن کی حیا کی شفق سورج کی کرنوں میں چمکتی ہے، جن کی معصومیت پھولوں کے دُفس میں نظر آتی ہے، جنہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ ان کی عزت کی جائے۔“

نوکری کو تو وہ حد احافظ کہہ ہی چکا تھا، پھر اب اسے کوئی فکر نہ تھی۔

”مم..... مم..... میں تمہیں دیکھ لوں گی باسٹرڈ۔“ اس قدر بے عزتی، اتنی توہین، ایسی رسوائی و ذلت؟ اس نے کبھی خواب میں بھی ایسا نہ سوچا تھا۔ جوش غضب سے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ خوب صورت آنکھیں شعلے برسانے لگی تھیں۔ حسین چہرے کی رنگت متغیر تھی۔

”مشی! پلیز کول ڈاؤن، کول ڈاؤن ناؤ.....“ جو جو نے اس کی حالت پر گھبرا کر کہا۔

”جو جو! اس گھلیا بانیک کے اتنے ٹکڑے کرو کہ جنہیں یہ سمیٹ نہ سکے۔“ اس نے قریب کھڑی بانیک کی طرف اشارہ کیا جو تڑپتی ہو کر ان کی کار کا راستہ روکے ہوئے تھی، جس کی وجہ سے یہ ہنگامہ ہوا تھا۔

جو جو بھی غصے سے فو فو کرنا آگے بڑھا اور بانیک کو دور اچھالا تھا۔

”کان کھول کر سن لے، کبھی آئندہ ہمارے راستے میں آیا تو اس بانیک کے ساتھ ساتھ تیرے بھی اتنے ٹکڑے کروں گا جو کبھی سمیٹ نہ جاسکیں۔“ وہ شاہ وزیر کی طرف انگلی اٹھا کر غرایا۔

”اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو ابھی میری بانیک نہایت عزت و احترام کے ساتھ کھڑی کر۔ ورنہ تیرے اس چمھر جیسے جسم کے ٹکڑے کرنے کی زحمت بھی نہ کرنی پڑے گی مجھے..... صرف چنگی کافی ہوگی، تجھے مسلنے کے لئے۔“ اس کے لبوں پر لمحے بھر کو مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔

”آپ کو اللہ کا واسطہ ہے صاحب! بات کو اتنا آگے نہیں بڑھاؤ، اسکوڑ ہم اٹھا کر دے گا۔“ چوکیدار مسلسل بات بڑھتے دیکھ کر بری طرح خوف زدہ ہو چکا تھا۔ مشعل کے مزاج سے وہ اچھی طرح واقف تھا کہ اپنے ایک اشارے پر وہ تمام ملازمین کی ہیئتہ کے لئے چٹھنی کروا سکتی ہے۔ پھر شاہ وزیر تو کچھ عرصہ قبل ہی آیا تھا مگر اپنی خوش اخلاقی و ہمدردانہ طبیعت کے باعث سب میں مقبول ہو گیا تھا۔ اسے کھونے کے خیال سے وہ جلدی سے بولا تھا۔

”نہیں بابا! آپ نہ بولیں تو بہتر ہوگا۔“ شاہ وزیر تیزی سے بولا۔

”میں نے سب سے بڑے مالک کا واسطہ دیا ہے۔ کیا اب بھی بات نہیں مانو گے؟ بے شک ہم سب کا مالک اوپر والا ہے اور اسی مالک نے ہمیں حلال روزی کمانے کا حکم بھی دیا ہے، ان زمین پر موجود مالکوں کے وسیلے سے ہمیں روزی ملتی ہے۔ جس طرح ہم ”اوپر“ والے مالک کو ناراض کر کے خوش نہیں رہ سکتے، اسی طرح ان زمینی مالکوں کی دشمنی بھی ہمیں سکون سے نہیں جینے دیتی۔“ اسے سمجھاتے ہوئے چوکیدار بری طرح روپڑا تھا۔

”خاموش ہو جائیں بابا! بے شک آپ نے دنیا کا سب سے بڑا واسطہ دیا ہے مجھے جسے میں ماننے پر مجبور ہوں ورنہ مجھے اپنے ارادوں سے موت بھی نہیں باز رکھ سکتی۔“ وہ جھٹکے سے آگے بڑھا تھا۔ چوکیدار کے چہرے پر طمانیت دوڑ گئی تھی۔

”ون منٹ پلیز.....“ مشعل ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے گویا ہوئی اور اس کے مقابل جا کر کھڑی ہو گئی۔ ”تم نے میرے فیائی کو چمھر کہا، کارٹون کہا۔ بہت ناز ہے تمہیں اپنے آپ پر؟ از حد غرور ہے اپنی باڈی پر؟“ ہاف آسٹین کی ٹی شرٹ میں اس کے بازوؤں کے مسلز خوب نمایاں تھے۔ چوڑا مضبوط سینہ اس کی طاقت کا مظہر تھا۔ جو جو مرعوب ہو گیا تھا مگر مشعل کو اس کی مرعوبیت ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ کڑوے لہجے میں پوچھ بیٹھی۔

”میں غیر ضروری سوالوں کے جواب نہیں دیا کرتا۔“ اس نے منہ بنا کر لاپرواہی سے کہا۔

”مجھے یقین ہے میں ایسا وقت ضرور لاؤں گی، جب تمہارا بیخیر و غرور سے تنا ہوا سر میرے قدموں میں جھکا ہوا ہوگا اور اس دن تمہیں معلوم ہوگا مشعل حسن کیا شے ہے۔“ وہ اس کی طرف گھورتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔ ”تمہارے نزدیک مجھ جیسی لڑکیاں، لڑکیاں نہیں غلاظت کا ڈھیر ہوتی ہیں۔ اور میرے نزدیک مجھ جیسی لڑکیوں سے نگاہیں جھکا کر بات کرنے والے مرد، مرد نہیں ہوتے۔“

اس نے ہاتھوں کو جوڑ کر اس کے چہرے کے آگے دونوں ہتھیلیاں بجاٹی تھیں اور منستی ہوئی جو جو کے ساتھ کار کی طرف بڑھ گئی۔

”چھوڑو بیٹا! یہ اونچے گھرانوں کے بچے ایسے ہی بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔“ چوکیدار نے اسے غصے سے کھولتے دیکھ کر نرمی سے سمجھایا۔

”میری شرافت کو نامردی کا طعنہ دے گئی ہے۔“ وہ تیزی سے جاتی ہوئی کار کو گھور کر بولا۔

”اپنے اور ان کے ذہنوں میں یہی فرق ہے بیٹا! جو باتیں ہمارے لئے باعث افتخار ہیں وہی باتیں ان کو معیوب و بوسیدہ لگتی ہیں۔ ان پر غیر مذہبوں کا اثر زیادہ ہے۔“ خراب موڈ کے ساتھ اس نے بانیک اٹھائی تھی جس کا ٹھیک ٹھاک نقصان ہو گیا تھا۔ پچھلے ہفتے ہی تو اس نے سیکنڈ ہینڈ خریدی تھی جس سے آمدورفت میں بہت آسانی ہو گئی تھی۔ اب دو تین دن اسے پھر بسوں کے پکڑوں میں خوار ہونا تھا۔

چوکیدار اسے اپنی سائیکل کی پیشکش کر رہا تھا لیکن وہ بے چارہ خود رو سے آتا تھا اس لئے شکریہ کے ساتھ اسے سائیکل واپس کر دی۔

اوپر آفس کی کھڑکی سے پردے کی اوٹ میں کھڑے سب کچھ دیکھتے اور سنتے حسن بیگ صاحب کی آنکھوں میں کوئی خاص چمک تھی۔



دوسرے دن حسن بیگ صاحب نے ایک گھنٹے اس کا انتظار کرنے کے بعد گاڑی بھیج کر بلوایا تھا۔

”جیک مین اکل ہم نے کچھ ڈسکس کیا تھا، نئے پراجیکٹ کے بارے میں۔ آج فائنل ٹچ کے دن آپ غائب ہو گئے۔“ وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے مسکرا کر خوش دلی سے بولے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی ملازمت کل کے واقعے کے بعد رخصت ہو گئی ہوگی اور یہی سوچ کر وہ آفس نہ آیا تھا مگر ان کا رابطہ کراسے بلوانا اور اب اس ناٹل طریقے سے ملنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ ابھی ان کی لاڈلی نے انہیں کچھ بتایا نہیں ہے لیکن اس کے مزاج کو دیکھ کر تو نہیں لگتا تھا کہ وہ سب برداشت کر گئی ہو۔

”کیا سوچ رہے ہو..... کیا آج آفس آنے کا ارادہ نہیں تھا؟“ وہ ایک مرتبہ پھر کوپا ہوئے۔

”نوسرا دراصل کل.....“

”مجھے معلوم ہے۔ کل جو کچھ بھی ہوا، میں اسے دہرانا نہیں چاہوں گا کیونکہ تکلیف دہ باتیں دہرانے سے تکلیف از سر نو جاگ اٹھتی ہے۔ مگر مشی کے رویے پر تمہارے معذرت چاہتا ہوں۔ یہ میرے ہی بے جالا ڈیپارکازلٹ ہے۔ شروع سے میں نے اسے کسی بات پر نہیں ٹوکا، اس نے جو کچھ کہا اس کا انجام سوچے بنانا مٹا چلا گیا۔ اب وہ ہر جگہ خود کو صحیح اور دوسروں کو غلط سمجھتی ہے۔ دوسروں کو شکست دینے کے لئے وہ ہر حربے کو جائز تصور کرتی ہے۔ کل ہی آپ نے دیکھا، گاڑی انہوں نے غلط جگہ پر پارک کی تھی اور انہیں اللہ اللہ آپ ہی پر لگا رہا تھا۔“ وہ معذرت کرتے ہوئے بولے۔



”سوری سرا کل غلطی مجھ سے بھی سرزد ہوئی تھی۔ اکثر ایسا ہو جاتا ہے مجھ سے، اپنے غصے پر قابو نہیں رہتا۔“ حسن صاحب کے اخلاق اور صاف کوئی نے اسے اس لمحے از حد متاثر کیا تھا۔ وہ شرمندگی سے کویا ہوا۔



”مشی! کم آن ڈارنگ۔ کیوں بور کر رہی ہو؟“ جو جو نے اکتا کر کہا۔

”تم میرے سامنے سے چلے جاؤ تو بہتر ہوگا۔“

”کیوں..... میں نے کیا، کیا ہے جو ایک ہفتے سے تم نہ مجھ سے بات کر رہی ہو اور نہ ہی باہر چل رہی ہو۔ آخر کیوں ٹینشن دے رہی ہو مجھے؟“

”اُس دن اس کیپٹن شاہویر نے کس قدر میری انسٹ کی تھی اور ساتھ میں تمہاری بھی، جواب میں تم اس کا منہ توڑنے کی بجائے بائیک گرا کرواپس آگے اور پاپا سے میں نے اس کی شکایت کی تو انہوں نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا، بلکہ کہنے لگے کہ وہ بہت لائق لڑکا ہے، غلطی میری بھی ہوگی اور یہ کہ وہ شاہویر کو کسی قیمت پر نوکری سے نہیں نکالیں گے۔“ وہ غصے سے بولتی چلی گئی۔

”اگلے تو کچھ زیادہ ہی اس پر فدا لگتے ہیں۔ دیکھا تھا کس طرح انہوں نے اس کو کمرے سے نہیں جانے دیا تھا اور میں ویٹنگ روم میں بھیج دیا تھا، جب اگلے ہی کسی قسم کا ایکشن لینے کے خلاف ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ کوک کے سپ لیتے ہوئے اس نے کندھے اُچکا کر بے چارگی سے کہا۔

”شٹ اپ، بے وقوف، شرم کرو۔“ اس نے چڑ کر کہا۔

”بھئی مجھ پر کیوں غصہ ہو رہی ہو۔ اگلے کو تمہارا خیال رکھنا تھا۔“

”پاپا کا اور میرا کتنا ساتھ ہے۔ آئندہ لائف تو ہمیں ساتھ گزاری ہے اور تمہیں ہی میرا خیال بھی رکھنا ہے، پاپا کی انگلی پکڑ کر میں ساری زندگی نہیں چل سکتی۔“

”یو آر رائٹ..... میں بھی اب یہی چاہتا ہوں کہ تم اگلے کی انگلی چھوڑ کر میرا بازو تھام لو۔ پھر میں اور تم ہوں گے اور زندگی کے سارے رنگ ہمارے سنگ ہوں گے۔ دنیا کی ساری خوشیاں تمہارے آئینے میں ڈال دوں گا۔ مگر ڈیڑہم دوپٹہ تو کبھی اوڑھتی نہیں ہو، پھر خوشیاں کہاں سیف کروں گا؟“ اسے جینز اور شرٹ میں ملبوس دیکھ کر وہ شوخی سے بولا تو مشعل بے ساختہ ہنس پڑی۔

”میرے بینک اکاؤنٹ میں۔“ جواباً اس نے بھی شوخی سے کہا۔

”شکر ہے، تمہارا یہ مسکراتا چہرہ دیکھ کر دل کو قرار آیا۔“

”کیا بات ہے، آج کل خوب اُردو بول رہے ہو؟“

”الہم کے تمام سونگز اُردو میں ہیں تو آج کل اُردو پر زیادہ توجہ ہے۔“

”تم نے شوٹنگ کی ڈینس فکس کر لی ہیں؟“ وہ اس کے قریب بیٹھ کر اشتیاق سے بولی۔

”نہیں پارا! ایک پراہلم ہوگئی ہے۔“

”کیا پراہلم ہے؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پریشانی سے کویا ہوا۔ ”ایڈوائس لے کر ماڈل ایک معروف ایڈورٹائزنگ فرم کی جانب سے کولمبو چلی گئی ہے، اب وہاں انہیں طویل عرصہ لگ جائے گا اور جب تک اس کی واپسی ہوگی تب تک میرے سونگز الہم کی ویلیو ماریٹ ڈاؤن ہو چکی ہوگی۔ اس ماڈل کو لمبی رقم دی ہے، میرے پاس اب کسی دوسری ماڈل کو بنگ کرنے کے لئے پیسہ نہیں ہے۔“

”لیکن اس سے ایڈوائس واپس لینا تھا، اس طرح کیوں جانے دیا؟“

”پارا! تم نہیں جانتیں اس فیلڈ کے لوگوں کو۔ جتنی گلیمرائز ان لوگوں کی پرسنالٹیز ہوتی ہیں اس قدر ہی فراڈ اور کرپٹ حرکتیں ہوتی ہیں۔ گیا تھا میں ایڈوائس واپس لینے مگر.....“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر رُبرُبرے منہ بنا کر کہا۔ ”اس چالا کو کے ماما نے ایسی میری خاطر مدارت کی کہ بس چھٹی کا دودھ یا دا گیا۔“

”اوہ شٹ! تمہیں عادت ہوگئی ہے ہر کسی سے مار کھا کر واپس آنے کی۔ ہونہ، نہ معلوم وہ کون سا محسوس لمحہ تھا جو میں نے تم جیسے بزدل و کمزور مرد کو پسند کیا۔ جو اپنی حفاظت کے لئے ہاتھ نہیں اٹھا سکتا، وہ میرا تحفظ کیسے کر سکتا ہے؟“ وہ ایسے سلگتے لہجے میں کویا ہوئی کہ جو جو مارے طیش کے تڑپ اٹھا۔

”شٹ اپ..... تم میری انسٹ کر رہی ہو۔“ وہ کھڑا ہو کر غصے سے بولا۔

”انسٹ..... ہونہ..... تمہیں تو انسٹ کے بچے بھی نہ آتے ہوں گے۔ تمہیں کیا معلوم کہ ان احساسات سے دوچار ہو کر بندہ کیسے ذلت و خواری کے احساسات سے زخمی ہوتا ہے۔ اسپورٹس، مائننگ، رائڈنگ، سنگنگ ہی لائف نہیں ہوتی۔ کہیں کہیں ہمیں فائٹ بھی کرنی پڑتی ہے، اپنے ہونے کا اظہار دوسری طرح سے کرنا پڑتا ہے۔“

”میں محسوس کر رہا ہوں جب سے اس ”مرکھے قیل“ سے ہمارا ٹکراؤ ہوا ہے، اس دن سے تم بدل گئی ہو، نہ مجھ سے ڈھنگ سے بات کر رہی ہو، نہ آؤ ٹنگ پر جا رہی ہو۔ کیا رینل تم اس حد تک ہرٹ ہوئی ہو اُس دن؟“ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بخجیدگی سے کہا۔

”لیس..... آف کورس.....“ اس نے بھی بخجیدگی سے کہا تھا۔

”اوکے..... اوکے، اب تم دیکھنا، تمہارا یہ خادم کیا کرتا ہے۔“

”اوہو..... کیا کرو گے.....؟“ مشعل شوخی سے کھلکھلائی تھی۔

”بہت جلد معلوم ہو جائے گا تمہیں کہ میرے ان بازوؤں میں کتنا دم ہے۔“ اس نے کمزور بازوؤں کو پھلاتے ہوئے اکثر سے کہا۔

”ہوں..... میں ابھی سے انتظار میں ہوں..... اچھا پھر ماڈل کا کیا کرو گے۔ کیونکہ اس کے بغیر شوٹنگ نہیں ہوگی۔ چھ ماہ گزر چکے ہیں انہی پر ابھر میں، روپیہ ختم ہو جاتا ہے مگر پر ابھر سولوڈ نہیں ہوتیں۔“ اس نے کشن کو دم میں رکھ کر اطمینان سے بیٹھے ہوئے پوچھا۔ جو جو سامنے صوفے پر نیم دراز تھا۔

”کل میرے ذہن میں ایک ونڈر فل آئیڈیا آیا ہے اور ماما نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے۔“ اس نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے سسپنس زدہ لہجے میں کہا۔

”کیسا آئیڈیا؟“

”تم ماڈلنگ کروگی۔“

”میں.....؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟“

”وہو تم نے بہت عرصہ پہلے کر دیا تھا۔“ اس کی جانب گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے روماننگ لہجے میں کہا۔ جواباً اس نے مسکرا کر کشن کھینچ مارا تھا۔

”میں جھوٹ نہیں کہہ رہا، رینل تمہاری انپس اس قدر بیوٹی فل آتی ہیں کہ تمہارا فیس، کیمرہ فیس ہے۔ پھر تم اس قدر حسین، دلربا، شاداب ہو کہ تمہاری بیوٹی میری الہم کو ٹاپ پوائنٹ تک پہنچا دے گی اور تمہیں بھی ٹاپ کی ماڈل بنا دے گی۔ شہر میں، ملک میں بلکہ ملکوں میں تمہارے خُسن کو سراہا جائے گا۔ تمہارے روپ کی دنیا میں دھوم ہو گی، تمہاری نیچرل بیوٹی کے آگے تمام حسینائیں منہ چھپائے روتی نظر آئیں گی، سپر اسٹار بن جاؤ گی تم..... تھلکہ مچ جائے گا تھلکہ.....“

”تمہیں اچھا لگے گا تمہارے علاوہ سب میرے خُسن کی تعریف کریں گے؟“

”اوہ، کم آن مشی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہاری سوچ اتنی بیک ورڈ ہے سے ہوگئی؟“

”اس قدر آنکھیں نہیں پھاڑو، میں نے ایسے ہی بات کر دی ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”میں بہت روشن خیال اور کھلے دل کا آدمی ہوں اور خُسن کو پر دوں میں چھپا کر رکھنے کا قائل ہرگز نہیں ہوں۔ میرے خیال میں جو ایسا کرتے ہیں وہ فطرت سے بغاوت کرتے ہیں۔ دیکھو نا، قدرت نے اپنے حسین نگاروں کو کبھی ماسک نہیں پہنایا۔ پھولوں کی خوب صورتی، چاند کی چاندنی، ستاروں کی دلکشی، کلیوں کی نوخیزی، ہنرے کی طمانیت، جھرنوں کی دلربائی اور بارش کی سرمستی، سب ہمارے لئے اوپن ہے، کہیں بھی کوئی پردہ، کوئی اوٹ، کوئی نقاب موجود نہیں ہے۔“ وہ جُرجوش کہتا ہوا لمحے بھر تو قف کے بعد بولا۔

”تمہاری تعریف، میری تعریف ہے، تمہاری ستائش میں، میں بھی شامل ہوں گا اور پھر سب سے انٹر سٹنگ بات یہ ہے کہ گھر کا منگرا اور گھر کی ماڈل ہوگی تو ہمیں لاکھوں روپوں کی بچت ہوگی۔“ آخری الفاظ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہے۔

”سوچوں گی۔“ اس کے انداز میں نیم رضا مندی تھی۔

”سوچنا کیا ہے، جب میں نے طے کر لیا ہے۔“ وہ کھڑا ہو کر بولا۔

”نہیں، تم پہلے اپنا وعدہ پورا کرو پھر.....“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔



عصر، مغرب اور اب عشاء کا وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ شاہویر ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ عصر کے وقت گھر لوٹ آنے کا اس کا روزانہ معمول تھا۔ اپنی اس روٹین پر پابندی سے عمل پیرا تھا لیکن آج نہ معلوم کیا ہوا تھا کہ عشاء کے بعد بھی وہ نہ آیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، بے جی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُن کی آنکھیں دروازے پر تھیں تو سماعت باہرگی میں گزرنے والے کسی کے بھی قدموں کی چاپ پر چونک اٹھتی تھی۔ ہر آہٹ انہیں بے چین کر ڈالتی تھی۔ دل کو پانچے کی رفتار سے چل رہا تھا، بے چینی و اضطراب انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس طرح بغیر بتائے کہیں چلا گیا ہو۔ کیونکہ وہ از حد ذمے دار اور حساس تھا۔ آفس میں اگر کام زیادہ ہوتا تو بتا کر جایا کرتا کہ واپسی دیر سے ہوگی اور بتائے گئے مقررہ وقت پر گھر آ جایا کرتا تھا۔

جب گھڑی کی سوئیاں گیارہ پہنچ گئیں تو خوف و گھبراہٹ سے اُن کا ہر حال ہو گیا۔ وہ پنگ پر دل پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو، کسی مصیبت میں میرا بچہ



گرفتار نہ ہو گیا ہو۔ یا اللہ! رحم کرنا، میرے بچے کی حفاظت کرنا میرے مالک! میرے بچے کو صحیح سلامت گھر بھیج دے، مولانا تیرا کرم ہوگا، تیرا احسان ہوگا، میرے بڑھاپے کی لاٹھی ہے وہاں پر وردگار میرے شاہویر کی حفاظت کرنا، اسے جلد از جلد گھر پہنچا دے۔“

وسوسوں نے ان کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑا تو وہ اندیشوں سے ڈر کر گرگڑا کر دعائیں مانگنے لگیں۔

اسی وقت دروازہ دھیرے سے کھلا تھا۔ شاہویر اندر داخل ہوا تھا۔

”شاہویر! یہ..... خو..... ان.....؟“ اس کی وائٹ شرٹ پر جا بجا لگے خون کے سرخ دھبے اور زرد چہرہ دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

”بے جی..... بے جی! مجھے کچھ نہیں ہوا، میں ٹھیک ہوں، یہ خون میرا نہیں ہے۔“ اس نے آگے بڑھ کر ان کے چکراتے وجود کو تھام کر اطمینان سے کہا۔

”نہیں..... تجھے کیا ہوا؟ اتنی دیر کیوں ہوئی؟ اور خون کس کا ہے؟“ اس کے چہرے اور جسم پر ہاتھ پھیر کر، کوئی زخم نہ پا کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر گویا ہوئیں۔

”بڑی بھوک لگی ہے بے جی! پہلے کھانا کھاتے ہیں، پھر تفصیل سے آپ کو بتاتا ہوں۔“

”ہاں، ہاں..... پہلے نہا کر کپڑے بدل لو۔ یہ خون دیکھ کر تو میرا کیچڑا بھی تک کانپ رہا ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ وہاں تھہروم کی طرف بڑھ گیا۔

جلد از جلد اصل بات جان لینے کی بے چینی میں ان سے کھانا بھی ڈھنگ سے نہیں کھایا گیا تھا۔ شاہویر ان کی پریشانی و بے چینی سے پوری طرح آگاہ تھا۔ کھانے کے بعد اس نے بتایا کہ آفس سے واپسی پر سڑک کے کنارے ایک نوجوان بے ہوش پڑا ملا۔ کوئی گاڑی والا مار کر چلا گیا تھا۔ کیونکہ وہ علاقہ زیادہ آباد نہیں ہے اس لئے کسی نے ایکسیڈنٹ کرنے والے کو نہیں دیکھا۔ وہ بڑی مشکل سے اسے ہاسپٹل لے کر پہنچا تھا جہاں ایکسیڈنٹ کیس ہونے کے باعث پولیس کا رروائی کے بعد اسے میڈیکل ٹریسٹ دی گئی تھی۔ اس دوران اس نوجوان کا بہت زیادہ خون ضائع ہو جانے کے باعث حالت نازک ہو گئی تھی۔ بلڈ بینک سے دو بوتل خون کی ملی تھیں۔ بلڈ گروپ مل جانے کے باعث مزید دو بوتل خون کی دے کر آیا تھا۔ خون دینے کے بعد اس پر فنوڈنگی سی طاری ہو گئی تھی، طبیعت بحال ہوتے ہی وہ گھر چلا آیا تھا۔

”کیسی طبیعت ہے اس بچے کی؟ ارے کیسے ظالم لوگ ہیں، دل میں خوف خدا ہی نہیں ہے۔ ایک تو گاڑیاں لوگوں پر چلا دیتے ہیں پھر اپنی غفلت چھپانے کے لئے رخصیوں کو مرنے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے بے ضمیر و بے ایمان لوگوں کی وجہ سے نہ معلوم کتنے گھروں پر ان ہو جاتے ہیں۔ اچھا کیا میرے بچے! جوتم نے نیکی کا کام کیا، اللہ تعالیٰ اس کا اجر تمہیں ضرور دیں گے۔ جس طرح تم نے اس بچے کی جان بچائی ہے، اوپر والا بھی تمہیں ہر ناگہانی آفت و مصیبت سے بچائے گا۔“ بے جی کے لہجے میں سکون در آیا تھا۔

”ہوش آگیا تھا بے جی اس کو۔ مگر گھرے زخموں کی وجہ سے بہت درد ہو رہا تھا۔

”چلو اللہ نے زندگی بچائی۔ یہ بہت مہربانی ہے اس کی۔ زخم کتنے ہی گہرے ہوں ایک دن بھر جائیں گے، پروردگار سب کی مانتا سلامت رکھے۔ چلو اب تم بھی آرام کرو۔ دو بوتل خون جسم سے نکل جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میں دودھ میں پستے، بادام پکا کر لارہی ہوں۔ صورت دیکھ کیسی سروسو جیسی ہو رہی ہے۔“

□●□

”بھائی جان! آج تو میں آپ سے ہاں کروا کر ہی جاؤں گی۔“ ڈنر کے بعد رانفہ حسن بیگ کے اسٹڈی روم میں چلی آئیں۔

”ہاں تو میں بہت عرصہ قبل کہہ چکا ہوں۔“ وہ شفقت سے مسکرائے۔

”آپ نے کہا تھا مشعل اسٹڈی کپیٹ کر لے پھر آپ اس کی شادی کریں گے۔ اب کے سال وہ اسٹڈی سے فارغ ہو گئی ہے، اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ احمد اگلے ہفتے بحرین سے آرہے ہیں، ان کے آنے کے کچھ دن بعد ہم شادی کی تاریخ مقرر کر دیں گے۔ جو جو بھی کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے کہ آپ سے بات کروں۔ دراصل آپ سے بات کرتے ہوئے ہجک آتی ہے اسے۔ بہت خوش نصیب ہیں آپ بھائی جان جو اس دور میں آپ کو اتنا شرمیلا و سعادت مند دلا دہل رہا ہے۔“ وہ دھیرے سے ہنس کر گویا ہوئیں۔

”جنید نے اپنے مستقبل کی کیا پلاننگ کی ہے؟ اسپورٹس، سٹنگ و غیرہ مجھے پسند نہیں ہیں اور نہ ہی ان سے ایک شاندار مستقبل بنتا ہے۔ یہ ایکٹیویٹیز بچپن لائف میں سوٹ اہل ہوتی ہیں۔ میرڈلائف میں ان ہابیز کی قطعی گنجائش نہیں ہوتی۔ اسے اب یہ تمام فضول مشاغل ترک کر کے عملی دنیا میں قدم رکھنا چاہئے۔“ اس بار وہ بخیدگی سے گویا ہوئے تھے۔

”بھائی جان! اس کے پیچھے کوئی لمبا چوڑا کتبہ نہیں ہے جو وہ سب کے پیٹ پالنے، تن ڈھاپنے کے لئے خود کو بھلا کر محنت و مشقت میں لگ جائے۔ اکلوتا بیٹا ہے ہمارا اور آپ کا بھی اکلوتا داماد ہے۔ ہماری اور آپ کی تمام جائیداد جو جو کی بھی تو ہے اوہ..... میرا مطلب ہے جو جو اور مٹی کی ہے۔ پھر ہمارے بچوں کو عام لوگوں کی طرح محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ بھائی کو از حد بخیدہ و فکر مند دیکھ کر وہ خاصی سنبھل سنبھل کر کہہ رہی تھیں۔

”عام لوگ، میرے خیال میں جو مشقت و محنت سے کام کر کے اپنے گھروں کو سپورٹ کر رہے ہیں وہ بہت خاص اور قابل قدر لوگ ہیں۔ تمہارے نظریے سے مجھے اختلاف ہے رانفہ.....“ وہ کچھ لمحے توقف کے بعد گویا ہوئے۔ ”ہم کیا تھے..... یہ تو تم نہیں بھولی ہو گی؟“

”ہم کیا ہیں، اب ہمیں صرف یہ یاد رکھنا چاہئے بھائی جان! ہمارے بچوں کو کبھی بھی ہمارے ماضی کے بارے میں معلوم نہیں ہونا چاہئے، ان کی شخصیت ایک بار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی تو نا حیات جڑ نہ پائے گی۔“ انہوں نے جڑ بڑھ کر کہا۔

”ماضی ہی تو انسان کی بنیاد ہوتا ہے۔ اس سے فرار پانے والے کامیاب زندگی نہیں گزار سکتے۔ بلند یوں کو چھونے سے پہلے اور بعد، پستیوں کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ نہ معلوم کون سا غلط قدم ہمیں کسی وقت ہمارے اصل کی طرف لوٹا دے۔“

”خدا کے لئے بھائی جان، ایسی بات نہ کیجئے۔ پستیوں سے بلند یوں کا سفر بہت جاں فزا ہوتا ہے مگر واپسی موت ہوتی ہے تقریباً۔ آپ ایسی خوف ناک بات نہ کریں تو بہت بہتر ہے۔ بس آپ جلدی سے مجھے ہاں کہہ دیں۔“

”ابھی نہیں رانفہ! مٹی میری اکلوتی بیٹی ہے، میری روح، میرے دل کا ٹکڑا ہے۔ اتنی جلد میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ کچھ وقت میں اس کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، پھر اس کی شادی کر دوں گا۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولے۔

”آپ فکر کیوں کرتے ہیں، شادی کے بعد مٹی اور جو جو آپ کے پاس ہی رہیں گے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے احمد بزنس کے باعث اکثر غیر ملکی ٹورز پر ہی رہتے ہیں اور اکثر مجھے بھی ان کے ساتھ جانا پڑتا ہے۔ جو جو کی شادی کے بعد مجھے اس کی فکر سے آزادی مل جائے گی تو بہت کم میرا یہاں رہنا ہوگا۔ تھوڑا عرصہ ہم دونوں میاں بیوی یہاں گزار لیا کریں گے، اس طرح مٹی کے ساتھ جو جو بھی آپ کے پاس ہی رہے گا، یا یوں کہہ لیں کہ میں جو جو کو وادع کر دوں گی۔“ وہ شگفتہ موڈ میں مسکرا کر بولیں۔

”ٹھیک ہے، پھر احمد آجائیں تو ڈیٹ فکس کر لیں گے۔“

”اوہ..... شکریہ بھائی جان، سچ خوشیوں سے آپ نے میرا دامن بھر دیا ہے۔“

”شکریے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپس میں رشتے دار یاں اس لئے کی جاتی ہیں کہ محبت کی ڈور اور مضبوط ہو اور غلوں و اپنائیت کی شیرینی بڑھ جائے۔“

”بے شک بھائی جان، بے شک..... ہماری محبت و اپنائیت کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ میں مٹی کو جو جو سے بڑھ کر چاہوں گی۔ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں مل سکتا بھائی جان! ایک ضرورت آن پڑی ہے بلکہ سخت پریشانی ہے۔“

ان کے ہنستے مسکراتے چہرے پر یکدم ہی پڑمردگی چھا گئی۔

”ہوں..... کیا ہوا؟“ انہوں نے چونک کر عینک درست کر کے استفسار کیا۔

”صرف ڈیڑھ کروڑ روپے کی اشد ضرورت ہے۔ اگر نہ ملے تو ہم سوسائٹی میں کسی کومنہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے اور بھائی جان! آپ کی پرسنل الگ خراب ہوگی۔ احمد اور میں آپ کے حوالے سے ہی جانے جاتے ہیں۔“ وہ آرزوگی سے بولیں۔

”ڈیڑھ کروڑ.....؟“

”پلیز بھائی جان! انکار مت کیجئے گا آپ۔ بڑی آس لگا کر آئی ہوں۔“ ان کی بات قطع کر کے وہ تیزی سے بولیں۔

”پہلے کبھی انکار کیا ہے جواب کروں گا، مگر اتنی بڑی رقم، کچھ وقت لگے گا.....“ وہ دھیسے لہجے میں گویا ہوئے تو رانفہ خوش خوشی اٹھ گئی تھیں۔

□●□

حسن بیگ صاحب کی طبیعت گزشتہ دو روز سے خراب تھی، اس وجہ سے وہ آفس بھی نہیں آرہے تھے۔ وہ آفس آیا تو منیجر صاحب نے اسے کہا کہ سراسر گھر پر بلا رہے ہیں۔ بزنس سے متعلق انہیں کچھ باتیں کرنی ہیں۔

پیغام سن کر کچھ لمحے کی بورڈ پر تیزی سے چلتی ہوئی اس کی انگلیاں ساکت ہو گئی تھیں۔ نگاہوں میں اس بدتمیز و از حد مغرور لڑکی کا سر پالہ رہا تھا اور نا کواری و ناپسندیدگی اس کے نقوش سے ہوید اور ہی تھی۔ مگر حکم حاکم تھا، اسے ویسے بھی حسن صاحب کی سادہ و فروغدار شخصیت نے اپنا اسیر کر لیا تھا۔

حسن بیگ صاحب بہت گرم جوشی سے ملے۔ اس نے بھی خلوص سے ان کی خیریت دریافت کی تو وہ مسکرا کر بولے۔

”بیٹا! بڑا ہلکا خود سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے، کس کس سے جان بچائیں بھلا؟“

”میں سوچتا ہوں سراسر انسان کو آخری سانس تک ہر دکھ، ہر تکلیف، ہر پریشانی سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ ہمت گنوا دینے سے، حوصلہ چھوڑ دینے سے معمولی سی چیز بھی ہم پر حاوی ہو کر بڑی سے بڑی تکلیف میں مبتلا کر دیتی ہے۔“ اس کے گہبھر لہجے میں بچائی، عزم و حوصلے کی چمک تھی۔

اس کی اسی جدوجہد، عزم و حوصلہ، محنت و دیانت داری نے حسن بیگ کو اس کا گرویدہ بنایا تھا۔ سب سے زیادہ انہیں اس کے بلند ارادے، از حد دیانت نے متاثر کیا تھا اور وہ بہت کم عرصے میں ان کے لئے بہت اہم ہو گیا تھا۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد وہ ضروری فائلز کھول کر ہی بیٹھتے تھے کہ یکدم اوپر سے آوازیں آنا شروع ہوئی



اس نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر سانس جیسے سینے میں آنک کر رہ گیا تھا۔ دوسرے لمحے اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

”بس یا راجلدی چلو، خود ہی مر جائے گا۔“ جو جو نے دور سڑک پر نمودار ہونے والے جگنوؤں کو دیکھ کر ہجرت کہا تھا۔

”ابھی تو مزا آنے لگا تھا اور تو کہہ رہا ہے چلو۔“ جوزف نے جو ایک مرتبہ چا تو شاہ ویز کے پہلو میں اتارنے کے بعد دوسرا وار کرنے کے لئے ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ اس کی گھبراہٹی ہوئی آواز وانداز نے اس کا موڈ بگاڑ دیا تھا۔ وہ شاید جنوبی اذیت پسند تھا اور ایسے لوگوں کو خون بہا کر، اذیت دے کر اور تڑپا کر مارنے میں دلی راحت و سکون محسوس ہوتا ہے۔

”مجھے لگ رہا ہے کوئی آرہا ہے..... غمناک چلو۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو.....“

”ٹھیک کہتی ہے مٹی تم کو، بزدل اور ڈرپوک۔ جب تم میں اتنا حوصلہ نہیں تھا تو صرف ہمیں بتا دیا ہوتا، خود کیوں ساتھ آئے؟ اس طرح ڈکار کو چھوڑنا ہماری بہادری کو مارا نہیں کر رہی۔“ دوسرا لڑکا جس نے شاہ ویز کو زنجیر ماری تھی بڑے خراب لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔ کانٹے دار خون آلود زنجیر ابھی بھی اس نے تھام رکھی تھی۔

شاہ ویز نیچے زمین پر پڑا ہوا تھا بے سدھ، بے خبر۔ اپنے خون میں ڈوبا ہوا۔

ان میں خوب بحث جاری تھی۔ جو جو انہیں لے کر فوراً نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ دور سے جگنو کی طرح نظر آنے والی لائٹس اب قریب آتی جا رہی تھیں جو یقیناً کسی کارکن ہینڈ لائٹس تھیں مگر ابھی بھی کارکن فی فاصلے پر تھی۔

”اوکے، اوکے، میں بزدل ہوں، ڈرپوک ہوں مگر بے وقوف اور جذباتی نہیں ہوں۔ جو تم لوگ ہو۔ جب میں کہہ رہا ہوں اس کا اتنا خون بہہ چکا ہے اور بہہ رہا ہے تو اس کا بچنا ناممکن ہے۔ اسے مرنا ہے تو سسک سسک کر ہی مرنے دو۔ کیوں ایک دم مار کر اسے تکلیف سے نجات دلانا چاہتے ہو۔“ جو جو نے بحث سے تنگ آ کر چیخ کر کہا۔

”ویل ڈن میری جان! شاید پہلی مرتبہ تم نے ٹھنڈی کی کوئی بات کی ہے۔ چلو، چلو مر جائے گا خود ہی۔ اگر زندہ بھی رہا تو ہمیشہ یاد رکھے گا کہ کس کے فریڈز سے لکری تھی۔ ڈر کے مارے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔“ جوزف کے ساتھ ان سب نے قہقہے لگائے تھے۔

”ایک منٹ.....“ جو جو گاڑی سے چھلانگ مار کر نیچے اترا اور بھاگتا ہوا سامنے گری ہوئی بائیک کے پٹرول ٹینک سے پٹرول لیک کر کے لاسٹر جلا کر اس طرف اچھالا تھا اور بھاگتا ہوا واپس گاڑی میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس دوران اس کی جیب سے نکل کر کچھ نیچے گر اٹھا جسے وہ جلدی اور گھبراہٹ میں محسوس نہ کر سکا تھا کیونکہ کار خاصہ قریب آگئی تھی اور بہت جلد ان تک پہنچنے والی تھی۔

”اس بائیک کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔ ویسے بھی جب بائیک والا ہی نہ رہے گا تو بائیک بے کار ہو جائے گی۔“ جو جو نے مسکرا کر کہا تھا اور تیزی سے گاڑی آگے بھاگ کر لے گیا تھا۔ لمحوں میں لینڈ کروزر ہواؤں سے شرط لگاتی لگا ہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

□●□

”سر، آگے اسکوٹر چل رہی ہے..... اور اس طرف لاش پڑی ہے۔“

”روکو..... کار روکو.....“ وہ گھبرا کر ڈرائیور سے پہلے کار سے نکلے تھے اور کچھ دور پڑے اس خون میں نہاے وجود کی طرف بڑھے تھے۔

”اوہ، اوہ آصف! یہ..... یہ شاہ ویز ہے! اوہ یہ کیا ہو گیا ہے، کس نے کیا ہے؟ مانی گاڈ! بہت خون بہہ گیا ہے۔“ حسن بیگ نے جیسے ہی اس کا چہرہ دیکھا تھا ان کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔

”سر! سامنے بائیک پورا چل گیا ہے اور بائیک کے پاس سے یہ والٹ ملا ہے۔“

”شاہ ویز کا ہی ہو گا یہ۔ تم جلدی سے شاہ ویز کو اٹھوا کر میرے ساتھ کار میں لٹاؤ۔“ انہوں نے والٹ کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”کار میں؟..... سر ایسیبولینس بلوائی لیتے ہیں۔“

”نہیں..... نام نہیں ہے۔ شاہ ویز کی حالت بہت سیریس ہے۔ لحد لحد قہقہے ہے، بلیڈنگ بہت ہو چکی ہے اور مورہی ہے۔“ بہت احتیاط سے انہوں نے شاہ ویز کو اٹھوا کر کار کی بچھلی سیٹ پر لٹایا تھا۔ اس کے لمبے چوڑے گھائل وجود کو اس پر سیٹ کرنے میں بھی خاصی دقت و احتیاط کا سامنا کرنا پڑا تھا اور خود حسن بیگ سیٹ کی درمیانی جگہ پر بیٹھ گئے تھے۔ دونوں ہاتھ اس پر رکھے ہوئے تاکہ ڈرائیونگ کے دوران کسی جھٹکے سے وہ نیچے نہ گر جائے۔

آصف فل اسپید میں کار دوڑا رہا تھا۔ حسن بیگ کے لبوں سے اس کے لئے دعائیں نکل رہی تھیں، جس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی، سانسوں کی رفتار سست پڑ رہی تھی۔ کی بورڈ پر بجلی کی سی پھرتی سے چلنے والے ہاتھ بے جان پڑے تھے۔

□●□

”الہی خیر!“ یکدم ہی موسم نے پلٹا کھایا۔ سارے دن آسمان پر آوارہ گردی کرنے والے چھوٹے چھوٹے سرمئی مکڑے یکجہت ہی متحد ہو کر گہری سرمئی چادر میں تبدیل ہو کر آسمان پر چھا گئے تھے اور لمحوں میں موٹے موٹے شفاف پانی کے قطرے ہر سونکھنے والے لگے تھے اور یک دم ہی ہوا منہ زور گھوڑے کی مانند سر پٹ دوڑنے لگی۔ آسمان واحد میں طوفانی ہواؤں سے گرد و خراب کے ساتھ عجیب زرد زردی فضا ماحول پر چھا گئی تھی۔ ہوائیں کھڑکیوں، دروازوں کے پٹ بری طرح جھنجھوڑ رہی تھیں۔

صحن کے بچوں بچ لگانیم کا درخت لگ رہا تھا کسی بھی لمحے اپنی جڑوں سمیت زمیں بوس ہو جائے گا۔ موٹی موٹی بوندیں موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو گئیں اور بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک رہے سبے اوسان بھی خطا کئے ڈال رہی تھی۔

بے جی دل پر ہاتھ رکھے الہی خیر..... الہی خیر کا ورد کرتی ہوئی ادھر ادھر متوحش انداز میں ٹہل رہی تھیں۔ جب کہ زرینہ الطینان سے پلنگ پر بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔

”سچ آپا، بچپن سے نکل کر بچپن کے پلینے میں آگئی ہو مگر یہ بارش، گرج و چمک سے ڈرنا تمہارا ابھی تک نہیں گیا۔ اللہ قسم تمہیں ابھی بھی اس طرح خوفزدہ و پریشان دیکھ کر مجھے بچپن کے وہ دن یاد آرہے ہیں جب تم اسی طرح ڈر کر بابا کی کود میں چھپ جایا کرتی تھیں اور لبا ساری رات تمہیں سینے سے لگائے رکھتے تھے۔ ماں، مال پوئے، میٹھی نکلیاں، گلے لگتی محبت سے بناتی تھیں اور تمہارے لئے دال بھرے پرائیڈ تو خصوصی طور پر بناتی تھیں مگر تم ایک نمبر کی ڈرپوک، تمہارا پینٹ تو خوف کھانے سے ہی ہر وقت بھرا رہتا تھا تو بھلا وہ چیزیں کیوں کھاتیں۔ کیا دن تھے وہ بھی آپا، کیسی اچھی اور سکھی زندگی تھی، ہر طرف بیارہی بیارہی محبت ہی محبت، خلوص ہی خلوص، نفسا نفسی اور عداوتیں نام کو نہ تھیں۔ جب کہیں بھی ملاوٹ نہیں تھی نہ رشتوں میں نہ خلوص و بیارہی میں اور نہ ہی چیزوں میں۔ اب تو کو یا ہر شے میں ہی ملاوٹ ہو گئی ہے۔ اس ملاوٹ سے اشیاء خورد و نوش ہی نہیں محفوظ رہیں بلکہ یہ وبا اتنی تیزی سے پھیلی ہے کہ اس کی لپیٹ میں انسان، رشتے، ماتے، محبت، خلوص، بیارہی و عزت و احترام سب کچھ ہی آگیا۔ شاید جیسی جس بھی زندگی کا مخ ہو گیا ہے۔“

وہ بولتے بولتے ایک دم ہی رنجیدہ ہو گئی تھیں۔

”زرینہ! میں گھر جاؤں گی، میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔“ ان کے اندر عجیب سی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ایک اذیت کا احساس تھا جیسے کوئی ان کے دل کو دو بوج رہا ہو، ایک بے نام سی وحشت و ویرانی انہیں محسوس ہو رہی تھی۔ دماغ کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ وہ زرینہ کے ہلتے ہونٹ محسوس کر رہی تھیں مگر راحت بیدار نہ تھی۔

”میں نے کہا زرینہ! میں گھر جا رہی ہوں۔“

”کیا ہوا آپا! میں کہہ تو رہی ہوں باہر موسم بہت خراب ہے۔ گھر کیسے.....“

”میرے اندر کے موسم سے زیادہ خراب نہیں ہے۔ میرا بچہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“ انہوں نے سائیڈ کی دیوار پر لگی کھوٹی سے اپنا برقع اتارتے ہوئے کہا۔

”غضب خدا کا، گھر میں ہی بیٹھی ہونا آپا! پھر کیوں اس قدر بے چین ہو رہی ہو۔ اور اللہ بھلا کرے شاہ ویز کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے جو گھر میں ڈر جائے گا۔“ وہ ان کے ہاتھ سے برقع لیتی ہوئی خٹکی سے بولیں۔

”مجھے مت روک زرینہ، میرا دل گھبرا رہا ہے۔ نہ معلوم کیا ہوا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ مجھے لگ رہا ہے جیسے..... جیسے میرے شاہ ویز کو کوئی مجھ سے چھین رہا ہو۔“ ان کے لہجے میں لمرزش، آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ لمحے بھر کو زرینہ کا دل بھی کانپ اٹھا تھا مگر وہ نظر بتا لا پرواہ وہ بے فکری طبیعت کی مالک تھیں۔ دوسرے لمحے خود کو سنبھال کر بولیں۔

”کون چھینے گا شاہ ویز کو تم سے بھلا۔ بے شک اس کو جنم تم نے نہیں دیا مگر آنکھ کھولی اس نے تمہاری آغوش میں، چھبیس سال کے ہر لمحے میں تم اور تمہارا عکس اس کے ساتھ رہا ہے۔ تم نے اس کے لئے ہر وہ تکلیف و پریشانی اٹھائی جو صرف اور صرف سگی ماں ہی اولاد کی خاطر جھیل سکتی ہے۔ کل کے ننھے سے بولے کو آج تناور درخت تمہاری محبت نے بنایا ہے۔ پھر تم سے کون چھین سکتا ہے اسے؟“

”اللہ میرے بچے کو اپنی امان میں رکھے، ہر بلا و تکلیف سے بچائے۔“ دعا مانگتے مانگتے وہ بے اختیار روونے لگی تھیں۔

”خالہ جان! کیا ہوا؟“ اندر کمرے سے اصغر نکلا۔ انہیں روتا دیکھ کر پریشانی سے پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں، بس آپا کا دل تو شروع سے ہی کمزور ہے۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد یہاں آئی ہیں تو شاہ ویز کی طرف سے پریشان ہو رہی ہیں۔“ بیٹے سے بات کرتے وقت ان کی تیوریوں میں تل پڑ گئے تھے، لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

”خالہ جان! فکر مند ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تھوڑا بارش کا زور کم ہو جائے میں جا کر شاہ ویز کو لے آؤں گا یا میرا خیال ہے وہ خود ہی آجائے گا۔“

”بیٹا! نہ معلوم کیوں مجھے عجیب سے وسوسے آرہے ہیں۔ کیا..... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مجھے ابھی گھر لے چلو۔“ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ممتی لہجے میں بولیں۔ اصغر نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اسی لمحے لائٹ فیل ہو گئی۔

”لو..... یہ لائٹ بھی چلی گئی۔ اب میں کہاں موم بتی ڈھونڈتی پھروں، بہو بیگم کو سیر سپاٹوں سے فرصت نہیں، گھر گیا بھاڑ میں۔ ایک ہفتے سے ماں کے ہاں گئی ہوئی ہے، واپسی کی فکر ہی نہیں ہے اور فکر ہونے بھی کیوں لگی۔ مجھوں میاں تو صبح و شام حاضری دے کر آرہے ہوں گے۔ ماں کی انہیں کہاں پرواہ ہے، کل کی مرنی آج مر جاؤں،



ان کے دلوں کی مراد بر آئے گی۔“ وہ حسبِ عادت شروع ہو گئی تھیں۔ اصغر خاموشی سے موم بتیاں لینے چلا گیا تھا۔ باہر بارش ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ ہوا کے جھلکے بند ہو گئے تھے مگر گرج چمک اسی طرح ہو رہی تھی۔

”خاموش ہو جاؤ زرینہ، کبھی کبھی ایسی باتیں درگزر بھی کر دیا کرو۔“

”کیسے خاموش ہو جاؤں آپ، میرے ہی گھر میں میری کوئی عزت نہیں ہے۔“

”اس کی ذمہ داری تم خود ہی ہو۔“

”آں، یہ تم کہہ رہی ہو آپ..... تم؟ آئے ہائے، میرے نصیب کہ.....“

”خاموش رہو، بالکل خاموش۔ عزت کروانے کے لئے ایثار، درگزر، ضبط و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی ”میں“ کو مارنا پڑتا ہے۔ لیکن تم بچوں کے ساتھ بچی بنی ہوئی ہو۔ سیدھی اور کھری بات یہ ہے کہ عزت کروانے کے لئے عزت کرنی چاہئے۔ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔“ انہوں نے رسائیت سے انہیں سمجھایا۔

”اچھا، اب چھوٹوں کی عزت کریں گے تب ہماری عزت ہوگی۔“

”ہاں..... وقت ہی ایسا ہے اور سیانا وہی ہے جو وقت کے ساتھ چلے۔“

”خالہ جان! باہر گلیوں میں پانی بھرا ہوا ہے۔ بارش کم نہیں ہو رہی اور لائٹ بھی نہیں ہے۔ ایسے میں گھر سے نکلتا خطرے سے خالی نہیں۔ آپ صبح تک انتظار کر لیں۔“ اصغر نے باہر کی صورت حال بتانے کے ساتھ ساتھ موم بتیاں بھی روشن کر دی تھیں۔

”اچھا ٹھیک ہے، جو اللہ کی مرضی۔“ انہوں نے پڑمردگی سے کہا اور وضو کرنے آگے بڑھ گئیں۔ اصغر ماں سے مخاطب ہوا۔

”امی جان! کھانا ہوٹل سے لے آؤں گا۔“

”گلیوں میں پانی بھرا ہے کیا تیر کر لاؤ گے؟“ انہوں نے جواب میں پتھر سا مارا۔

”اسٹاپ والا علاقہ زیادہ خراب ہو رہا ہے۔ ہوٹل تک راستہ ذرا بہتر ہے۔“

”ہاں بھئی، بیوی نے عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ ہوٹلوں کا کھانا کھلا کھلا کر اب گھر کا کھانا کہاں پسند آئے گا؟“ وہ بیٹے کی ہمدردی کو غلط رنگ دیتی، بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔



شہر کے معروف و مہنگے ترین ہسپتال میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ ایک وجوہ خود جن بیگ کی موجودگی تھی کہ وہ مشہور انڈسٹریسٹ تھے۔ ان کی شناخت خاصی جگہوں پر تھی، دوسرے اس ہسپتال کے مالک سے ان کی دوستی تھی جو یہاں کڈنی اسپیشلسٹ کے طور پر بھی بیٹھتے تھے اور انہوں نے ہی یہ کیس اپنے ذمے لیا تھا۔ شاہوین آپریشن روم میں تھا۔ اس کی حالت ابھی تسلی بخش نہیں تھی۔

بیگ صاحب آصف کے ہمراہ آپریشن تھیٹر کے باہر گیلری میں بچھے صوفے پر بیٹھے تھے۔ مضطرب و پریشان اور آصف دل ہی دل میں ان کے خلوص و محبت کو داد دے رہا تھا۔ ایک ملازم کے لئے مالک کا اتنا فکر مند و پریشان ہونا اس دور میں ناقابلِ یقین تھا مگر یہ سب اس کے سامنے ہو رہا تھا اس کے لئے وہ حیران تھا۔

”سر! شاہوین صاحب بچ جائیں گے نا؟“

”دعا کرو آصف! دعاؤں میں بہت طاقت ہوتی ہے۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔

”شاہوین صاحب کے لئے تو دل سے دعائیں نکلتی ہیں سر۔ بہت نیک اور ہمدرد طبیعت پائی ہے انہوں نے۔ سمجھ میں نہیں آتا اتنے اچھے انسان کا کون دشمن ہو سکتا ہے۔“

”دشمن اچھے انسانوں کے ہی ہوتے ہیں۔ موسم بہت خراب ہے۔ مجھے یہاں نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے۔ تم گھر چلے جاؤ۔ تمہارے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“ حسن بیگ نے رسٹ و ایج میں ناظم دیکھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔

”نہیں سر! میں تنہا ایسے موقع پر آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا بلکہ آپ کو گھر چھوڑ کر آ جاؤں پھر یہاں رک جاؤں گا، آپ سارے دن کے تھکے ہوئے ہیں۔“

”نہیں، میں گھر نہیں جاؤں گا۔ جس طرح شاہوین تمہیں عزیز ہے، اسی طرح وہ مجھے عزیز تر ہو گیا ہے۔ بہت کم لوگوں میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ جس کو دیکھتے ہیں وہ ان کے ہو جاتے ہیں۔ بہت کم عرصے میں اس نوجوان نے ہمیں اپنا اسیر کر لیا ہے۔ اس جیسی ذہانت، قابلیت اور خود اعتمادی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔“ حسن صاحب کی آواز بہت دھیمی تھی جیسے وہ خود سے غوغلا ہو رہا تھا۔

”نہ معلوم کچھ انسانوں میں حیوانیت کیوں اس قدر سرامت کر چکی ہے کہ ان کی گھناؤنی و بے رحمانہ حرکات انسانیت کو منہ چھپانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ کیسے بے ضمیر درندہ صفت لوگ تھے جنہوں نے نہ صرف اپنے وحشیانہ سلوک سے زندہ و صحت مند شخص کو زخم زخم کر کے موت کی دہلیز کی طرف دھکیل دیا ہے بلکہ بے حسی و بد لحاظی کی بدترین مثال وہ بایک جلا کر پیش کی ہے۔ یہ کیسا اندھا انتقام ہے جو انسانوں کو ہی نہیں بلکہ ان سے وابستہ ہر شے کو خاکستر کر ڈالتے ہیں۔“

”یہ کچھ لوگوں کا مزاج بن گیا ہے۔ مگر سر! آپ ان لوگوں کو ضرور سزا دلوائیے گا جو اتنے سفاک و ظالم ہیں۔“ آصف نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

”ہاں ضرور..... شاہوین ہوش میں آ کر نشاندہی کر دیں گے۔“

”سر! اگر آپ اجازت دیں تو کاؤنٹر سے گھرفون کر کے اطلاع کر دوں ورنہ گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“ کچھ دیر بعد آصف نے اجازت چاہی۔

”ہاں، ہاں..... ضرور۔ بلکہ میں کہہ رہا ہوں گھر چلے جاؤ۔ اگر نہیں جانا چاہ رہے تو گھر اطلاع لازمی کر دو۔“ انہوں نے فوراً اجازت دی تھی۔ آصف چلا گیا تھا۔ انہوں نے تھک کر صوفے کی بیک سے ٹیک لگالی۔ معائنہ پادیا کہ شاہوین کے گھر والے بھی اس کا انتظار کر رہے ہوں گے اور ایک تو موسم کی خرابی دوسرے اس کی اتنی دیر کی غیر حاضری پر وہ پریشان ہوں گے۔ یہ انہیں معلوم نہ تھا کہ اس کے گھر میں کتنے افراد ہیں مگر اکثر شاہوین سے کسی بے جی کا ذکر سنتے رہے تھے۔ اس کے لہجے کے والہانہ پن سے انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ بے جی کو دل و جان سے بڑھ کر چاہتا ہے اور یقیناً وہ بھی اسے اسی طرح عزیز رکھتی ہوں گی۔

اس خیال نے بری طرح چونکا یا تھا۔ وہ سیدھے ہو بیٹھے اور تیزی سے کوٹ کی جیب سے آصف کو ملنے والا والٹ نکالا، اس میں شاہوین کا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ ضرور ہو گا۔ والٹ کی چھوٹی سی زپ کھولنے کے بعد وہ اندر لگے فون کو دیکھ کر شاکد رہ گئے تھے۔

”اوہ نو، یہ جو جو کا والٹ وہاں کیسے گر گیا؟“

اندر مشعل اور جو جو کی فون لوگی ہوئی تھی اور چیک کرنے پر انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ والٹ جو ادکا ہی تھا۔ کیوں کہ اندر سے اس کے آئیڈنٹیفائی کارڈ کے علاوہ اور بھی کارڈز ملے تھے جو اسی کے تھے۔ حسن صاحب کے اندر دھماکے ہو رہے تھے۔ بہت تیزی سے ان کے اندر مختلف مناظر ابھر رہے تھے اور جو صورت حال ان کے ذہن میں ابھری اس نے سچ مچ ان کے حواس گم کر دیئے تھے۔

ایسے ٹھنڈے موسم میں بھی ان کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا تھا۔ غم و غصے سے کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئی تھیں۔

”مبارک ہو حسن، مسٹر شاہوین اب خطرے سے باہر ہیں۔“ اسی دم سرجن سعید خان نے گرم جوش لہجے میں اطلاع دی تھی مگر ان کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی گھبرا کر آگے بڑھ کر انہیں سنبھالا تھا جو آنکھیں بند کئے لڑکھڑا رہے تھے۔

”ارے، کیوں اس قدر پریشان ہو رہے ہو..... اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ چند گھنٹے بعد ہوش آجائے گا انہیں۔“ سعید خان انہیں سہارا دے کر اپنے روم میں لے آئے جہاں پانی پینے اور کچھ دیر آنکھیں بند کر کے بیٹھنے کے بعد ان کی حالت قدرے سنبھلی تھی اور شاہوین کی زندگی بچ جانے کی خوش خبری نے ان کے اندر کی وحشتوں اور غم و غصے کو قدرے اطمینان بخشا تھا۔ مگر جو ادکی طرف سے ان کے دل میں غبار پھیل گیا تھا۔

”شکر ہے پروردگار کا..... بہت بہت احسان ہے تیرا، ورنہ جس طرح اس کی بلیڈنگ ہوئی تھی میں بہت خوفزدہ ہو گیا تھا۔“ انہوں نے مسکرا کر تشکر ادا لہجے میں کہا۔

”یہ اس کی خوش نصیبی تھی جو بلیڈ کا بندوبست ہسپتال کے بلڈ بینک سے ہو گیا تھا۔“

”اس کے زخموں کی کیا پوزیشن ہے؟“

”زخم خاصے گہرے ہیں۔ ایک ماہ آرام ضروری ہے اور ساتھ میڈیکل ٹریٹمنٹ بھی۔“

”ٹھیک ہے..... میں اس کی زندگی کی نوید پا کر بہت خوش ہوں سعید۔“

”ہوں، میرا خیال درست ثابت ہوا۔“ وہ انٹرکام پر کافی اور سینڈوچز کا آرڈر دیئے کے بعد معنی خیز مسکراہٹ لبوں پر سجا کر ان سے مخاطب ہوئے۔

”کیسا خیال؟“ جو ابابوہ بھی مسکرائے۔

”شاہوین، شاید مٹی کے فیانی ہیں۔ یعنی ہمارے ہونے والے داماد، کیوں درست ہے میرا خیال؟ مسلسل تمہاری یہاں موجودگی، پریشانی، فکر..... یہ سب کسی ابغنی کے لئے تو نہیں ہو سکتیں۔“ وہ اطمینان سے کہہ رہے تھے۔

”شاہوین میرے.....“

”سر! پھنٹ کو ہوش آ گیا ہے اور وہ گھر جانے کی ضد کر رہے ہیں۔“ قبل اس کے کہ وہ ان کی غلط فہمی دور کرتے ایک نرس پریشانی سے آکر کوبیا ہوئی۔

”اتنی جلدی ہوش آ گیا ہے.....“ وہ حسن صاحب کے ہمراہ وہاں چلے آئے تھے۔

”کیسا ٹیل کر رہے ہیں بیٹے آپ؟“ حسن صاحب اس سے شفقت سے مخاطب ہوئے تھے۔

”میں گھر جانا چاہتا ہوں، بے جی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ وہ نیم فوندگی میں تھا اور بے جی کی پریشانی کے خیال و فکر مندی نے اسے وقت سے پہلے بیدار کر دیا تھا۔ مگر کیفیت اس کی نیم بے ہوشی کی تھی۔ آنکھیں بند تھیں، ہونٹ مل رہے تھے۔

”بیٹا! ابھی آپ کی حالت چلنے پھرنے کی نہیں ہے۔ آپ کے پیٹ کا آپریشن کیا گیا ہے۔ سر کے زخم میں بھی ٹانکے لگے ہیں، پشت کے زخموں پر ڈریسنگ ہے۔ ابھی

ایک ہفتے تک آپ کو مکمل بیڈ ریست کرنا ہوگا۔“ ڈاکٹر سعید نرمی سے سمجھا رہے تھے۔

”مجھے بے جی کے پاس جانا ہے۔ وہ پریشان ہو رہی ہوں گی، مجھے گھر جانا ہے۔“ وہ نیم بے ہوشی میں مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

ڈاکٹر کے کہنے پر نرس نے اسے سکون آور انجکشن لگا دیا تھا۔ چند لمحوں میں وہ دوبارہ غافل ہو گیا اور حسن صاحب نے باہر آ کر آصف سے اس کے گھر کا ایڈریس لیا۔

□●□

کاؤنٹر بار پر بے شمار کھلی ادھ کھلی بوتلیں رکھی تھیں، کچھ ٹھوکرے، لڑکیاں چیز زپر بیٹھے لی رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کوک تھا، کسی کے ہاتھ میں پیپسی، کوئی سگریٹ کا دھواں اُڑا رہا تھا۔ ہر سمت قہقہوں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔

پرہل شراؤز اور بلاؤز میں وہ ان لوگوں کے ساتھ ٹٹھی پیپسی پی رہی تھی۔ جو جو کے اشارے پر ویٹر مشروبات سے جی ٹرائی لے کر ان کے قریب آ گیا تھا۔ سب نے اپنے اپنے پسندیدہ ڈرنکس اٹھا لئے تھے۔ مشعل نے پیپسی اٹھائی تھی۔

”بچپن پھلانگ آئی، ہو تو بیفیز رکھی لینا چھوڑ دو۔“ جو جو نے اپنا فیورٹ ڈرنک اٹھاتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”نوبا! امیرے لئے بیفیز رہی مناسب ہے۔“ مشی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”آج تو ہم خوشی سلیرٹ کر رہے ہیں۔ تمہاری اور جو جو کی اسلٹ کرنے والے بندے سے ہم نے کل رات کو انتقام لے لیا تھا۔“ جوزف نے اکڑ کر کہا۔

”اور انتقام بھی ایسا اگر زندہ رہ گیا تو ساری زندگی اس راہ سے گزرنا چھوڑ دے گا جس سے تم اور جو جو گزرو گے۔“ پیٹرک کی بات پر قہقہے بلند ہوئے تھے۔

”ہوں، مجھے خوشی اس وقت زیادہ ہوتی جب صرف تمہا جو جو اسے اس حال تک پہنچاتا۔ تم سب نے مل کر جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ کوئی بہادری نہیں ہے۔“

”وہاٹ..... یہ کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ سب ہی متعجب ہوئے تھے۔

”جو تم لوگوں نے سنا ہے۔ تمہا شخص کو مارنا کہاں کی بہادری ہے؟ میں خوش تو تب ہوتی اگر جو جو تمہا اس کیلئے کو موت کا مزا چکھاتا۔

”کیا مطلب ہو تمہاری اس بات کا؟ کیا ہم تمہارے فرینڈز نہیں ہیں؟ کیا ہمیں تمہاری اسلٹ کا بدلہ لینے کا حق نہیں ہے؟“ جوزف بری طرح ہرٹ ہو کر بولا۔

”ایجوٹل مت بنو جوزف! تم جانتے ہو میں ہر بات منہ در منہ کرنے کی عادی ہوں۔ کسی کی اچھائی، برائی سب میں سامنے کہتی ہوں اور مجھے ہمیشہ سے بہادر اور دلیر مرد پسند رہے ہیں۔ مرد خوب صورت ہونہ ہو مگر فائزر لازمی ہو۔“ وہ صاف کوئی سے بولی۔

”یعنی اب مجھے اپنی تمام ہلیز چھوڑ کر فائنگ سیکھنی ہوگی؟“ جو جو نے اس کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آف کورس..... اگر سبب بنتا ہے تو۔“ راشد نے ہنس کر کہا۔

”اوکے فرینڈز! ویری ویری تھینکس سوچی۔ اب میں جاؤں گی۔“ وہ بوتل خالی کر کے ٹیبل سے پرس اٹھا کر کھڑی ہوتے ہوئے کویا ہوئی۔

”اتنی جلدی کہاں جا رہی ہو، ابھی بیٹھو۔ زیادہ وقت کہاں ہوا ہے؟“

”نہیں جوزف! میں ابھی جا رہی ہوں۔ ایکجوبلی میں کل سے جو جو کے ساتھ اس کے گھر آئی ہوئی تھی۔ اب ڈیڑی سے ملوں گی جا کر کل سے ان سے ملی نہیں۔“

”اوکے، میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔“ جو جو اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

”ٹریٹ دینے کے بعد بلز پے کرنے کی بجائے دم دبا کر کہاں بھاگ رہے ہو؟“

”دے رہا ہوں، بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“ اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا لیکن والٹ کہیں موجود نہیں تھا۔

”ہاں، ہاں..... اب کہو والٹ کہیں گر گیا ہے یا گھر رہ گیا ہے۔ روپیہ بچانے کے تمہیں آمینڈ یا زکس قدر آتے ہیں۔“

”میں نے کل والٹ اسی پاکٹ میں رکھا تھا۔“ جو جو پریشانی سے ان سے بولا تھا جو ایک سے ایک ریمارکس دے رہے تھے۔

”ڈونٹ وری، میں پے منٹ کر دیتی ہوں۔“ مشعل نے پرس کھولتے ہوئے اس کی مشکل حل کی۔

”اوہ گاڈ! کس قدر پورفینسی ملا ہے یا تمہیں۔ مجھے لگتا ہے ساری لائف تمہیں اس کے بلز پے کرتے گزر جائے گی، میں تو کہتا ہوں ابھی وقت ہے، سوچ لو میرے بارے میں، پیسج کر لو اپنا فیصلہ۔“ جوزف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ جیسا بھی ہے، مجھے قبول ہے۔“ ایک لمحے جھک کر اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا اور جو جو کے بازو میں بازو ڈال کر وہاں سے نکل گئی تھی۔

گھر پر پاپا کو دیکھ کر وہ پست گئی تھی ان سے۔

”پاپا! میں نے بہت مس کیا آپ کو۔“

”جو جو اب یہ والٹ کس کا ہے؟“ اس پر نظر پڑتے ہی وہ خود پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ کل شام کا خونی منظر اور رات بھر کی پریشانی از سر نو جاگ اٹھی تھی۔

”میرا بے انکل! آپ کو کہاں سے ملا؟“ اس نے ان کے ہاتھ سے بلیک لیدر کا والٹ لیتے ہوئے کچھ حیرانی و پریشانی سے استفسار کیا تھا۔

”وہاں سے جہاں تم کل یہ خونی ڈرامہ کھیلتے وقت چھوڑ آئے تھے۔“ ان کا آگ برساتا لہجہ اتنا سرد و پر اسرار تھا کہ وہ دونوں بری طرح چونک اٹھے تھے۔

”آ..... آپ کو..... کیسے معلوم ہوا؟“ جو جو کی بوکھلاہٹ اور خوف عروج پر تھا مشعل بھی حیرانی سے انہیں تنک رہی تھی۔

”ہوں..... تو آپ اعتراض کر رہے ہیں کہ وہ انسانیت سوز کام آپ کا ہی تھا۔“

”نہ..... نہیں انکل! آپ میری بات.....“

”شٹ اپ.....“ ان کا بھرپور تھپڑ جو جو کے سفید چہرے کو سرخ کر گیا تھا۔

”پاپا..... یہ آپ نے کیا، کیا؟“

”مشی! جاؤ یہاں سے۔“

”بٹ پاپا.....“

”جائیں آپ..... شاباش.....“ پہلی بار وہ اس سے سختی سے پیش آئے تھے۔

چند ثانیے وہ بے یقینی اور تعجب سے ان کو دیکھتی رہی۔ ہمیشہ جس چہرے پر نرم چاندنی جیسی مسکراہٹ رہتی تھی اس وقت جاہ و جلال کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ لہجے سے کوڑے برس رہے تھے، آنکھوں میں قہر کے رنگ تھے۔ وہ خاموشی سے وہاں سے نکل آئی اور پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر سننے لگی۔

”انکل، انکل! اس نے اسلٹ کی تھی میری۔“ ان کے ایک تھپڑ نے ہی اس جیسے کمزور اعصاب و بے حوصلہ شخص کو تھر تھرا کا پسنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ان سے خوفزدہ ہو کر اگلے قدموں چلتے ہوئے منسنا یا تھا۔

”تمہارے مجڑنے کا احساس تو مجھے بہت عرصہ قبل ہی ہو گیا تھا مگر تم انسانیت کی سطح سے اس قدر پستی میں گر چکے ہو اس کا احساس نہیں تھا مجھے۔ اتنی معمولی معمولی سی باتوں کو تم لوگ انا کا مسئلہ بنا لیتے ہو اور پھر ایسے بھیا تک طریقے سے انتقام لیتے ہو کہ درندے بھی دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔“ وہ غصے سے چیخ رہے تھے۔

”معاف کر دیں انکل! معاف کر دیں۔“ وہ بری طرح رو پڑا تھا۔

”میں کون ہوتا ہوں معاف کرنے والا؟“

”پلیز انکل..... پلیز!“ اس نے روتے روتے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

”اب آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ آنسو تمہیں اس وقت بہانے چاہئے تھے جب تم اس بے قصور نوجوان کو مار کر مرنے کے لئے چھوڑ آئے تھے۔ اور کان کھول کر سن لو۔ اس نے تمہارے خلاف بیان دیا تو میں روکوں گا نہیں اسے۔ خود تمہیں سزا دلو! اس کا کہ تم جیسے حیوانیت پسند لوگ مجھے بالکل پسند نہیں۔“ انہوں نے اٹل و بے لچک لہجے میں کہا۔

”نہیں..... نہیں انکل! پلیز ایسا مت کہیں..... مر جاؤں گا میں۔“

”اس بچے کی جان کی بھی اتنی ویلیو ہے، زندگی اسے بھی اتنی ہی عزیز ہے۔“

”مجھ سے غلطی ہوگی انکل، بہت بڑی غلطی ہوگی۔“

”میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر شاہوین نے پولیس کیس کیا تو میں کچھ نہیں کروں گا۔“ وہ سختی سے کہہ کر وہاں سے چلے گئے تو مشعل پر دے کے پیچھے سے نکل آئی۔

”مشی! انکل کے ارادے خطرناک ہیں..... مجھے پھانسی کا پھندا ابھی سے اپنے گلے میں پڑا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ہائے، کیا ہوگا؟“ اس نے با آواز بلند رونا شروع کر دیا۔

”پلیز تم اپنی یہ بھین بھین بند کرو، اٹو گدھے لگ رہے ہو اس طرح روتے ہوئے۔ خاموش ہو جاؤ، کچھ سوچنے دو۔“ اس نے خاصی جھاڑ پلائی تھی اسے۔

”نہ معلوم تمہاری عقل کہاں ہر وقت گھاس جھتی رہتی ہے۔ اس کیلئے پر حملہ کرنے سے قبل یہ تو سوچ لیتے کہ وہ راستہ فیکٹری سے ملحقہ ہے اور پاپا ہمیشہ اپنے تمام ورکرز کے جانے کے بعد وہاں سے نکلتے ہیں اور اسی راستے سے گزرتے ہیں۔“

”گڑبڑ ساری اس والٹ کی ہے۔“ جو جو نے زور سے والٹ کو فرش پر مارا تھا۔

”والٹ کی نہیں تمہارے دماغ کی گڑبڑ ہے۔“

”مشی! وہ شخص میرے اور تمہارے درمیان حائل ہونے لگا ہے اور انکل کا رویہ بھی پیسج ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ کر پریشانی سے کویا ہوا۔

”مائی فٹ..... وہ دو کوڑی کا شخص کس طرح ہمارے درمیان آ سکتا ہے۔ اس فقیر کی اوقات ہی کیا ہے۔ اور پاپا کا تو ایٹنی نیوڈ ایسے لوگوں کے لئے بیسٹ ہی ہوتا ہے۔ نا معلوم پاپا کا کیا کام ملکس ہے۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”فی الحال ڈیئر! کوئی ایسی ترکیب سوچو جس سے لاشی بھی مر جائے اور سانپ بھی نہ ٹوٹے۔“

جواباً مشعل کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”یہاں میری جان پر مبنی ہے اور تمہیں ہنسی سو بھر رہی ہے۔“

”اپنے محاورے پر غور کرو، الٹا بولا ہے۔“

”اوکے، سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ ٹوٹے۔“ وہ خود بھی کھسیا کر ہنس پڑا۔



شاہ ویز تیسرے دن خاصا ٹھیک ٹھاک اور مکمل ہوش میں تھا۔

بے جی کو حسن صاحب آصف کے ساتھ جا کر ہسپتال لے آئے تھے۔ اپنے اندیشوں کے بچ کا ثابت ہونے پر انہیں بڑا افسوس تھا اور دوسرے اسے بے ہوش اور بیٹوں میں جکڑا دیکھ کر ان کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ لیکن ڈاکٹر سعید اور حسن صاحب کی تسلی بخش باتوں نے انہیں کافی حوصلہ بخشا تھا اور اب اسے پہلے کی طرح باتیں کرتے، ہنستے مسکراتے دیکھ کر اطمینان ہوا تھا۔ شکرانے کے نقل و ہنر اُڑھ چکی تھیں۔

”اب تو آپ خوش ہوں گی بہن! جی! شاہ ویز ذہنی طور پر بالکل ٹھیک ہے۔“ اندر داخل ہوتے حسن صاحب انہیں شاہ ویز سے باتیں کرتے دیکھ کر اطمینان سے کویا ہوئے۔

”اللہ کا بہت بہت شکر ہے بھائی صاحب! جس نے میرے بچے کو نئی زندگی دی ہے اور آپ کی بھی بہت مہربانی ہے جس طرح آپ نے میرے بیٹے کا خیال رکھا، اس کے لئے میں آپ کا شکر یہ ہی ادا کر سکتی ہوں مگر اس کا اجر آپ کو اللہ دے گا۔“

”یہ میرا فرض تھا، کوئی احسان نہیں ہے۔“ وہ مسکرا کر کہتے ہوئے شاہ ویز کے قریب بیٹھ گئے۔ ”کیسی طبیعت ہے چک مین؟“

”فائن سر! بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“ اس نے دھیمے سے مسکرا کر جواب دیا۔

”کیا ہوا تھا؟ کس طرح ہوا یہ سب؟ کون لوگ تھے وہ؟“ حسن صاحب اس موضوع کی طرف آگئے جس پر بات کرنے کے لئے بے چین تھے۔

”معلوم نہیں سر، شاید میرے نصیب میں اس حادثے کو اسی طرح ہونا لکھا تھا۔“

”رپورٹ کے مطابق آپ کو زخمی کرنے والے ایک سے زائد افراد تھے۔ ان میں سے کسی نہ کسی کا چہرہ آپ کو یاد ہوگا؟“ وہ بضد تھے۔

”چھوڑیں سر، کیا فائدہ ہوگا۔ ویسے بھی ذاتی طور پر کسی سے انتقام لینے کا قائل نہیں ہوں۔ میں بھول گیا۔ آپ بھی بھول جائیے۔“ وہ ان سے نگاہیں جدا کر کویا ہوا۔ اسے جو جو اور اس کے ساتھیوں کے چہرے یاد تھے اور یہ بھی یاد تھا جو جو نے کہا تھا۔ ”مشی مجھ سے دودن سے ناراض ہے، میں نے اس سے وعدہ کیا ہے جب تک میں اس شخص سے حساب برابر کر کے مزانہ چکھا دوں تب تک اس کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔“ وہ انہیں کیا بتائے کہ اس کو اس حال تک لانے والا ان کا ہونے والا داما ہے، جس نے ان کی بیٹی کو ہی خوش کرنے کے لئے اس کی یہ حالت بنائی ہے۔

وہ بہت نرم اور حساس دل رکھنے والا تھا، جس طرح حسن صاحب نے اس کا خیال رکھا، اس کے علاج کے تمام اخراجات اٹھانے کے علاوہ اپنی مصروفیات میں سے اسے بھی ہام دیتے رہے تھے۔ انہوں نے تو اسے اپنے احسان تلے دبا لیا تھا اور نادانستگی میں اپنوں کے ہاتھوں لگائے گئے زخموں پر خود ہی میخانے کا مرہم رکھتے گئے تھے۔ اسے ان سے یا جو جو سے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں رہی تھی۔

”یاد کریں بیٹا! ذہن پر زور ڈال کر سوچیں۔ یاد آجائیں گے آپ کو وہ ظالم لوگ جو محض اپنی انا کی خاطر حیوان بن جاتے ہیں۔ یقین مانو اگر ان لوگوں میں مجھ سے وابستہ کوئی رشتہ بھی ہو تو میں حق و صداقت کا ساتھ دوں گا۔“ وہ کویا اس کی سوچیں پڑھ رہے تھے۔ لمحے بھر کو تو اس کو ایسا ہی محسوس ہوا کہ وہ حقیقت سے آگاہ ہیں مگر دوسرے پل ہی وہ اس سوچ کو جھٹک کر بولا۔

”نوسر! میں ان لوگوں کو نہیں پہچانتا۔“

”اچھا.....“ انہوں نے گہری نگاہوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لے کر آہستگی سے کہا۔

”ہمیں انتقام لے کر کیا کرنا ہے، اوپر والا لے گا ہمارا انتقام۔ ہم صبر کر چکے ہیں۔“ بے جی نے موضوع ختم کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا بھئی..... اب میں چلتا ہوں، کل آؤں گا۔“ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”سر! میں ڈسپارچ ہونا چاہتا ہوں..... بہت بور ہو گیا ہوں۔“

”ابھی کم از کم چار دن تمہیں اور یہاں ایڈمٹ رہنا پڑے گا، زخم ابھی منسل نہیں ہوئے ہیں۔ کچھ دن کی تو بات ہے پھر آرام سے گھومے پھریے گا۔“ انہوں نے پُر شفقت لہجے میں اسے سمجھایا اور بے جی کو خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے۔

بے جی اسے سب کاٹ کر کھلانے کے ساتھ باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔ یہ ان کی بے انتہا محبت تھی جو وہ بہت کم کوہونے کے باوجود اس سے مسلسل باتیں کر رہی تھیں۔ گزرے ہوئے وقت کی اچھی باتیں، اس کے بچپن کی شرارتیں، ضدیں اور کم عمری میں ذہانت و سمجھداری کے مظاہرے، ہر بات انہیں ازبدر تھی۔

”اب نہ معلوم عمر کا تقاضا ہے یا وقت کا کہ پہلے کی ہر بات یاد ہے مگر کل کے بارے میں یاد نہیں رہتا۔“ انہوں نے چھری اور پلیٹ ٹرالی کی دراز میں رکھتے ہوئے یا سیت سے کہا۔ شاہ ویز مسکرا اٹھا تھا۔

اسی دم دروازہ جھٹکے سے کھلا تھا۔ خوشگوار سی مہک کمرے میں پھیل گئی تھی۔ بے جی کے ساتھ اس نے بھی چونک کر دیکھا تھا۔ نگاہ اٹھی رہ گئی تھی۔

”ہیکسکویزی، آپ جائیں کمرے سے۔“ وہ اندر آ کر بے جی سے مخاطب ہوئی جو اس کے حسین مکھڑے اور جسم پر موجد لیدر کی جینز اور سلولیس شارٹ شرٹ کو دیکھ رہی تھیں۔ اسے خود کو حکم دینا دیکھ کر ہڑبڑا گئی تھیں۔

”کیوں.....؟“ شاہ ویز کے تیور اس کے انداز مخاطب نے بگاڑ دیے تھے۔

”کیوں کہ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”ہمارے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے کہ تم مجھ سے تنہائی میں بات کرو۔“

”ایسا رشتہ ہو بھی نہیں سکتا، منہ دھور کھو۔“ اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ شاہ ویز نے ہونٹ بھیجنے لئے۔ کیونکہ گفتگو انگش میں ہو رہی تھی اس لئے بے جی لاعلم تھیں مگر ان پڑھ تھیں، جاہل نہیں۔ کتابوں میں لکھے لفظوں سے نا آشنا ہی ضرور تھی لیکن چہروں، لہجوں کو پڑھنے میں ماہر تھیں۔ یہ مزاجیوں اور انداز کو پرکھنے میں لاثانی تھیں۔ اس وقت بھی ان دونوں کے درمیان ہونے والی گٹ پٹ کو سمجھنے سے قاصر تھیں مگر اس لڑکی کا لہجہ و انداز دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہتی ہے مگر شاہ ویز یہ کسی صورت نہیں مانے گا کہ وہ کمرے سے جائیں۔

”جو کہنا ہے کہو۔ بے جی کمرے سے نہیں جائیں گی کسی بھی صورت میں۔“ اس نے اٹل لہجے میں کہا۔

”یہ اگر نہیں جائیں گی تو میں دھکے دے کر نکال دوں گی۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”شٹ اپ، گیٹ لاسٹ، اگر تم یہاں سے دفع نہ ہوئیں تو میں تمہیں یہاں سے نیچے پھینک دوں گا۔“ بے جی کے خیال سے اس نے خود کو کنٹرول کیا ہوا تھا۔

”بیٹا! عصر کا وقت ہونے والا ہے۔ میں وضو کر کے آتی ہوں۔“ بے جی کو یہی بہانہ سوچا تھا ان کے درمیان سے جانے کا۔ وہ اس کے منع کرنے کے باوجود بٹلی گئی تھیں۔

”تم سے زیادہ مجھ داروہ اولڈ وومین ہے۔“ وہ کاٹ دار مسکراہٹ سے کویا ہوئی۔

”کیوں آئی ہو یہاں؟“ اس کے لہجے کی کڑنگی نے لمحے بھر کو اسے بوکھلا دیا تھا۔ مگر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور قریب آ کر بولی۔

”ایک بار ہم سے ٹکرانے کا انجام دیکھ لیا ہے۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو جو جو کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالنا ورنہ اس بار زندہ نہ رہ پاؤ گے۔“ مشی نے جھٹک کر اس کی طرف دیکھ کر سخت لہجے میں دھمکی دی تھی۔

”موت اور زندگی دینا تم جیسے گھٹیا لوگوں کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ مجھے زندہ دیکھ کر یہ احساس تمہیں اچھی طرح ہو جانا چاہئے۔ موت کا خوف تم جیسے لوگوں کو کمزور کرنا ہے، مجھے نہیں۔“ اس نے دانستہ آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے اطمینان سے کہا اور اس کی اس انگور کرنے والی حرکت نے حسب توقع اسے کھولا ڈالا تھا۔

”یعنی تم جو جو کے خلاف پولیس کو رپورٹ کرو گے؟“

”کاش میں اتنا خود غرض اور احسان فراموش ہوتا تو اب تک وہ بزدل آدمی جیل میں بند ہو چکا ہوتا۔ میرے احساسات پر حسن صاحب کے احسانات غالب آگئے ہیں۔ اس لئے جاؤ، خوشیاں مناؤ، میں نے اس کارٹون کی جان بخش دی ہے۔“

”وہاٹ ریلیش..... لگتا ہے تمہاری عقل ابھی ٹھکانے پر نہیں آئی ہے۔ بار بار جو جو کی انسلٹ کر کے اپنے لک کو بیڑ لک مت کرو اسٹو پیڈ مین۔“

”مجھے بچپن سے بچا بولنے کی عادت ہے۔“ اس کا انداز دل جلانے والا تھا اور ابھی تک اس نے آنکھوں سے باز نہیں ہٹایا تھا جس کا مطلب تھا وہ اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس انداز کو وہ خوب سمجھ رہی تھی اور کھول رہی تھی۔

عجیب بے جس و کٹھور شخص تھا جو حسن سے لا پرواہ، رعنائی سے لائق تھا۔

”اب..... آپ یہاں سے جانے کا کیا لیں گی؟“

”کمینہ، دیکھ رہا ہے اور غنا کتنا ہے۔“ اس نے جل کر سوچا اور غصے سے کویا ہوئی۔

”جا رہی ہوں، کوئی ساری زندگی تمہارے پاس ٹھہرنے نہیں آئی۔“



”اللہ نہ کرے جو ایسا بڑا وقت مجھ پر کبھی آئے۔“ جواباً وہ ہر جتن بول اٹھا۔

”ہونہہ..... نان سینس! تمہارے منہ ہی نہ لگنا چاہئے، بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تمہیں۔“ وہ جھنجھلائی ہوئی کمرے سے نکلی اور زوردار طریقے سے دروازہ بند کر کے آگے بڑھ گئی۔



”بھائی جان! آپ فکری نہ کریں تو بہتر ہے۔ جو جو میرا کلونا بیٹا ہے، اسے ہم نے آج تک ترچھی نگاہ سے نہیں دیکھا اور آپ نے اسے اتنی معمولی بات پر تھپڑ مار دیا مجھے بہت افسوس ہے۔ آپ کو جو جو پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔“ دوسرے دن خراب موڈ اور بگڑے تیوروں کے ساتھ رانچہ، بھائی کے سامنے موجود تھیں۔

”افسوس تو مجھے تم پر ہو رہا ہے۔ کیسی ماں ہو تم جو خود بیٹے کو تباہی و بربادی کے راستے پر چلا رہی ہو۔ کسی انسان کی جان تمہارے نزدیک مکھی مچھر کی جان سے بھی زیادہ حقیر ہے؟“ حیرانی اور ناسف ان کی آواز اور چہرے سے ظاہر تھا۔

”میرے بچے کے مقابلے میں کسی کی جان کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔“

”تم جیسی ماؤں کے بیٹے ہی بڑے بڑے مجرم بنتے ہیں جو نہ صرف خاندان بلکہ ملک کے لئے بھی ناسور ثابت ہوتے ہیں۔ لاڈ بیار کی بھی ایک حد ہوتی ہے رانچہ! آج کل کا وقت تو بہت نازک گزر رہا ہے۔“

”دنیا بدل گئی، حالات بدل گئے مگر بھائی جان، آپ کے اندر رہنے والا وہ سالوں پرانا حسن بیگ نہیں بدلا جو ایک معمولی پرچون فروش کا بیٹا ہے۔“

”انسان کو کبھی اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہئے رانچہ۔“ ”معمولی“ سے ”خاص“ بننے میں لامحدود عرصہ لگتا ہے مگر ”خاص“ کو ”معمولی“ بننے میں مختصر مدت کافی ہے۔“

”میں تو ڈرتی ہوں اگر احمد کو جو جو نے یہ سب بتایا تو وہ تو کبھی بھی اس گھر میں رشتہ جوڑنے پر راضی نہیں ہوں گے جہاں ہونے والے داماد کی کوئی ویلیو، کوئی عزت نہیں ہے۔ کیا کروں گی بھائی صاحب میں؟ بہت برا ہوا ہے یہ اور احمد کا موڈ تو پہلے ہی آف ہے۔ آپ نے روپوں کا بندوبست ابھی تک نہیں کیا۔ وہاں انہیں بہت پر اہمیز ہو رہی ہیں۔“

”میں بہت پریشان ہوں..... سمجھ میں نہیں آتا کس کو اپنی پریشانی بتاؤں۔“ انہوں نے دائیں ہاتھ سے پیشانی مسلتے ہوئے متشکر لہجے میں کہا۔

”ارے بھائی جان! پر اہمیز تو ہم جیسے لوگوں کے لئے ہوتی ہیں۔ آپ کو بھلا کیا پر اہم ہو گئی؟“ ان کے انداز کی لاپرواہی و بے یقینی نے حسن صاحب کو ملول کر ڈالا۔ کیسی بہن ہے یہ؟ کیا کچھ انہوں نے اس کے اور اس کے شوہر و بیٹے کے لئے نہیں کیا تھا۔ ان کا شاہانہ طرز زندگی، شان و شوکت، پھیلا ہوا کاروبار، اعلیٰ طبقوں میں پذیرائی۔ یہ سب ان کا ہی مرہون منت تھا۔ کیا تھا اگر وہ ہمدردی اور بہنوں والے مان سے ان کی پریشانی سن لیتی۔ مگر شاید محبت و خیال کا جذبہ صرف ان کی فیملی کے لئے تھا ان سے رشتہ صرف خواہشیں اور ضروریات پوری کرنے کے لئے یاد کیا جاتا تھا ورنہ اور کوئی ان کی وہاں اہم حیثیت نہ تھی۔ ان کے دل میں سخت کینیدگی و بدظنی پھیلتی چلی گئی۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟ پھر آپ روپے کب دے رہے ہیں؟“

”سچ تو یہ ہے رانچہ، اس وقت میں خود بہت پریشان ہو چکا ہوں۔ فارن کمپنیز ویسے ہی تعصب کا شکار ہو کر بند ہو چکی ہیں اور ساتھ کروڑوں کا لوس دے گئی ہیں۔ یہاں پر میں ایک نیا پراجیکٹ شروع کرنا چاہ رہا تھا مگر سرمائے کی قلت کے باعث وہ منصوبہ بھی التوا میں پڑا ہے۔ اب چند ٹیکٹر بڑ ہیں، وہ بھی ان حالات میں کب دھوکا دے جائیں کچھ پھر وسد نہیں ہے۔ ایسے میں، میں تمہاری کوئی بھی مدد کرنے سے معذرت خواں ہوں۔“ انہوں نے آہستگی سے سمجھایا تھا۔

”بھائی جان! دینا نہیں ہے تو صاف انکار کر دیں، کیوں جھوٹ بول رہے ہیں؟“

”میں جھوٹ کیوں بولوں گا..... اس سے قبل میں نے کبھی تمہیں منع کیا ہے؟“

”ہاتھی مرنے کے بعد بھی لاکھوں کا ہوتا ہے۔ آپ اتنی جلدی کیونکے نہیں ہو سکتے۔“ ان کی بے ثباتی و بے مروتی عروج پر تھی۔ حسن صاحب کے دل کو ان کا ایک ایک لفظ بھالے کی مانند گھائل کر رہا تھا۔ از حد بیار جتاتی، ناز اٹھواتی، بہن کا حقیقی روپ بڑا ظالم، بھیا نک تھا۔ دل میں اٹھنے والی ٹیسوں نے آنکھوں کو نم کرنا شروع کر دیا تھا۔

”ہاتھی اور انسان میں یہی فرق ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہاتھی کی قیمت دو گنی ہو جاتی ہے اور انسان تو بالکل بے مول ہو جاتا ہے۔ بے وقعت، بے مصرف.....“

”آپ نے مجھے ٹینشن دے دی ہے بھائی! اب بھلا میں احمد کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ کتنے مان سے آئی تھی میں آپ کے پاس، کتنا اعتماد تھا میرا آپ کی زبان پر مگر آپ نے تو سب مٹی میں ملا دیا۔ احمد تو پہلے ہی جو جو کی ہرج اپنی بھانجی سے کرنا چاہتے تھے، کروڑوں کی تنہا مالک ہے وہ لڑکی، مگر میں نے ضد کر کے مشعل کو بہو بنانے کا فیصلہ کروایا کہ آپ اس کی طرف سے مطمئن ہو جائیں گے مگر.....“

”فکر مند مت ہو رانچہ۔ امید پر دنیا قائم ہے۔ اندھیرے اجالے، دھوپ چھاؤں، فائدے و نقصان کے سودے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آج تک دتی آئی ہے تو کل خوشحالی بھی یقیناً آئے گی۔ امید کے چراغ کو اتنی جلدی گل مت کرو کہ کل سوائے پچھتاوؤں کی راکھ کے کچھ نہ بچے۔“ انہوں نے بردباری سے کہا۔

”نہیں بھائی جان! مجھے بعد میں کوئی الحرام مت دیجئے گا۔ احمد پرسوں آرہے ہیں اور آپ کو ان کے آن سے پہلے تمام روپوں کا انتظام کرنا ہو گا ورنہ کوئی امید مت رکھئے گا۔“ وہ بد لحاظی سے کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔



ہائے، ہائے..... غضب خدا کا..... بچے کو اتنی چوٹ لگ گئی، اتنے زخم آگئے اور مجھے کسی نے اطلاع دینا ہی کو اہ نہیں کیا۔ آپا! کیا اتنا غیر سمجھتی ہو؟ میں تو تمہیں اور شاہ ویز کو ہی سب کچھ سمجھتی ہوں.....“ زریہ کو آج صبح اصغر سے معلوم ہوا تو وہ فوراً چلی آئی تھیں اور آتے ہی شکوے شروع کئے تھے۔

”ارے بیٹھو تو سہی، تم تو جانتی ہو کہ گھر میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی تیسرا نہیں ہے۔ مجھے پریشانی میں یا ڈنہیں رہا کہ تمہیں اطلاع کر دوں۔ وہ تو کل ہسپتال سے چھٹی کے بعد شاہ ویز نے اصغر کو فون کر کے بتایا۔ وہ تو اسی وقت آفس سے یہاں چلا آیا تھا۔ میں نے کہا تھا تمہیں صبح بتائے ورنہ تم رات میں ہی بے چین ہو جاتیں، جانتی ہوں تمہاری محبت کو، اب تو شاہ ویز بالکل بہتر ہے اور آج سے آفس جانے کی تیاری کر رہا ہے۔“ انہوں نے زریہ کا ہاتھ پکڑ کر پٹنگ پر بٹھاتے ہوئے تفصیل بتائی تو ان کے دماغ میں بات آئی گئی ہو گئی اور موڈ بہتر ہو گیا۔

”بہت شکر ہے اس مالک کا۔ اصغر بتا رہا تھا کہ اسکوڑ بالکل تباہ ہو گئی ایکسیڈنٹ میں۔ میں تو کہتی ہوں چلو بلا ٹلی۔ اللہ نے زندگی بچائی ہے، یہ بڑا احسان ہے۔ اسکوڑ کا کیا ہے، زندگی ہے تو بہت سی اسکوڑ اور کاریں مل جائیں گی۔“

”ہاں..... میں بھی یہی کہہ رہی تھی شاہ ویز سے۔“ شاہ ویز نے ہی کہا تھا کہ کسی کو بھی اصل بات نہ بتائی جائے، یہی کہا جائے کہ ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ اس طرح سے وہ بے شمار سوالات سے بچ جائیں گے اور اس بات نے انہیں کافی مشکلات سے بچالیا تھا۔

”السلام علیکم خالہ جان!“ اسی دم کمرے سے مسٹر ڈجینز اور سیاہی شرت میں ملبوس مسکراتا ہوا شاہ ویز باہر آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھیں، دونوں ہاتھوں سے بلائیں لیتے ہوئے پیشانی چوم کر بولیں۔

”جیتے رہو بیٹا! لمبی عمر پاؤ، کیسا منہ نکل آیا ہے، کس قدر زرد چہرہ ہو گیا ہے میرے لال کا۔ ابھی کچھ دن آرام تو کر لیتے۔ کام کا کیا ہے، ساری زندگی ہی کرنا ہے۔“

”بہت آرام کر لیا خالہ جان! پورے چار ہفتے ہو گئے ہیں، یعنی ایک ماہ..... بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس کے چہرے سے کمزوری ظاہر ہو رہی تھی۔ رنگ بھی کافی زرد رہا تھا۔ ہاسپٹل میں مکمل طور پر اسے ٹریٹمنٹ ملی تھی، خون بھی خاصی مقدار میں چڑھایا گیا تھا۔ مگر صحت مند ہونے میں بھی خاصی مدت لگتی ہے۔

”ان دنوں بھی مشکل سے ٹکا ہے۔ جو کام کرنے والے ہوتے ہیں انہیں آرام کہاں برداشت ہوتا ہے۔ اب تو ماشاء اللہ بہتر ہے تو ناممکن بات ہے کام کئے بنا رہنا۔“ بے جی نے ناشتہ لگاتے ہوئے کہا۔ پھر ناشتہ کرتے ہی وہ اللہ حافظ کہتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ آفس میں کافی کام جمع ہو گیا تھا اس کی غیر موجودگی میں۔ وہ مکمل کرتے کرتے لُنج آور ہو گیا مگر کام کی زیادتی کے باعث اس نے لُنج کول کر دیا۔ لُنج آور کے ایک گھنٹے بعد حسن صاحب نے اسے اپنے روم میں بلایا تھا۔

”ٹینس شہ ویز!“ وہ اسے کرسی کی جانب اشارہ کر کے بولے۔ وہ جھینکس کہہ کر بیٹھ گیا۔

”خوب کام ہو رہا ہے، لُنج بھی کول کر دیا آپ نے آج۔“ انہوں نے شفقت آمیز تبسم سے کہا۔

”جی سر! ایک چوکی میری عادت ہے کہ اگر کام کی زیادتی ہو تو مجھے بھوک، بیاس و آرام کی طلب نہیں ہوتی اور صبح بے جی نے انڈوں، پرائیڈوں کا ناشتہ کروایا تھا، سو بھوک کا احساس ہوا بھی نہیں۔“ وہ حیران تھا ان کی باخبری پر۔

”اچھی بات ہے، ابھی آپ نے بہت دن تکلیف دہ گزارے ہیں، از حد اذیت برداشت کی ہے۔ اب دوبارہ سے طاقت و ہمت لانے کے لئے بہترین غذا اپنی ضروری ہے اور غذا کے متعلق معمولی سی غفلت بھی نہیں برتنی ہے۔ اچھی صحت سب سے بڑی نعمت ہے، اس کا اندازہ ہماری عمر میں آنے کے بعد ہوتا ہے۔ آج کافی عرصے بعد کارڈ ریو کر کے آیا ہوں اور شو لڈرز میں اتنا درد ہو رہا ہے کہ لگتا ہے ابھی الگ ہو جائیں گے۔“

”کوئی چین کلر لے لیں سر۔“

”ڈاکٹر باری کو فون کیا ہے، آرہے ہوں گے وہ۔ دراصل بی بی پی ہائی رہنے لگا ہے۔ اس کی وجہ سے بغیر چیک اپ کے کوئی ٹیسٹ نہیں لے سکتا۔“

اسی دم پی اے نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو انہوں نے اسے بھی کھانے کی دعوت دی تھی۔

”نوسرا! مجھے بھوک نہیں ہے۔ آپ.....“

”آجائیں۔ آپ کے ساتھ ہم بھی کھالیں گے ورنہ آج ہمارا بھی ارادہ نہیں تھا۔“ وہ خود اس کا ہاتھ پکڑ کر برآمد والے کمرے میں لے گئے تھے جہاں ٹیبل پر انواع و اقسام کے کھانوں کی ڈشوں سے اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ ساتھ باسکٹ میں فروٹ خوب صورتی سے سجے ہوئے تھے۔ منرل وائٹر کی بالٹز اور پیٹیشی کے کین بھی موجود تھے۔ انہوں نے بڑے اصرار سے کھانا کھلایا۔ ایک ایک ڈش اپنے ہاتھوں سے پیش کی اور فروٹ بھی بڑی چاہ سے کھلائے تھے۔ کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے جب

ڈاکٹر باری آگے اور چپک اپ سے معلوم ہوا کہ حسب معمول ان کا بی بی ہائی تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کرو گے اپنا؟ بی بی کی ہائی اسپینڈ.....“

”پلیز..... پلیز باری! مت بتاؤ اسپینڈ، کیا کروں؟ اتنی احتیاط تو کرتا ہوں۔“

”کھانے پینے کی احتیاط سے زیادہ احتیاط کرو سونے سے۔ کہاں کی فکریں تم نے پال لی ہیں؟ کیا روگ ہے جس نے تمہیں اندر ہی اندر کھیر دیا ہے؟ کیا سوچتے رہتے ہو؟ کس بات کی فکر ہے تمہیں؟ کس کی ٹینشن ہے جس نے تم جیسے کامیاب انسان کو کمزور کر دیا ہے؟“ ڈاکٹر باری کے لہجے میں مسیحا کی علاوہ محبت و ہمدردی کے رنگ تھے۔

”ہماری کمزوریاں ہی کمزور کرتی ہیں باری۔“ چند لمحے ان کے چہرے پر غم طرب رہا، پھر خود کو سنبھال کر مسکرا کر گویا ہوئے۔

”عمر کا تقاضا ہے یا راجھا بڑھا پے سے بڑی بھی کوئی بیماری ہو سکتی ہے؟“

”تم اتنے عمر رسیدہ نہیں ہوئے ہو حسن کہ بیماری اور بڑھا پے کی چکی میں پس جاؤ۔“

”تم تو عورتوں کی طرح ایمونٹل ہو رہے ہو عمر کے معاملے میں۔“ وہ دھیسے سے ہنس کر گویا ہوئے تو ڈاکٹر باری نے زوردار قہقہہ لگایا تھا جبکہ شاہ ویز نے مسکرا کر اپنی اکتفا کیا تھا۔ ڈاکٹر باری میڈیسن اور ہدایات دے کر جا چکے تھے۔

”شاہ ویز! میں نے آپ کی پرموشن کر دی ہے۔ کل سے آپ کمپیوٹر سیکشن کے انچارج ہیں، چاروں سیکشنز آپ کے اندر کام کریں گے۔“ چھٹی سے قبل انہوں نے اطلاع دی۔

”پرموشن..... سر؟“ حیرانی، ہسرت، استعجاب سے اس کی آواز کھپکا کر رہ گئی جبکہ حسن صاحب اس کا یہ انداز دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے۔

”ہوں..... اگلے ہفتے آپ کو آپ کے بنگلے کی چابیاں اور کارڈ مل جائے گی۔“

”سر! اتنا کچھ.....؟ کہیں آپ مجھ پر ترس تو نہیں کھا رہے؟“

”میں آپ پر ترس کیوں کھانے لگا؟ ماشاء اللہ بالکل پرائیکٹ ہو، کوئی ایسی خامی نہیں جو مجھے ترس کھانے پر مجبور کرے اور ترس کھا کر کچھ امداد کی جاتی ہے یا بھیک دی جاتی ہے۔ ایسی مراعات صرف ذہین لوگوں کو ملتی ہیں، اعزاز کے طور پر۔“

”جھینکس اے لوٹ سر.....“

جواباً حسن صاحب نے شفقت سے اس کا شانہ چھپھپھایا تھا۔

”سر! آصف کیا چھٹی پر ہیں آج؟“

”ہاں..... ایک ہفتے کی چھٹی لے کر لا ہو گیا ہے، اس لئے اب مجھے کارڈ رائیو کرنی ہے۔“

”لیکن سر، ڈاکٹر نے آپ کو سختی سے منع کیا ہے ڈرائیونگ سے.....“

”ہوں..... ننھے ڈرائیور میں رکھنا نہیں چاہتا۔ دومرتبہ بہت نقصان اٹھا چکا ہوں۔ اور آصف شریف و ذمہ دار نو جوان ہے اور ضرورت مند بھی۔ کیا آپ کارڈ رائیو کرنا جانتے ہیں؟“ انہوں نے چونک کر پوچھا۔

”جی سر..... جب نوکری نہیں ملتی تھی، اس دوران اور ڈاکٹر تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں نے کافی عرصے تک ٹیکسی چلائی ہے۔ آصف کی آمد تک میں آپ کو پک اینڈ ڈراپ کر دیا کروں گا، اگر چاہیں تو۔“

اخلاق کو اخلاق ہی زیر کرتا ہے۔ ان کی محبت و خلوص کا تو وہ دل سے معترف تھا۔ اب ایسے میں انہیں ڈاکٹر نے سختی سے ڈرائیونگ نہ کرنے کی تاکید کی تھی اور وہ خودشانوں میں بے انتہاد درد کا بتا رہے تھے تو اس کے ضمیر نے خاموش رہنا کو ارا نہیں کیا۔ ورنہ عام طور پر وہ اس ہمدردی کو چالپوسی و خوشامد کا نام دے کر کبھی آگے نہ بڑھتا۔ مگر یہاں معاملہ سچائی و خلوص کا تھا۔

”ویری گڈ شاہ ویز! آئی ایم ویری اسپائر فار یو!“ انہوں نے کسی بے اختیاری جذبے کے تحت آگے بڑھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایسے پُر اعتماد اور باحیث نو جوان پسند ہیں جو اپنا کل کسی سے نہیں چھپاتے، بلکہ ماضی پر فخر کرتے ہیں اور کرنا بھی چاہتے۔ اعتماد، ہمت اور عزم ہی انسان کو بلندی نصیب کرتے ہیں۔ بہت آگے جاؤ گے آپ۔ بہت آگے۔“

”شکریہ سر! آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔“ ان کی تعریف و توصیف نے خواہ مخواہ اسے جھینپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس سے اتنے متاثر تھے کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر سارے راستے باتیں کرتے آئے تھے۔

”بہت شکریہ شاہ ویز! آؤ، چائے پی کر جانا۔“ انہوں نے اترتے ہوئے کہا۔

”نہیں، جھینکس سر! مجھے اجازت دیں۔“ اس نے چابی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”چابی اپنے پاس ہی رکھیں، جب تک آصف نہیں آ جاتا۔“ انہوں نے بعد اصرار چابی تھادی۔ اسی لمحے اندر سے ملازمہ آئی تھی۔

”صاحب! بی بی کا دومرتبہ فون آچکا ہے، وہ ڈرائیو کو بلو ا رہی ہیں۔“

”اوہ..... مجھے یاد ہی نہیں رہا مشی کو بتانا کہ آصف چھٹیوں پر چلا گیا ہے۔ اب وہ انتظار کر رہی ہوگی، کیا کروں؟“ وہ کوپا خود سے مخاطب تھے۔ شاہ ویز نے سن لیا تھا، اس بدتمیز و جاہل لڑکی کا ڈرائیور بننا اسے پسند نہیں تھا مگر حسن صاحب کی ناگفتہ بہ حالت اور چہرے پر پھیلی پریشانی و تفکرات بھی اس سے مخفی نہ تھے۔

”وہ کارلے جاتی، میں نے منع کر دیا تھا۔ دراصل اس کی فرینڈ کی برتھ ڈے پارٹی تھی۔ ان کی رہائش بھی مضافاتی علاقے میں ہے، وہاں سے رات کو تنہا آنا ٹھیک نہیں ہے اور اپنے مزاج کے مطابق وہ اپنی فرینڈ کے ڈرائیور کے ہمراہ آئے گی نہیں کہ اس طرح کسی کا احسان لینا اسے پسند نہیں ہے، کتنی ہی مجبوری کیوں نہ ہو..... آپ جاؤ بیٹا، میں دوسری کار میں اسے لے آؤں گا۔“ وہ بادل خواستہ تیار ہوئے۔

”آپ مجھے ایڈریس دیں سر، میں پک کر لیتا ہوں۔ طویل ڈرائیونگ آپ سے نہیں ہو سکتی۔“ اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”میں بھی یہی چاہ رہا تھا۔ مگر آپ کو دیر تو نہیں ہوگی۔ آپ ایسا کریں پہلے گھر اطلاع کر کے جائے گا تا کہ دیر ہو جائے تو آپ کی والدہ فکر مند نہ ہوں۔“ وہ اپنا بوجھ اس کے کاندھوں پر ڈالنے کو تیار تھے، سو بہت خوشی سے ایڈریس دیا تھا۔

□●□

”لو کا پٹھا..... ایڈیٹ، ابھی تک نہیں آیا۔ آجائے ذرا، شوٹ کر دوں گی۔“ وہ کافی دیر سے انتظار کر رہی تھی۔ دفون کا لٹرن کرنے کے باوجود آصف کا ابھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ ریٹا کی برتھ ڈے پارٹی ختم ہوئے بھی وقت گزر گیا تھا۔ تمام مہمان جا چکے تھے۔ کچھ فرینڈز نے اسے ڈراپ کرنے کی آفر بھی کی تھی مگر یہ بات اس کی شان کے خلاف تھی۔ وہ احسانات کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی، لینے کے لئے نہیں۔ سب ہی اس کی فطرت سے آگاہ تھے اس لئے کسی نے زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔

”اوہ..... مائی گاڈ! کہاں مر گیا یہ آصف؟ پاپا نے بھی موبائل آف کر رکھا ہے۔ نہ معلوم آفس سے کب آئیں گے۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا تو ریٹا ہنس کر گویا ہوئی۔

”بیٹھ جاؤ سلی گرل! کیوں کنفیوڈ ہو رہی ہو؟ آجائے گا ابھی۔“

”تم نہیں جانتیں، پاپا نے نوکروں کو کتنی آزادی دے رکھی ہے۔ اگر انہیں ان کی اوقات پر نہ رکھوں تو ہم نوکر اور وہ مالک نظر آئیں۔“

ریٹا کے ملازم نے اطلاع دی کہ اس کی کار آگئی ہے تو وہ اسے ہائے کہتی ہوئی نیچے آگئی جہاں کار کھڑی تھی۔

”کہاں مر گئے تھے، کب سے انتظار کر رہی ہوں، تم اپنی منحوس صورت لے کر اب آرہے ہو۔ گھر جا کر بتاؤں کی، مان سنیں، بہت جلدی چڑھ گئی ہے حرام کھا کھا کر۔“ وہ کار میں بیٹھتے ہی غصے سے کہنے لگی مگر اس کی چیخ و پکار کے باوجود ڈرائیونگ سیٹ پر خاموشی تھی۔ شدید غصے اور اشتعال میں اس نے ڈرائیور پر توجہ نہیں دی تھی، جو آصف کی بہ نسبت بہت زیادہ فاسٹ ڈرائیونگ کر رہا تھا اور کوئی معذرت و معافی بھی نہیں مانگ رہا تھا۔

”کہاں مر گئے تھے؟ جواب کیوں نہیں دے رہے؟ کیا زبان بچ کھائی ہے؟“

”آصف چھٹیوں پر ہے۔“ شاہ ویز نے قہقہے سے جواب دیا۔

آواز سنتے ہی وہ چونکی۔ فوراً جھک کر اس کی شکل دیکھی۔ پھر استہزائیہ انداز میں بولی۔

”آصف کی ڈیوٹی بھی تم نے سنبھال لی، اچھا..... اچھا، بہت غریب ہو..... اب تو روپوں کی اور ضرورت ہوگی، کیونکہ تمہیں بایک بھی خریدنی ہوگی اور.....“

”پلیز..... خاموشی سے بیٹھی رہیں، مجھے دوران سفر گفتگو پسند نہیں۔“

”اچھا..... تو میں کیا کروں؟ میں تمہاری نوکر نہیں ہوں جو تمہاری پسند و ناپسند کا احترام کروں بلکہ تم میرے نوکر ہو اور تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں چاہوں گی۔“

”میں نوکر ہوں، اپنی محنت کی تنخواہ لیتا ہوں، آپ کی فضول بکواس سننے کی نہیں۔“ وہ اس خود سر لڑکی سے قطعی شکست کھانے کو تیار نہ تھا، سو دبدو جواب دیا۔

”ہو تو تم دو ٹکے کے انسان، مگر نہ معلوم خود کو لو کہاں کا کنگ سمجھتے ہو۔ ارے شاہ نام رکھنے سے کوئی بادشاہ نہیں بن جاتا تم جیسے چھوٹے لوگ اسی خوش فہمی میں زندہ رہتے ہیں کہ کبھی زندگی میں ان ناموں کا اثر بھی پڑے گا۔ بابا بابا..... بے چارے، بے وقوف لوگ، سمجھتے نہیں کہ غریب پیدا ہوئے ہیں اور غریب ہی مرجائیں گے۔ وہ نظر اہستہ ہوئی کوپا تھی۔

”خاموش رہو.....“ شاہ ویز سخت لہجے میں بولا۔

”شت اپ ہم مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟ اوقات نہیں بھولواؤ، نوکری سے نکال دیا تو ساری زندگی بھیک مانگتے گزرے گی تمہاری۔“

”جس طرح زندگی اور موت کا اختیار تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے، اسی طرح ملازمت دینے اور چھیننے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو۔“

”مسٹر امیر! منہ لگنے کی کوشش مت کرو..... بہت بری ہوں میں۔“ غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا، آنکھیں چنگاریاں برسانے لگی تھیں۔

”اس اطلاع کا شکریہ۔“ اس کا لہجہ جلانے والا تھا۔ وہ سگ اٹھی تھی۔

”ہونہہ..... یہ سب پاپا کی ڈھیل ہے جو تم ماںک اور نوکر کا فرق بھول کر بکواس کئے جا رہے ہو۔ مگر بہت ہوگئی، گھر چلو تمہیں نوکری سے نکلوا کر سڑکوں پر بھیک نہ منگوائی تو میرا نام بدل دینا۔“

اس کی برداشت کی حد ختم ہوگئی۔ شاہ ویز نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اسے خاموش کروانا چاہ رہا تھا، وہ خاموش ہوگئی تھی۔ مگر اس کو خاموش رہنے کی عادت نہیں تھی، پھر بول اٹھی۔

”نہ معلوم پاپا کو تم فقیروں میں کیا خوبی نظر آتی ہے، جو گرویدہ ہو جاتے ہیں۔“

”محترمہ زبان سنبھال کر بات کیجئے، کیا فقیر فقیر کی رٹ لگا رکھی ہے؟“

”کیوں..... اصلیت سے جڑ ہوتی ہے؟ گھبراتے ہو پیداؤں کی فقیر!“

”میرا حوصلہ مت آزماؤ۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”تم کر بھی کیا سکتے ہو دو دھکے کے نوکر؟“

□●□

اچانک ہی کار جھٹکے سے رکی تھی۔ ساتھ ہی وہ بوکھلا کر چیخی تھی۔

”دل تو چاہ رہا ہے آپ کی سانس بھی روک دوں..... مگر اختیار سے محروم ہوں۔“ اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا اور ڈرائیونگ ڈور کھول کر باہر نکل گیا۔ کار کے جائزے کے بعد معلوم ہوا پچھلا مارٹر پتھر ہو چکا ہے۔ وہ سر پکڑ کر رہ گیا۔

”اوہ..... اب کیا ہوگا؟ تمہیں پہلے ایکسٹرانارڈنگی میں رکھنا چاہئے تھا۔“ اس نے باہر نکل کر مارٹر پتھر دیکھا تو چیخ پڑی۔

”یہ میرا کام نہیں ہے اور نہ ہی مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔“

”اب کیا ہوگا..... کیا میں تمہارے سر پر بیٹھ کر جاؤں گی؟ ایک تو تھکن پہلے ہی اس قدر محسوس ہو رہی ہے اوپر سے مارٹر کو بھی ابھی پتھر ہونا تھا۔“

”اگر آپ اتنی ہی تھکی ہوئی تھیں تو کسی فرینڈ سے لفٹ لے کر چلی جاتیں۔ کیوں اتنا نام و بیٹ کیا۔ جانتی ہیں یہ ایریا بھی کراچی سے آؤٹ وے ہے۔ رش ڈرائیونگ کے باوجود دوڑھائی گھنٹے لگیں گے کراچی پہنچنے میں اور گھر پہنچنے میں مزید وقت درکار ہوگا۔“

جھنجھلاہٹ اس پر بھی سوار تھی۔ مزید اس بد تمیز لڑکی کی بد مزاجی نے اسے کھولا کر رکھ دیا تھا۔

”اے مسٹر! حد میں رہو اپنی اور اپنے گھنٹیا مشورے اپنے پاس رکھو اور نہ آئندہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرنا۔“ اس نے ہواؤں سے چہرے پر آتی لٹ پیچھے کرتے ہوئے ڈپٹ کر کہا۔

”ہونہہ.....“ اس نے قریب پڑے پتھر کو زوردار کک مارتے ہوئے غصے سے چنکارا بھرا۔

وقت مٹھی میں بندریت کی طرح پھسل رہا تھا۔ سڑک دور تک ویران تھی۔ جس کے ایک طرف جھاڑیوں کا جنگل ساتھ اور دوسری طرف میدانی علاقہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ سامنے بہت دور اسٹیل ملز کی روشنیاں جگنوؤں کی مانند نظر آرہی تھیں۔ دن بھر خوب گرمی رہی تھی۔ رات کے اس سے چلتی نرم و ٹھنڈی ہوا میں طمانیت ڈانڈی تھی۔

”ایسے کب تک یہاں کھڑے رہیں گے؟“ بڑھتی ہوئی تاریکی اسے پریشان کرنے لگی تھی۔ ادھر ادھر ٹپکتے شاہ ویز سے وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”جب تک اللہ میاں کوئی نیکی کا فرشتہ نہیں بھیج دیتے۔“

”نہ معلوم پاپا کو کیا ہو گیا ہے۔ سارے دن سے ابھی تک موبائل آف کر رکھا ہے اور نہ ہی کوئی فون ریسو کر رہا ہے۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو آف کرتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔

”آپ اپنی دوست کو کال کر کے ان کی کار منگوالیں، وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بتالیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم کب تک یہاں کھڑے رہیں گے؟ وقت کے ساتھ تاریکی بڑھتی جا رہی ہے۔“ کافی سوچ و بچار کے بعد اس نے کہا تھا۔

”اوہ شٹ! میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔“

”مجبوری ہے..... آپ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“ شاہ ویز نے نرمی سے سمجھایا۔

”نہیں یہ میری اسلٹ ہے۔ میں کسی کی ہیلپ ایکسپٹ نہیں کر سکتی۔“

”پھر مجھ سے کچھ مت کہئے گا۔“ اس نے بھنا کر کہا۔

کافی دیر گزر گئی تھی۔ مشعل بونٹ پر بیٹھ گئی تھی جب کہ شاہ ویز وہیں ایک بڑے پتھر پر بیٹھے ہوئے اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب اس نے حسن بیگ صاحب کو کارڈ رائیو کرنے کی آفر کی تھی اور اس کی بد بختی اسے اس ویران جگہ پر بے یار و مددگار چھوڑ گئی تھی۔

”الوؤں کی طرح بیٹھے کیا سوچ رہے ہو؟ موبائل پر پڑائی کرو شاید پاپا سے رابطہ ہو جائے۔“ اس نے کھڑکی سے سر نکال کر خامے رعونت بھرے لہجے میں کہا۔

اس کے انداز مخاطب پر شاہ ویز کی حیرت تھلا اٹھی تھی مگر از حد سرعت سے اس نے اپنے اندر اٹھنے والے غصے و وحشت کے لبال کو کنٹرول کیا۔ یہ سوچ کر اشتعال کو تسلی دی کہ صورت حال کچھ بھی سہی بہر حال وہ اس کے محسن، اس کے باس کی بیٹی ہے اور ان کے حکم پر ہی وہ اس وقت اس کے ساتھ ہے اور اس کے احکامات کی تعمیل اس پر فرض ہے کہ وہ ملازم ہے۔

وہ آرام سے پچھلی سیٹ پر نیم دراز تھی اور بڑی مغرور نگاہوں سے ڈیش بورڈ سے موبائل اٹھا کر بشن پیش کرتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر اس وقت اپنی برتری اور حاکمیت کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ شاہ ویز وہ پہلا شخص تھا جو پہلی نظر سے ہی اس کے لئے چیلنج ثابت ہوا تھا اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ غیر ارادی طور پر اسے شکست دینے پر کمر بستہ ہوگئی تھی۔ شاہ ویز کی سنجیدگی، بے نیازی و بے رخی اس کی ضدی، خود پسند، خود پرست طبیعت کے لئے ناقابل برداشت تھی کہ وہ صنف مخالف کو اپنے محسن سے بھسم کرتی آئی تھی۔ بڑے بڑے امراء کی اولادیں اس کی رفاقت کی متمنی تھیں۔ وہ انہیں تڑپا کر، لپکا کر، نقشہ رکھ کر خوب اپنی انا کو آسودہ کرتی تھی مگر شاہ ویز جو بے حد معمولی و عام انسان تھا، جس کا تعلق نہ تو کسی برگر فیملی سے تھا اور نہ ہی کسی صنعت کار و جاگیر دار کی بگڑی اولاد سے تھا۔ وہ ایک عام انسان تھا۔ لمبے قد، ورزشی جسم، گندی رنگت رکھنے والے شاہ ویز میں ایسی کوئی خاص اٹریکشن نہ تھی جو اس جیسی محسن پرست، دولت پرست و اسٹیٹس پرست لڑکی کو اپسریں کرتیں۔ ماسوائے ان سیاہ گھور بڑی، روشن روشن ذہانت سے چمکتی آنکھوں کے، جن میں اعتماد و طمانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جس نے اس کی شخصیت کو بہت اسٹرونگ بنا دیا تھا۔

شاہ ویز کی یہی بے نیازی و اعتماد اس کے لئے انا کی چوٹ بن گئی تھی۔

”سوری میڈم! سر کا موبائل آف ہے۔“ کافی دیر پڑائی کرنے کے بعد وہ مخاطب ہوا۔

”نہ معلوم پاپا کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ دن بدن اپ سیٹ ہوتے جا رہے ہیں۔“ وہ بڑبڑائی تھی۔

اس اثناء میں وہ ہائٹ کرو لاسڑک پر آتی نظر آئی تھی۔ مشعل جلدی سے کار سے نکلی تھی جب کہ شاہ ویز بھی خاصا مستعد کھڑا تھا۔ کاران کے قریب آ کر رک گئی۔

”ہیکسلو زمی، لفٹ پلیز۔“ اس سے پہلے وہ ڈرائیونگ ڈور پر جھک کر نو وارد سے مخاطب ہوئی۔

”اوہ یس..... اس مائی پلیز۔“ اس نوجوان نے اس کے گہرے گلے کا گہری نگاہوں سے جائزہ لیتے ہوئے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی اس کے ہمراہ تین اور نوجوان کار سے اترا آئے تھے۔ شاہانہ و بے باک انداز۔ وہ مشعل ہی کی کیگنری کے لگ رہے تھے۔

”پر بئی گرل! ہمارے پاس اونٹنی ون سیٹ ہے، آپ کے پارٹنر کو سیٹ نہیں ملے گی۔“ ان میں سے دوسرا مخاطب ہوا تھا۔ اس کی بھوکی نگاہوں کی ہوس شاہ ویز کی زیرک نگاہوں سے مخفی نہ رہ سکی۔ وہ خاموشی سے ان کے کتاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹائٹ ٹراؤزر جس کے کھلے پانچوں پریشٹوں اور ریٹیم کی کڑھائی تھی، ساتھ ہی ریڈ شارٹ شرٹ پر بھی شیشوں اور میچنگ ریٹیم کی کڑھائی تھی۔ اس سوٹ میں اس کی سرخ و سپید رنگت کھل رہی تھی۔ میچنگ جیولری تھی، سرخ لپ اسٹک سے رنگے ہونٹ کو یا مہکتے ہوئے گلاب تھے۔ سیلوئس بازو، چاندی کے مانند چمچا رہے تھے۔ مستزاد اس کی غلافی آنکھوں سے نکلتی غرور و تفاخر کی بجلیاں اور الہز انداز کسی کو ٹکا ہیں چرانے کی جسارت بھی نہ دیتا تھا۔

”ڈونٹ وری، میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“ اس نے شولڈر پر سٹانے پڑا لے ہوئے بے فکری سے کہا پھر مڑ کر خاموش کھڑے شاہ ویز سے مخاطب ہوئی۔

”تم آ جانا، کوئی نہ کوئی لفٹ تمہیں بھی دے ہی دے گا۔“ انداز سو فیصد تمسخرانہ تھا۔

”مس مشعل حسن بیگ صاحب! آپ میرے ساتھ ہی جائیں گی۔ میں آپ کو.....“

”وہاٹ! دماغ درست ہے تمہارا؟“

”جی ہاں..... بہت شکریہ! آپ لوگوں کی مہربانی کا۔ آپ لوگ جائیں۔“ وہ سخت لہجے میں ان چاروں سے مخاطب ہوا تھا جو چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

”ارے..... اوقات میں رہو اپنی دوکڑی کے ملازم۔ تمہیں حق کس نے دیا مجھ پر اپنا فیصلہ صادر کرنے کا؟ مجھے حکم دینے کا؟“ اس کا اشتعال سے برا حال تھا۔ اس کے معاملے میں کبھی اس کے باپ نے مداخلت نہ کی تھی پھر اس ملازم کو کس نے اختیار دیا؟“

”مجھے اپنی اوقات ازبر ہے لیکن آپ اپنی اوقات بھول رہی ہیں۔ آپ لڑکی ہیں اور تمہا ان اجنبی لوگوں کے ساتھ جانا آپ کو سوٹ نہیں کرے گا۔“ اس کا لہجہ نرم مگر آنکھوں اور چہرے پر سرخیاں اتر آئی تھیں۔

”ہونہہ..... اجنبی تو تم بھی ہو اور تمہارے ساتھ بھی میں تمہا.....“



”میں اجنبی نہیں ہوں، آپ کے فادر کی فرم میں ملازم ہوں اور انہوں نے ہی مجھے یہ ڈیوٹی سونپی ہے کہ باحفاظت آپ کو گھر پہنچاؤں اور آپ سن لیجئے کہ میں یہ ڈیوٹی نبھاؤں گا۔ پلیز برادر! آپ لوگ بھی اب جائیں ورنہ مجبوراً مجھے یہ استعمال کرنا پڑے گا۔“ اس نے جیب سے پستول نکالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو وہ چاروں جوڑکار ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر اس کی طرف جارحانہ انداز میں بڑھ رہے تھے، یکدم یکے بعد دیگرے کار میں بیٹھ کر فو چکر ہو گئے۔ اس کے لبوں پر لمحو بھر کو سکراہٹ چمک کر معدوم ہو گئی۔

”تم..... تم.....“ وہ شدت غضب سے کچھ نہ کہہ سکی۔

”زبان کو لگام دیجئے اپنی میڈم۔“ نبرداشت وضبط کی طنائیں اس سے چھوٹ گئیں۔

”شٹ اپ، ذلیل آدمی، نوکر ہو کر میرے منہ لگتے ہو۔ گھر جا کر تمہاری کھال میں بھس نہ بھروادیا تو میرا نام نہیں۔“ وہ کوپا انگڑوں پر لوٹ رہی تھی۔

شاہ ویز کے لئے یہ لحاظ زندگی کے بدترین لحاظ تھے کہ کوئی بالکل بے قصور ہونے کے باوجود اسے گالیاں دے رہا تھا۔ وہ پتھر بنا سن رہا تھا۔

”کوئی آسمان سے اترے گا ہماری مدد کو اب؟ کیوں نہیں جانے دیا مجھے..... کیا یہاں تنہائی میں ڈر لگ رہا تھا، بزدل۔ ویسے تو بڑے طرم خان بنتے ہو، تمہاری بہادری ایک لڑکی کے سہارے کی محتاج ہے؟“ اس نے استہزاء سیہ لہجے میں جھلا کر کہا۔

”میں اگر حسن صاحب کے لحاظ میں خاموش ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جو چاہیں گی بکو اس کریں گی۔ ہنہ..... لڑکی اور سہارا..... آپ لڑکی نہیں ہیں بلکہ جیتی جاگتی، چلتی پھرتی بے حیائی و بے غیرتی کی مثال ہیں۔ بے راہ روی، بے ضمیر کی غلاظت میں بھٹکتے ہوئے آپ کو خود کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ کھوکھلی دیواریں کبھی سہارا نہیں بن سکتیں، ان سے ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔“ اس کی رکوں میں شرارے دوڑ رہے تھے، لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ مشعل تپلا کر رہ گئی۔

قبل اس کے کہ ان میں مزید کوئی بات ہوتی، ایک سوزوکی والا وہاں آگیا اور شاہ ویز نے اس سے لفٹ مانگی اور کسی نہ کسی طرح کار بھی اسی سے باندھ کر ورکشاپ تک لے آئے تھے۔ وہاں سے گھر تک کا فاصلہ مشعل نے خاموشی سے طے کیا تھا۔

شاہ ویز اسے گیٹ کے باہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ نیند، تھکن اور پھر سب سے زیادہ اس سر پھرے شخص کی تلخ باتوں نے اس کا دماغ گھما ڈالا تھا۔ بے قراری سے انتظار کرتے حسن صاحب سے وہ سرسری انداز میں مل کر اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

دوسرے دن وہ خاصی دیر تک سوتی رہی تھی۔ حسن صاحب ناشتہ کر کے آفس چلے گئے تھے اور ان کی واپسی سے ایک گھنٹہ قبل وہ بیدار ہو کر فریش ہوئی تھی۔

رانعہ، جو جو کے ہمراہ آئی تھیں۔ جو جو اس کے پاس چلا آیا تھا۔ چائے اور اسٹیکس کے دوران انہوں نے گپ شپ کی تھی لیکن اس دوران وہ محسوس کر رہی تھی کہ جو جو کچھ پریشان ہے۔ اس کے پوچھنے پر وہ ہنس کر نال گیا تھا۔ اسی لمحے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر انڈھ کھڑی ہوئی۔ اسے رانعہ پھپھو کے ملنے کے خیال کے ساتھ شاہ ویز کا بھی خیال آگیا تھا کہ کل کس طرح اس نے اسے ہرٹ کیا تھا۔ اب تو اسے نوکری سے نکلوا کر ہی چین سے بیٹھے گی اور اسے کوئی ایسی سزا دے گی جو ساری زندگی اسے یاد دلاتی رہے گی۔ وہ دل میں تہیہ کرتی جو جو کا ہاتھ پکڑے سنگت روم کے دروازے کے باہر ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔ اندر سے پھپھو کی خوب چیخ کر بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”احمد بہت ناراض ہیں، بہت ناگوار گزر رہے انہیں جو جو پر آپ کا ہاتھ اٹھانا۔ اسی وجہ سے وہ آپ سے ملنے بھی نہیں آئے اور میں کوشش کر رہی تھی کہ آپ روپوں کا انتظام کر دیں گے تو شاید میں انہیں راضی کر لوں مگر یہاں آپ نے ہری جھنڈی دکھا دی ہے۔“

”احمد اور تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، میری پر اہم میری مجبوری کو سمجھنے کی سعی تو کرو۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے تم سے زیادہ دولت و جائیداد کبھی عزیز نہیں رہی۔ اس وقت ویٹرن کنٹریز میں خصوصاً مسلم کمیونٹی کو بزنس کے معاملے میں جو پر اہم درپیش ہیں، ان سے احمد بخوبی واقف ہوں گے۔“

”یہ تو وہ بھی جانتے ہیں کہ آپ کوئی چھوٹے یا نا تجرب کار بزنس میں تھوڑی ہیں۔“

”پہلے میری بات مکمل سنو۔“ وہ تیزی سے اپنی بات قطع کرتے دیکھ کر سنجیدگی سے بولے۔ ”رشتوں کے مقابلے سرمائے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ نہ وقت کا چیلن کبھی یکساں رہا ہے۔ تھوڑا سا صبر و برداشت سے کام لو، میں کوشش کر رہا ہوں، انشاء اللہ جلد کوئی نہ کوئی سہیل نکل آئے گی۔ احمد سے میں معذرت کرنے کو تیار ہوں، جو جو پر ہاتھ اٹھانے کی۔ مگر شرمندہ گرد نہیں ہوں۔“ ان کے لہجے میں دکھ بھی تھا اور صاف کوئی حق پرستی کا وقار بھی۔

مشعل جو شا کڈسی پھپھو اور پاپا کی باتیں سن رہی تھی معا پاپا کے معذرت کے لفظ پر اس کی حیات شارپ ہو گئیں۔ پھپھو کس قدر بدتمیزی و بد دلچالی سے مخاطب تھیں جب کہ پاپا کے لہجے کی زری، لجاجت و مروت نے اس کے اندر آتش نشاں کھولا ڈالا تھا۔

”پاپا! کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو کسی سے معافی مانگنے کی یا معذرت کرنے کی۔“ اس نے اندر آ کر بیڑے لہجے میں کہا۔ پیچھے جو جو بھی اندر داخل ہوا تھا۔

”میٹا! آپ اپنے روم میں جائیں۔“

”نہیں پاپا! آئی آپ سے اتنے اونچے لہجے میں بات کر رہی ہیں۔ اتنی بد دلچالی و بے مروتی سے کو یا جیسے آپ سے ان کا کوئی معتبر رشتہ نہ ہو۔“

”تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے ہم بہن بھائی کے معاملے میں بولنے کی۔“ رانعہ غرائیں۔

”بھائی..... ہنہ..... کیوں، کیا بھائی کو اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کسی بنا پر بہن کے بیٹے کو ایک تھپڑ رسید کر سکے؟“ اس نے بھی دوہرہ کہا۔

”جو جو کو کبھی اس کے باپ نے نہیں مارا۔“

”کوئی انہونی بات نہیں ہے یہ۔ اس کے باپ نے کبھی اس کے اخراجات بھی نہیں اٹھائے۔“

”اوہ..... تو تیرے باپ نے اٹھائے ہیں؟“ وہ لمحے بھر میں آپے سے باہر ہو گئیں۔

”یس..... آف کورس۔ نہ صرف اس کے بلکہ اس کے باپ کے بھی اور اس کی ماں کے بھی اور اس کے فرینڈز اور ہلیز کے بھی۔ آپ نے کیا، کیا ہے سوائے اسے پیدا کرنے کے؟“

”دیکھ رہے ہیں بھائی جان اس بد تمیز لڑکی کی زبان؟ کیسے طعنے دے رہی ہے؟“ وہ جلتے پیر کی بلی کی طرح پورے کمرے میں ناچ اٹھیں۔

”جو بچ کہنے کا شوق رکھتے ہیں انہیں بچ سننے کا حوصلہ بھی رکھنا چاہئے۔“

”مشی! بری بات ہے میٹا۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کس طرح بات کر رہی ہیں؟ یہ پھپھو ہیں، بڑی ہیں آپ سے۔ چلیں سوری کریں۔ کم آن چیز آپ۔“ حسن صاحب جو ہکا بکا بیٹی کے خطرناک تیور دیکھ رہے تھے معاصر زلزلہ کرنے لگے۔

”یہ مجھ سے بڑی ہیں، میں ان کی عزت کروں اور آپ ان سے بڑے ہیں، انہیں آپ کو بے عزت کرنے کا حق حاصل ہے؟ نہیں پاپا! میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر آپ کی اسلٹ مجھے کبھی کوارہ نہیں ہے۔ آئی، احمد انکل کی ناراضگی کی بات کر رہی ہیں، انہیں اعتراف ہے کہ جو جو کو آپ نے تھپڑ کیوں رسید کیا مگر اس سے قبل انہوں نے کبھی اس امر پر اعتراف کیوں نہیں کیا کہ ان کی موجودگی کے باوجود جو جو کی ذمہ داری آپ کیوں اٹھاتے ہیں؟ آج ایک تھپڑ پر انہوں نے اتنا ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔“ وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

”ہم نے جو بھی لیا اپنا حق لیا، تمہیں اعتراف کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

ان کی کھری اور کڑوی باتوں نے انہیں لا جواب کر ڈالا تھا مگر اپنے تیز و طر امزاج کے باعث تھپڑا لے کر تیار نہیں تھیں۔ جو جو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

”بھائی جان! میں ابھی اسی وقت یہ رشتہ توڑتی ہوں تو بتو بہ، اچھا ہو اوقت سے پہلے اس لڑکی کی زبان کا مجھے بھیدل گیا ورنہ بعد میں تو ہمیں سر چھپانے کی بھی کہیں جگہ دستیاب نہ ہوتی۔“ انہوں نے آخری وار کیا تھا۔

حسن صاحب پریشان سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مشعل کے چہرے پر بے یقینی تھی جب کہ جو جو اسی طرح سر جھکا ئے بیٹھا تھا جیسے اس کو اس فیصلے کا پہلے سے علم ہو۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کچھ احساس ہے تمہیں رانعہ!“ حسن صاحب صدے کی کیفیت میں تھے۔

”سوری بھائی صاحب! لیکن میں مجبور ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں عورت کتنی خود مختار کیوں نہ ہو مگر کچھ فیصلے اسے مرد کے تابع رکھتے ہیں، حکم ماننے پر مجبور کرتے ہیں، رشتہ استوار رکھنے کے لئے دل پر جبر کرنا ہی پڑتا ہے۔“ بھائی کی دگرگوں ہوتی حالت نے ان کے کرخت و چنگھاڑتے لہجے کو بہ مصلحت نرم و غمگین کر دیا تھا مگر ان کی آنکھوں کی طمانیت چہرے کی آسودگی ان کے ہر لفظ کی چٹلی کھا رہی تھی۔ مشعل بغور جو او کو دیکھ رہی تھی جو خاموش بیٹھا تھا۔

”احمد نے رشتہ میری بیٹی سے جوڑا تھا یا میری دولت سے؟“ بیگ صاحب کے لہجے میں خنجر تھا۔

”آف کورس پاپا! میرے ذریعے ملنے والی دولت سے۔“ مشعل نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”تم چپ رہو لڑکی اور بھائی صاحب! آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ کیا احمد.....“

”پاپا بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ تیز لہجے میں کہہ کر جو اد کی طرف بڑھی۔ ”جو جو اتم بتاؤ، کیا تم مجھ سے تعلق توڑنا چاہتے ہو؟ کیا تم میرے بنارہ لو گے؟“

”نہ..... نہ..... نہیں مگر..... مم!“

”اس سے کیا پوچھتی ہو..... مجھ سے معلوم کرو۔ یہ ہے ہی احمق اعظم۔“ رانعہ آگے آ کر اس کے اور جو جو کے درمیان کھڑی ہو گئیں۔ جو جو گھگھیا کر خاموش ہو گیا۔

”رانعہ! میرے خیال میں تم یہ بالکل غلط کر رہی ہو۔ تمہیں بچوں کی خواہشوں کے درمیان نہیں آنا چاہئے۔ میں کہہ رہا ہوں مجھے تھوڑا وقت دو۔“

”نو پاپا! اب کبھی بھی میں اس رشتے کو نہیں مانوں گی۔ میں ہزار بار تھوکتی ہوں اس رشتے پر۔ عمر گزارنے کے لئے کسی مضبوط، باہمت اور بہادر لائف پارٹنر کی ضرورت ہوتی ہے جو وقت کے گرم و سرد دے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ جو کسی کا پابند نہ ہو، اپنے فیصلے خود کرنے کا اختیار رکھتا ہو، جس کی ذہانت و لیاقت سامنے والے کو مرعوب رکھے۔ جو جو ایسا کبھی نہیں بن سکتا، اس میں یہ کوالٹی ہی نہیں ہے۔ کل میرے ساتھ تھا تو میری محبت کا دم بھرتا تھا۔ آج اپنی ممانے کے ساتھ ہے تو ان کے فیصلوں پر دم ہلا رہا ہے۔“

اس کا اشتعال نقطہ عروج پر تھا۔

جو اد اس کی خونخوار نظروں کی تاب نہ لا کر وہاں سے چلا گیا۔

”مشی! پلیز کول ڈاؤن مینا! رانہ پھوپھو ہیں آپ کی۔ اس قدر ایویشنل نہیں ہوتے چندا۔“

”میرا کوئی رشتہ نہیں ہے ان سے..... میں کوئی تعلق رکھنا بھی نہیں چاہتی۔“

”ہاں..... ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو، میرا کوئی رشتہ نہیں ہے تم سے اور نہ ہی تعلق ہے..... یہ سب تو بھائی صاحب کی.....“

”رانہ! خاموش رہو۔“ حسن بیگ اتنی زور سے چیخے کہ کمرہ کونخ اٹھا۔ مشعل نے از حد حیرانی سے باپ کی طرف دیکھا جو زندگی میں پہلی بار لاڈلی، چپیتی، بہن سے اس لہجے میں مخاطب ہوئے تھے۔

”مشی! آپ جائیں مینا اپنے روم میں فوراً.....“ اس بار ان کے لہجے میں ملامت کے ساتھ واضح طور پر لڑش بھی تھی۔ اس نے ایک نگاہ باپ کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا پھر وہاں سے چلی گئی۔

”کہنے دیجئے مجھے بھائی صاحب! یہ آپ کی رحم دلی کا نتیجہ ہے جو ایک ایسی لڑکی ہمارے منہ لگ رہی ہے جس کی نہ ماں کا پتہ ہے نہ باپ کا..... نہ معلوم کس گندے ونچ گھٹیا خاندان سے تعلق ہوگا اس کا۔ جو بچے کچرے کے ڈھیر پر پڑے ملتے ہیں وہ خود بھی نجس ہوتے ہیں، کچرہ ہوتے ہیں اور آپ اس کچرے کے ڈھیر سے بچی کو لا کر یہ بھول گئے کہ نہ معلوم اس کی رکوں میں کس بد چلن عورت، کس بد کردار مرد کا خون گردش کر رہا ہوگا۔ ایسا گند اخون اپنی گندگی ضرور دکھاتا ہے، نسلوں کی بنیاد ہمیشہ اعلیٰ اور صاف خون پر رکھی جاتی ہیں۔ ایک خاندانی ماں ہی بہترین خاندان تشکیل دے سکتی ہے اور مشعل میں یہ تمام خوبیاں نہیں ہیں۔“ وہ بے حسی و سنگدلی کی جتنی جاگتی تصویر بنی اس حقیقت کو بیان کر رہی تھیں جس کو وہ جان بوجھ کر برسوں سے ذہن سے کھرچتے آئے تھے اور آج اٹھارہ انیس سال بعد وہ اس حقیقت کو پوری طرح بھول چکے تھے کہ رانہ نے بڑی بے رحمی سے اس حقیقت کو یاد دلایا کہ انہیں زخم زخم کر ڈالا تھا۔

”رانہ! تمہیں، بخوبی علم ہے کہ تمہارا ایک ایک لفظ میرے اندر گہرے گہرے زخم بنا رہا ہے۔ مشعل میری بیٹی نہیں ہے۔“ انہوں نے کرب سے ہونٹ بھیجے۔ ”مگر مجھے بیٹی کی طرح ہی عزیز ہے بلکہ اپنی جان سے بڑھ کر، اپنی روح سے بڑھ کر پیاری ہے۔ آج تو تم نے اسے غیر کہا ہے مگر آئندہ کبھی اسے کچھ کہا یا اسے اور جو اس کی اصلیت بتانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا میرا امر منہ دیکھو گی۔“ ان کے لہجے میں بے کراں اذیت و کرب پنہاں تھا۔

”بھائی صاحب! اس کی محبت میں آپ اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ موت کی سرحد عبور کرنے کو تیار ہو گئے ہیں اور میں انہیں اصلیت بتانے ہی کیوں لگی؟“ وہ کچھ کھسیا کر بولیں۔

”غلط بیانی مت کرو رانہ! اگر میں دخل نہ دیتا تو تم یہاں قیامت برپا کر چکی ہوتیں۔“

”اچھا بھائی صاحب! میں وعدہ کرتی ہوں، کبھی بھی یہ حقیقت نہیں بتاؤں گی۔ مگر سن لیں، مشعل میری بہن نہیں بن سکتی۔“ وہ سر دھری سے کہہ کر رکی نہیں وہاں سے چلی گئیں۔ حسن صاحب لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے بیڈ روم میں آئے تھے۔ سردیوں ہاتھوں میں تھام کر بیڈ پر ڈھسے گئے۔ دانستہ طور پر ان کی بہن نے ان کے زخموں کے ٹانکے نوچ ڈالے تھے۔ تکلیف، کرب، اذیت سے ان کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا۔ ماضی کے جھروکوں سے ان کی محبوب بیوی آنکھوں میں محبت و چاہت کے دیپ جلائے جھانک رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر دلچرپ مسکان تھی۔

”رضوانہ! یہ کیا کہہ دیا رانہ نے کہ مشعل میری بیٹی نہیں ہے، آہ کس قدر کٹھور ہو گئی ہے وہ، نہ اسے رشتوں کے تقدس کا خیال رہا ہے نہ اپنوں سے وابستگی کا احساس، کتنے اطمینان سے اس نے کہہ دیا کہ مشعل میری بیٹی نہیں ہے۔ وہ گند اخون اس کی بہو بننے کے قابل نہیں ہے۔ آج بہت کمزور روپ دیکھا ہے میں نے اپنی ماں جانی کا، وہ مجھے برا کہتی، میری کردار کشی کرتی میں اسے معاف کر دیتا، کبھی شکوہ بھی زبان پر نہ لاتا۔ مگر رانہ نے مشعل پر انگلی اٹھا کر مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے اور سمجھا دیا ہے کہ اب اپنوں پر بھی اعتبار و بھروسہ کرنے کا وقت نہیں رہا ہے، بدلتے وقت، بدلتے موسم ان خالص رشتوں میں بھی تغیر پیدا کر چکے ہیں۔ رضوانہ! تمہیں معلوم ہے نا؟ آج اگر میں زندہ ہوں تو مشعل کی وجہ سے ورنہ تمہارے پیچھے مشعل کے پیچھے میں بھی اس دنیا کو چھوڑ چکا ہوتا۔ لیکن میرے ساتھ میرے مولانا نے ایک جگہ انصاف کیا، ایک مشعل تمہارے ساتھ بھیج دی تو دوسری مشعل کو دنیا میں میرے لئے بھیج دیا۔ وہی میرے جینے کا آسرا ہے۔ پھر رانہ نے کیوں کہا کہ وہ میری بیٹی نہیں ہے، گند اخون ہے، اس کے خاندان کی بہو بننے کے قابل نہیں ہے۔ نہیں نہیں..... مشعل میری بیٹی ہے، میری جان ہے، میری روح ہے، میرے زندہ رہنے کی وجہ ہے۔ مشعل..... مشعل.....“

”مشی!“ شدید صدمے نے انہیں حواس باختہ کر ڈالا تھا۔ پہلے تو وہ اس طرح ٹوٹ گئی تھیں جیسے کسی ناپیدہ وجود سے مخاطب ہوں، پھر گھبراہٹ و درد کا احساس اتنی سرعت سے ہوا تھا کہ وہ قلب پر ہاتھ رکھے شدید تکلیف میں مشعل کو پکارنے لگے تھے۔



فرم کی جانب سے بہترین علاقے میں اسے بنگلہ مل چکا تھا جس کو اس نے بہت نفاس اور سادہ طرز سے ڈیکوریٹ کر لیا تھا۔ نئی آف و ہاؤس چھماتی کار بھی اس کے تصرف میں تھی۔ بے جی اس روشن اور ہوادار گھر میں آکر بہت خوش تھیں۔ خالد زینہ بھی ایک ہفتہ رہ کر بہت خوش واپس لوٹی تھیں۔ شاہدین نے بے جی کے علاوہ ان کے لئے بھی دل کھول کر شاپنگ کی۔

”اللہ کالا کھلا کھشکر ہے کہ اس نے اپنی رحمت ہم پر دراز کر دی۔ میں کہتی تھی نا بیٹا! رات کتنی ہی طویل ہو با آخراح کی سپیدی و اجالا ہر سو نکھر جاتا ہے، ہر شے منور اور روشن ہو جاتی ہے۔ اب تمہارے راستے بھی سیدھے اور روشن ہیں۔ میری دعا ہے اللہ نے جس طرح یہاں تمہیں سرفراز کیا ہے، آخرت میں بھی کامیاب و کامران کرے۔“ انہوں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے دعا دی۔

”یہ سب آپ کی دعاؤں، کاوشوں کا انعام ہے ورنہ میری بساط ہی کیا ہے۔“

”نہیں بیٹا! میں نے کیا کیا ہے۔ یہ سب تمہاری محنتوں اور صبر کا ثمر ہے۔ میں نے تو ایک ماں کی ذمہ داری نبھانے کی کوشش کی ہے، جو رب کے فضل سے رایگاں نہیں ہوئی۔ میں نے جیتے جی تمہیں کامیاب و خوشحال دیکھ لیا۔ اب تو ایک ہی تمنا جاگ اٹھی ہے۔“

”کون سی تمنا؟“ اس نے سلائس پر جیم لگاتے ہوئے پُراشتیاق انداز میں استفسار کیا۔

”اس گھر میں بھولانے کی، تمہیں سہرا باندھے دیکھنے کی۔“ وہ سرت سے چپک کر بولیں۔

”اوہ، ابھی نہیں بے جی۔ اس خواہش کو مزید کچھ عرصے کے لئے سلا دیں۔“

”کیوں؟“

”میں ابھی کچھ عرصہ آزاد رہنا چاہتا ہوں۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”شادی کا کہہ رہی ہوں، کوئی بیڑیاں تھوڑی تمہارے پاؤں میں ڈال رہی ہوں؟“

”بیڑیاں ہی تو ڈال دی جاتی ہیں..... ناپیدہ بیڑیاں۔“

”اچھا ابھی پلک جھپکتے میں شادی تھوڑی ہو جائے گی، شادی کے لئے ایک عدد لڑکی کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے میں صرف لڑکی کو نہیں بلکہ اس کا خاندان، گھر کا ماحول، گفت و شنید، نشست و برخاست، طور و اطوار سب کچھ ہی دیکھنا و پرکھنا ہوتا ہے۔ لڑکی کا مزاج و سلیقہ گھر کے ماحول سے پتہ چل جاتا ہے۔“ چائے پیتے ہوئے وہ خاصی جذباتی تھیں۔

”بے جی! آپ لڑکی کیا خرید کر لائیں گی جو اس قدر خوبیاں دیکھیں گی۔“ وہ عادت کے برخلاف تہقہہ لگا کر کوہا ہوا تھا۔ بے جی شفقت سے مسکرائیں۔

”ارے خریدنا کیا میرے بچے! دراصل میں صورت کی نہیں سیرت کی طلب گار ہوں۔ لڑکی بھلے خوب صورت نہ ہو مگر بااخلاق و بامروت اور گھڑ، سلیقہ مند ہونی چاہئے جو سچ گھڑ گھر کو جنت بنا کر رکھ دے، خوب سوچ سمجھ کر کسی ایک گھر میں قدم رکھوں گی میں، جو میرے معیار کا ہوگا۔ گھر گھر گھس کر گائے، بکریوں کی طرح لڑکیاں دیکھ کر مسترد کر دینا اور پھر دوبارہ یہی مشغلہ جاری رکھنا مجھے سخت ناپسند ہے۔ خواہ ماں باپ کی عزت اور لڑکیوں کی نافرمانی و عزت نفس کو مجروح کرنا کتنی دل آزاری کا کام ہے۔ پھر اللہ کو بھی یہ بات پسند نہیں کہ ہم اس کے بنائے بندوں میں فتنائیں نکالیں۔“

”مجھے تو آپ کے ارادے خطرناک اور عزائم خوفناک لگ رہے ہیں۔“ اس نے شوخی سے کہا۔

”اچھا ایک بات تو بتاؤ سچ سچ؟“ وہ اس کی جانب ٹوٹتی نگاہوں سے بولیں۔

”جی کہئے..... پر اس سچ سچ کہوں گا۔“ وہ چائے کا کپ رکھ کر المٹ ہو گیا۔

”تمہیں کوئی لڑکی پسند تو نہیں؟“

”نہیں..... بالکل نہیں۔“

”سچ کہہ رہے ہو؟“

”بالکل سچ۔“

”پھر وہ لڑکی کون تھی؟“ انہوں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

”وہ لڑکی؟ کون سی لڑکی بے جی؟“ وہ از حد متعجب ہوا۔

”وہ جو ہسپتال میں تم سے ملنے آئی تھی اور انگریزی گفتگو کر رہی تھی اور لباس بھی اس نے فرنگیوں والا پہن رکھا تھا۔“ بے جی کی نگاہیں ابھی بھی اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو بغور دیکھ رہی تھیں، جانچ رہی تھیں، پرکھ رہی تھیں جیسے کوئی عہد پانا چاہا ہو رہی ہوں اور ان کی وضاحت پر مشعل کا مغرور سراپا اس کے ذہن کے کیوں پر ابھرا اور ایک دم اس کا منہ اس طرح بن گیا جیسے ٹیٹھے با دام کھاتے کھاتے اچانک کڑوا با دام منہ میں آجانے سے بن جاتا ہے۔

”وہ حسن بیگ صاحب کی بیٹی ہے اور باپ کی دولت و جائیداد نے اس کا دماغ بالکل خراب کر دیا ہے۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں اس بدتمیز و بد دماغ لڑکی کا؟“

”میں..... میں سمجھی شاید تم اسے پسند کرتے ہو۔“

”میں اور اس کڑوے کر لیے کو پسند کروں گا..... لا اول والا قوۃ..... وہ لڑکی نہیں، بھڑوں کا چھتہ ہے۔ اس سے شادی کرنے سے بہتر ہے بندہ خودکشی کر لے۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو بے جی بولیں۔

”ہوں..... یہ تو قصہ ہی ختم۔ وہ تمہارے مالک کی بیٹی ہے۔ تمہارا اور اس کا جو ممکن بھی نہیں، بہت بڑے لوگ ہیں وہ۔ خیر اب میرے ذہن سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ ایک ہفتے بعد زرینہ آنے کا کہہ گئی ہے۔ وہ آجائے تو خاندان کی لڑکیوں کے متعلق وہی بتائے گی کہ کون کون بیاہی گئیں اور کون کنواری ہیں۔ مجھے تو شروع سے ہی تنہائی کی عادت ہے مگر وہ تو سب سے ہی ملتی جلتی رہتی ہے اس لئے حالات سے بھی سب کے باخبر ہے۔ لیکن تم تو مشورہ دو، لڑکی دیکھوں یا نہیں؟“ معانیہوں نے چونک کر استفسار کیا۔

”آپ کا حکم میں کس طرح مان سکتا ہوں۔ آپ کی چوائس پر مکمل بھروسہ و اعتماد ہے مجھے۔ صرف ایک استدعا ہے، شادی ایک ڈیڑھ سال کے بعد کروں گا۔ اس سے قبل آپ جو رکھیں کرنا چاہیں بھد شوق کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ اس نے اختیار کی ڈور انہیں تنہا دی تھی۔ جولانے بے شمار دعاؤں سے نوازا گیا تھا۔ بے جی کو اس کی سعادت مندی پر ہمیشہ سے فخر رہا تھا۔ اب زندگی کے اتنے اہم فیصلے کی اجازت انہیں دے کر تاقیامت معتبر کر ڈالا تھا۔

□●□

فرم جا کر معلوم ہوا کہ رات حسن بیگ کو شدید ہارٹ ایٹک ہوا تھا۔ ان کی حالت تسلی بخش نہیں تھی۔ وہ آئی سی یو میں تھے۔

وہ سیدھا ہسپتال چلا آیا۔ وہاں کسی کو بھی حسن بیگ سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ کل سے اب تک ان کی حالت میں سرفرقت نہیں آیا تھا۔ وہ مسلسل خطرے میں تھے۔ وہ ڈاکٹر ز سے ملنے کے بعد آئی سی یو سے ملحقہ کوریڈور میں رکھی بیٹھ چکا تھا۔ اس کے اندر دکھ کا غبار پھیلتا چلا گیا۔ دل کی گہرائیوں سے وہ ان کی لمبی عمر اور صحت یابی کی دعائیں کرنے لگا۔ حسن بیگ سے ان کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا نہ ہی قریب یا دور کی رشتے داری تھی لیکن اس کے اندر دکھ و احساسات کی ایسی ہی لہریں پھر رہی تھیں جیسے اپنے کسی سگے کی تکلیف یا دکھ پر، پریشانی و اضطراب لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگتا ہے۔ یہ سب بیگ صاحب کی مشفق طبیعت و بااخلاق مزاج کی کشش تھی جو صرف ایک ملازم ہونے کے باوجود انہوں کی طرح چریشان، مشکرو دعا کو تھا۔

معانیہ کے کانوں میں گھٹی گھٹی سسکیاں کوٹتی تھیں۔ اس سے کافی فاصلے پر نیم اندھیرے حصے میں مشعل چہرہ جھکائے بیٹھی تھی۔ سرنخی مائل خروٹی رنگ کے بال اس کے شانوں تک بکھرے ہوئے تھے، کچھ چہرے کے ارد گرد بھی پہرہ دینے لگے تھے۔ کافی فاصلے سے بھی اس کے رخساروں پر پھیلتے شفاف موتی واضح نظر آرہے تھے۔ سسکیوں کے سبب اس کا نازک وجود کسی پھولوں کی ڈال کی طرح چمک چمک جاتا تھا۔

ایک کوشے میں تنہا بیٹھی روتی ہوئی وہ مکمل بے بسی، بے کسی و بے تعلقی کی زندہ مثال تھی۔ یہ بے حد خاص لڑکی کا بے حد عام سا روپ تھا۔ بھلا پتھر بھی کبھی موم ہوتے ہیں؟ وہ دم بخود اس کی جانب بے ارادہ دیکھے جا رہا تھا اور پہلی بار اسے اور اک ہوا، مرد کتنا ہی سنگدل و کٹھور کیوں نہ ہو مگر عورت کے آنسو اسے پگھلانے کے لئے تیزاب سے بھی زیادہ طاقت کے حامل ہوتے ہیں، روتی ہوئی عورت مرد کی کمزوری ہے۔ بڑے بڑے پہلو انوں کو شکست دی جا سکتی ہے مگر عورت کے آنسوؤں کو نہیں۔ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ کسی صنف مخالف کو آنسوؤں کی برسات کرتے دیکھا۔ اس لمحے اس کے دل سے تمام نفرت، عداوت غائب تھی۔ اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا جا کر اس کمزور و بے بس لڑکی کو تسلی و تسنی دے، حوصلہ و ہمت سے اس کٹھن وقت کو سہارنے کی ترغیب دے۔ اسے عام کمزور و بے سہارا لڑکی کی طرح آنسو بہاتے دیکھ کر اس کے اندر کاروائی مرد جاگ اٹھا تھا جو عورت کی کمزوری و آنسوؤں کے سامنے خود کو طاقت و راور با حوصلہ سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اٹھنے ہی والا تھا کہ یکدم کوریڈور کا گلاس ڈور کھول کر ایک متناسب جسم کی فیشن بھل خاتون اندر داخل ہوئیں اور بائیں پھیلا کر روتے ہوئے مشعل کی جانب بڑھتے ہوئے کہنے لگیں۔

”بھائی صاحب کو کیا ہو گیا؟ رات کو تو ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گئی تھی۔“

”اس کا جواب خود ہی دیجئے۔ کیونکہ میں تو پاپا کو ٹھیک چھوڑ کر گئی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد ملازم نے انہیں بے ہوش دیکھ کر مجھے اطلاع دی۔ ان کو اسی وقت ملازم کے ساتھ میں ہسپتال لے کر آئی تھی۔ ان کی حالت رات سے اب تک ایسی ہے۔ انکل باری کہہ رہے ہیں کہ وہ کسی گہرے اور ناقابل برداشت صدمے کے زیر اثر ہیں۔ ان کی ہارٹ بیٹس، بی پی لیول کنٹرول نہیں ہو رہا ہے اور اس کی وجہ آپ ہیں۔“ اس نے غصے سے اپنی طرف بڑھنے والے ان کے بازو جھٹک دیئے تھے اور بہت نفرت و درشتگی سے ان سے مخاطب ہوئی تھی۔

”کیا، میں.....؟ دماغ درست ہے تمہارا؟“ وہ اسے گھور کر غصے سے بولیں۔

”نہیں..... اس وقت میرا دماغ درست نہیں ہے۔ میرے پاپا اندر زندگی و موت سے جنگ لڑ رہے ہیں اور یہاں میں..... لیکن آپ کان کھول کر سن لیں اگر میرے پاپا کو کچھ ہو گیا تو میں آپ کو اور آپ کے خاندان کو زندہ نہیں رہنے دوں گی۔“

کچھ دیر قبل نظر آنے والی معصوم و کمزور ہرنی کا یہ روپ ریشمی شیرنی کا سا تھا۔

”اے لڑکی! زبان سنبھال کر بات کر۔ وہ میرے بھائی ہیں اور مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں۔“

”ہوں، بھائی نہیں دولت۔ ابھی بھی آپ کی آس، امید اور لالچ زندہ ہے۔ محبت تو کب کی مرچکی مگر اب سب ختم۔ میرے پاپا کو اس حالت تک پہنچانے والی عورت سے ہمیں کوئی رشتہ نہیں رکھنا۔ چلی جائیں آپ یہاں سے..... چلی جائیں۔“ اس وقت وہ سخت جنونی ہو رہی تھی۔ کوریڈور میں شاف کے علاوہ دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ شاہ ویز کے دل میں پیدا ہونے والے ہمدردی کے جذبات فنا ہو گئے۔ وہ کھڑا تھا۔

”مجبور ہوں میں، بھائی جان کو دیئے صدمہ کا پاس نہ ہوتا تو تمہاری اصلیت ابھی بتاتی اور تم لوگوں سے چہرہ چھپاتی نظر آتیں۔“ رانہہ بیگم بھی شدید طیش میں تھیں۔

”میری اصلیت سے ایک دنیا واقف ہے، جس باپ کی میں بیٹی ہوں اس سے سب واقف ہیں۔ آپ کیا میری اصلیت بتائیں گی۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ یہاں سے چلی جائیں اور آئندہ ہمیں اپنی صورت دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں یہاں اپنے بھائی سے ملنے آئی ہوں اور آتی رہوں گی۔ کسی میں دم ہے تو روک کر دکھائے مجھے۔“ اتنے لوگوں میں اپنا تماشا بن جانے پر سخت خجالت محسوس کر رہی تھیں مگر مضبوط اعصاب کی مالک تھیں، مضبوطی سے مقابلے پر ڈٹی رہیں۔

”واج مین، واج مین! اس عورت کو دھکے دے کر نکالو یہاں سے..... اگر آئندہ یہ مجھے نظر آئی تو تمہیں ملازمت سے چھٹی مل جائے گی۔“ وہ بلیو یونیفارم میں ملبوس چوکیدار سے دھمکی آمیز لہجے میں بولی تو چوکیدار گھبرا سا آگے بڑھا۔

”آئیے میڈم! پلیز میڈم!“ وہ رانہہ کی بارعب شخصیت سے بھی مرعوب تھا اور خونخوار بینی مشعل سے بھی متاثر تھا اور جانتا تھا یہاں کے بانی ڈاکٹر باری سے ان کے بہترین تعلقات ہیں۔ بڑے پریشان کن انداز میں وہ مخاطب ہوا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ ڈاکٹر باری کی پاٹ دار آواز سنتے ہی سب لوگ چلے گئے تھے جب کہ چوکیدار سر اسیمبلی کی حالت میں کھڑا ہوا تھا۔

”باری صاحب! اس پاگل لڑکی نے سب ہنگامہ کھڑا کیا ہے۔ میرے بھائی کی حالت نے میری جان پر بتا رکھی ہے اور اس لڑکی کے دماغ ہی ٹھکانے پر نہیں ہیں۔“ رانہہ نے بھرائے لہجے میں ڈاکٹر باری سے شکایت کی تھی۔

”انکل! اس عورت کو لے جائیں یہاں سے..... پاپا کی حالت کی ذمہ داری ان کی ہے۔“

”ریلیکس..... ریلیکس مائی ڈائر!“

”نہیں انکل! مجھے سکون نہیں ملے گا..... میرے پاپا وہاں تکلیف میں مبتلا ہیں۔ وہ سب کا خیال رکھتے ہیں، سب کی بہتری کے خواہاں رہتے ہیں۔ آج خود سے بے خبر ہیں، مجھ سے بے خبر ہیں اور یہ سب ان کی لالچ و خود غرضی کے سبب ہوا ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے انہیں شوٹ کر دوں۔“ اس کا جنون، اس کا اشتعال لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر باری اس کی ذہنی کنڈیشن سے بخوبی واقف تھے۔ وہ رانہہ سے استدعا کرنے لگے کہ وہ یہاں سے چلی جائیں۔

”واہ..... یہ کیا بات ہوئی؟ میں کیوں جاؤں؟ میں اس بدتمیز اور زبان دراز لڑکی سے دبنے والی، ڈرنے والی اب نہیں ہوں۔ جائے گی تو یہ یہاں سے۔“ وہ مقابلے پر اتر آئیں۔

”پلیز میڈم! آپ خیال کریں..... یہ انتہائی نگہداشت روم ہے۔ اندر آواز چلی گئی تو ڈسٹرنس ہو سکتی ہے۔“ شاہ ویز سے برداشت نہ ہو تو وہ چیختی، چنگھاڑتی رانہہ سے مخاطب ہوا۔ وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

”میں بھی آپ کو یہی سمجھانے آیا تھا۔ مشعل ابھی نا سمجھ، کم فہم ہے۔ آپ تو جانتی ہیں حسن کس قدر محبت کرتے ہیں ان سے۔ ایسے موقع پر اس طرح کی مس انڈر سٹینڈنگ ہو جاتی ہے۔ آپ مائنڈ نہ کریں، بعد میں وہ خود آپ سے ایکسیکیوز کریں گی۔“ ڈاکٹر باری رانہہ کو سمجھا بچھا کر لے جانے میں وہاں سے کامیاب ہو گئے تھے۔

”نان سٹنس..... ایکٹر لیس وومن سمجھتی ہے سب کو اسٹوپڈ بنالے گی۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے صوفے کی جانب بڑھی تھی۔ کوریڈور خالی تھا ماسوائے ان دونوں کے۔

”اے! پانی لا کر دو ایک گلاس۔“ وہ سخت تحکمانہ لہجے میں ایک طرف کھڑے شاہ ویز سے مخاطب ہوئی تھی۔ اس لمحے پوری طرح اس کے اندر کی گھنڈی لڑکی بیدار تھی۔ وہ ایک طویل سانس لیتا ہوا، سر کو جھٹکنا باہر کینٹین کی طرف بڑھ گیا اور منرل واٹر بوتل اسے لا کر پکڑائی تھی۔ وہ جو شاید ساری رات کی جاگی ہوئی تھی اور اذہد پریشانی و گریہ سے اس کے چہرے پر تھکن تھی، لمحے بھر کو بوتل اسے دیتے ہوئے اس کی نگاہیں اس سے ٹکرائی تھیں۔ سیاہ ہڈاؤز، سیاہ شرٹ میں اس کے سفید چہرے پر سرخ اگہ رہ آنکھیں عجب لگ رہی تھیں جن میں نی کی ابھی بھی کنول کی طرح تیر رہی تھی۔



دوپہر میں حسن صاحب کی حالت کچھ سنبھلی اور رات کو انہیں آئی سی یو سے پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا۔ مشعل کو انہوں نے ہوش میں آتے ہی پکارا تھا اور جب سے اب تک وہ اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دے رہے تھے۔ ازحد کمزور، آزرده و مضطرب تھے۔ مشعل تو ان کے سینے سے لگ کر دل کا غبار آنسوؤں کی صورت میں نکال کر ہر سکون ہو گئی تھی مگر گاہے بگاہے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل کر نیچے میں جذب ہو رہے تھے۔

شاہ ویز نے انہیں بہت تسلی دی، ازحد ہمت بندھائی، بیماری سے جدوجہد کرنے کا حوصلہ دیا۔ وہ دھیمے سے مسکرا کر اس کی تمام ہدایات سن رہے تھے۔ رات کو شاہ ویز چلا گیا تھا۔ مشعل وہیں ان کے پاس رکی رہی تھی۔ باری صاحب نے کہا بھی کہ وہ اور اسٹاف موجود ہیں حسن صاحب کی کیئر کرنے کے لئے مگر اس نے وہاں سے جانے کی ہامی نہ پھری اور نہ ہی حسن صاحب نے اسے گھر جانے کا کہا۔ وہ بھی اسے نظروں سے دور کرنا نہیں چاہتے تھے۔

دوسرے دن بھی ان کی طبیعت زیادہ بہتر نہیں ہوئی تھی۔ شاہ ویز کو انہوں نے فرمز کی اہم ذمے داریاں سونپ دی تھیں جنہیں وہ خوش اسلوبی سے نبھا رہا تھا۔ شام کو ہسپتال آکر وہ انہیں تمام کاروبار کے متعلق بریف کرتا، اہم فائلز پر سائن لیتا تھا حسن کو اس کی کارکردگی و صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔

برنس کی جانب سے وہ مطمئن تھے مگر ان کی بڑی اور اہم پر اہم تھی مشعل کی ذات، اس کا خیال اور مستقبل کی فکر۔ رائفہ نے مکمل طور پر انہیں بدظن و دل گرفتگی کا شکار کر دیا تھا۔ اس سے قبل وہ صرف مشعل کی وجہ سے جو اد کی تمام ایکٹیوٹیز نظر انداز کرتے آئے تھے۔ اس کی نااہلیت، نامعقولیت، کالہیت کوکڑوے گھونٹ کی طرح جی کی خاطر جبراً حلق سے اتار گئے تھے، یہ سوچ کر کہ ان کے پاس تمام دولت و جائیداد مشعل کے نام ہے جو شادی کے بعد ان دونوں کے لئے ہوتی اور شاید شادی کے بعد اس کے اندر ذمے داری و احساس پیدا ہو جائے تو وہ محلول انسان بن جائے۔ مگر رائفہ نے ان کے خوابوں و آرزوؤں کا گھڑا، امیدوں کا آئینہ منزل سے بہت پہلے ہی چمکنا چور کر ڈالا تھا، کہن نہیں ناگن ثابت ہوئی تھیں۔ اب انہیں یہ خوف کھائے جارہا تھا کہ اپنی کمینی و بے اعتماد عادت کی بدولت اس راز سے مشعل کو آگاہ نہ کر دیں..... اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو؟ یہاں آکر ان کے مضطرب و مضطرب کی طنائیں چھوٹ جاتی تھیں۔ ان کا بس چلنا تو مشعل کو لے کر یہاں سے ہمیشہ کے لئے بہت دور چلے جاتے جہاں ایسا کوئی خطرہ و بے بس کر دینے والا احساس نہ ہوتا۔ انہیں احساس تھا اگر خدا نخواستہ مشعل اس انکشاف سے آگاہ ہو گئی تو وہ جذبات میں خود کو ختم کر سکتی ہے۔ اس کی جذباتیت و طبیعت سے وہ واقف تھے اور اسی سوچ نے انہیں فرسٹ ہارٹ ایک کا شکار کر دیا تھا اور طبیعت ابھی بھی ان کی تسلی بخش نہیں تھی۔ ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود انہیں ڈسپارچ نہیں کیا گیا تھا۔

”میں پوچھ پوچھ کر تھک چکا ہوں حسن! اب بتاؤ بھی اصل پر اہم کیا ہیں؟ جن پر اہم نے تمہیں اس قدر ڈسٹرب کر رکھا ہے کہ تمہارا بی بی نائل لیول تک نہیں آتا جس سے تمہاری ہارٹ اینڈ برین کنڈیشن پریشز آ رہی ہیں۔ آج کل ہارٹ ویری و پلینس فیل کر رہا ہے اور تمہیں انفارم کر دوں کہ تمہاری یہی کیفیت رہی تو سیکنڈ ہارٹ ایک کی برداشت کرنے کا تم میں حوصلہ و طاقت نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے جو بھی پر اہم ہیں وہ شیئر کرو۔“

اس دن شاہ ویز انہیں کاروباری معاملات کے متعلق آگاہ کر رہا تھا جب ڈاکٹر باری بہت ناراضگی و خفگی سے ان سے مخاطب ہوئے تھے۔

شاہ ویز خاموش ہو گیا جب کہ حسن صاحب مسکرا کر گویا ہوئے۔

”فکر مند مت ہو باری! اتنی جلدی مرنے والا نہیں ہوں۔“

”ہاں اگر تم اپنی پر اہم شیئر کرتے ہو تو۔“ وہ شاہ ویز کے برابر میں بیٹھ کر بولے۔

”پر اہم تو زندگی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ آگاہی بخشے ہیں زندگی کی اہمیت کی۔“

”باتوں میں اڑانے کی کوشش مت کرو، بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟ ورنہ تم جیسا بہادر با حوصلہ آدمی اس طرح بیڈ پراسٹے دن نہیں گزرا سکتا۔“ وہ بھند تھے۔

”سرا! میں اجازت چاہتا ہوں۔“ ان کے پرنسپل معاملات میں اسے اپنی موجودگی غیر مناسب سی لگی تھی۔ وہ فوراً بول اٹھا۔ ویسے بھی وہ مشعل کی غیر موجودگی میں آتا تھا۔

اب اس کی آمد کا نام بھی ہو رہا تھا۔ وہ اس کی آمد سے قبل جانا چاہتا تھا۔

”نہیں بیٹھیں، چائے کا آرڈر دیا ہے۔ آپ ایسے موقعوں سے فوراً غیر حاضر ہونا چاہتے ہیں جب ہم کوئی پرنسپل انیئر زڈ سکس کرنا چاہتے ہوں لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ میں آپ کو اپنی فیملی کا ممبر سمجھتا ہوں اور یہ باری بھی سمجھ گئے ہیں اس لئے انہوں نے اتنی پرنسپل بات آپ کے سامنے پوچھی ہے۔“ حسن صاحب نے اس کا ارادہ بھانپ کر فوراً نرمی سے کہا۔

”آف کورس یگ مین! اس اپورٹنس کا اندازہ تو آپ کو فوراً ہو جانا چاہئے تھا۔ حسن نے کاروبار کی مکمل ذمے داری آپ کو دے رکھی ہے۔ اتنا اطمینان و اعتماد تو انہوں پر ہوتا ہے ورنہ میں جانتا ہوں آپ سے بہت سینئر زفرم میں موجود ہیں۔“ انہوں نے فوراً تسلی کی تو وہ ہکا بھکا کر رہ گیا کہ بعض اوقات تشکر کے لئے الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔

”زندگی با وفا، باعتبار کبھی بھی اور کسی کی بھی نہیں ہوتی باری۔ موت زندگی کا تعاقب پیدائش کے وقت سے ہی شروع کر دیتی ہے۔ یہ ہماری عاقبت نا اندیشی و غفلت ہوتی ہے کہ ہم زندگی کو سدا رہنے والی قوت سمجھتے ہیں اور سوچتے ہیں ابھی تھوڑی مریں گے اور اسی خوش فہمی میں ہم موت کی آغوش میں پھنک جاتے ہیں۔ بے شک موت کے لئے عمر، وقت و تجربہ کوئی شرط نہیں ہے۔ یہ رب کریم کے حکم سے آتی ہے۔“

”یہ..... یہ کیا باتیں شروع کر دی ہیں حسن!“ وہ پریشانی سے کہنے لگے۔

”میں درست کہہ رہا ہوں، میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ موت کا کوئی بھروسہ نہیں کب اور کس عمر میں آجائے مگر جب میری طرح دل کمزور پڑنے لگے تو سمجھو ہم صرف مہمان ہیں یہاں، ایک ایسے بخارے جو کبھی اچانک ہی سب چھوڑ چھاڑ چل پڑیں گے آخرت کے سفر پر۔ یہاں کی تشنہ آرزوئیں، نا آسودہ خواہشیں، بلکنی انگلیں، بسورتی امیدیں ہم پر واویلا کرتی رہ جائیں گی اور مسافر منہ موڑ کر چل پڑے گا۔“ نہ معلوم کن احساسات و جذبات کے تحت ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔

”فکر ہے مجھے اپنی کائنات، اپنی جی، اپنی مشعل کی۔ میرے بعد اس کا کیا ہوگا؟“

اسی وقت ڈاکٹر کو پیغام ملا، کسی ایمرجنسی کیس کے آجانے پر انہیں فوری آپریشن روم میں بلایا گیا تھا۔ وہ معذرت کرتے ہوئے بعد میں بات کرنے کا کہہ کر تیز قدموں سے چلے گئے۔

”مجھے بھی خوف ہے، یہی فکر ہے کہ میری مٹی کا کیا ہوگا؟ یہاں کے تمام رشتے کھوٹ زدہ ہو گئے ہیں، دولت کی چمک دمک نے دلوں سے خالص رشتے اور اپنائیت کی چمک چھین لی ہے۔“

”ایسا نہیں ہے سرا! ہر جگہ رشتوں کا تقدس پامال نہیں ہوا ہے، اپنائیت کی حرمت بھی محفوظ ہے، انسانیت کی معراج بھی معتبر ہے، خالص محبت بھی ناپید نہیں ہوئی ہے۔ صرف کہیں کہیں شگاف ضرور پیدا ہوئے ہیں اور یہ سب وقتی ہوتے ہیں۔“

”اچھا، کیا انسانیت کے ماتے خلوص کی بقا کے لئے یا ایک نیم زندہ شخص کے لئے آپ بڑی قربانی دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟“ یکدم ہی اس کا ہاتھ اپنے ناتواں ہاتھوں میں لے کر انہوں نے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا۔ شاہ ویز نے اس وقت ان کے پڑمردہ چہرے پر عجیب سی چمک دیکھی، سمجھی ہوئی اداس آنکھوں میں یکنخت ہی کئی چراغ روشن ہوئے تھے۔ اپنے ہاتھ پر ان کے ہاتھوں کی لمزش و پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

”کیسی قربانی سر؟“ وہ پوری طرح المرث ہوا تھا۔

”آپ مٹی سے شادی کر لیں۔“ وہ الٹ الٹ کر آہستگی سے اس سے مخاطب ہوئے تھے۔ اس لمحے اس کے ہاتھ پر ان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ وہ مراؤمید آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے تھے جب کہ شاہ ویز کی نگاہوں میں بے یقینی، چہرے پر استعجاب کے رنگ نکھر گئے تھے۔

”سرا! کیا کہہ رہے ہیں آپ..... آپ کو احساس ہے؟“ بہت جلد اس نے خود پر قابو پا لیا تھا اور خامے سنجیدہ لہجے میں استفسار کیا تھا۔

”ہاں..... میں باہوش و حواس آپ سے مخاطب ہوں شاہ ویز! یہ میری خواہش ہی نہیں التجا بھی ہے۔ میں تہہ دل سے مشکور ہوں گا اگر آپ.....“

”لیکن سرا! یہ کس طرح ممکن ہے۔ میرا اسٹینڈرڈ، میرا اسٹینٹس بہت لو لیول ہے اور ایسے تعلقات کی ڈور برابری کی بنیاد پر باندھنا بہتر ہوتا ہے۔ پھر مس مشعل تو انگریز ہیں، شاید آپ بہت زیادہ ڈسٹرب ہیں۔“

”اصل اسٹینڈرڈ انسان کا علی کردار و خاندانی شرافت و سعادت مندی ہوتی ہے بیٹا! دھن دولت کو نہ میں نے کبھی پہلے کوئی اہمیت دی ہے اور نہ اب میرے آگے اس کی کوئی ویلیو ہے۔ ارادے مضبوط اور حوصلے بلند ہوں تو انسان ناممکن کو بھی ممکن بنا ڈالتا ہے اور کھری بات یہ ہے کہ آپ میری توقعات پر کھرے اترے ہو۔ اور ہا سوال مشعل کی انگیج منٹ کا تو جو رشتے دولت کے ڈھیر پر استوار ہوتے ہیں وہ کپے دھماگے سے بھی زیادہ نا پائیدار و کمزور ہوتے ہیں۔ سو یہ تعلق بھی کچھ ایسا ہی بے وقعت و کمزور تھا۔ آپ اپنا ارادہ بتائیں، یہ قربانی دینے کو تیار ہیں؟ دیکھیں بیٹا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ میرے دل کی آواز ہے۔ میرے لاشعور میں مخفی ایک زوردار خواہش و آرزو جو بخدا نہ معلوم کب میرے اندر داخل ہو گئی اور ڈاکٹر باری نے جب یہ کہا تھا آپ کو ہسپتال میں دیکھ کر کہ آپ مٹی کے فیائسی ہیں، میرے ہونے والے داماد نہ معلوم کیوں میں اس کی تردید نہ کر سکا۔ شاید میرے تحت اشعور میں کہیں یہ خواہش دہی ہوئی تھی جو میں خاموش ہو گیا۔ بہر کیف فیصلہ کرنے کا اختیار مکمل طور پر آپ کو ہے۔ یہاں میں آپ کو پریشر آؤ نہیں کروں گا اور نہ ہی کسی قسم کی سوچ اپنی ملازمت کے بارے میں لائیے گا۔ آپ کی ہاں اور ناں دونوں صورت میں آپ کی ملازمت برقرار رہے گی۔ اور نہ ہی میری آرزو کو میرے غلوں کے پیمانے پر پرکھئے گا۔ کیونکہ زبردستی کے بندھن کبھی بھی پائیدار ثابت نہیں ہوتے۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

”سرا! آپ نے لفظ قربانی کیوں استعمال کیا ہے؟“ وہ ہچکچا کر گویا ہوا۔

”مشعل میری جان ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ میرے بے جالاؤ بیار اور آزادی نے اسے بے حد ضدی، ہٹ دھرم اور آزاد خیال بنا ڈالا ہے۔ اس کے ساتھ لائف گزرا واقعی خود کو قربان کر دینے کے مترادف ہے۔ وہ ازحد خود پسند و خود پرست ہو گئی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ اس کا یہی مزاج، ایسا ہی رویہ رہا تو اس کے لئے قطعی بہتر

نہیں ہوگا۔ آپ سے چند ملاقاتیں تو ہوئی ہیں اس کی اور یقیناً آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ کس قدر منہ پھٹ و بے لگام ہو چکی ہے۔ میں اپنی بیٹی کی برائی نہیں کر رہا بلکہ اللہ کو حاضر و ناظر جان کر آپ کو صاف کوئی وسوسہ نہیں ہے وہ سب بتا رہا ہوں جو میرے خیال میں آپ کے علم میں ہونا لازمی ہے تاکہ آپ خوب سوچ سمجھ کر اس رشتے سے وابستہ ہو سکیں نہ ہونا چاہیں کیونکہ کسی بھی معاملے میں، میں نے کبھی کسی سے غلط بیانی نہیں کی۔“

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے تھے۔ گفتگو نے انہیں بڑھال سا کر ڈالا تھا۔ شاہ ویز کے اندر سنائے غول درغول اترتے جا رہے تھے۔ وہ کسی مجتہد کی طرح ساکت تھا۔

”میں باپ ہوں اس کا اور میرے ساتھ رویہ اس کا جاں نثار بیٹی جیسا ہے۔ بہت چاہتی ہے مجھے۔ مگر میرے علاوہ وہ کسی رشتے کو کوئی اہمیت نہیں دے سکتی۔ لیکن شوہرو بیوی میں جو تعلق ہوتا ہے، وہ عزت و احترام، خلوص و محبت کے احساسات کا مظہر ہوتا ہے اور اس کا سارا کریڈٹ مرد کو جاتا ہے کہ وہ بیوی کو کس زاویے پر رکھتا ہے، میری بات سمجھ رہے ہیں نا آپ؟ یعنی مشعل کو ایک بہترین واعلیٰ انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں میں۔ یہاں میں ایک باپ کے طور پر نا کام ہو گیا ہوں مگر شوہر نا کام نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے مشعل ابھی اتنی دوزخیں گئی جو اس کی واپسی کی راہیں مسدود ہو جائیں۔“

”سوری سر! آپ کے جذبات کا میں احترام کرتا ہوں، آپ کی تہ دل سے عزت کرتا ہوں مگر میرا اور آپ کا معاشی تقاضا مجھے قدم اٹھانے نہیں دے گا۔ بصورت دیگر اگر میں کسی طرح یہ کام کر لوں تو بھی میری انا، میرا وقار، میری حمیت مجھے میری نگاہوں میں کبھی سرفروغ نہیں ہونے دے گی اور ایک ٹونا بکھرا، شرمندہ و بے اختیار شخص کبھی بھی قابل احترام و معتبر نہیں ہوتا سر! اپنی جگہ پتھر بھی مضبوط ہوتا ہے اور اپنی جگہ سے ہٹ کر ٹھوکریں اور تڑیل ہی اس کا نصیب ہوتا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے اپنی رائے ظاہر کی تھی۔

”میں نے کہا نا دولت و جائیداد آپ کے درمیان نہیں آئے گی۔“ حسن صاحب نے تیزی سے کہا۔

”اے سائل سرا یہ تو بہت پرانی کہانی ہے۔ ضرورت مند ملازم، دولت مند باس کی بیٹی سے شادی اور پھر ذلت بھری پُراہانت زندگی، جہاں آدمی کی زندگی اس کتے سے بھی بدتر ہو جاتی ہے جو نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔“ اس کے لہجے میں سخت نا کواری و ناپسندیدگی تھی۔ حسن صاحب بہت غور سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

”کیا آپ کسی ایسی لڑکی سے شادی کریں گے جو اپنے جینز میں مفلسی و غربت لائے؟“

”آف کورس..... میں ان فرسودہ چھالت بھری روایات کے خلاف ہوں۔ آپ خود سوچیں کسی باحیثیت شخص کو یہ سوٹ کرتا ہے کہ اس کی زندگی میں شامل ہونے والی لڑکی وہ سب سامان لے کر آئے جو ضروریات زندگی ہوتا ہے۔ کیا یہ کسی باغیرت و باضمیر شخص کے لئے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام نہیں ہے؟ میں ان فضول رسموں کے خلاف ہوں جو خود داری و خود انحصاری کو قتل کر دیتی ہوں۔ فی الحال میری زندگی اور میرے حوالے سے میرے گھر میں آنے والی لڑکی کے پاس جو بھی کچھ ہوگا وہ میری کمائی کا ہوگا۔ چاہے وہ معمولی سا لباس ہو یا عام سا زیور، سب پر میرا نام ہوگا۔“

”ہاں..... مجھے ایسے ہی غیرت مند اور خود ارڈر کے کی تلاش تھی جو بیوی کے ساتھ آنے والی دولت کا خواہش مند نہ ہو بلکہ اپنے زور بازو اور محنت پر یقین رکھتا ہو۔ تم ہیرا ہو شاہ ویز! ایک نارو یا ب ہیرا، میں تمہیں کسی طرح بھی کھونے نہیں دوں گا۔ میری مشعل کو راہ راست پر تم ہی لاسکتے ہو۔ تمہیں حاصل کرنے کے لئے مجھے اپنے وقار و حیثیت سے گرا پڑنے کا۔ مجھے منظور ہے۔ تمہیں پانے کے لئے میں تمہارے در پر بھیک مانگنے سے بھی نہ ہچکچاؤں گا لیکن تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔“ وہ خود سے مخاطب تھے۔ ایک نیا عزم، نیا جوش، نیا ولولہ ان کے اندر توانائی بن کر اتر رہا تھا۔

”چند دن بعد خوب سوچ سمجھ کر مجھے جواب دینا۔ اور ہاں اگر آپ چاہیں گے تو دولت و جائیداد کی دیوار ڈھائی بھی جاسکتی ہے، وچہ صرف یہی ہے کہ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا۔“ انہوں نے بات کرتے ہوئے خلوص سے کہا۔ وہ شکر سا ہاتھ ملا کر چلا گیا۔



آج ایک ہفتے سے زائد ہو چکا تھا۔ وہ آفس پابندی سے جا رہا تھا مگر حسن صاحب کے پاس جانے کی ہمت و حوصلہ نہ تھا۔ حالانکہ تین روز قبل وہ ڈسپارچ ہو کر گھر چائے تھے مگر کمزوری اور طبیعت مکمل طور پر ٹھیک نہ ہونے کے باعث وہ آفس نہیں آرہے تھے۔ آفس کے ضروری کام کے لئے وہ ان کے سیکرٹری کو استعمال کر رہا تھا۔

زندگی میں پہلی بار وہ اس ٹینشن کا شکار ہوا تھا جس سے وہ خلاصی نہ پا رہا تھا۔ مشعل جیسی بدتمیز، مغرور، خود سر اور از حد آزاد خیال لڑکی کبھی بھی اس کی آئیڈیل نہ رہی تھی۔ اس کے لباس، اس کے انداز، اس کی طرز گفتگو کچھ بھی تو اس کی طبیعت و مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی اور نہ ہی وہ اس کے ذریعے دولت مند بننے کا آرزو مند تھا۔ لیکن اس دن سے آج تک اس کی نگاہوں میں حسن صاحب کا آس بھرا لہجہ، پُر امید نگاہیں، التجائیہ انداز اور ہر طریقے سے اس کی منشاء کو مد نظر رکھ کر پیشکش کرنا اسے مجھے میں ڈالے ہوئے تھا۔ اس کا دل و دماغ پوری شدت سے انکاری تھا۔ کسی طرح بھی مشعل کو اپنانے پر تیار نہ تھا۔ پہلی مرتبہ اس نے بے جی سے یہ بات چھپائی تھی۔ جانتا تھا وہ ہر طرح سے اس کی پسند و فیصلے کو ہی ترجیح دیں گی۔

آج آفس میں حسن صاحب کا پیغام آیا تھا کہ وہ اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر کام میں لگا رہا تھا اور چھٹی میں سب سے پہلے باہر نکل گیا تھا اور اب گھر آکر وہ پریشان تھا۔ اس کا ضمیر اسے سخت ملامت کر رہا تھا کہ اسے اس طرح اس شریف و مخلص شخص کے صبر کا امتحان نہ لینا چاہئے اور اپنا فیصلہ سنا دینا چاہئے کہ وہ ان کی بیٹی سے شادی کرنے کی قربانی دینے کو ہرگز تیار نہیں ہے۔ مگر یہاں آکر حسن صاحب کی امیدوں و خواہشوں کے خیال سے وہ ہارنے لگتا تھا۔ اس کی حساسیت و نرم دلی اسے بے سکون کر ڈالتی اور ذہن میں مسلسل سوالات احساسات حملہ آور ہو جاتے اور وہ مضطرب ہو اٹھتا۔ دل کہتا بھلا ایک شخص کی آرزو کی خاطر وہ اپنی زندگی داؤ پر کیوں لگا دے؟ ضمیر کا راجھا اصل زندگی وہی ہے جو دوسروں کو خوشیاں دینے کے لئے وقف ہو۔

دامغ چنچ اٹھتا کہ نہیں، زندگی ایک بار ملتی ہے اسے کسی دوسرے کی خود غرضی کی خاطر رائیگاں نہیں کرنا چاہئے صرف اپنی سرتوں کو ترجیح دینی چاہئے۔

احساسات شور مچانے لگتے کہ وہ کس طرح حسن صاحب جیسے اچھے و پُر خلوص شخص کو نہ کہہ سکتا ہے۔ ان کے بہت احسانات ہیں اس پر۔

”یہ زرینہ کو بھی پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے، جب دھن سوار ہوگی تو ہر روز پکر پر پکر لگاتی ہے۔ اب ایک ہفتہ گزر بھی گیا اور اسے کچھ ہوش ہی نہیں کہ یہاں آنا بھی ہے یا نہیں۔ ہر روز انتظار کرتی ہوں کہ آج آئے، شاید آجائے مگر وہ تو لگتا ہے یہاں کا راستہ ہی بھول گئی ہے، سوچ رہی ہوں میں خود ہی چلی جاؤں۔ دراصل مجھے انتظار ہے، اس سے مل کر.....“

انہیں محسوس ہوا کہ وہ اتنی دیر سے بولے جا رہی ہیں اور شاہ ویز کوئی جواب نہیں دے رہا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو اسے دونوں ہاتھوں میں سر تھا اسے آنکھیں بند کئے کر سی پر بیٹھا پایا۔

”خیر بیت تو ہے نا بیٹا..... کیوں اس طرح بیٹھے ہو؟“ انہوں نے گھبرا کر اس کا شانہ ہلا کر کہا۔

”اوہ، بے جی..... کوئی بات نہیں۔“ لمبے بھر کو غنودگی میں ڈوب گیا تھا وہ۔

”نہیں..... میں نہیں مان سکتی۔ ضرور کوئی بات ہے..... کیا اب ہمارے درمیان ایسا بھی ہوگا کہ تم اپنی پریشانی مجھ سے چھپاؤ گے؟“ ان کا لہجہ آزرہ تھا۔

”ایسا کبھی ممکن نہیں ہے بے جی۔ آپ پریشان مت ہوں۔“

”پھر بتاؤ کیا بات ہے؟ میں کچھ دنوں سے محسوس تو کر رہی ہوں کہ تم اچھے اچھے، پریشان سے ہو مگر میں نے سوچا آفس کے کام کی زیادتی کی وجہ سے ایسا ہے۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کوئی اہم بات ہے، بہت زیادہ اہم و ضروری جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔“ ان کی متنا و شفقت نے اسے مجبور کر ڈالا سب کچھ بتانے کو۔ پھر اس نے ان سے کچھ نہیں چھپایا، سب بتا ڈالا اور مشورہ بھی مانگا کہ وہ کیا کرے؟

”ہمیں ان کے خلوص اور نیت پر شبہ نہیں کرنا چاہئے بیٹا، انہوں نے جس طرح سے قدم قدم پر ہمیں سہارا دیا ہے یہ ان کی نیک فطرت و دریا دلی کا ثبوت ہے اور پھر اب بھی فیصلہ انہوں نے تمہاری مرضی پر چھوڑ کر اپنی اعلیٰ ظرفی دکھائی ہے اور ان کی اس سے زیادہ سچائی کیا ہوگی کہ انہوں نے اپنی بیٹی کی عادت و مزاج کے بارے میں صاف کوئی سے بتا دیا۔ میں کہتی ہوں ہاں کہہ دو۔“

اس کی بات اطمینان سے سننے کے بعد انہوں نے مشورہ دیا تھا۔

”کیا؟..... بے جی کیا کہہ رہی ہیں آپ..... وہ لڑکی مجھے قطعاً پسند نہیں۔“ وہ ان کے دو ٹوک لہجے پر حیرانگی سے کھڑا ہو کر بولا۔

”شادی کے بعد اس کو اپنی پسند کے مطابق ڈھال لینے میں تو مرداگی ہے۔“

”بے جی..... بے جی! وہ لڑکی ہے، کوئی موم کی گرڈیا نہیں ہے۔ نہ معلوم کیا سمجھ رہی ہیں آپ اسے..... وہ اس قدر بدتمیز، زبان دراز اور گھمنڈی لڑکی ہے جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ زرینہ خالہ کی بہنو تو تھوڑی غصے کی تیز ہے لیکن وہ مشعل تمیز و آداب سے واسطہ ہی نہیں رکھتی اور خود پرست اتنی ہے کہ اپنے علاوہ اسے دوسرے نظر نہیں آتا۔“

”کوئی بات نہیں..... تمہاری صحبت میں رہے گی تو مکمل انسان بن جائے گی۔ نہ میں زرینہ ہوں اور نہ تم اصغر، کس رشتے کو کس طرح نبھایا جاتا ہے ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ شکر ہے میرے مولا کا، جو اس نے مجھے گھر بیٹھے بہو دلا دی۔ ورنہ نہ معلوم مجھے کیا کیا جتن کرنے پڑتے خیر وہ لڑکی بہت خوب صورت ہے، چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔“

”جی، سورج ہے وہ، جو سوائیز پر ہوتا ہے..... ہل بھر میں ہر شے کو خاستر کر ڈالنے والا۔ میں تو سوچ رہا تھا آپ مجھے کوئی معقول و خوب صورت مشورہ دیں گی اس بلا سے جان چھڑانے کا مگر آپ نے فیصلہ صا در کر دیا۔ کچھ تو غور کریں بے جی۔ وہ بڑے گھر کی بگڑی ہوئی لڑکی ہے جو اپنے سے کمزوروں کو جا نوروں سے بھی بدتر سمجھتی ہے۔“

”جب وہ ہمارے پاس آئے گی تو ہمارے جیسی ہی ہوگی۔ ہم اقرار کی بھی شرط رکھیں گے کہ لڑکی خالی ہاتھ ہمارے گھر آئے گی اور اس کے باپ کی دولت و جائیداد سے ہمارا یا اس کا کبھی بھی کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔“ بے جی کا جوش و خروش اس کا دل جلا رہا تھا۔

”میں کل ہی جاؤں گی زرینہ کو ساتھ لے کر ان کے ہاں تمہارے رشتے کی بات کرنے، بے فکر ہو۔ میں خود ہر بات سنجال لوں گی۔“ بہت سنجیدہ و بردبار سی بے جی اس وقت بچوں کی طرح خوش و فرم و پر جوش نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے سختی سے اس کے ہر اعتراض، جواز اور انکار کو مسترد کر دیا تھا۔ وہ بے بس سا ان کو دیکھتا رہ گیا کہ انہیں بتا

کر اپنے گلے پر چھری اس نے خود پھیری تھی۔ اب بچاؤ کی تدبیر ہی فضول تھی۔

دوسرے دن زرینہ کو بلا کر وہ باقاعدہ شاہ وزیر کا پر پوزل لے کر حسن صاحب کے پاس گئی تھیں جہاں ان کی خصوصی طور پر مہمان نوازی کی گئی تھی۔ حسن صاحب تو دلی مراد بر آنے پر اس قدر خوش تھے کہ انہوں نے روایتی طور پر کچھ وقت مانگنے کے بجائے فوراً رشتہ منظور کر لیا تھا۔ بے جی کے ساتھ زرینہ بھی بہت خوش لوٹی تھیں۔ آفس سے واپسی پر شاہ وزیر کو خوب ستا کر، چھیڑ کر رات کا کھانا کھا کر گھر گئی تھیں۔

”خوش نہیں ہو؟“ زرینہ کے جانے کے بعد وہ خاموش بیٹھے شاہ وزیر سے مخاطب ہوئیں۔

”اب یہ پوچھنا کوئی معنی نہیں رکھتا بے جی۔“

”دیکھو شاہ وزیر! اچھی چیزوں کے سبب طلب گار ہوتے ہیں۔ یہ عام رجحان ہے مگر انفرادیت و خاصیت یہ ہے جب آپ اپنی اچھائی سے برائی کو بھی اچھائی میں تبدیل کر دیں۔“

”یہ سب کرنے کے لئے ایک صبر آزماء صدر کار ہوتا ہے۔ جو ہمارے پاس کہاں۔“ اس نے بنجیدگی سے کہا۔

اسی دم تیل بجی تھی۔ وہ باہر گیا تو حسن صاحب وہاں موجود تھے۔ اندر دگی، پریشانی، پشیمانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ انہوں نے ڈرائیور کو واپس جانے کو کہا اور خود اس کے ہمراہ لیونگ روم میں داخل ہوئے جہاں بے جی موجود تھیں۔

”بہن جی! میں معذرت چاہتا ہوں۔“

”جی بھائی صاحب؟“ بے جی بوکھلا کر گویا ہوئیں۔

”آرام کے نام آپ کو بے آرام کرنے پر معذرت خواہ ہوں۔“

”اوہ، کوئی بات نہیں..... آپ بیٹھیں۔ ہم دیر سے سونے کے عادی ہیں۔“ آتے ہی بلا تمہید ان کی معذرت پر ان کے دل میں کئی صو سے آئے تھے۔

”دراصل مجھے آپ سے اور شاہ وزیر سے چند ایسی باتیں کرنی ہیں جن کو ہمارے سو اور کوئی نہ سن سکے۔ اس لئے میں آپ کے یہاں حاضر ہوا ہوں۔“ وہ صوفے پر آرام سے بیٹھتے ہوئے گویا ہوئے تھے۔

”ضرور بھائی صاحب! آپ ہم پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ آپ کا بھر وسہ سدا قائم رہے گا۔“ بے جی دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں بولیں جب کہ شاہ وزیر بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ہر انداز سے لاطعلقی و بے زاری عیاں تھی۔

کمرے میں مکمل سکوت تھا، صرف وال کلاک کی ٹک ٹک کی آواز معمولی سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ بے جی اور شاہ وزیر خاموش بیٹھے تھے۔ حسن صاحب گنگو کے آغاز کے لئے لفظوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ان کے پُر وقار چہرے پر ملامت تھی۔ ذہین آنکھیں دماغی اسکرین پر ماضی کو دیکھ رہی تھیں۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد وہ گویا ہوئے۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بات کہاں سے شروع کروں کہ ماضی پرستوں کے لئے ہر بات، ہر یاد بھی اہم و عزیز ہوتی ہے اور ان کو دہرانے میں جواز و طمانیت ہوتی ہے وہ بیان سے قاصر ہے۔ میں کوشش کروں گا مختصر طور پر آپ کو ہر اس حقیقت سے آگاہ کروں جو بعد میں کسی بھی خفت یا بدگمانی کا باعث نہ بنے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ شاہ وزیر اس پر پوزل پر بالکل ناخوش ہیں۔ یہ ان کی سعادت مندی و از حد فرماں برداری ہے جو یہ زندگی کا اتنا اہم فیصلہ، بہن جی آپ کی وجہ سے یا میرے لحاظ میں جبراً قبول کر بیٹھے ہیں۔“

ان کی صاف کوئی اور ذہانت نے بے جی کو نروس کر دیا تھا جب کہ شاہ وزیر پہلو بدل کر رہ گیا۔

”میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ زبردستی کے بندھن کبھی پائیدار نہیں ہوتے اور ابھی سوچنے سمجھنے کا وقت موجود ہے۔ آپ بلا جھجک فیصلہ کریں۔“

”بھائی صاحب! ہمارے پاس صرف جو دولت ہے وہ زبان کی پاسداری ہے جو زبان اقرار کر چکی ہے وہ انکار نہیں کر سکتی۔ آپ بے فکر ہو جائیں، شاہ وزیر سے آپ کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ بے جی نے تذبذب کا شکار دیکھ کر سمانیت سے سمجھایا۔

”میں کوئی جدی پستی ریکس نہیں ہوں، میرا بچپن اور نوجوانی کا عرصہ سخت غربت و عسرت میں گزرا ہے، وقت کے بہت گرم و سرد دیکھے ہیں، فاقوں و مجبوریوں سے بھی شناسائی رہی۔ میرے والد بہت عبادت گزار و سختی آدمی تھے، والدہ بہت جلد ہمارا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ والد نے ہی ماں کے انتقال کے بعد ان کی ذمے داری بھی نبھائی، کٹھن حالات اور بے حد غربت کے باوجود ہم بہن بھائی کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور یہ ان کی محنتوں و دعاؤں کا ہی ثمر ہے کہ آج میں اپنے ملک کے بڑے بزنس میز میں شمار ہوتا ہوں..... شاہ وزیر! مجھے دیکھ کر آپ کو کبھی یہ احساس ہوا کہ میرا اور آپ کا وقت کبھی ایک سا رہا ہے؟“ وہ مسکرا کر اس سے مخاطب ہوئے۔

”نہیں سر! یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے جو آپ اپنا آپ ظاہر کر رہے ہیں۔“ شاہ وزیر کو اخلا تا ہونٹ کھولنے پڑے تھے۔

”طویل صبر آزماء صے کے بعد میں نے کاروبار ایک چھوٹے معمولی کارخانے سے اشارٹ کیا تھا اور اس دو تھک کمروں کے کارخانے کو چلانے کے لئے جس طرح میں نے بینک سے لون حاصل کیا وہ جدوجہد و خوری میں آج تک فراموش نہیں کر سکا ہوں، میں پُر اعتماد تھا، پُر امید تھا، مجھے لگن تھی، جنون تھا اپنا آپ بدلنے کا، اپنے حالات بدلنے کا، اپنی تقدیر بدلنے کا کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی یہی فرماتا ہے۔ بس میں نے یہی بات ذہن نشین کر لی تھی اور اکثر دہرا کر خود کو حوصلہ دیتا رہتا تھا۔ لگن سچی ہو، حوصلے چٹان ہوں تو انسان ہر شے کو حاصل کر سکتا ہے۔ غیب سے امداد ہوتی ہے آگے بڑھنے والوں کی۔ سو میں کٹھنایوں کو عبور کر کے آگے بڑھتا چلا گیا اور کامیابیاں میری راہوں میں سرنگوں ہوتی گئیں۔ میری جدوجہد، اعتماد و کٹھن محنت نے مجھے غربت و افلاس کی پستی سے نکال کر دولت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ میرے حوصلوں نے میری کامیابی کی پلٹ دی تھی۔ والد صاحب شکرو قناعت کے عادی تھے۔ وہ بھی میری خوش حالی دیکھنے سے قبل دنیا چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اپنی بہن رانہ کی شادی میں وہ تمام ارمان نکالے جو برسوں سے میرے دل میں تھے۔ رانہ کی شادی کے دو سال بعد میں نے بھی شادی کر لی۔ رضوانہ کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ ایک فنکشن میں، میں نے اسے دیکھا تھا۔ رضوانہ میری سوچ کے مطابق بہترین بیوی ثابت ہوئی تھی۔ میری زندگی میں بہار رہی بہار ہو چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف آسودگی و طمانیت، خوشبو کی طرح بکھری ہوئی تھی جس سے میرا جیون ہر سو مہکتا تھا۔“

ان لمحوں میں وہ مکمل طور پر ماضی کی حسین یادوں کی گرفت میں خود کو فراموش کر چکے تھے۔

”جب مجھے رضوانہ کے پریگنٹ ہونے کی خبر ملی تو میں بہت خوش تھا اور رضوانہ بھی۔ اسے لڑکیوں سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اور جب رپورٹس کے ذریعے اسے قبل از وقت معلوم ہوا کہ اس کی کوکھ میں پرورش پانے والی بیٹی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ میں بھی سرور تھا۔ ہم نے بچی کے لئے بے تحاشا شاپنگ کی اور ہم نے اپنی آنے والی بیٹی کا نام مشعل پسند کیا۔ رضوانہ کو ڈیوری سے دو ماہ قبل میں نیویارک لے گیا اور ایک رات اس کی حالت اچانک خراب ہو گئی۔ نہ معلوم اس کے کیس میں ایسی کیا پیچیدگی ہو گئی تھی کہ ایک ہفتے شدید تکلیف میں گزارنے کے بعد وہ ڈیوری سے قبل ہی مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی..... اس کے جانے کے بعد کئی ہفتے مجھے اس کی جدائی کا یقین نہیں آیا۔ میں سچ مچ دکھ اور صدمے سے پاگل ہو گیا تھا۔ میرا دکھ دوہرا تھا۔ رضوانہ خود گئی تو ساتھ میری امانت کو بھی لے گئی تھی۔ شاید میری بیٹی کو وہ جنم دیتی تو اس کے سہارے ہی زندگی گزارنا سہل ہو جاتا، ایک سہارا مل جاتا۔ میں اکثر یہی سوچا کرتا۔ تین ماہ بعد مجھے رانہ اور احمد کے اصرار پر پاکستان آنا پڑا۔ واپسی کا سفر آنسوؤں اور یادوں کے سنگ طے ہوا تھا۔ نگاہوں میں بار بار وہ منظر تھے جب میں رضوانہ کو ساتھ لے کر نیویارک جا رہا تھا۔ کتنا خوش تھا میں..... سر تین ہمسفر تھیں۔ اور اب ہمسفر ہی ساتھ چھوڑ گئی تھی، تنہی دست، تنہی دامن ہو گیا تھا میں۔ دکھوں نے قید کر لیا تھا۔ ایئر پورٹ سے ٹیکسی میں بیٹھا میں سوچ رہا تھا کچھ ماہ قبل ان راستوں سے گزرتے ہوئے رضوانہ بھی میرے ساتھ تھی۔ آج میں تنہا سوچ رہا ہوں، انسان فانی ہو چکے ہیں، جگہوں کو بھلا ہے۔ کسی نکلنے والے جلوس کی وجہ سے راستے ہلاک تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے متبادل راستوں سے ٹیکسی نکالنی شروع کی تھی۔ میں خالی خالی نگاہوں سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ معامیری نگاہوں نے ایک پریشان کن منظر دیکھا۔ سامنے پھرے کا ڈھیر تھا اور اس کے کنارے گلابی کپڑے میں لپٹا یقیناً وہ انسانی وجود تھا..... کپڑا مسلسل حرکت میں تھا۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی تھی لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آیا جو میں نے دیکھا ہے وہ حقیقت ہے یا نگاہوں کا دھوکا؟ یا میرے ذہن کا تصور جہاں میں اپنی ان دیکھی بیٹی کو اکثر کھلکھلاتے دیکھتا ہوں۔ گاڑی خاصی آگے نکل آئی تھی لیکن میرا ذہن وہیں انک گیا تھا۔ عجیب بے چینی و اضطراب نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ایک کشش تھی، ایک اضطراب، ایک وابستگی جیسے کوئی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے، پکار رہا ہے، بلا رہا ہے۔ میں بے خود سا ہوا تھا، میں نے ڈرائیور سے ٹیکسی واپس اسی راستے پر لے جانے کو کہا اور کچھ دیر بعد میں کوڑے کے ڈھیر سے اس گلابی کپڑے میں لپٹی بچی کو کوکھ میں اٹھا رہا تھا جو بھوک کی شدت سے ہاتھ پاؤں چلا چلا کر رونے لگی تھی۔ حیرت انگیز طور پر میرے اندر کی بے سکونی و اضطراب کو سکون ملنے لگا۔ میں نے بے اختیار اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا اور میرے سلگتے وجود میں ٹھنڈک پھیلنے لگی۔ ٹیکسی ڈرائیور جو بہت حیرانی سے میری حرکات دیکھ رہا تھا کہنے لگا۔

”صاحب جی! کیا کر رہے ہیں آپ؟ کوڑے پر پڑے ملنے والے بچے کوڑا ہی ہوتے ہیں صاحب تمہی تو ان کو اس جگہ پھینک دیا جاتا ہے۔“ اس کے لہجے میں کراہیت تھی۔

”ایسے نہیں کہو یا را اگر ایسی بات ہے بھی تو اس معصوم کا اس میں کیا تصور۔ پھر ایک گناہ کے بعد کتنا بڑا گناہ یہ ہے اللہ کے بتائے بندوں کو ایسی غلاظت پر پھینکنا۔ تو جن

انسانیت ہے یہ۔ بھلا اس میں ایسے معصوموں کا کیا تصور؟“

”چھوڑیں صاحب! اسے آپ کہیں پھینکیں اور چلیں۔“

”لیکن اس کا کیا ہوگا..... میں اسے کچرے پر نہیں پھینکوں گا۔“ مجھے قطعی کوار نہیں تھا۔

”جب اس کے کچھ ہوتوں نے اسے یہاں پھینکا ہے تو آپ بھی پھینک دیں..... ابھی تھوڑی دیر میں کتے آکر صفایا کر دیں گے یا پھر کسی زہریلے کیڑے کا شکار ہو کر مر جائے گی۔“

”ایسی بات منہ سے نکالتے ہوئے اللہ کے قہر سے ڈرو۔ کیا انسانوں پر اتنا برا وقت آگیا ہے کہ کتوں اور کیڑوں کی خوراک بنیں؟“ مجھے شدید غصہ آگیا تھا۔

”صاحب! آپ جلدی کریں..... آپ سے قسم اللہ ہوئی ہے۔ ابھی اور سواری بھی پکڑنی ہے۔“

”چلو.....“ میں بچی کو لے کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے حیرت سے مجھے دیکھا مگر پھر کچھ نہیں کہا۔ رانہ مجھے بغیر اطلاع کے آتے دیکھ کر پہلے حیران ہوئی پھر میرے

سینے سے لگ کر رونے لگی۔ رضوانہ کے اور اس کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اس کی موت سے اسے بھی بہت صدمہ پہنچا تھا۔ اس کے آنسو رک نہیں رہے تھے اور مجھے فکر اس بچی کی تھی جو روتے روتے سو گئی تھی اور میں اسے دانستہ بیڈ پر لٹا آیا تھا۔

”رائعہ! ملازمہ سے کہو بے بی شب میں باتھ کے لئے پانی تیار کرے۔ تم اتنے فیڈر تیار کرو میں وارڈروب سے بے بی سوٹ نکال کر لا رہا ہوں۔ وہ بہت بھوکی ہے۔ مگر پہلے باتھ دینا لازمی ہے اسے تاکہ جراثیم سے محفوظ ہووہ۔“ میری بات سن کر کچھ تعجب اور کچھ خوف سے وہ میری شکل دیکھنے لگی پھر اور بھی تیزی سے رونے لگی۔

”میں پاگل نہیں ہوا ہوں رائعہ۔“

”پھر کس بچی کی بات کر رہے ہیں بھائی جان؟ مشعل کلو اللہ نے دنیا میں آنے سے قبل ہی چھین لیا۔“ رائعہ کی بات نے مجھے نئی راہ دکھائی۔ مشعل جو روشن ہونے سے قبل ہی تاریک ہو گئی تھی میرے اندر نئی زندگی بن کر جگمگا اٹھی اور میں بے اختیار کہہ اٹھا۔

”نہیں رائعہ! اللہ بے رحم نہیں ہے..... اگر ہم سے کچھ لیتا ہے تو دیتا بھی ہے۔ اللہ نے ایک مشعل لے کر دوسری لوٹا دی ہے۔ آؤ..... آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔“

”بھائی جان! آپ تو کہہ رہے تھے.....“

”ہاں..... میں نے صحیح کہا تھا مگر یہ بھی درست ہے کہ یہ مشعل ہے..... میری مشعل۔“ میں نے اس بچی کو اٹھا کر والہانہ انداز میں چوما اور رائعہ کو اصل صورت حال بتا دی۔

”کیا مطلب بھائی صاحب! یہ آپ کی بیٹی نہیں ہے؟“ ان کے خاموش ہوتے ہی بے جی بولیں۔

”جی بہن جی! اس حقیقت سے آپ کو باخبر کرنے کے لئے مجھے آپ ہی کا گھر منتخب کرنا پڑا کہ میں نے آج تک یہ حقیقت مشعل سے پوشیدہ رکھی ہے اور تا حیات مخفی رکھوں گا۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی سہی مگر مجھے وہ بیٹی سے بڑھ کر عزیز ہے۔ بہت سوچ کر میں نے آپ کو اس راز میں شامل کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرا اعتماد زائل نہیں ہوگا۔ اب اصل فیصلے کی گھڑی ہے۔ میں آپ کو وقت دوں گا لیکن زیادہ نہیں کیونکہ مجھے ایک ہفتے بعد برنس کے سلسلے میں باہر جانا ہے کیونکہ برنس میری کچھ عرصے سے ڈاؤن جا رہی ہے۔“

میں آپ کو یہ بتا دوں کہ مشعل کی نسبت میں نے اپنی بہن اور بہنوئی کے اصرار پر بچپن میں ہی اپنے بھانجے جو جو یعنی جواد سے طے کر دی تھی اور اس حوالے سے میں نے ذیل معاملات نبھائے ہیں مگر اب جب کہ میرا برنس وقت کی نزاکت کا شکار ہے، میں ان کی فرمائشوں کی ادائیگی کے قابل نہیں ہوں تو میری بہن نے یہ کہہ کر نسبت توڑ دی کہ مشعل جیسی لڑکی کو وہ بہن نہیں بنا سکتیں۔ میرا آپ کو بھی یہی مشورہ ہے کہ آپ بھی خوب سوچ سمجھ لیں تاکہ بعد میں کسی بچھتاوے کی گنجائش نہ نکلے۔“

اپنی بات کے اختتام پر ان کے چہرے پر حزن و ملال تھا۔ بے جی نے شاہوین کی جانب دیکھا تھا جو ہونٹ پیچھے آنکھیں جھکائے گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

”فیصلہ جو ہے وہی رہے گا سر۔“ اس نے کہا تو اس بار اس کے لہجے میں طمانیت و آسودگی تھی۔ شاید وہ مشعل کے اسٹیٹس کے برتری کے احساس سے نکل آیا تھا۔

”ہاں بھائی صاحب، آپ سے بلند و عظیم آدمی کے سامنے بھلا ہماری حیثیت ہی کیا ہے۔ لوگ صرف اچھائی و عظمت کا دعویٰ کرتے ہیں مگر آپ نے عمل کر کے دکھایا۔“ وہ عقیدت بھرے لہجے میں کوہا ہوئیں تو حسن صاحب ممنونیت سے مسکرائے تھے۔

”سر! شادی بہت سادگی سے ہوگی اور دوسری بات آپ چیز کے نام پر ایک روپیہ بھی نہیں دیں گے۔“ اس نے مضبوط مگر مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

”میرے پاس جو بھی ہے سب میری بیٹی کا ہی ہے۔ پھر.....“

”پلیز سر! میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا یہ میری حمیت اور وقار کے منافی ہے۔“

”اوکے، اس موضوع پر ہم پھر کبھی بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال وہی ہوگا جو آپ چاہتے ہیں۔“ ساتھ ہی وہ اجازت لے کر اٹھ گئے تھے۔



کلب سے واپسی پر جو جو کلب کے پارکنگ لائٹ میں مل گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بھاگ کر اس کے قریب آکر کوہا ہوا۔

”میری بات سنو مٹی پلیز!“

”مجھے تمہاری کوئی بکواس نہیں سننی..... گیٹ لاسٹ۔“ اسے دیکھتے ہی غصے و خنجر سے اس کی رگیں تن گئی تھیں۔ چہرہ انگارہ بن گیا تھا۔

”پلیز..... پلیز مٹی، آئی ایم ویری اپ سیٹ۔“

”مائی فٹ.....“ وہ کندھے اچکا کر لاپرواہی سے کوہا ہوئی۔

”مجھے معاف کر دو..... میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔“ جو جو رو پڑا تھا۔

”کب مرو گے؟ دو ہفتے طے بغیر بھی زندہ ہو۔“ وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔

”تم..... تمہارا بیوی روید ہاتھ میں زندہ نہیں رہاؤں گا۔ پلیز، فارگاڈ سیک، ناراضگی بھلاؤ الو۔ چلو ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں ورنہ ماما اور انکل ہمیں جدا کر ڈالیں گے۔“ وہ اس کے قریب جا کر رازدارانہ لہجے میں بولا تو مشعل بری طرح کھول اٹھی۔ وہ فطرتاً آزاد خیال و بے باک ضرورتاً مگر اپنے باپ کی عزت کا خیال اسے ہر دم رہتا تھا۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب اس نے بھی دیکھا تھا مگر باپ کی مکمل رضا مندی اور سسرال کی محبت و آؤ بھگت کے ساتھ۔ ایسی کورٹ میرج کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی جس میں نہ صرف اس کے باپ بلکہ اس کا بھی کردار مندرجہ ہوتا۔ اب تو میرج ہی ممکن نہ تھی۔

”تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تم کو ابھی بھی لفٹ دوں گی؟“

”کیونکہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو..... کرتی ہونا؟“

”ہرگز نہیں۔“

”نو، امپا سبل ہم مجھ سے محبت کرتی ہو۔“ وہ مصر تھا۔

”میں نے کہا نا دفع ہو جاؤ..... مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ اور آئندہ میرے راستے میں آنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہیں شوٹ کر دوں گی۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”ایسے نہ کہو مٹی، میں اپ سیٹ ہوں..... ہر وقت تمہیں سوچتا ہوں مگر ماما.....“

”ہاں، ہاں..... کہو ماما سے ڈر لگتا ہے، ان کی مرضی کے بغیر تم کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتے۔ ہونہ، میں ایسے آدمی پر تھوکتا بھی پسند نہیں کرتی جس میں اپنے رائٹ کے لئے اسٹینڈ لینے کی ہمت بھی نہ ہو۔ گیٹ لاسٹ..... گیٹ لاسٹ۔“ وہ اسے اپنے آگے سے دھکا دے کر کار کی طرف بڑھ گئی۔

”میں کہتی تھی نا چھوڑ دو اس بد ذات لڑکی کا پیچھا..... مگر میں تیرے آگے کوئی حیثیت ہی کہاں رکھتی ہوں۔ اب خوش ہو گیا ہوگا اپنی بے عزتی کروا کر۔“

کاروں کی قطار کے پیچھے سے رائعہ بیگم نمودار ہوئیں اور خشک لگیں گھوٹوں سے مشعل کو گھورتی ہوئی جو جو سے غصے میں مخاطب ہوئیں۔

”اوہ..... تو آپ کی بیڈ پلومیسی تھی۔“ اس نے کار سے ٹپک لگا کر ان سے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”میں تمہارے منہ لگانا پسند نہیں کرتی۔ اس کا پیچھا کر کے یہاں پہنچی ہوں۔“

”ماما..... ماما! آپ اتنی بیڈومن نہ بنیں۔“ جو جو نے منمننا کر احتجاج کیا۔

”چپ کر..... کیوں اسی لڑکی کے پیچھے خوار ہو رہا ہے؟ میرے بیٹے کو لاکھوں لڑکیاں مل جائیں گی۔ معلوم تو بھائی صاحب کو ہوگا جب اس پہاڑ کو چھاتی پر ساری عمر رکھیں گے۔ کون پوچھے گا اس لڑکی کو..... یہ تو میری ہی ہمت تھی جو اس عذاب کو اٹھانے چلی تھی۔ اگر بروقت عقل نہ آتی تو ساری عمر سر پکڑ کر روتے ہوئے گزر جاتی۔ دیکھوں گی نا اب کوئی کیسے اس لڑکی کا ہاتھ تھامتا ہے۔“ وہ تیز تیز کہہ کر جو جو کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئی تھیں۔

وہ بہت مضبوط سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی مگر اندر شرارے دوڑ رہے تھے۔ آنکھوں میں شعلے رقصاں تھیں۔ اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں میں لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ بے حد رش ڈرائیونگ کے باعث کئی جگہ ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔ پورٹیکو میں کار روک کر دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند کر کے آگے بڑھی تھی۔

حسن صاحب لاؤنچ میں اس سے بات کرنے کے لئے پچھلے دو گھنٹوں سے محو انتظار تھے۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر شفقت و ملائمت سے کوہا ہوئے۔

”ہیلو مائی سویٹ ڈائز۔“

”پاپا! کیا اب کوئی بھی مجھ سے شادی نہیں کرے گا؟“ وہ بلا تھجک بات کرنے کی عادی تھی اور اب تو ویسے بھی وہ رائعہ کی طنز پر گنگو اور خفارت سے بھر پور لہجے پر کھول رہی تھی۔

”جی..... کس نے کہا یہ؟“ انہوں نے اپنی حیرانی پر فوری قابو پا کر استفسار کیا۔

”وہی میڈوومن رائعہ احمد نے۔“ اس نے کچھ دیر قبل گزرنے والا واقعہ سنا کر کہا۔

”کیا ہو گیا ہے رائعہ کو..... کیا بچکانہ بی ہو کر رہی ہے؟“ پریشان لہجے میں جیسے وہ خود سے مخاطب تھے۔

”بچکانہ نہیں، انتقامانہ۔ بری تو وہ تھیں ہی مگر اب تو ناقابل برداشت ہیں۔“

”اصل مسئلہ جواد احمد کا ہے مٹی! اگر اس میں معمولی سی بھی ہمت و بہادری ہوتی تو وہ ایسا ہونے نہیں دیتا۔ حالانکہ میں نے جو کچھ کیا ہے ہنڈرڈ پرسنٹ آپ کے فیوچر کی پلاننگ کے تحت کیا ہے مگر جو.....“

”نام مت لیں اس بزدل کا، اس کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے اور آج اس طرح آنٹی مجھے چیلنج کر کے گئی ہیں کہ اب میں کسی سے بھی شادی کر کے نہیں دکھاؤں گی کہ انہیں تو اپنے بزدل و بے ہمت بیٹے کے لئے لڑکیاں ڈھونڈنی پڑیں گی مگر میرے پاپا کو میں خوار نہیں ہونے دوں گی۔ کیا پاپا کوئی ہے آپ کی نظر میں ایسا جس سے ہم کل شادی کر سکیں؟“

ہر کام کو بہت سہل، ہر شے کو اپنی مٹھی میں محسوس کرنے والی لڑکی کے لئے ایک دن میں شادی جیسا حساس و نازک کام کرنا کوئی دشوار و مشکل نہ تھا۔ اس کا اعتماد دھندوں سے



نکل چکا تھا۔ صبر و قناعت، استدلال و دانشمندی سے تو کبھی بھی اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس کی سوچ ٹی وی ریویو کی مانند تھی کہ بٹن پش کرنے سے لمحے بھر میں دنیا کے کسی بھی ملک کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی خواہشیں اس کی استطاعت سے بڑھ گئی تھیں۔

”پاپا! کیا اسپاگل ہے کل میری شادی ہو جانا؟“ ان کو خاموش دیکھ کر وہ گھبرا کر کوپا ہوئی۔ وہ دل میں ٹھان چکی تھی کہ اب کل ہی شادی کر کے رانفہ بیگم کو نیچا دکھائے گی، ان کے چیلنج کا منہ توڑ جواب دے گی۔

”نہیں، کیوں اسپاگل ہوگا..... میری چاندی بیٹی کو تو کوئی لکی مین ہی اپناے گا۔“ انہوں نے خوش دلی سے بازو کے گھیرے میں لے کر جواب دیا۔ رب کی اس مہربانی پر وہ از حد شکر گزار تھے جس کی خصوصی نظر کرم سے وہ بہت آسانی سے اس مرحلے سے گزر گئے تھے ورنہ شاہ ویز کے اقرار کے بعد انہیں یہی فکر پریشان کئے ہوئے تھی کہ کس طرح ضدی و خود سر بیٹی کو اس رشتے کے لئے راضی کریں گے کیونکہ وہ اس کی چڑ اور شاہ ویز سے مخالفت کو بخوبی جانتے تھے۔

”میں آپ کو یہی بتانے والا تھا کہ کل شاہ ویز کا پر پوزل لے کر ان کی والدہ آئی تھیں اور میں نے ہاں کہہ دی ہے۔“ انہوں نے مصلحتاً اس سے مکمل بات چھپاتے ہوئے کہا۔

”شاہ ویز؟ یو مین پاپا! وہ سڑیل مزاج آدمی جو ہماری فرم میں ایمپلائر ہے؟“ شاہ ویز کا نام سنتے ہی اس کے ذہن میں دھماکے ہوئے تھے اور نگاہوں میں اس کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ لمحہ بھر میں اس کے اندر سرخ آندھی چلنے لگی۔

”وہ دو کوڑی کا ملازم، اس کی ہمت کیسے ہوئی یہاں پر پوزل بھیجنے کی؟ آپ نے..... آپ نے پاپا اس کی مدد کو دھکے دے کر نہیں نکلوایا؟ اس فقیر کی جرأت کیسے ہوئی؟“ اس وقت وہ رانفہ کا چیلنج، اپنا ارادہ بلکہ عزم سب بھول گئی۔

”نہیں..... میرے خیال میں اس وقت ان حالات میں شاہ ویز سے بہتر کوئی اور لائف پائر آپ کو نہیں مل سکتا بلکہ اس میں اس قدر صلاحیتیں ہیں کہ بہت جلد وہ بزنس ورلڈ میں بھرپور شناخت سے ابھرے گا۔“

”لائف پائر؟ وہ اس قابل نہیں ہے کہ چند لمحوں کے لئے پائر بنایا جائے۔“

”ابھی آپ اس کی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہیں۔“

”اور نہ کبھی واقف ہونے کا ارادہ ہے۔“ وہ دوبارہ کوپا ہوئی۔

”سوچ لیں آپ۔ جلد بازی کے فیصلے اچھے نہیں ہوتے۔ میں آج ہوں، کل نہیں ہوں گا تو کون پرواہ کرے گا آپ کی؟ کون سہارا دے گا؟“

”پاپا..... پاپا! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ وہ ان کے سینے سے لگ گئی۔

”جو حقیقت ہے یہ آپ کو بھی سوچ لینا چاہئے۔ میری زندگی اب ہواؤں میں رکھے چراغ کی مانند ہے۔ نہ معلوم کس سرکش جھونکے سے ہمیشہ کے لئے گل ہو جائے۔“ اسے سمجھاتے ہوئے باوجود ضبط کے ان کی آواز بھرا گئی تھی جب کہ مشعل رو پڑی تھی۔

”ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں پاپا؟ آپ کو میری عمر بھی لگ جائے۔“

”میری فکر و پریشانی جب ہی دور ہوگی جب تم اپنے گھر عزت سے جاؤ گی۔ سگے رشتوں کو آپ بھی پرکھ چکی ہو اور میں بھی..... خوب سمجھ میں آ گیا ہے کہ رشتوں سے زیادہ دولت کو اہمیت حاصل ہے۔ دولت ہے تو سب اپنے، دولت نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ شاید رشتے تو رشتے، برے وقت میں اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے میری جان۔“

”لیکن پاپا! میں سایہ نہیں ہوں..... کبھی بھی آپ کو نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ ان کے سینے سے سر لگا کر بیگی آواز میں بولی۔

”نہیں بیٹا! ایک نہ ایک دن بیٹیوں کو ماں باپ کو چھوڑنا ہی ہوتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے..... ایک فرض اولین ہے جس کی ادائیگی ہر والدین کو سرخرو کر ڈالتی ہے اور میں بھی سرخرو ہونا چاہتا ہوں مٹی..... کیا آپ اپنے پاپا کی پہلی اور آخری خواہش پوری نہیں کریں گی؟ میں رانفہ کو بتانا چاہتا ہوں اگر آپ میرا ساتھ دو۔“

”لیکن ایک ورکر کس طرح میرا لائف پائر بن سکتا ہے۔ آئی مین پاپا، لوگ کیا کہیں گے، پیر کا جوتا ہم نے سر پر رکھ لیا۔“

”لوگوں کی نہیں میری پرواہ کرو۔“ وہ اس کی خطرناک کیفیت نوٹ کر رہے تھے مگر جانتے تھے کچھ عرصے بعد وہی شاہ ویز کی تعریفیں کرے گی اور ان کے انتخاب کو سراہے گی۔

”بٹ پاپا آئی ڈونٹ لائک شاہ ویز۔“

”میری خاطر پسند کر لیں اسے اور آج رات فیصلہ کر کے مجھے صبح اثبات میں جواب دیں..... اگر انکار کرنا چاہیں تو سوچ لیں، میں موت سے دوبارہ فائٹ نہ کر سکوں گا۔“

اپنی بات کہہ کر وہ رکے نہیں، لاؤنچ سے فوراً نکل گئے۔

رات اور پھر پورا دن گزر جانے کے باوجود بھی وہ فیصلہ نہ کر سکی تھی۔ دل و دماغ میں عجیب سی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ بار بار وہ اس فیصلے پر آ کر انک جاتی کہ کس طرح شاہ ویز جیسے بڑے کے ساتھ گزارہ کر سکے گی اور پاپا کو کوئی اور نہیں ملا؟ جو جو کے علاوہ بھی بے شمار ایسے نوجوان موجود تھے جو، جو جو سے بھی اعلیٰ اسٹینڈرڈ رکھتے تھے اور اہم بات یہ تھی کہ اس کی محبت کا دم بھرتے تھے، اس کے طلب گار تھے۔ شاید شاہ ویز نے ہی کوئی ایسا چکر چلایا ہے جو پاپا کو اس کے علاوہ کوئی اور نظر ہی نہیں آیا۔ ایک عرصے سے وہ

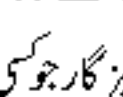
سو تے جا گئے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اس کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ ہمہ وقت ان کے لبوں پر اس شخص کی تعریفیں رہتی تھیں۔ اور آج وہ جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے۔

سب دولت اور پاپا کے لیے چوڑے بزنس کو ہتھیلے کے چکر میں پہلے ہمارے اپنوں نے چال چلی تھی اور اب کچھ مختلف انداز میں وہی پلاننگ ہے۔ کاش ہم غریب ہوتے تو شاید ایسا نہیں ہوتا..... اوکے میں پاپا کی زندگی کی خاطر مکار، دھوکے باز، کینے شخص تمہارے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں..... کیونکہ پاپا ابھی ایسوشل ہیں، ان کی کمزوری و بیماری کو مد نظر رکھ کر مجھے تمہارا ساتھ کوارا کرنا ہوگا اور ساتھ تمہیں مزہ بھی چکھاؤں گی۔ دولت و جائیداد ہتھیلے کے خواب، خواب ہی رہیں گے۔

اس نئی سوچ نے اسے ایک دم ہی فریش کر دیا۔ وہ سروسی اٹھ بیٹھی۔ اس نے سوچ لیا باپ کی حالت اس قابل نہیں کہ کوئی خلاف مزاج بات برداشت کریں۔ ابھی ان کی بات مان کر، ان کی خواہش پوری کر کے، ان کا مان بھی سلامت رکھ سکتی ہے۔ رانفہ کا چیلنج جیت کر انہیں شکست بھی دے سکتی ہے اور کچھ عرصے بعد شاہ ویز سے ڈائیورس لے لے گی۔ ویسے بھی اس شخص کی ہمت کہاں اس کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اٹھانے کی۔ وہ کبھی اسے چھو نہیں سکتا۔

”واہ! یہ قہر لہذا سنسک ہے..... لائف انجوائے کرنے کا بہترین موقع۔ کتنا مزہ آئے گا جب اس اکڑ باز کو انگلیوں کے اشارے پر چلاؤں گی، اس کی بے بسی و بے کسی کا تماشا کس قدر دلچسپ ہوگا۔ ہا، بہت شریف بنتا ہے، بہت سنگ دل و متقی پرہیز گار جو کسی لڑکی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتا ہے، بتاؤں گی جس نے کیا ہوتا ہے، دلربائی کسے کہتے ہیں؟ جذبات میں آگ لگا کر دور کھڑے ہو کر تماشا دیکھنا میری فیورٹ ہابی ہے۔“ وہ مطمئن سی حسن صاحب کے پاس آگئی۔

”پاپا! میں نے فیصلہ کر لیا ہے..... مجھے آپ کی ہر خواہش منظور ہے۔“ اس نے سر جھکا کر آہستگی سے کہا تو انہوں نے آگے بڑھ کر اس کو سینے سے لگا لیا۔



”شاہ ویز! مجھے ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کاش میرا کوئی بیٹا ہوتا، جو میرا سہارا بنتا، میرا بازو ہوتا۔ اس خواہش کا اظہار آج آپ کے سامنے کر رہا ہوں۔ جب میں نے پہلی دفعہ آپ کو دیکھا تو میرے دل میں خود بخود ہی ایک نرم کوشہ آپ کے لئے پیدا ہو گیا تھا۔ آپ مجھے اپنے اپنے سے لگے تھے۔ میں نے اکثر آپ کو قریب رکھا۔ آپ کی صلاحیتوں، ذہانتوں کو پرکھنے کے لئے مشکل سے مشکل کام کروایا اور ہر بار ملنے والی کامیابی پر مجھے خود سے اعتراف کرنا پڑا کہ آپ ایک غیر معمولی صلاحیتوں والے انسان ہیں۔ عام لوگوں سے زیادہ قوت ارادی و اعتماد رکھتے ہیں اور مشعل سے شادی کی ہامی بھر کر آپ نے جس شرافت، سعادت مندی و روشن خیالی کا ثبوت دیا ہے وہ قابل فخر و ستائش ہے۔ میں نے خوب سوچ کر فیصلہ کیا ہے کہ آپ ہی میرے حقیقی بیٹے بننے کے لائق ہیں۔“

آج آفس آنے کے بعد وہ خود اس کے روم میں چلے آئے تھے اور سیکرٹری کو انفارم کر دیا تھا کہ وہ انہیں ڈسٹرب نہ کرے اور نہ کسی کو یہاں آنے دے۔

”پلیز سر! شرمندہ نہ کریں۔ میں بے حد معمولی، عام سا بندہ ہوں۔“ وہ جھینپ کر کوپا ہوا۔

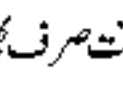
”میرے کی قدر صرف جوہری کرتے ہیں جگ مین، اب ہم بے کھوٹ رشتوں میں بندھ چکے ہیں۔ بے ریاپی و منافقت ہمارے درمیان نہیں ہے، باہمی رشتوں سے قبل ہمارے دلی تعلقات استوار ہو چکے ہیں اور جب خلوص و اعتماد کی مہکار ہمارے ارد گرد مہکتی لگتی ہے تو ہمارے درمیان کوئی پردہ داری نہیں رہتی چاہئے۔ دراصل اس وقت میرا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے۔ بزنس کی حالت نہایت اتر ہے۔ اس وقت صرف بھرم ہے جو بھاری ہے ورنہ بزنس تو بری طرح بکھر چکا ہے جس کو دوبارہ بحال کرنے کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑے گی۔“

”جی سر! میں آگاہ ہوں تمام حالات سے۔“ نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ پہلے وہ حسن صاحب کے ساتھ بلا تکلف گفتگو کرنا تھا مگر اب عجیب سی شجک و تکلف خود بخود قائم ہو گیا تھا۔

”مٹی اس صورتحال سے بالکل بے خبر ہے۔ میں نے خود اسے بے خبر رکھا ہوا ہے۔ وہ بہت حساس ہے۔ احساس محرومی اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا جو مجھ سے قطعی برداشت نہیں ہوگا بیٹا۔ اس کا بہت خیال رکھنا۔ مجھے احساس ہے وہ از حد ضدی، خود سر، دو گستاخ ہے مگر پھر بھی ایک کمزور لڑکی ہے جس کے احساسات بہت نازک ہیں اور جس طرح آپ کے ساتھ رشتہ استوار ہو رہا ہے، ان اچھے ہوئے حالات میں شاید وہ فوری طور پر آپ کو قبول نہ کرے، اس لئے مائی سن! آپ کو کچھ وقت کے لئے صبر و تحمل، ضبط و بردباری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔“ ان کا لہجہ شکستہ و التجائیہ تھا۔

”جی، میں سمجھتا ہوں۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

”اللہ آپ کی عمر دراز کرے، ہمیشہ کامیابیوں سے نوازے، آپ نے بھاری بوجھ سے مجھے آزاد کر دیا ہے۔“ غرور جذبات سے ان کی آواز کانپ رہی تھی۔



مشعل کی ضد تھی وہ شادی بالکل خاموشی سے کرے گی۔ دوسری طرف شاہ ویز بھی سادگی کا خواہاں تھا۔ حسن صاحب اپنے تباہ حال کا روبرو اور قرض داروں کے باعث ان کی باتیں ماننے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اکلوتی بیٹی کے حوالے سے تمام خواہشات و آرزوئیں دل میں ہی بسورتی رہ گئی تھیں لیکن وہ جُراؤمید تھے کہ کاروبار جب دوبارہ مضبوط ہو جائے گا تو وہ ہر ارمان پورا کریں گے۔ ان کو اس تباہی کے مقام پر لانے والا کوئی غیر نہیں ان کی اپنی لگی بہن تھی۔ انہوں نے مشعل کی طرح انہیں عزیز رکھا،

بغیر کہے ہر طرح سے انہیں سپورٹ کرتے رہے۔ احمد کو بزنس انہوں نے ہی اشارت کر کے دیا جہاں منافع تو ان سے چھپایا جاتا تھا مگر نقصان ہمیشہ ان کے اکاؤنٹ سے پورے کئے جاتے۔ اس کے علاوہ رانعدہ کی شاہ فریجیوں کے علاوہ مشعل سے دو سال بڑے جو ادکی ہر ذمے داری ان کے سپرد تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہاں بیٹا مشعل کے ذریعے اپنے لاکر زبھر تے رہے اور آج بہت مُردہ ضمیر کے ساتھ ان کے تمام احسانات کو بھلائے، قربت داری و محبت کو بھلائے وقت کی طرح بدل گئے تھے۔

حسن صاحب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بہن کو مشعل کی شادی کا انویٹیشن کارڈ دینے گئے تھے۔ وہاں گیٹ پر ہی چوکیدار نے مطلع کیا کہ رانعدہ کی فیملی صبح ہی ورلڈ ٹور پر گئی ہے۔ حسن صاحب دل برداشتہ ہو گئے۔ ان کی بہن نے انہیں انفارم کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا اور ساتھ ہی ان کی پست و گھٹیا ذہنیت کھل کر سامنے آئی تھی۔ کس قدر دغلی اور جھوٹی فطرت تھی رانعدہ کی۔ ان سے مطالبہ کر رہی تھیں ایک کروڑ روپے لینے کا کہ بقول اس کے بزنس میں زبردست خسارہ ہوا ہے اور ان کی معذرت پر جھٹ سے رشتہ توڑ گئی تھیں۔ اب فیملی کے ساتھ ورلڈ ٹور پر جانے کے لئے دولت کہاں سے آئی تھی۔ وہ سخت متغیر ہو گئے۔

□●□

”میں کہوں آپا! کیا ہتھیلی پر سروس اگانے چلی ہو..... اس طرح ہوتی ہے شادی؟“ زرینہ حیران پریشان سی شاہ ویز کی شادی کا کارڈ پا کر دوڑی چلی آئی تھیں۔

”شاہ ویز کی خواہش ہے شادی بالکل سادگی سے ہو۔“

”کیوں سادگی سے ہو؟ پہلی پہلی شادی ہے، وہ بھی اکلوتے، لاڈلے بیٹے کی اور وہ بھی اتنے بڑے اعلیٰ خاندان میں..... ہماری برداری میں پہلی بار کسی اونچے رئیس گھر کی لڑکی بہو بن کر آرہی ہے۔ جتنی بھی خوشیاں منائی جائیں کم ہیں۔“ وہ از حد مُردہ جوش تھیں۔

”دراصل وہ لوگ بھی خاموشی سے شادی کرنا چاہ رہے ہیں اور تمہیں شاہ ویز کی عادت تو معلوم ہے جو دل میں ایک مرتبہ ٹھان لے، اس پر ہی اڑ جاتا ہے۔ اس کی خواہش تھی شادی ایک ڈیڑھ سال بعد ہو مگر یہاں مسئلہ ہے، لڑکی کے باپ کو دل کی بیماری ہے جس کے علاج کے لئے وہ شادی کے دوسرے دن باہر جا رہے ہیں۔ ان کے آنے کے بعد ہی ویسے کی تقریب ہوگی اور وہ ہی تب بھی اپنے ملنے ملانے والوں کو بیٹی کی شادی کی خبر کریں گے۔“ بے جی نے پا لک کاٹتے ہوئے مکمل وضاحت کر دی تھی۔

”لو بھلا، یہ کیا بات ہوئی؟ اکلوتی لڑکی کی شادی اتنے امیر ہونے کے باوجود اس طرح کریں گے..... کیا چکر ہے آپا؟“

”مجھے تو کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔“ وہ بھونچکا رہ گئیں۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے زرینہ! کاروباری لوگوں کے دشمن زیادہ ہوتے ہیں، دوست کم۔ بس یہی وجہ ہے۔“ بے جی کا لہجہ اطمینان سے لبریز تھا جب کہ زرینہ بیگم کی شعلہ صفت طبیعت میں پٹائے چھوٹ رہے تھے۔ تھیں تو بے جی کی چھوٹی بہن مگر جس قدر بے جی کے مزاج میں بردباری، ملائمت، متانت اور سادگی تھی ان کی طبیعت بالکل متضاد تھی۔

”کیسی منحوس خبر سنائی..... میں تو سوچ رہی تھی وہ بڑے باپ کی بیٹی، جہیز میں کوٹھی، بنگلے، کاروں کے علاوہ اتنا کچھ لے کر آئے گی کہ تمہارے گھر میں جگہ ہی نہیں ہوگی رکھنے کے لئے..... مگر ان امیروں سے اچھے تو ہم غریب ہی ہیں جو اپنی ناک اونچی رکھنے کے لئے بھلے ادھار مانگ کر ہی بیٹیوں کے ساتھ ٹک بھر کر سامان بھیجتے ہیں اور میں نے چاروں بیٹیوں کی دفعہ پوری برداری کی دعوت کی تھی اور اصغر کی شادی تو اتنی دھوم سے کی تھی کہ آج تک لوگ مثالیں دیتے ہیں۔“ انہوں نے فخر سے بتایا۔

”اب تک قرضہ بھی تو ادا کر رہی ہو ان شادیوں پر لانے والا۔ ایسی نمود و نمائش کا کیا فائدہ جو ناک تو اونچی کر دے مگر کچھ نہیں جھکا دے۔ اس سے تو سادگی بھلی ہے۔“

”ارے رہنے دو! آپا! تم نے سارا اثر بے چارے شاہ ویز پر ڈال دیا ہے۔ تمہاری ہی پٹی میں آ کر اس نے جہیز لینے سے انکار کر دیا ہوگا۔ ہونہ، میں کہوں اس میں برائی کیا ہے؟ لڑکی اپنا جہیز خود برتی ہے، سسرال پر اس کا کیا احسان؟“

”میں تمہیں نہیں سمجھا سکتی، شاہ ویز آجائے تو خود اس سے بات کر لینا۔ وہ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے۔ یہ بتاؤ میں پا لک کوشت پکا رہی ہوں، تم کیا کھاؤ گی؟“ انہوں نے کئے ہوئے ٹماٹر، ہری مرچیں کوشت میں ڈالتے ہوئے موضوع بدلا تھا۔

”فریق میں کچھ نہیں رکھا..... میں گردے کی درد کی وجہ سے پا لک نہ کھا سکوں گی۔“

”چکن تورمہ اور شامی کباب ہیں..... ساتھ میں پھلکے ڈال دیتی ہوں۔“

□●□

نکاح نامے پر سائن کرتے وقت کسی انجانے جذبے کے تحت اس کے ہاتھ کانپ اٹھے تھے۔ ایک بے چینی، ایک خطر اب نے اس کی رگ و پے میں سنسنی دوڑا دی تھی۔

”مشعل حسن بیگ! یہ شریک سفر ہے تمہارا..... تم جو اپنے سے کمتر لوگوں کو نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کرتی تھیں آج ایک کمتر، بے حیثیت، اپنی ہی فرم کے ملازم کی بیوی ہونے جا رہی ہو؟“ ایک زہریلی سوچ ذہن کے کسی گوشے سے ابھری تھی۔ وہ لمحے بھر کو دم بخود رہ گئی۔

”نہیں، نہیں..... یہ حقیقت نہیں ہے..... نہ ہی مشعل حسن بیگ اتنی بے مول و بے وقعت ہے۔ یہ صرف پا پا کی خوشی و صحت کے لئے کی گئی ایبوشل کمٹ منٹ اور ایک انوکھا و منفرد ایڈ وینچر، تھریل اور لائف انجوائے منٹ ہے جو بہت جلد ڈراپ کر دیا جائے گا۔ پھر اس اکھڑ و بد دماغ شخص سے اپنی توہین کا بدلہ لینے کا بہترین موقع۔“ فوراً ہی اس کے فخر و خود اعتمادی نے ہمیشہ کی طرح اس کا دفاع کیا تھا اور اس نے مطمئن ہو کر سائن کر ڈالے تھے۔ نکاح کے بعد مُردہ تکلف ڈرتھا۔ شادی کی سادہ سی تقریب حسن صاحب کی رہائش گاہ پر تھی۔ حسن صاحب نے اپنے چند قابل اعتماد دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ شاہ ویز کے ساتھ بھی باراتی بن کر بے جی اور زرینہ کی فیملی آئی تھی۔ بہت مختصر سے لوگ تھے۔ ریڈیٹر ارشد سوٹ میں نازک جیولری اور عمدہ میک اپ میں وہ ہمیشہ کی طرح حسین تر لگ رہی تھی۔ حسن صاحب کے دوستوں کی بیویوں اور بیٹیوں میں گھری وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ گرل فرینڈ اس نے بنائی نہیں تھی۔ بچپن سے بوائے فرینڈ بنانے کی عادی تھی جن میں سے کسی کو بھی اس نے سبکی کے خیال سے انوائٹ نہیں کیا تھا یا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

رخصتی سے قبل حسن صاحب نے تنہائی میں بے جی اور شاہ ویز سے کچھ ضروری گفتگو کی تھی جس سے وہ بے خبر تھی۔ اس کی ہکا ہیں شاہ ویز پر تھیں جو کاشن کے سوٹ میں ملبوس بالکل عام و سادہ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی مسرت و شادمانی کے رنگوں کی برسات نہ تھی۔ وہی سنجیدہ، خاموش و مُردہ قارنداز تھا اور چہرے پر چھایا ہوا سکوت و از حد سنجیدگی سے محسوس ہو رہا تھا وہ اپنی شادی میں نہیں بلکہ کسی کے جہلم میں آیا ہوا ہے۔ اس کا یہ انداز اسے سخت ناگوار گزرا تھا جب کہ اس کا خیال تھا وہ بے اندازہ دولت پانے کے ساتھ ساتھ اس جیسی حسین و جمیل لڑکی مل جانے پر بے حد خوش ہوگا مگر یہاں کوئی سرشاری و بے خودی دیکھنے کو نہ ملی۔ وہ تپ اٹھی تھی۔

رخصتی کے وقت اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا روئے کا مگر جب حسن صاحب نے اسے سینے سے لگایا تو دل ایک دم ہی موم بن گیا اور وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اسی دم بے جی کی نرم آغوش نے اسے تھام لیا تھا اور خلوص سے حسن صاحب کو تسلی دے رہی تھیں جو اسے وداع کرتے وقت اپنے جذبات اور آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکے تھے۔ انہیں رونا دیکھ کر اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ایک ناشائسا دکھ اور جدائی کی تکلیف و صورت حال سے وہ ہڈ ہال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

شاہ ویز کے لئے اس کی بے ہوشی از حد حیران کن اور دلچسپ تھی۔ بھلا اس قدر اسٹرائٹ اور چنگیز خان و، ظرنا پ مزاج اور طبیعت رکھنے والی لڑکی کے اعصاب اتنے کمزور اور نازک ہو سکتے ہیں؟ بہر حال وہ اسی حالت میں رخصت ہو کر گھر آئی اور ایک مرتبہ پھر اس کے بازوؤں میں سفر کر کے اپنے جلد عروسی میں پہنچی تھی جو اصغر نے اس کی غیر موجودگی میں گلاب و موتیا کے پھولوں کی لڑیوں سے سجا ڈالا تھا۔ اسے ایک انداز سے بیڈ پر پُٹ کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ خوشی کا تعلق دل سے وابستہ جذبات سے ہوتا ہے۔ زندگی کے اس اہم ترین دن و رات کی اہمیت تب ہوتی اگر مشعل ایک عام سی لڑکی ہوتی، مشرقی اقدار و مذہبی اطوار کی پروردہ عام اور خالص لڑکی، جس کی زندگی میں آنے والا وہ پہلا اور آخری مرد ہوتا تو آج کی رات بڑی حسین، بہت فسوں خیز و دلربا ہوتی۔ اس کے جذبات کی شوریدگی و دلکشی اس کے وجود کے ہر حصے کو روشن کر دیتی۔ لیکن یہاں ایسا کوئی منہ زور جذبہ نہ تھا بلکہ کوئی بھی جذبہ نہ تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا، گھبروتا ریک سناٹا..... سر دسکوت و مُردہ ہیبت ویرانی!

□●□

”کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ کسی امیر سینھ کی اکلوتی بیٹی اس طرح بھی ہو سکتی ہے۔ تو بے بھی، اس سے اچھی شادی کسی فقیر کی بیٹی کی ہوتی ہوگی۔ چند لوگ بلائے اور بیٹی کو ایسے بیاہ دیا جیسے کوئی گناہ چھپ چھپا کے کیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے کتنے ارمان، کیسی خواہشیں ہوتی ہیں، بیچاری لڑکی بے ہوش نہ ہوگی تو کیا ہوگی..... نہ ہندی، نہ اُٹن، نہ مایوں..... ارے کوئی بھی تو بچی کا ارمان نہ نکالا گیا۔“

زرینہ کو شروع سے اس شادی کو اس سادگی سے انجام دینے پر اعتراض اور شدید اختلاف تھا۔ وہ تو ویسے بھی اپنی رائے دینے میں ذرا بھی دیر نہ کرتی تھیں۔ اب بھی مسلسل ان کی زبان رواں تھی۔

”بہو فرج! دیکھنا ذرا دلہن کے کمرے میں جا کر۔ شاید ہوش آ گیا ہو۔“ بے جی فرح سے آہستگی سے مخاطب ہوئیں تو وہ اثبات میں گردن ہلاتی آگے بڑھ گئی۔

چند لمحے قبل ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ ساکت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ پھر بیڈ کے چاروں اطراف لگی گلاب و موتیا کی لڑیاں اور اجنبی کمرہ لہجہ میں شعور بیدار کر گیا تھا..... وہ جھٹکے سے اٹھی تھی، اس طرح اٹھنے سے بھاری کام والے بھاری دوپٹے نے جو بے شمار قیمتی مہرز سے سیٹ تھا بری طرح بال بھینچے تھے۔ ایک آہ سی نکل گئی تھی۔ آہستہ سے سر سہلاتے ہوئے اس نے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔

پنک کراکیم میں کمرے کی ہر شے گلابی تھی۔ کمرہ بہت سادہ مگر خوب صورت لگ رہا تھا اور اپنے مالک کے مزاج کی طرح سرد و بے نیازی کے تاثر سے بھر پور تھا۔ شاہ ویز کا تصور آتے ہی اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ ابھری تھی۔ ابھی بیڈ سے اترنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ معادروازہ کھلا اور ایک مسکراتی ہوئی لڑکی اندر داخل ہوئی تھی

”شکر ہے آپ جاگ گئیں۔“ فرح نے صریحاً ہوش کا نام نہ لیا تھا اور اس کے قریب آگئی۔

”مجھے نیند آرہی ہے..... میرا نائٹ ڈریس کہاں ہے؟“ اس نے فرح کی دوستانہ مسکراہٹ کو یکسر نظر انداز کر کے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ نئی نویلی بلکہ بالکل تازہ دلہن کا رعونت بھرا اتھکمانہ لہجہ فرح کو شدید حیران کر گیا۔ وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

”کیا ہوا؟ میں نائٹ ڈریس کا پوچھ رہی ہوں۔“ اس کی خود اعتمادی عروج پر تھی۔

”وہ..... وہ ڈرینگ روم میں ہے۔ لیکن ابھی آپ ڈریس چینج مت کریں۔ ابھی شاہوین بھائی..... آپ کے لئے کچھ لائیں، کولڈ ڈرنکس، چائے، کافی، آئس کریم؟“ اس کی نگاہوں سے عیاں ہوتی نا کواری ویرہی نے فرح جیسی بولڈ اور تکیے مزاج کی لڑکی کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اکلوتی بڑی بھابی کے رتبے سے اسے چھیڑنے، شاہوین کے حوالے سے تنگ کرنے کا پروگرام بنا کر آئی تھی مگر یہاں دلہن کے تیوروں اور چہرے کے زاویوں سے نولفٹ صاف نظر آرہی تھی بلکہ اسے لگ رہا تھا کہ دو لہامیاں کو بھی لفٹ دینے کا کوئی ارادہ ہرگز نہ تھا۔

”تو تھینکس..... میں صرف اس وقت سونا پسند کروں گی۔ سوتے وقت مجھے معمولی سی بھی ڈسٹرنس پسند نہیں ہے۔“ وہ شرارہ سنبھالتی اٹھی تھی۔

”پلیز..... پلیز، آپ تھوڑا انتظار کریں، میں شاہوین بھائی کو بھیج رہی ہوں۔“ وہ اسے ڈرینگ روم کی طرف بڑھتے دیکھ کر منت بھرے لہجے میں بولی پھر پھرتی سے کمرے سے نکلی تھی تاکہ دلہن کے روپ اجاڑنے سے قبل وہ شاہوین کو یہاں بھیج دے۔ کیسی عجیب سر پھری دلہن تھی وہ جس کو اپنے دلہنا پے کا کوئی احساس نہ تھا۔ جیون ساتھی کے جذبات و احساسات کی پرواہ نہ تھی۔ لڑکی اس انداز سے ایک بار ہی تجتی ہے، دلہن ایک بار ہی بتائی جاتی ہے، امنگوں بھری، مسرتوں سے لبریز ساتیں فقط ایک ہی بار تو آتی ہیں۔ پھر وہ احمق کیوں اپنے ہاتھوں سے ان چہ انگوں کو گل کر رہی ہے۔“

نیچے آکر اس نے سب طرف شاہوین کو دیکھا مگر اس کے ساتھ امنگی غیر موجودگی بھی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ دونوں بلا اطلاع گھر سے غائب ہیں۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ”تمہیں دلہن کو دیکھنے کے لئے بھیجا تھا یا اس طرح کدکڑے لگانے کو؟ کیا ہوا..... اس کو ہوش آیا یا نہیں؟ آپا پریشان ہو رہی ہیں۔“ زریہ فرخ سے ڈپٹ کر خطاب ہوئیں۔ ”وہ ہوش میں آگئی ہے، اب بے ہوش ہونے کی آپ لوگوں کی باری ہے۔“ اس نے مسکرا کر آخری جملہ آہستگی سے کہا تھا۔

”ارے کیا بڑا ارہی ہے..... پوری بات کیوں نہیں کرتی؟“

”آئی! دلہن کو ہوش آگیا ہے اور اب وہ سونا چاہتی ہے۔“

”لو بھلا..... یہ کیا بات ہوئی؟ کیوں سونا چاہتی ہے؟ نئی نویلی دلہنوں کے یہ ڈھنگ ہوتے ہیں؟ ہوش گنوا کر اپنے باپ کے گھر سے آئی، کوئی رسم پہلے ہی نہ ہوئی تھی۔ اب سوچا تھا کچھ رکھیں کہ دل کے ارمان نکالیں گے تو وہ بھی نادر۔ سارے ارمان دل کے دل میں ہی رہ گئے۔“ وہ برہم میں کھڑی بے جی سے سردارہ بھر کر کویا ہوئیں۔

”بہو! پوچھا تھا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“ بے جی قفل سے فرح سے خطاب ہوئیں۔

”جی ہاں بے جی! انہوں نے منع کر دیا تھا۔“ فرح نے آہستگی سے کہا تھا۔



رات کے پچھلے پہر وہ آیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر ہینڈل گھمایا تو معلوم ہوا دروازہ اندر سے لاک ہے۔ بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہوئی تھی۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر دروازہ لاک کر دیا تھا۔ مدھم مدھم روشنی میں کمرے کی بج بستی فضا مہک رہی تھی اور جی ہوئی مسہری کے بچپوں بیچ سرے سے پیر تک چا درتانا بے خبر سوری تھی یا ایکٹنگ کر رہی تھی۔ وہ ہیڈ کے قریب کھڑا سینے پر دونوں بازو باندھے بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دل میں کوئی خوش رنگ بالکل نہیں تھی۔ نہ ہی جذبات میں گرجوشی تھی۔ پھر بھی عجیب سے احساس سے اس لمحے وہ دوچار ہوا تھا۔ چند لمحے اس کی طرف دیکھنے کے بعد وہ شانے اچکا تا ہوا ڈرینگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

حسن بیگ صاحب نے اس کے رویے کی، احساسات کی پہلے ہی ترجمانی کر دی تھی۔ اگر نہ بھی کرتے تو وہ خود اس کے جذبات سے آگاہ تھا۔ جو جو کے ساتھ اس کی انوالومنٹ سے وہ بخوبی واقف تھا۔ جس طرح اور جس مجبوری کے تحت وہ اس سے رشتہ جوڑنے میں راضی ہوگئی تھی وہ اس کے لئے حیرت کا مقام تھا۔

اب اس کے اس بیگانہ و بے نیاز رویے نے ظاہر کر دیا تھا وہ صرف اس سے ظاہری رشتہ جوڑنا چاہتی تھی اور بس۔ یہی خواہش اس کی بھی تھی۔

نہ معلوم کس بناء پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ نیم بیدار آنکھوں سے لیٹے لیٹے ہی اس نے گردن گھما کر دیکھا، رات کو سلیپنگ پلزلینے سے قبل تمام کھڑکیاں، دروازے وہ لاک کر کے سوئی تھی اور صرف نائٹ بلب روشن رکھا تھا مگر اس وقت کمرہ روشنی سے بھرا ہوا تھا اور کھڑکیوں کے شیشوں سے لکرائی سنہری کرنیں پتہ دے رہی تھیں صبح کی آمد کا۔ شاید صبح ہوئے کافی وقت گزر بھی چکا تھا۔

”جب سب لاک کر کے سوئی تھی تو پھر کس نے اندر آ کر کھڑکیوں سے پردے ہٹائے ہیں..... جب کہ دروازہ بدستور لاکڈ نظر آ رہا تھا..... پھر کس طرح..... کہیں..... کہیں؟“ ایک خیال تیر بن کر اس کے اندر بے سست ہوا تھا۔ وہ کچھ گھبرا کر، کچھ بوکھلا کر سیدھی اٹھ بیٹھی تھی۔ نگاہیں ڈائریکٹ صوفے پر بیٹھے اطمینان سے چائے پیتے اور ساتھ اخبار کا مطالعہ کرتے شاہوین سے لکرائی تھیں اور اس کے خیال کی تصدیق ہو چکی تھی۔

”تنت..... نت..... تم اندر کیسے آئے؟“ اس کی حالت قابل دید تھی۔

”صبح بخیر۔“ شاہوین نے چائے کا گھونٹ لے کر نگاہیں اخبار پر مرکوز کئے کہا۔

”مائی فٹ۔“ میں پوچھتی ہوں تم نے اندر آنے کی جرأت کیسے کی؟ اجازت کیوں نہیں لی؟“ وہ غصے سے ہل کھاتی اس کے قریب آ کر پھنکاری۔

”محترمہ! یہ میرا کمرہ ہے اور میں نے آج تک کسی ذی شعور شخص کو اپنے ہی کمرے میں اجازت لے کر داخل ہوتے نہیں دیکھا۔ اس نے اخبار ٹیبل پر رکھ کر اطمینان سے جواب دیا۔ مشعل اس کے جواب پر پہلی مرتبہ لاجواب ہوئی تھی۔ پھر اس نے شاہوین میں حیرت انگیز تبدیلیاں دیکھی تھیں کہ اس کا اس کے سامنے رہنے والا بے بس و مؤدب انداز یکدم بدل گیا تھا بلکہ وہ بہت مطمئن، با اعتماد و اختیار نظر آ رہا تھا۔

”فنا فٹ تیار ہو کر نیچے آؤ، سب انتظار کر رہے ہیں ناشتے پر۔“

”میں بریک فاسٹ تنہا کرنے کی عادی ہوں اور آئندہ مجھ پر اپنے فیملی ٹھونسنے کی کوشش ہرگز مت کرنا۔ انڈرائسینڈ؟“ اس کی جارحیت عود کر آئی۔

”سمجھنے کی مجھے نہیں تمہیں ضرورت ہے۔“ اس نے خالی مگ ٹیبل پر رکھا اور اس کے مقابل کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ ”کل تک تم اپنے باپ کے گھر میں تھیں تو اپنی چلاتی تھیں۔ آج تم میرے گھر میں۔ یعنی مجازی خدا کے گھر میں ہو تو تمہیں اس گھر کے طور طریقے اپنانے ہوں گے۔ ان پر چلنا ہوگا۔ انڈرائسینڈ؟ میں صرف ایک بار سمجھاتا ہوں۔“ مشعل نے اس کے سخت تنبیہی لہجے پر حیرانی سے دیکھا۔ وہ مشعل کو دیکھ رہا تھا..... آف، کیا سحر انگیز بوٹی آنکھیں تھیں، روشن روشن، پرکشش آنکھیں، اس کا دل بے ساختہ بری طرح دھڑکنے لگا تھا..... رگ و پے میں سنسنائیں دوڑ گئیں۔ اس نے نہ صرف نگاہیں جھکا لیں بلکہ رخ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ پہلی ہی نظر میں وہ اس کی نگاہوں سے ٹکست کھاگئی تھی۔ کس قدر لعنتیں دیتی تھی وہ، کتنا طیز کرتی تھی اس کی جھکی نگاہوں کے حوالے سے۔ وہ ہمہ وقت جھکی رہنے والی پلکیں اٹھیں تو ایک قیامت برپا کر گئی تھیں۔ کتنا استحقاق و یقین تھا ان آنکھوں میں۔ عجب سحر انگیزی کشش۔

”فنا فٹ تیار ہو کر نیچے آؤ۔“ وہ کہہ کر نیچے آگیا جہاں بے جی کے ساتھ خالد زریہ اور فرح بھابھی کچن میں مصروف تھیں۔ مزے دار خوشبوئیں وہاں پھیلی ہوئی تھیں۔

”شادی کے پہلے ہی دن اتنی بے قاعدگی صبح سویرے بیدار ہونے والا شخص گیارہ بجے بیدار ہو رہا ہے۔“ اصغر اسے دیکھ کر شرارت سے بولا۔

”بالکل غلط..... شاہ بھائی تو صبح سویرے ہی اٹھ گئے تھے۔ ایکسرسائز اور واکنگ سے فارغ ہو گئے ہیں۔ آپ خود بے خبر پڑے سو رہے تھے۔“ انڈے فرائی کرتے ہوئے فرح نے جتانے والے انداز میں کہا تو اصغر جھینپ کر مسکرانے لگا۔ جب کہ طوہ ڈش میں نکالتی ہوئی زریہ اس کے شانے پر پڑا دوپٹہ دیکھ کر دانت پیس کر کویا ہوئیں۔

”تمہارے دیدوں کا پانی بالکل ہی ڈھل گیا ہے بہو! ساسوں، میاں اور دیور کے سامنے نگے سر کیا فرالے سے زبان چلا رہی ہو۔ کچھ تو شرم کرو۔“

”سوری آئی۔ دراصل چائنا سلک کے دوپٹے کہاں مٹھلتے ہیں، سر سے پھسلتے رہتے ہیں۔“

”ہاں..... تم سے نہ زبان سنبھالی جاتی ہے اور نہ دوپٹے صرف میاں کو قابو کرنے کے گر جانتی ہو۔“ وہ موقع محل دیکھ کر بات کرنے کی عادی نہ تھیں۔

”زریہ! معمولی معمولی سی بات پر جھگڑنے نہ بیٹھ جایا کرو۔ ٹھیک کہہ رہی ہے بہو۔ یہ دوپٹے سر پر نہیں ٹھہرتے۔“ بے جی کو غیر جانب داری سے بولنا پڑا تھا۔

”شاہوین، بھابھی کب تک نیچے تشریف لائیں گی؟ سچ اب تو چوہے بھی پیٹ میں بھاگ دوڑ کر بندھال پڑے ہیں۔“ اصغر نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دہائی دی۔ میز لڈیڈ ڈشوں سے بھری تھی۔ وہ سب کرسیوں پر براجمان مشعل کی آمد کے منتظر تھے اور قبل اس کے کہ شاہوین کوئی جواب دیتا سامنے نیچے اترتی مشعل کو دیکھ کر وہ گنگ رہ گیا۔ ہاتھ گاؤن میں اس کی گلابی پنڈلیاں عریاں تھیں۔ تو لیے کوسر پر لیٹ رکھا تھا۔ شفاف چہرے پر بھی پانی کے قطرے موجود تھے۔ وہ دوسری سیزم پر آ کر رک گئی تھی جب کہ نیچے ایک دم ہی سناٹا چھا گیا تھا۔ اصغر نے گردن جھکا لی تھی۔ بے جی اور زریہ ایک دوسرے سے نگاہیں چہرہ ہی تھیں۔ فرح کے لبوں پر طعنے مسکراہٹ تھی۔

”آپ لوگ ناشتہ کریں پلیز۔“ وہ کہہ کر اٹھا اور ایک جست میں کئی میز ہیاں پھلانگ کر اس کے پاس پہنچا اور وہ جو کچھ کہنے کے لئے لب واکر رہی تھی کہ بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے میں لایا تھا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ جھلا کر بولی۔

”شٹ اپ۔“ وہ اس سے بھی گئی آواز میں دھاڑا تھا۔ ”تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس بیہودہ جلیے میں سب کے سامنے نیچے جانے کی؟ میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ اب اس گھر میں آگئی ہو، اس گھر کے طور طریقے اپنانے ہوں گے۔ یہاں کسی بیٹی، بہن، بہو کے سر سے آنچل بھی ڈھلک جائے تو سخت معیوب سمجھا جاتا ہے اور تم اپنی خوب صورتی کے زعم میں اس ادنیٰ درجے کی بے حیائی کا مظاہرہ کرتی ہاتھنگ گاؤن میں نیچے چلی آئیں۔ اسلٹ کروادی میری سب کے سامنے۔“ وہ سخت طیش میں تھا۔

”مسٹر! مجھ پر اپنے بیک ورلڈ فیملی کے گھنڈیاہٹ اپ ٹھونسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں وہی کروں گی جو میں کرنا چاہتی ہوں اور کسی خوش فہمی میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہاں صرف پاپا کی خواہش کے احترام میں چند دنوں کے لئے آئی ہوں..... بہت جلد چلی جاؤں گی تم سے ڈائورس لے کر۔“ وہ سر سے تولیہ ہٹاتی تمسخرانہ لہجے میں بولی۔

”پھر تو یہ گھر نہیں۔ مگزی کا جال ثابت ہوگا تمہارے لئے۔“

”کیا؟ کون روک سکتا ہے مجھے یہاں سے جانے سے؟“

”فی الحال اس فضول ہاپک کو ہمیں رہنے دو اور فوراً ریس چھینج کرو۔“ اس نے وقت کی نزاکت کو محسوس کر کے قصد اُلجھے اور چہرے پر نرمی طاری کی۔

”میرا سوٹ کیس کہاں ہے؟“

”آپ کے کپڑے یہاں موجود ہیں، وہی پائین۔ اس گھر سے یہاں کچھ نہیں آئے گا۔ تمہارا سوٹ ڈریسنگ روم میں موجود ہے۔“ اس نے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر کہا جہاں سی گرین شلوار سوٹ بڑے سے دوپٹے سمیت ڈنگر میں جگمگا رہا تھا۔ ساتھ میچنگ سینڈل، جیولری اور پرس بھی موجود تھا۔

”وہاٹ..... میں نے آج تک ایسے ڈریس نہیں پہنے، نہ میں عادی ہوں۔“ وہ منہ بنا کر اس لباس کو تحقارت سے دیکھ کر بولی۔

”آج سے آپ یہی ڈریس زیب تن کیا کریں گی اور بہت جلد عادی ہو جائیں گی۔“

”نو..... نیو مسٹر! مجھ پر اپنی مرضی چلانے کی کوشش مت کرو..... ورنہ میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے طلی جاؤں گی۔“ وہ پھر اٹھی۔

”کوشش کر کے دیکھ لو..... کبھی کامیابی نہیں ہوگی۔“ ڈریسنگ روم کی طرف اسے دھکیل کر اس نے سخت لہجے میں کہا۔



”اولی اللہ..... کیسی بے غیرت لڑکی ملی ہے آپا، کیسی بہولی ہے تمہیں؟ تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی ناک کٹا دی اس نے۔ فرح کو دیکھو کس طرح دھیسے دھیسے مسکرا رہی ہے۔ خوب سمجھ رہی ہوں اس کے بھڑکے..... مجھے بتا رہی ہے وہ۔“

اصغر ناشتے سے فارغ ہو کر چلا گیا تھا۔ انہوں نے بھی ناشتہ کر لیا تھا۔ فرح مشعل کا ناشتہ کمرے میں دے آئی تھی۔ اب وہ ٹیبل صاف کرتی مسکرا رہی تھی۔ اپنی ساس کی عادت وہ بخوبی جانتی تھی کہ وہ ہمیشہ دوسروں کی بہوؤں کے گھنٹھڑین، سلیقہ مندی، شرم و حیا کی مثالیں دے کر اس کا ناک میں دم کئے رکھتی تھیں اور اب سگی بہن کی بہو کے حوالے سے شروع سے وہ ہرٹ ہو رہی تھیں اور اب مشعل کے ہاتھ گاؤن والے پوز نے تو انہیں از حد سبکی و شرمساری سے دوچار کیا تھا اس کے سامنے۔

”ایسی بات نہیں ہے زریںہ! دراصل مشعل کی ماں بچپن میں ہی اسے چھوڑ کر مر گئی تھی۔ اس کی تربیت زیادہ تر انگریز آیاؤں نے کی ہے۔ اسی وجہ سے وہ ایسی نزاکتوں کو نہیں جانتی۔ اب یہاں رہے گی تو سب سمجھ جائے گی، بدل جائے گی۔“ بے جی نے بہت قہر و بردباری سے مشعل کی حمایت کی تھی۔

”مجھے تو وہ کسی کو گھاس ڈالنی نظر نہیں آ رہی۔ آئے ہائے، شاہویر جیسے شریف اور خوش مزاج بچے کے نصیب پھوٹ گئے۔ کیسی بے حیا و بد دماغ بیوی ملی ہے۔“

”پریشان مت ہو زریںہ! کچھ عرصے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔“ زریںہ کے ساتھ ساتھ یہ تسلی انہوں نے خود کو بھی دی تھی۔ زریںہ کے مقابل ان کی قوت ارادی و قوت برداشت بہت زیادہ تھی۔ پھرخصتی سے قبل خصوصی طور پر حسن صاحب نے اس کی تمام حرکات و عادات کے متعلق بتا کر التجائیہ درخواست کی تھی کہ وہ ساس بن کر نہیں، ماں بن کر اس کی کوتاہیوں و نادانیوں کو معاف کر دیا کریں گی اور بیٹی کی طرح خیال رکھا کریں گی۔ وہ ان سے وعدہ کر چکی تھیں۔ ویسے بھی وسعت قلبی کے باعث وہ زیادہ تر درگزر سے کام لینے کی عادی تھیں۔ ان کا امتحان بہت کٹھن و صبر طلب تھا۔ یہ انہیں شام تک معلوم ہو چکا تھا۔

مشعل نے ناشتے کی طرح دوپہر اور رات کا کھانا بھی اپنے کمرے میں کھایا تھا اور سارا وقت تھا کمرے میں رہی تھی۔ اس کی ہٹ دھرمی اور دیدہ دلیری دیکھ کر زریںہ کو اپنی بہو کے بگڑنے کا احساس ہوا تو وہ رات کے کھانے کے بعد رکی نہیں، طلی گئی تھیں۔ ساتھ بیٹے بہو کو بھی لے گئی تھیں۔

رات میں وہ جلد ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ بے تکلفی سے بیڈ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔ گلابی خوب صورت نائٹی میں اس کی اچلی رنگت دمک رہی تھی۔ سرخی مائل خروئی بال ریٹم کے بچھوں کی طرح نکھرے ہوئے تھے۔ مصنوعی آرائش سے مبرا چہرے پر بلا کی دلکشی و جاذبیت تھی کہ نگاہ ہلک کر رہ جائے۔ مگر وہ بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ کوئی عام جذباتی و کمزور اعصاب انسان نہیں تھا۔ ایک اپنی ہی نگاہ ڈالنے کے بعد خاموشی سے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ نائٹ سوٹ بدل کر آیا تو اسے اپنا منتظر پایا۔

”تم اس کمرے میں سوؤ گے؟“

”یس..... کیوں کہ میں ان احمق شوہروں میں سے نہیں ہوں جو کسی بھی اختلاف کی بنا پر کمرے سے باہر یا کمرے میں صوفے پر سوتے ہیں۔ سائیز پر جاؤ۔“ اس نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور اپنا تکیہ اس کی گردن کے پیچھے سے کھینچ کر آگے ہونے کا اشارہ کیا۔ مشعل نے اس کے طرز عمل کو بہت استعجاب سے دیکھا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر اس کے لبوں پر طہر یہ مسکرا ہٹ ابھری تھی۔ مغرور نگاہوں میں چمک بڑھنے لگی تھی۔

”اوہ ہو..... مرد کتنا ہی اسٹراٹگ ہو مگر ”مسن“ اور ”سیکس“ اس کی کمزوری ہوتے ہیں۔ حسن کے جلوؤں کی تاب بڑے بڑے سورما نہیں لاسکے، سیکس کی کشش میں تو بڑے وضعدارو بے نیاز آؤ بن کر انگلیوں پر ناچتے ہیں۔ بہت جلد تم نے سر ہڈ کر دیا..... بس اتنی سی برداشت تھی تمہاری؟..... اتنی جلدی میرے حسن کے آگے سرنگوں ہو گئے؟“ اس کی زبان کی کاٹ تلوار کی کاٹ سے زیادہ کاری تھی۔

”محترمہ! آپ سمجھتی ہیں کہ مرد کا ٹھکانا کونسا ہے جس کو انگلیوں کی جنبش پر با آسانی نچایا جاسکتا ہے؟ آپ کا خیال ہے حسن بڑی طاقت ہے مرد کو زیر کرنے کے لئے..... آپ سمجھتی ہیں سیکس مرد کی بہت بڑی کمزوری ہے، اس کمزوری کی بنا پر عورت اسے اپنا غلام بنا سکتی ہے؟ ہوں..... مرد کے بارے میں آپ کا ہر خیال، ہر سوچ، ہر فلسفہ بالکل غلط ہے۔ آپ کے خیالات و نظریات انتہائی گمراہ کن ماحول کی پیداوار ہیں۔ آپ ایک بھٹکی ہوئی لڑکی ہیں۔ مرد کیا ہے یہ آپ جان ہی نہ سکیں۔ اپنی وے، اب میری رفیق حیات بننے کے بعد آپ کو معلوم ہو گا دراصل مرد ہوتا کیا ہے..... مجھے معلوم ہے کل رات کی آپ کی نگاہ میں کوئی کشش و وقعت نہ ہوگی جو یونہی گزر گئی۔ شادی کی پہلی رات کی اہمیت صرف وہی لڑکی سمجھ سکتی ہے جو اپنی حیا و نسا نیت کے وقار کو سنبھال کر رکھتی ہے، جو لڑکی عصمت کے تصور کو فرسودہ سمجھ کر اس کے ساتھ کھیلتی ہے وہ قابل احترام و قابل اعتبار نہیں ہوتی۔“

اس کے آنچ دیتے لہجے میں کیا تھا کہ وہ سن ہوگئی۔ اسے سی کی ٹل کوٹنگ میں بھی مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ نگاہیں اٹھنے کے قابل نہ رہی تھیں۔

”مردوں کو تو آپ کو کی کبھی نہیں رہی ہے..... مجھ غریب سے آپ کی شادی کا فیصلہ صرف انجوائے منٹ اور تھرل ہے، شوہر تو آپ کو بالکل بھی نہیں چاہئے۔ عاشق بھی آپ کے بے شمار ہیں۔ اور آپ یہ ازبر کر لیں میں وہ نہیں ہوں جو آپ نے سمجھا ہے اور نہ وہ بنوں گا جو آپ بنانا چاہتی ہیں۔ میری طرف سے آپ کی رو نمائی کا تحفہ یہی وارننگ ہے۔ آج اور ابھی سے ہی نیک و وفا پرست بننے کی جدوجہد شروع کر دیجئے، اوکے گڈ نائٹ۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیپ آف کر دیے۔ دبیز تاریکی ہر سو چھا گئی تھی۔ وہ سن دل و دماغ لئے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ سماعت، بصارت، کوپائی سلب ہوگئی۔ ہلنے چلنے کی سکت نہ تھی۔ صرف یکے بعد دیگرے ہوتے ذہن میں دھماکوں کو سن رہی تھی۔ اس نے کیا سوچا تھا؟ وہ کیا نکلا تھا؟ سنگدل، کٹھور، بے حس، لفظوں کی مار مارنے والا ظالم انسان۔

وہ آسمانوں پر اڑتی تھی۔

زندگی پھولوں، خوشبوؤں، اجالوں میں بسر کی تھی۔

جو چاہا وہ پایا، من مانی کرنا اس کا شیوہ تھا۔

اپنی منوانا جنونی ہابی تھی۔ اسے کسی نے گرم نگاہ کی مار مارنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔ از حد ناز و نعم میں پرورش پا کر وہ جوان ہوئی تھی۔

جوانی بھی کتنی ہوشربا تھی اس کی، جس نے دیکھا دیوانہ ہو گیا۔ دیوانوں کو ترپانا اس کا شغل تھا۔ وہ تڑپ عجب لطف دیتی تھی۔

مردوں کو وہ بے وقوف مخلوق سمجھتی تھی۔ اس کے شعور کے مطابق مردوں کی کمزوری، جسم ہوتے ہیں اور اسی کمزوری کا سہارا لے کر انہیں جس طرف چاہو بھکا دو۔ بھلا مرد کی زندگی کا مقصد ہی کیا ہے کہ وہ ہمیشہ حسین عورت کے تلوے چاٹتا رہے۔ خوب صورت عورت صرف چاہے جانے کے لئے ہوتی ہے، ناز اٹھوانے کے لئے ہوتی ہے۔ عورت اگر معاشی طور پر مضبوط ہو تو اسے کبھی مرد کی غلامی نہیں کرنی پڑتی۔ وہ تو ویسے بھی پاپا کی تمام جائیداد کی اکلوتی وارث ہے..... ہونہر، سمجھا کیا ہے خود کو؟ ذلیل، کمینہ، آٹو کا پٹھا، مکار، جھلساز.....

شدید غصہ اور نفرت اس کی رگ رگ میں ابوبن کر دوڑنے لگا تھا۔

”میں نہیں سوؤں گی یہاں۔“ اس نے آگے بڑھ کر ٹیبل لیپ روشن کر کے چیخ کر کہا۔

”اس وقت میں کوئی ڈرامہ برداشت نہیں کر سکتا..... خاموشی سے سو جاؤ۔“ وہ رخ موڑے ہوئے ہی سخت لہجے میں کوپا ہوا تھا۔

”میں تم جیسے گھنیا آدمی کے قریب رہنا اپنی تو جین سمجھتی ہوں۔“

”اب تمہیں عادت پڑ جائے گی۔“ اس نے ذرا بھی ماسد نہیں کیا۔

”ہرگز نہیں..... میں ابھی اسی وقت پاپا کے ہاں جاؤں گی۔“ ایک چھلانگ میں وہ بیڈ سے اتر گئی تھی۔ شاہویر کو مچو رہا بیٹھنا پڑا تھا۔

”سوری، یہ خواہش تمہاری پوری نہیں کر سکتا۔ حسن صاحب آج صبح ہی بنگاک کے لئے روانہ ہو چکے ہیں اور انہیں ایئر پورٹ سی آف کر کے آیا ہوں۔“

”وہاٹ..... وہاٹ.....؟ پاپا مجھے انفارم کئے بنا کیسے جاسکتے ہیں؟“ حیرت و بے یقینی سے اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

”ریلیکس پلیز، وہ تم سے ملنے آئے تھے، تم سوری تھیں۔ انہوں نے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایئر پورٹ سے انہوں نے کال بھی کی تھی مگر تم شاید تب بھی سو رہی تھیں۔ اس لئے کال ریسیو نہیں کی۔“ وہ اطمینان سے کہتا ہوا اس کے چہرے کے بننے بگڑتے زاویوں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

”تم مجھے اب بتا رہے ہو دھوکے باز آدمی..... جھوٹ بول رہے ہو تم..... پاپا کبھی بھی مجھے انفارم کئے بغیر نہیں جاتے۔“ اسے برا بھلا کہتی وہ چھپٹ کر سائیز ٹیبل پر رکھے موبائل کی طرف بڑھی اور پھرتی سے گھر کے نمبر زنجش کے جہاں ملازم نے کفر م کر دیا تھا کہ پاپا بنگاک گئے ہیں اور وہ ابھی کی کوئی اطلاع نہ تھی۔

بہت بری طرح شکا کڈ ہوئی تھی وہ..... از حد چاہنے والے پاپا کا کون سا روپ تھا یہ؟..... کیا وہ ایک ہی دن میں اتنی پرانی اور اجنبی ہوگئی، اس قدر غیر اہم اور ناقابل اعتبار



کہ انہوں نے پہلے اسے اپنے ٹور کے بارے میں آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ کیا ہوا؟ اپنے بیگانے بنا دیئے گئے تھے، غیروں کو ہر بات کی آگاہی تھی۔  
 ”پلیز سو جاؤ..... مجھے صبح آفس بھی جانا ہے۔“ وہ جو اس کی پل پل بدلتی حالت کا جائزہ لے رہا تھا، نرمی سے بولا اور ساتھ لپس آف کر دیئے تھے۔



رات نہ معلوم کون سے پہر تک وہ فون فون کرتی کمرے میں ادھر ادھر چکر لگاتی رہی۔ شاہ ویز آنکھیں بند کئے اس کی حرکات و سکنات سمجھ رہا تھا۔ کافی دیر بعد وہ بڑبڑاتی ہوئی صوفے پر جا بیٹھی تھی۔ شاید تھک گئی تھی۔ کمرے میں خاموشی ہوتے ہی شاہ ویز کی آنکھوں میں نیند اتر آتی تھی اور وہ بے خبر سو گیا تھا۔  
 حسب معمول صبح فجر کے وقت اس کی آنکھ کھل گئی تھی لیکن روز کی طرح آج وہ فوراً اٹھ کھڑا نہ ہوا تھا۔ رات دیر سے سونے کے باعث طبیعت میں کسکندگی تھی اور کچھ اعصاب ابھی تک اس اچانک ہونے والی اتنی اہم تبدیلی کو قبول نہ کر پائے تھے۔ عجیب بوجھل و بے کیف سی دھندل و دماغ پر چھائی تھی جس سے وہ خود کو اندھیرے کنوئیں میں مقید محسوس کر رہا تھا۔ دس منٹ تک وہ ساکت لیٹا سوئی جاگتی کیفیت میں چھت کو گھورتا رہا پھر ایک دم نماز قضا ہونے کے خیال نے اس کے اعصاب کو ہتھوڑ ڈالا تھا۔ تیزی سے بیڈ سے اتر اٹھا اور باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی نگاہ صوفے پر بے خبر سوئی ہوئی مشعل پر پڑی تھی۔ گلابی نائلی میں وہ خاصی بے ترتیبی سے سو رہی تھی۔ سفید دودھیائی ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا۔ سرخی مائل براؤن بال چہرے پر ریٹیم کی طرح کھمرے ہوئے تھے۔ وہ چند سیکنڈ اس کی طرف بغور دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کو انسانی ہمدردی کی رفق اس کے اندر پیدا ہوئی تھی۔ اس نے چاہا آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ اوپر کر دے مگر پھر دوسرے لمحے اسے احساس ہوا اسے ہاتھ لگانا کو یا قیامت چھیڑنے کے مترادف ہے۔

اس کی نیچر سمجھتے ہوئے وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے خیال کو ترک کر کے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ نماز اور ایکسرسائز سے فارغ ہونے کے بعد وہ آفس جانے کے لئے تیار ہونے کمرے میں آیا تو مشعل ہنوز بے خبر سو رہی تھی۔ البتہ اب ہاتھ سینے پر تھا۔ بے جی کی تربیت کا اعزاز تھا یا اس کے اندر ہی انسانی نیت کا لحاظ اور فطرت میں سادگی و حساسیت اعلیٰ پائے کی تھی جس کی بناء پر وہ از حد خاموشی سے تیار ہو کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ مشعل بے خبر سوئی رہی تھی۔

”کیا ہوا..... ناشتہ کیوں نہیں کر رہے..... کوئی پریشانی ہے؟“ بے جی ناشتے کی ٹیبل پر تمام لوازمات یوں ہی دھرے دیکھ کر اس سے مخاطب ہوئیں۔

”میں صرف چائے پیوں گا بے جی۔“ اس نے ٹی پائٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو بے جی نے ہاتھ تھام لیا۔

”میں خالی پیٹ چائے کبھی نہیں پینے دیتی۔ یہ اچھی طرح معلوم ہے تمہیں اور کیا بات ہے؟ کیوں اتنے فکر مند ہو۔ مجھے بتاؤ تو آخر..... ورزش کے بعد جوس بھی نہیں پیا ہے تم نے اور رات کو کبھی کھانے میں چند لقمے ہی لئے تھے۔“

”بے جی! جو بلا آپ نے میرے گلے میں ڈالی ہے اسی کا اثر ہے یہ۔“

”نرمی بات۔ وہ انسان ہے، ایسے مت کہو۔ انہوں نے زبردستی اسے فرائی انڈے اور ٹوسٹ کھانے پر مجبور کیا تھا۔ ساتھ رسائیت سے سمجھایا بھی تھا۔

”وہ انسان ضرور ہے مگر انسانیت سے دور کا بھی اس کا واسطہ نہیں ہے۔ بہت غلط کیا ہے آپ نے بے جی اس بد تمیز لڑکی کو بہو بنا کر۔“

”کیا غلط فیصلہ ہوا..... کیا، کیا اس نے؟“

”بے جی آپ فجر سے پہلے کی بیدار ہو چکی ہیں اور پہلے کی طرح ہی میری خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ کیا آپ کو محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کی بہو گھر آچکی ہے؟ کسی مڈل کلاس فیملی سے بہو لے کر آئیں تو اب آپ کو اس طرح کام نہیں کرنا پڑتا بلکہ وہ آپ کی خدمت کرتی اور میرا خیال رکھتی۔ تب محسوس ہوتا اس گھر میں آپ کی بہو اور میری بیوی آچکی ہے لیکن..... لیکن اب ایسا لگ رہا ہے کیا عذاب مول لے لیا ہو۔“

”اس طرح بدگمان مت ہو اس بچی سے۔ میرے کہنے سے زندگی کا اتنا اہم فیصلہ نہ رہی لیا ہے تو اسے اللہ کے بعد میرے حوالے کر دو۔ دیکھنا چند دنوں میں ہی کس طرح اس کے طور طریقے بدلتی ہوں۔ پھر خود ہی بڑے فخر سے اسے اپنی بیوی اور میری بہو تسلیم کرو گے۔“

بے جی کی خوش گمانیوں پر وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا تھا۔

”ہاں، ہاں..... ہنس لو، اڈالو میرا مذاق..... مجھے پروا نہیں۔“

”بے جی! میں بھلا ایسی گستاخی کر سکتا ہوں؟“ وہ فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا۔

”بہو کوناشتے میں کیا پسند ہے..... مجھے بتاؤ تا کہ اس کے اٹھنے پر تیار کر دوں۔“

”یہ تو آپ اپنی بہو صاحبہ سے خود ہی معلوم کیجئے گا۔“ وہ لاپرواہی سے کو یا ہوا۔

شاہ ویز ناشتے کے بعد آفس چلا گیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ رات دیر سے آئے گا۔ انہوں نے ناشتے کے برتن سیٹ کر ٹیبل صاف کی اور کچن میں برتن دھو کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ صفائی کرنے والی ماسی آگئی۔ ماسی کے جانے کے بعد گیٹ بند کر کے پکٹی ہی تھیں کہ وہ سامنے کھڑی نظر آئی۔ چہرے پر عنونت و مکمل بے زاری کے تاثرات سجائے۔

”اٹھ گئیں بیٹی!“ وہ مسکرا کر اس کی جانب بڑھتی ہوئی کو یا ہوئیں۔

”شٹ اپ، آئی ایم نوٹ بورڈرائز۔“ وہ خاصے تحقیر بھرے لہجے میں کو یا ہوئی۔ بے جی اس کی بات تو نہیں سمجھی تھیں مگر اس کے چہرے، آنکھوں و لہجے سے جھلکتی تحقیر و تحقیک نے انہیں پل بھر میں باور کرا دیا کہ اسے ان کا مخاطب کرنا برا لگا ہے۔ چند ٹانے وہ گولو کی کیفیت میں ٹھٹھک کر رک گئی تھیں مگر پھر ایک نئے حوصلے سے آگے بڑھی تھیں۔

”ناشتے میں کیا لیں گی آپ؟“ انہیں خود اس بار اپنا لہجہ اجنبی تھا۔

”اونٹنی ون کپ ٹی وڈاؤٹ شوگر۔“

”میں سمجھی نہیں بیٹی۔“ بے جی کو اس نے چند لمحوں میں گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔

”صرف ایک کپ چائے لے کر آؤ۔ وہ بھی بغیر چینی کے۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

بے جی پرانے خیالات کی عورت تھیں۔ ان کے ہاں صبح نہار منہ صرف چائے پینے کا رواج نہ تھا۔ ان کے خیال میں ناشتہ بھر پور انداز میں کرنا چاہئے کیونکہ صبح آغاز ہوتا ہے اور انسان کو رات تک ڈھیروں کاموں سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس لئے انسان کو شروع میں بھر پور توانائی حاصل ہونی چاہئے اور اسی نظریے کے تحت وہ پھرتی سے مشعل کے لئے چائے کے علاوہ دوسرے لوازمات بھی لائی تھیں اور بہت چاہ سے اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”صبح ہی صبح میں نہار منہ کبھی بھی شاہ ویز کو چائے پینے نہیں دیتی اور آپ کو کبھی نہیں پینے دوں گی۔ اس سے بہت نقصان ہوتا ہے۔ پہلے کچھ کھالیں پھر چائے.....“

”وہاٹ؟ اب مجھے یہ تم سے سیکھنا ہوگا کہ میرے لئے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں؟“ وہ شدید غصے میں تنناتی ہوئی کرسی کو ٹھوکر مار کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہیں بیٹی.....“

”شٹ اپ، میں نے کہا میں تمہاری بیٹی نہیں ہوں۔ مجھے پکارنے سے پہلے اپنی اوقات دیکھو، تم جیسی اولڈ وومن کو میں ملازم رکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ ہونہہ..... مجھے سکھانے چلی ہے ان پڑھ، گنوار عورت۔ اپنے اس جاہل، اجڈ بیٹے کو اپنے یہ جاہلانہ مشورے دینا۔ آئندہ کبھی میرے منہ لگنے کی کوشش مت کرنا..... انڈرائسٹنڈ؟“ وہ بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی۔ از حد بے حس و بد لحاظ تھی وہ۔ مکمل بد تمیز بھی۔ اسے بالکل پروا نہیں تھی کہ اس کے ان جملوں نے بے جی جیسی مشفق و با وقار شخصیت رکھنے والی عمر دار عورت کو کس قدر نام و شرم مندہ کر ڈالا تھا۔ وہ گم صم سی کھڑی رہ گئی تھیں۔ بھلا انہوں نے کب ایسی بد تمیزی و گستاخی دیکھی تھی۔ بلاشبہ گزرا ہوا وقت عسرت و تنگ دستی کا دکھارہا تھا مگر ان سے کبھی کسی نے اونچی آواز میں بات نہ کی تھی۔ کسی نے تحقیر کی نگاہوں سے نہ دیکھا تھا۔ ان کی طبیعت میں ہی وقار و مملکت تھی۔ کچھ وہ شروع سے ہی خوددار و حساس تھیں۔ کڑے سے کڑے وقت میں اللہ کے سوا کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلا یا تھا۔ آج اس دودن کی آئی لڑکی نے کتنی بد تمیزی سے اپنے قدموں تلے ان کی عزت، وقار و مرتبہ کچل ڈالا تھا۔ ان کی رگ رگ میں کراہیں پھیلتی چلی گئیں۔ سچ مچ ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اگر وہ آگے بڑھ کر کرسی تھام نہ لیتیں تو زوردار انداز میں زمین بوس ہوتیں۔ جب کہ مشعل نے چائے کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اوپر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پھر چند لمحے بعد دوبارہ برآمد ہوئی تو پرس ہاتھ میں تھا سسے گلہ سزا آنکھوں پر چڑھائے تیزی سے بیڑھیوں سے اتری تھی اور بے جی کو نظر انداز کر کے گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔

”کہاں جا رہی ہیں آپ؟“ بے جی لپک کر اس کی جانب بڑھی تھیں۔

”کیوں..... تمہیں بتانا لازمی ہے؟“ اس کا لہجہ ہنوز گستاخانہ تھا۔

”ہاں.....“ بے جی کو جلد ہی احساس ہوا شاہ ویز جو اس کے بارے میں کہتا تھا سو فیصد درست تھا۔ زیادہ نرمی برتنا اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

”کیوں کہ تم اس گھر کی بہو ہو اور ہمارے گھرانے کی بہوئیں ایسی شتر بے مہار نہیں ہوتیں۔ تمہیں اپنے گھر سے باہر جانے کے لئے شاہ ویز کی اجازت لینا لازمی ہے۔“

”اس گھرانے کی بہوئیں کیا ہیں اور کیا نہیں مجھے اس کی پروا نہیں اور نہ ہی میں کسی کے دباؤ میں آنے والی ہوں۔ میں اپنی لائف اپنے طریقے سے گزارنے کی عادی ہوں۔ یہاں میں کسی کا انٹرفیئر برداشت نہیں کر سکتی اور بانی داوے میں شاہ ویز سے اجازت کیوں لوں؟“

”وہ شوہر ہے تمہارا..... اسی کے حوالے سے تم اس گھر میں آئی ہو۔“

”شوہر.....“ وہ تھہہ لگا کر ہنسی۔ ”اپنے بیٹے سے پوچھنا میں نے اسے شوہر کا درجہ دیا ہے؟“

بے جی اس کی زبان درازی پر چکر اکر رہ گئیں جب کہ وہ سکون سے وہاں سے چلی گئی۔



پہلی مرتبہ زندگی میں انہیں ایسی بد تمیزی و تحقیر کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سودل پر یکخت ہی منوں بوجھ گر سا گیا تھا۔ مشعل کے جانے کے بعد کافی دیر تک وہ گم صم بیٹھی رہی تھیں۔ پھر ضمیر کے کسی کوشش سے ہی صدا ابھری تھی کہ اتنی جلدی پہلے ہی مرحلے پر ہمت ہار دی؟ شکست تسلیم کر لی؟ انہوں نے تو شاہ ویز سے بڑے دعوے کئے تھے اس کو

سدھارنے کے، راہ راست پر لانے کے اور بہترین و مکمل لڑکی بنانے کے..... وہ کیا ہوئے؟ سب نمک بن کر بہہ گئے اور یہاں انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اتنی جلدی شکست تسلیم نہیں کریں گی، جلد نہ سہی بہر حال کامیابی ضرور حاصل کریں گی۔

اس عزم نے ان کے حوصلے از سر نو توتا کر دیئے اور وہ مطمئن ہو کر اٹھ گئیں۔ اسی دم زرینہ آگئیں۔ سلام دعا کے بعد ادھر ادھر لگا ہیں دوڑا کر ان کی طرف چہرہ جھکا کر سرکوشی کرتے ہوئے کویا ہوئیں۔

”بہو بیگم کہاں ہیں؟“ بے جی جو پہلے ہی ان کے اس سوال کی توقع کر رہی تھیں گھبرا گئی تھیں۔ جھوٹ انہیں پسند نہیں تھا، سچ ان کی طبیعت بتانا کووارانہ کر رہی تھی۔ وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھیں کہ زرینہ اپنی جلدباز طبیعت کے باعث خود ہی کہہ اٹھیں۔

”اوپر ہوں گی اپنے کمرے میں..... اور کہاں جائیں گی؟ سچ آپ، مجھے تمہاری بہو کے لچھن اچھے نہیں لگے۔ نئی نوپلی دھن کے یہ طور طریقے ہوتے ہیں؟ اللہ تو بہ، نہ شرم نہ حیا۔ کیسے بے حیاؤں کی طرح ایسے ہی اٹھ کر چلی آئی تھی۔“

”ماں تو اس بچی نے دیکھی نہیں۔ آیاؤں کی کودوں میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ پھر آزادی بھی ہر قسم کی ملی۔ کوئی روک ٹوک نہیں، کوئی سمجھانے والی عورت نہ، پتو بچے بگڑ ہی جاتے ہیں۔ خیر سے اب یہاں آگئی ہے، رفتہ رفتہ سمجھ جائے گی۔“ بے جی نے اطمینان سے کہا۔

”ارے چھوڑو آپ! سب کو اپنی طرح سیدھی و معصوم نہ سمجھا کرو..... وہ جس قسم کی لڑکی ہے میں تو اس دن اس کے تیروں سے پہچان گئی تھی۔ کیسی تحقیر و اہانت تھی اس کی نگاہوں میں۔ کویا ہم کوئی انسان نہیں زمین پر ریگٹنے والے کیڑے، مکوڑے ہوں۔ اصغر کہہ رہا تھا دعوت کرنے کی مگر میں نے منع کر دیا۔ ہماری دعوت، ہمارا گھر کہاں تمہاری بہو کے مزاج کے شایان شان ہو سکتا ہے۔“

ان کے لہجے میں طنز نہیں بلکہ احساس کمتری و دکھ تھا۔ بے جی نے بہت محبت سے انہیں سمجھایا۔ کافی دیر وہ بیٹھی رہی تھیں اور اس دوران بے جی دل ہی دل میں یہ دعائیں مانگتی رہی تھیں کہ مشعل ان کی موجودگی میں نہ آجائے جو ان کا بھرم، ان کی عزت، بہن کے سامنے بکھر جائے اور شاید اللہ کو ان کا وقار عزیز تھا۔ زرینہ چلی گئیں مشعل کی آمد سے قبل ہی۔ انہوں نے تشکر بھرا سانس لیا تھا۔

شام کے سائے بڑھ کر رات کی تاریکی میں بدلنے لگے تھے۔ وہ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وضائف پڑھنے لگی تھیں اور پھر ان سے فراغت کے بعد بھی بہت نام گزر گیا تھا۔ مشعل ابھی تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ فکر و پریشانی ان کے اعصاب پر سوار ہوتی جا رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کہاں گئی ہے اور کس طرح معلوم کیا جائے کہ ابھی تک کیوں نہیں لوٹی ہے۔ کئی بار دل میں خیال آیا کہ شاہوین سے رابطہ کریں لیکن پھر ہر بار یہی سوچ کر اس خیال کو رد کرنا پڑا کہ وہ پہلے ہی اس سے بدظن و ناخوش ہے اب اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ مشعل گھر سے گئی ہوئی ہے اور وہ بھی بغیر اطلاع و اجازت تو وہ گھر میں طوفان مچا دے گا۔ شاید وہ اپنے آپ کو نظر انداز کرنا تو برداشت کر بھی لے مگر ان کی اجازت نہ لینے پر وہ قطعی برداشت نہ کر سکتا تھا۔

عشاء کی نماز پڑھ کر بھی خوب خشوع و خضوع سے انہوں نے مشعل کی خیریت سے لوٹ آنے کی دعائیں مانگی تھیں۔ ابھی وہ جا نماز تہہ کر رہی تھیں کہ فون کی بل بج اٹھی۔ ”ہیلو!“ انہوں نے قابل داد پھرتی سے ریسیور اٹھا کر کہا تھا۔

”بے جی! کیا ہوا؟ آپ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہیں؟“ دوسری طرف سے شاہوین کی پریشان کن آواز ابھری تھی۔ انہوں نے فوراً ہی خود کو کنٹرول کیا۔ ”صبح سے نکلے ہوئے ہواب گیارہ بجنے والے ہیں۔ گھر واپسی کی کوئی فکر ہی نہیں۔ پریشان نہیں ہوں گی تو خوش ہوں گی؟“

”اوہ تھینکس گاڈ! اور نہ میں سمجھا تھا آپ کی لاڈلی بہو نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔ سوری بے جی! دراصل آپ تو جانتی ہیں جو کاروبار کا حال ہے۔ یہاں حالات معمول پر لانے کے لئے مجھے انتھک محنت و جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک ڈوبے ہوئے تباہ حال جہاز کو دوبارہ سے ساحل پر کھڑا کرنا ہے اور ایسا کرنے کے لئے رات دن مجھے محنت کرنی ہے۔ اور آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔“

”میں بھی سٹھیاتی جا رہی ہوں۔“

”ایسا نہ کہیں بے جی! میں نے یہ بتانے کے لئے فون کیا تھا کہ میں لیٹ آؤں گا۔ آپ فکر مت کیجئے گا اور کھانا کھا لیجئے گا۔ میں کھانا کھا کر آؤں گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“

”بے جی! آپ کی لاڈلی بہو کمرے سے باہر بھی نکلی ہیں یا آپ وہیں خدمت کر رہی ہیں؟“ اس کی آواز میں شوخی تھی بے جی لمحہ بھر کانپ سی گئیں۔

”اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔ ٹھیک ہو جائے گی وہ بہت جلد۔ کھانا ڈھنگ سے کھانا، کبھی لاپرواہی سے دو تین لقمے لے کر ہی فارغ ہو جاؤ۔ بہت لاپرواہی برتنے ہو اپنی صحت کے بارے میں۔“

ریسیور رکھ کر وہ سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔ شاہوین کا لیٹ آنا انہیں ایک طرح سے امداد غیبی لگا تھا۔ اس کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد پھر نئے سرے سے انہیں مشعل کی غیر موجودگی کی تشویش ہونے لگی تھی۔

بالآخر ایک بجے کے بعد وہ گھر میں داخل ہوئی تھی اور قبل اس کے کہ وہ کچھ پوچھتیں وہ دھڑ دھڑ سیزھیاں جڑھتی اوپر غائب ہو چکی تھی۔

کچھ دیر انہوں نے انتظار کیا کہ وہ شاید نیچے آئے مگر وہ نہیں آئی تھی۔ انہیں خود ہی اوپر آنا پڑا۔ اوپر کمرے کا دروازہ اندر سے لاکڈ تھا۔

”ہوا زائے؟“ دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے اس کی چنگھاٹائی ہوئی آواز آئی۔

”کھانا کھا لو بیٹی۔“

”میں کھانا کھا کر آئی ہوں..... مجھے ڈسٹرب مت کرو، جاؤ یہاں سے۔“ تنہا نہ لہجہ، بے ادبی و بدتمیزی سے بھرپور تھا۔ وہ چند ساعتیں بند دروازے کو تاسف سے دیکھتی رہیں پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی وہاں سے نیچے آگئیں۔ یہ گھر جو کل تک انہیں اپنی پناہ گاہ لگا کرنا تھا جہاں وہ عزت و احترام و سکون محسوس کرتی تھیں آج یکھت خاردار جھاڑی بن گیا تھا جہاں ان کی عزت و وقار کی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔ دل کی عجیب ناقابل فہم سی حالت ہو گئی تھی۔ کبھی خوب آنسو بھر بھر چلے آتے تو کبھی وہ خود کو تسلی دے کر بہلانے لگتیں۔ اس کی گستاخیوں و بدتمیزیوں کو نا کھجی ولا ابالی پن سمجھ کر بہلانے کی سعی کرتے کرتے کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ شاہوین آگیا اور اسے دیکھ کر انہیں خود کو بالکل نارمل ظاہر کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی تھی۔

”کھانا لگاؤں؟“ وہ اس کے تھکے تھکے چہرے پر نگاہیں ڈال کر بولیں۔

”نہیں..... میں نے کہا تھا نا کھانا کھا کر آؤں گا۔“ وہ ناکی کی ناٹ ڈھیلی کرنا کویا ہوا۔

”اچھا پھر دودھ لے آتی ہوں۔“

”نہیں بے جی، ابھی کسی چیز کو طبیعت نہیں چاہ رہی ہے۔ صرف سونے کو دل چاہ رہا ہے۔“ اس کے لہجے میں شدید تنہگی تھی۔ بے جی فکر مندی سے کویا ہوئیں۔

”بیٹا! اتنی محنت مت کرنا کہ خود کو نشین ہی سمجھ لو۔“

”ابھی از حد پر ابلھر ہیں، بہت مسائل ہیں، ایک عرصے تک شاید خود کو مشین بنانا ہی پڑے گا۔ آپ کی دعائیں ساتھ رہیں تو انشاء اللہ بہت جلد ہم ان مشکلات و مسائل سے چھٹکارا پالیں گے۔“

”ہاں ضرور، اللہ محنت کبھی ضائع نہیں کرتا۔ انشاء اللہ بہت جلد سرخرو ہو جاؤ گے۔ جاؤ، جا کر آرام کرو۔ بہت رات گزر گئی ہے۔“ بے جی اٹھتے ہوئے کویا ہوئیں۔

وہ اوپر چلا آیا۔ دروازہ باہر سے نہیں کھلا جس کا مقصد تھا اندر سے لاک ہے۔ اس کے تھکن زدہ اعصاب ایک دم ہی کشیدہ ہو گئے تھے، فراخ پیشانی پر سلونٹیں پڑ گئی تھیں۔ جیب سے چابی نکال کر لاک کھولا تھا۔ اندر دیز تارکی نے اس کا استقبال کیا۔ ٹل اے سی کی کوئٹنگ نے اس کے اندر سردی لہر دوڑا دی۔ کمرے میں اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ چند لمحے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھنے کے باوجود ریڈنگ روم کی طرف نہ بڑھ سکا تھا۔ پھر اندازے کے مطابق بڑھا بھی تو کارپٹ پر پڑی کسی شے سے الجھ کر گر اٹھا۔ منہ پھٹے منہ پھٹے بھی نامعلوم ٹیبل یا صوفے سے اس طرح ٹکرا رہا تھا کہ اندھیرے میں تاریک نظر آگئے تھے۔ وہ ہونٹ بھیچھے اٹھنے لگا تو وہ شے اس کے ہاتھ میں آگئی جس سے وہ الجھ کر گر اٹھا۔ بلاشبہ وہ سینڈل تھی جو مشعل نے لاپرواہی سے پھینک دی تھی۔ شدید غصے میں سینڈل اس نے زور سے اچھالی اور خود اٹھنے لگا تھا۔ اسی لمحے مشعل کی چیخ کمرے میں گونجی تھی اور ساتھ ہی کمرہ ٹیبل یسپ کی روشنی سے منور ہو گیا تھا۔

”تم..... تم نے مجھے یہ سینڈل ماری ہے؟“ وہ سر پکڑے غرائی تھی۔

”یہ کیا جہالت ہے..... سینڈل یہاں رکھنے کی جگہ ہے؟“ وہ اس سے زیادہ سختی سے کویا ہوا۔

”ہاں..... میں انہیں یہاں ہی رکھوں گی۔“ ہٹ دھرمی اس کی سرشت تھی۔

”تمہیں اگر یہ اتنے ہی عزیز ہیں تو اپنے سر پر رکھو مگر میں اپنے کمرے میں یہ بڑھنگا پن پسند نہیں کروں گا اور تم نے کمرہ لاک کیوں کیا تھا؟ تمہیں معلوم نہیں کہ نیچے بے جی تنہا ہیں۔ بجائے اس کے کہ ان کی تنہائی شیر کرتیں، یہاں کمرہ لاک کر کے انہیں بالکل تنہا چھوڑ دیا۔ میں تمہیں انسانیت سے اس قدر عاری نہیں سمجھتا تھا۔“ وہ درشت لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”میرے آنے سے قبل وہ تمہاری غیر موجودگی میں کس کے ساتھ اپنی تنہائی شیر کرتی تھیں؟“ اپنی وے، مجھے عادت نہیں اولڈ ہیپلز کو کہنی دینے کی۔ مجھ سے ایسی توقع رکھنا بھی نہیں۔ میں تمہاری تھرڈ کلاس عورتوں کی طرح بوڑھوں کی خدمت کروں گی۔ مجھے نفرت ہے ایسی عورتوں سے جن کی صورتوں سے خوشامد گیتی ہے اور لباس سے لہسن، پیاز اور مسالوں کی بو آتی ہے۔“

”وہ تمہارے اس لباس سے پھوٹی فیتی مہک سے زیادہ فیتی و بے مثال ہے۔ وہ خوشامد نہیں بلکہ ان کی نیک نیتی و وفاداری کا ایسا خوب صورت نور ہے جو تمہارے پھٹکار زدہ چہرے پر کبھی چمک ہی نہیں سکتا۔ ان عورتوں کے مقابلے میں تم از حد بد صورت بلکہ کریہہ صورت ہو۔“ وہ غصے سے بولتا ہوا واش روم کی طرف بڑھ گیا اور کچھ

دیر بعد جب وہ ٹائٹ سوٹ بدل کر باہر آیا تو وہ نیچے تیز کئے بیٹھی تھی۔

”کیا کہاتم نے مجھے..... میں بد صورت ہوں؟ کر یہہ صورت ہوں؟ تمہارے لو اسٹینڈرڈ کی عورتوں کے آگے کچھ نہیں، میں..... یعنی اس ملک کے ٹاپ بزنس میں حسن بیگ آفندی کی اکلوتی بیٹی، جس کے کُسن کے چہ ہر سو ہیں، جس کی ایک نگاہ کے لئے لوگ مر مٹنے کے لئے تیار رہتے ہیں، جو زمین پر نہیں اپنے نامراد عاشقوں کے دل پر چلتی ہے۔ میرا مقابلا اپنی ان کالی کلونٹی، بے ہنگم و بے ڈھب عورتوں سے کر رہے ہو جن کو ان کے مرد ہی نظر بھر کر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔“

”بہی فرق ہے ان عورتوں میں اور تم میں..... وہ عورتیں کسی غیر لڑکے کے نام کو اپنی زبان پر لانا بھی گناہ عظیم سمجھتی ہیں اور تم جیسی تھرڈ ڈبیت بڑے فخر سے اپنے مجازی خدا کو اپنے نام کا عاشقوں کے مشغلے بتا رہی ہے۔ عصمت و حرمت کیا ہوتی ہے تم کیا جانو۔ اپنی وے میں مزید بک بک سننے کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ پلیز خود بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو، بہت تھکا ہوا ہوں۔“ اسے غصے سے ہل کھانا دیکھ کر وہ ڈپٹ کر کویا ہوا اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔

”خوب جانتی ہوں میں تم جیسے شریفوں کو۔“

”میں نے کہا نا اب کوئی آواز نہیں آتی چاہئے۔“ اس دفعہ وہ اتنی سختی سے بولا تھا کہ اس کی زبان دوبارہ نہ کھل سکی۔ اس نے اس کے برابر سے نکلیے گھسیٹا اور لائٹ آف کر کے صوفے پر دراز ہو گئی۔



”سرا بہت پر ابلخر ہیں..... اگر اس ماہ کے آخر تک بینک کو انٹالمنٹ نہیں پہنچی تو وہ قانوناً بینک صاحب کی فیکٹری فروخت کر کے اپنی رقم حاصل کرنے کے حقدار ہوں گے اور ایک فیکٹری اور ان کے ذاتی بنگلے کے علاوہ اب کچھ بچا بھی نہیں ہے۔ لیکن سرا اگر یہ فیکٹری اور بنگلہ فروخت ہو بھی گیا تو ہم بینک کو مکمل قرضہ پھر بھی نہ لوٹا سکیں گے۔ بھاری رقم پھر بھی ہم پر ڈیور ہے گی اور اس طرح وہ سب منظر عام پر آجائے گا جو ہم بمشکل لوگوں کی نگاہوں اور پریس سے چھپاتے آئے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ برسوں کی عزت و وقار خاک میں مل جائے گا۔ جس کو بینک صاحب کبھی بھی برداشت نہ کر پائیں گے۔“ حسن بیگ کے پرانے منیجر نے مکمل کھانا اس کے آگے کھول کر رکھ دیا تھا۔ وہ کچھ دیر گم سم بیٹھا رہا پھر کچھ تو قف کے بعد کویا ہوا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا ایسا کیوں ہوا؟ بینک صاحب بہت سادہ و نیک انسان ہیں۔ عام بڑے لوگوں کی طرح ان میں کوئی بھی بیڈ ہیٹ نہیں ہے۔ میں نے انہیں ہر قسم کی خرافات سے دور دیکھا ہے پھر یہ سب..... اتنا زبردست لاس میری سمجھ سے باہر ہے۔“

”بلاشبہ آپ کی باتیں بالکل درست ہیں..... بینک صاحب بالکل سیدھے اور متقی قسم کے بندے ہیں اور ساتھ ہی بے حد سخاوت و عطاوت طبیعت بھی پائی ہے۔ ان کی آمدنی کا آدھا حصہ تو غریب و نادار لوگوں کی خدمت کے لئے وقف تھا۔ کئی ٹرسٹ ان کی زیر نگرانی چل رہے تھے۔ خیر نیکی تو کبھی ضائع نہیں جاتی۔ یہ ان کی نیکیوں کا ہی اجر ہے کہ سب کچھ تباہ ہونے کے باوجود ان کی ساکھ و عزت برقرار ہے بلکہ ان کے قریبی لوگوں کو بھی معلوم نہیں ہے اور ہماری کوشش یہی ہے کہ کسی کو معلوم نہ ہو اور ہم جلد اشیاء ہوجائیں۔ لیکن آپ کو غفلندی اور حد درجہ سمجھداری سے کام لینا ہوگا۔ بینک صاحب اپنی سادگی و اعتماد کے توڑ دیئے جانے پر اس حال کی طرف بڑھے ہیں۔ دراصل بزنس میں وہی کامیاب ہوتا ہے جو بزنس کو بزنس کی طرح کرتا ہے۔ یعنی میرا مطلب ہے بزنس میں کوئی مروت و رعایت نہیں کرنی چاہئے۔ اگر کریں بھی تو اس حد تک کہ آپ اور آپ کا بزنس اس سے متاثر نہ ہو اور اس میدان میں بینک صاحب نے اپنی فطری ہمدردی و نرم دلی دکھائی تھی اور ان کو اس حال تک پہنچانے والے کوئی غیر نہیں خود ان کی سگی بہن، ان کے شوہر اور بہن کا بیٹا شامل ہے۔ بلکہ مشعل بی بی بھی اپنے فادر کی طرح طبیعت کی مالک ہیں۔ انہیں بھی ان لوگوں نے خوب بے وقوف بنایا۔ تینوں تو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے تھے ہی ساتھ مشعل بی بی کو بھی بہلا کر بے حساب دولت سمیٹی ہے اور وقت پڑنے پر پیٹھ دکھا کر چلے گئے۔“

”بے فکر ہیں آپ..... میں لوگوں کی فطرت سے جلد واقف ہو جاتا ہوں نہ موقع پرست ہوں اور نہ ہی لوگوں کو موقع دیتا ہوں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اب میرے لئے کیا حکم ہے؟“ وہ فوراً کھڑا ہو کر مؤدب لہجے میں کویا ہوا۔

”ورکرز کی کیا کنڈیشن ہے؟ کیا وہ چند ماہ ہاف سٹری پر کام کرنے پر راضی ہو جائیں گے؟ بعد میں انہیں ان کی سیلریز سے ڈبل رقم ادا کی جائے گی۔“

”میں ورکرز یونین کے لیڈر سے بات کر کے آپ کو جواب دوں گا۔“

”اوکے، میں بھی چند دنوں میں ٹائم نکال کر ان سے بات کروں گا۔ فی الحال تو ابھی آرڈرز کی دستیابی کے لئے شدید محنت کرنا پڑے گی اور ساتھ ہی میں مکمل کوشش کروں گا بینک منیجر کچھ عرصہ خاموش ہو جائے اور انشاء اللہ ایسا ہو جائے گا۔ کیونکہ ہمارا ریکارڈ بہت اچھا رہا ہے۔“ اس کے لہجے میں یقین و امید تھی۔



دو ہفتے سے زائد دن گزر گئے تھے۔ مشعل کی وہی روٹین تھی، اپنی مرضی سے گھر سے نکل جانا اور رات دیر سے گھر میں داخل ہونا۔ شاہ ویز اس دوران بزنس کے الجھاؤ میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ صبح جلد گھر سے نکل جاتا تھا اور اس کی واپسی رات کافی دیر تک ہوتی تھی اور واپسی پر وہ اس حد تک تھکا ہوا ہوتا کہ بے جی بالکل رسمی بات چیت کرتی تھیں اس کی تھکن کے خیال سے۔ جب کہ مشعل کو شروع میں انہوں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی ہٹ دھرمی اور گستاخوں کے باعث خاموش ہو گئیں۔ اب انہیں ہر وقت یہ خوف ستانے لگا تھا کہ کبھی اس کی غیر موجودگی میں شاہ ویز گھر آگیا تو کیا ہوگا؟ وہ کیا جواب دیں گی؟ اور پھر کیا ہوگا؟ یہ سوالات واندیشے انہیں ہر دم پریشان کئے رکھتے اور وہ یہی دعائیں مانگتیں کہ مشعل شاہ ویز کی آمد سے قبل گھر آجائے اور ابھی تک ایسا ہی ہوا تھا اور بہت دآئشندی سے انہوں نے اس کی ان حرکتوں کو پوشیدہ رکھا تھا۔

لیکن ہر وقت دعائیں مستجاب نہیں ہوتیں اور اکثر وہ بھیڈ کھل جایا کرتے ہیں جن کو ہم پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ حالات بدلتے اور بگڑتے کیا دیر لگتی ہے۔ آج بھی مشعل حسب معمول صبح سے غائب تھی اور اب رات کے بارہ بج چکے تھے اور اس کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ شاہ ویز نے کارپورچ میں کھڑی کی اور اندر جانے کے لئے قدم بڑھا ئے ہی تھے کہ گیٹ کھلا دیکھ کر وہ چونک کر اسے مخاطب ہوا۔

”خان بابا! گیٹ بند کیوں نہیں کیا؟“

”صاحب! ابھی چھوٹی بیگم صاحبہ کا انتظار کرتا ہے۔“ چونک کر اس نے مستعدی سے جواب دیا۔

”چھوٹی بیگم صاحبہ..... کون؟ کس کی بات کر رہے ہیں؟“ وہ پریشان سا اس کی طرف بڑھ گیا۔

کار کی آواز سن کر گھبرا کر میسر سے جھانکتی بے جی اسے حیران و پریشان چونک کر اس کی طرف بڑھتے دیکھ کر خوف، گھبراہٹ و پریشانی سے کانپ اٹھیں۔

”ہمارا چھوٹا مالکن..... آپ کا بیوی صاحب۔“ چونک کر اس نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے لمحے بھر کو اسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں ہوا تھا۔

”کب گئی تھیں وہ؟“ اس کے چہرے پر اتنی سرخی بے جی اوپر سے صاف دیکھ رہی تھیں۔ بالآخر وہی ہوا جس کا انہیں ڈر تھا۔

”وہ صاحب! روز جاتا ہے۔ کبھی گیا رہ بجے، کبھی دس بجے اور کبھی بارہ بجے، پھر رات کو بھی ایسا ہی آتا ہے گیا رہ، بارہ بجے تک۔“ ادھیر عمر کا وہ پٹھان چونک کر بہت سادگی سے اسے اپنی ڈیوٹی سمجھ کر معلومات فراہم کر رہا تھا۔

شاہ ویز کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اپنی بے خبری پر اسے رنج تھا۔ وہ سیدھا اندر چلا آیا۔ بے جی اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہی تھیں۔ انہوں نے عشاء کی نماز پڑھ لی تھی۔ پھر اس کے سوالوں سے بچنے کے لئے نفلوں کی نیت باندھ لی تھی۔ شاہ ویز ان کے کمرے سے نکل آیا اور لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ اسے خود پر غصہ تھا کہ اچھی طرح اس کی نیچر کو جاننے کے باوجود بھی اس نے کیوں اس سے غفلت برتی۔ بے شک بزنس کے مسئلوں میں الجھ کر وہ خود سے بھی غافل ہو گیا تھا مگر اب احساس ہو رہا تھا کہ ان مسئلوں میں بڑا مسئلہ تو خود اس محترمہ کی ذات کا ہے۔

بے جی کے گریز و اجتناب سے وہ سمجھ گیا کہ یقیناً اس کے سوالات سے بچنے کے لئے جاء نماز پر کھڑی ہوئی ہیں ورنہ وہ اذان ہوتے ہی نماز ادا کرنے کی عادی ہیں۔ خود بخود ہی اس پر یہ بات عیاں ہوگئی کہ وہ بے جی کو بھی مطلع کر کے نہیں جاتی ہوگی کہ کہاں جا رہی ہے؟ کیوں جا رہی ہے؟ اس خیال نے اس کی رگ رگ میں انگارے دوڑا دیئے۔ بے جی کی تو جین اسے محسوس ہوئی۔ ایک بجے کے بعد صبر و ضبط کی حدوں سے وہ نکل گیا تھا۔

مشعل مسکراتی، گنگنائی اندر داخل ہوئی تھی۔ پہلی نظر سامنے صوفے پر بیٹھے شاہ ویز پر پڑی۔ خلاف معمول اسے آج خود سے پہلے موجود دیکھ کر ایک ساعت کو ٹھٹھکی تھی۔ پھر اس کے سامنے سے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر کے اس طرح گزر گئی جیسے وہاں رکھے بے جان فرنیچر کا وہ بھی ایک حصہ ہو۔

”شاہ ویز! درگزر سے کام لینا بیٹے، وہ ابھی نا سمجھ ہے۔“ بے جی اسی لمحے باہر آ کر بہت نرمی سے اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”شکر ہے آپ کی نظلیں تو ختم ہوئیں۔ میں سمجھا تھا آپ نے ایک لاکھ کی نیت باندھ لی ہے۔“ وہ خفگی سے کویا ہوا۔

”جاؤ آرام کرو، میں دودھ کمرے میں رکھ آئی تھی۔“

”بے جی! آپ کو صرف ہاں یا ناں میں جواب دینا ہے، بالکل ایمانداری کے ساتھ۔ مشعل آپ کی اجازت سے جاتی ہے؟“ وہ اس وقت سنجیدگی سے کویا ہوا۔

”میں نے کہا نا وہ نا سمجھ ہے۔“ بے جی گڑبڑا کر کویا ہوئیں۔

”نہیں بے جی! یہاں بات نا سمجھی کی نہیں، میری حمیت و وقار کی ہے..... آپ کو اللہ کو حاضر و ناظر جان کر سچائی کا ساتھ دینا ہوگا۔“ اس نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا تو بے جی کو سچائی کا دامن تھا منا پڑا۔ انہوں نے انکار میں گردن ہلا دی تھی۔ لیکن آگے بڑھ کر رقت آمیز لہجے میں بولیں۔

”اے معاف کر دو میٹا! فضول میں بات بڑھانے سے تماشہ بنے گا۔“

”آپ فکر مت کریں بے جی! ہمارا اتنا شاہنے کے دن گزر گئے ہیں۔ آپ جا کر آرام کریں، بہت ٹائم ہو گیا ہے۔“ اس نے زبردستی انہیں کمرے میں بھیجا تھا۔ وہ بیڈ روم میں داخل ہوا تو مشعل نا کئی پہنے ہاتھ روم سے برآمد ہوئی تھی۔

”کہاں گئی تھیں؟“ وہ اس کے قریب آتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

”کیوں بتاؤں؟“ وہ بالوں میں برش چلاتے ہوئے لاپرواہی سے گویا ہوئی۔

”شرافت سے بتاؤ، میرے ضبط کا امتحان مت لو۔“ اس کی آواز میں انگارے دکھ رہے تھے۔ ”تمہاری ہمت کیسے ہوئی بے جی کی اجازت کے بغیر یہاں سے قدم نکالنے کی۔“

”اوہ..... تو یوں کہو نا اس بڑھیا نے کان بھر دیئے۔“

”شٹ یور ماؤتھ..... اگر بے جی کی شان میں کوئی گستاخی کی تو زبان کھینچ لوں گا۔“

”مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر! میں کسی کی دھونس میں آنے والی نہیں ہوں اور ہمیشہ اپنی مرضی سے چلنے کی عادی ہوں۔“

”جبر انہی سہی، نا پسندیدگی کے باوجود تم میری زندگی میں شامل ہو چکی ہو اور ہمارے یہاں اپنی مرضی نہیں ہمیشہ بیوی کو شوہر کی مرضی کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ اپنی نہیں، ہسپنڈ کی مرضی مقدم سمجھی جاتی ہے۔“

”شو..... ہر..... ہونہ، شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں؟ تم تو میری پرچھائیں چھونے کے قابل نہیں ہو۔ میں نے صرف پاپا کی خاطر یہ قبول کیا ہے، وہ بھی چند دنوں کے لئے۔ ورنہ اس ڈربنما گھر میں رہنا میری توہین ہے۔“

شاہ ویز کے جبر اور نا پسندیدہ لفظوں نے اس کے اندر احساس توہین بیدار کر دیا تھا۔ منہ پھٹ وہ سدا کی تھی، خود پرست انتہا کی۔ اپنی ذات کے بارے میں ریمارکس وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ جو اب شاہ ویز کو اس نے کھری کھری سنائی تھیں۔

”تمہارے لئے یہ رشتہ جوڑنا جتنا آسان تھا میرے لئے یہ رشتہ توڑنا اتنا ہی مشکل، بلکہ ناممکن ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے ساری تو انائی رشتہ مضبوط کرنے پر لگاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو لوگ تمہارا تماشہ دیکھیں اور تم منہ چھپاتی نظر آؤ۔“ اس کی سر دوشک آواز گونجی۔

”میں تمہارے منہ لگنا نہیں چاہتی۔“ وہ صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے چبکی۔

”میری بھی ایسی گھٹیا خواہش نہیں ہے۔“ وہ دوبارہ بولا۔

”تو سر پر کیوں سوار ہو؟“

”کہاں گئی تھیں..... اور کس کی اجازت سے.....؟“

”تم جاتے ہو..... تمہیں کوئی روکتا ہے؟“

”مجھے روکنے والا ایسا کوئی پیدا نہیں ہوا۔ نہ ہوگا۔“

”میں بھی اپنی مرضی کی مالک ہوں۔“ اس نے شانے اچکا کر کہا۔

”اس گھر میں صرف میری مرضی چلے گی۔“

”اس گھر میں حکمرانی کی خواہش بھی نہیں ہے۔“

”تمہیں میری مرضی پر چلنا ہوگا۔“

”میں کسی کی مرضی کی تابع نہیں ہوں۔“

”میں تمہارا شوہر ہوں.....“

”میں اپنے آپ کو تمہاری بیوی نہیں سمجھتی۔“

”تمہارے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے حقیقت بدل نہیں سکتی۔“

”تم شوہر بنائے جانے کے قابل نہیں ہو اور نہ میں تمہیں کبھی شوہر تسلیم کروں گی۔“

”ہا..... پہلے خود کو اس قابل تو بنناؤ کہ تمہیں بیوی کا درجہ دیا جائے۔“ اس کے لہجے میں مکمل طنز و تضحیک تھی۔ مشعل کے انگ انگ میں شرارے پھوٹنے لگے۔

”شٹ اپ..... تم نہایت گھٹیا، کمینے، ذلیل انسان ہو۔ مکار، چالاک و فریبی شخص..... میرے پاپا کی دولت و جائیداد پر قبضہ جمانے کے لئے تم جیسے فقیر و کمتر انسان نے کتنی اچھی اداکاری کی۔ شرافت و سعادت مندی کا ڈرامہ کھیل کر میرے معصوم و سادہ مزاج ڈیڈی کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو تم جیسے کنگلے کے نکاح میں دے گئے۔“

”خاموش رہو.....“ اس کی آنکھیں ابھورنگ ہو رہی تھیں۔“

”کسی میں ہمت نہیں ہے مجھے خاموش کروانے کی۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ مجھے نہیں رہنا تمہارے ساتھ۔“ وہ پاؤں شیج کر گویا ہوئی۔

”میں لحاظ کر رہا ہوں ورنہ تمہیں خاموش کرنا اچھی طرح جانتا ہوں..... اب تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نہیں جانی چاہئے۔“

”تم میری آواز نہیں بند کر سکتے..... میں سب کو بتاؤں گی، پوری دنیا کو بتاؤں گی کہ تم کون ہو۔“ وہ حلق پھاڑ کر چیختی ہوئی صوفے سے اٹھ گئی تھی۔

”کون ہوں میں؟“ ضبط و برداشت کے کناروں پر تھا وہ۔

”مکار، فریبی، چالباز، کسی بے نام و نشان خاندان کے فرد..... جن کا کام بڑے لوگوں کی چالوسی کرنا، ان کا اعتماد جیتنا ہے تاکہ ان کی دولت پر قبضہ کر سکو۔ یہی تم جیسے لوگوں کا پلان ہوتا ہے جو تم نے میرے ذریعے حاصل کیا۔ اتنی دولت جائیداد کبھی تمہارے باپ نے بھی خواب.....“

تڑاخ تڑاخ، تڑاخ، عورت کی زبان لمبی ہوتی ہے تو مرد کے ہاتھ دراز ہوجاتے ہیں۔ وہ جوضبط کی طنائیں پوری شدت سے کھینچے کھڑا تھا، بات اس کی ذات تک رہتی تو وہ کبھی بے قابو نہ ہوتا مگر خاندان اور پھر باپ تک کوئی اس کے پہنچ جائے وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ شدید طیش میں آگے بڑھا تھا۔ لمحے بھر میں مشعل کا کول کول چہرہ سرخ اٹھ رہا بن گیا۔ رگ رگ میں جلن و درد کی محسوس اٹھنے لگیں۔ وہ دونوں ہاتھ رخساروں پر رکھے سششدرسی، بے یقینی سے اس کی جانب دیکھے جارہی تھی۔

□●□

حسن صاحب سے کئے گئے وعدوں کی زنجیر نے اسے باندھ رکھا تھا مگر آج وہ اپنی برداشت و حد کھو چکا تھا اور اسے ذرا بھی ڈھیل دینے کا روادار نہ تھا۔ مشعل پر ہاتھ اٹھانے پر اسے کوئی شرمندگی یا پشیمانی نہ تھی البتہ وجہ یہ چہرے پر قہر و غصے کے رنگ ہنوز پھیلے ہوئے تھے۔

”انسان اور جانور میں تم کوئی فرق نہیں سمجھتی مگر اب میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ انسان سے کس طرح مخاطب ہوتے ہیں اور آئندہ میرے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بولنے سے قبل آج کے یہ لحاظ یاد رکھنا اور یہ بھی اپنی ناقص عقل میں یاد رکھنا کہ مرد کا ہاتھ ایک بار اٹھ جائے تو کبھی رکتا نہیں۔ تم جیسی لڑکی پر مجھے بار بار ہاتھ اٹھانے پر کوئی شرمندگی یا محسوس بھی نہ ہوگا۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ ساتھ ہی زوردار آواز میں دروازہ بند کر کے۔

وہ چلا گیا اور اس کے گم صم حواس لوٹ آئے۔ لبوں سے آہ و نغائ کا طوفان بہہ نکلا۔

”پاپا..... پاپا..... آپ مجھے کس وحشی کے حوالے کر گئے ہیں؟ کس قصائی کے سہارے چھوڑ گئے ہیں؟ وہ سنگدل جو جھکنا نہیں جانتا، جس کا ظاہر جتنا پُرکشش و خوب صورت ہے باطن اتنا ہی سیاہ و بد ہیئت۔ مجھے بچائیں پاپا..... مجھے بچائیں۔ وہ وحشی مجھے مار ڈالے گا..... مجھے مار ڈالے گا۔“ روتے روتے بیڈ پر ڈھسے گئی۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ رونی تھی۔ بے تحاشہ، پہلی مرتبہ ہی کسی نے اسے درد سے آشنا کیا تھا ورنہ آج سے پہلے تو وہی لوگوں کو زخم لگاتی آئی تھی۔ ہاتھ سے بھی اور زبان سے بھی۔ اب احساس ہو رہا تھا درد کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ چوٹ کس طرح جسم کے ہر عضو میں سرایت کر کے بے چین کر ڈالتی ہے۔

تھپڑوں سے زیادہ اس ظالم و بے حس شخص کی زبان سے نکلے لفظ جہ کے لگا چکے تھے۔ وہ دہری اذیت میں مبتلا تھی۔ روتے روتے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ رات گزرنے کو تھی۔ وہ پلٹ کر نہیں آیا تھا اور اسے پرواہ بھی نہ تھی۔ پہلے تو وہ صرف اس سے چڑتی تھی مگر اب نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ دونوں رخسار سوچ گئے تھے جن پر اس درد نے کی انگلیوں کے نشان ثبت ہو کر چہرے کی تمام خوبصورتی ماند کر رہے تھے۔

”میں مزہ چکھا دوں گی تجھے کمینے انسان..... کیا سمجھ کرٹو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا؟ اس ملک کے بڑے بزنس مین کی بیٹی ہوں، کسی گھسیارے کی اولاد نہیں۔“ وہ غصے سے کھولتے ہوئے تصور میں شاہ ویز سے مخاطب ہوئی تھی۔ پھر لائٹ آف کر کے بیڈ پر سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔

□●□

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بے جی کے پاس کچن میں چلا آیا۔

”بے جی! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں کہ آپ نے مجھ سے مشعل کی حرکات چھپائیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اس پسند و صلح جو طبیعت کی مالک ہیں مگر بے جی، پلیز اب آپ اس کی بالکل طرف نداری نہیں کریں گی۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ انسانیت و احساسات سے بالکل عاری ایک خود پسند و خود پرست لڑکی ہے جس کو اپنے علاوہ سب جانور نظر آتے ہیں۔“ وہ از حد سنجیدہ تھا۔

”کیا تم نے کچھ کہا اسے؟“ بے جی چونک کر گویا ہوئیں۔

”اے انسان بنانے کا وقت آگیا ہے۔ اب اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ ہوگی۔“

”یہ بات غلط ہے شاہ ویز! اس گھر میں آئے اسے صرف ایک ماہ ہوا ہے۔ ابھی اسے ہمارے ماحول کو سمجھنے اور اپنانے میں وقت لگے گا۔ ہمارے گھرانوں کی لڑکیاں جب دلہن بن کر آتی ہیں تو انہیں ایک عرصہ لگتا ہے سسرال میں گھلنے ملنے میں، پھر وہ تو بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ محلوں میں رہنے والی شہزادیوں کی مانند زندگی گزارنے کی عادی۔ اس گھر میں اسے پہلے میں کافی وقت لگے گا۔“ انہوں نے نرم روی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کوئی شہزادی و ہزارادی نہیں ہے..... بد تمیز و خود سر روح ہے وہ۔ میں آفس جا رہا ہوں اور پلیز..... پلیز بے جی۔“ اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ملتی لہجے میں کہا۔ ”وہ کتنا بھی شور کرے، چپے چلائے آپ اوپر نہیں جائیں گی۔“



”کیا مطلب..... کیا بند کر کے جارہے ہو اس کو؟“ تھیر آ میز لہجے میں استفسار تھا۔

”بند کر کے ہی جا رہا ہوں بے جی۔“ اس نے بے جی کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا اور ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر سانسیت سے کوپا ہوا۔

”جسم کے کسی حصے میں کینسر ہو جائے تو اس عضو کو جسم سے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے باقی بدن کی فلاح کے لئے بقا کے لئے۔ اور آپ کی جو ہوسا حبہ ہیں ان کی بد مزاجی و بد تہذیبی کینسر سے بھی زیادہ مہلک و متباہ کن ہے۔ اس کا علاج نرمی و تحمل مزاجی سے ہرگز نہیں ہوگا۔ اس کے لئے ہمیں بہت صبر برداشت کی ضرورت پڑے گی۔ یہ سمجھئے کہ آج انہیں ٹریٹمنٹ کی پہلی ڈوز دی جا رہی ہے۔ آگے اس سے بھی زیادہ ہیوی ڈوز آئیں گے جس کی آپ کو ابھی سے عادت ڈالنی ہوگی اگر چاہتی ہیں وہ محترمہ انسانیت سمجھ جائیں۔“

”یہ میری ہی نہیں اس کے باپ کی بھی خواہش ہے مگر اس طرح.....“

”پلیز..... پلیز بے جی! آپ اس طرح یا اس طرح بالکل نہیں کریں گی صرف میرے ساتھ تعاون کریں گی۔ اوکے، میں جا رہا ہوں۔ امید ہے آپ میری پریشانیوں کو کم کرنے میں میری مدد کریں گی۔“ وہ انہیں کوگو کی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا۔ چند ثانیے بعد وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

اس وقت انہیں شدت سے احساس ہو رہا تھا اپنی غلطی کا، اپنی جلد بازی اور غلط فیصلے کا۔ شاہ ویز کے انکار کو انہوں نے کوئی اہمیت یہ سوچ کر نہ دی کہ وہ اپنی شرمیلی عادت کے باعث یونہی دکھاوے کو انکار کر رہا ہے ورنہ ہسپتال میں اس کے درشت لہجے کے باوجود وہ خود اس کے خُسن سے مبہوت ہو گئی تھیں۔ گلاب سی رنگت والا تروتازہ شاداب چہرہ، ستواں ناک، دراز پلکوں کی چھاؤں میں جگر جگر کرتی آنکھیں، پھول کی پتھڑیوں سے یا قوتی لب..... وہ سراپا خُسن تھی۔ پھر بھلا کوئی مرد اتنی حسین لڑکی سے کیونکر رشتہ استوار کرنا نہ چاہے گا۔ یہی سوچ کر انہوں نے بہت تیزی سے اسے اس کی شریک سفر بنایا تھا اور اب ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ حسین صورت رکھنے والے ضروری نہیں کہ حسین سیرت بھی ہوں۔ شاہ ویز عام مردوں کی طرح خُسن پرست نہ نکلا تھا ورنہ صورت حال یہ ہرگز نہ ہوتی۔

”کتنی بڑی خطا ہو گئی مجھ سے..... شاید اس کا ازالہ میں کر بھی نہ پاؤں۔ ساری زندگی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے اور چند جذباتی لمحوں میں خود کو ہی عریاں کر ڈالا۔ آہ، کاش میں شاہ ویز کی بات مان لیتی اور متوسط طبقے سے ہی بہولے آتی تو آج میں بھی مطمئن ہوتی اور میرا بچہ بھی ازدواجی زندگی کی سرتیں سیٹ رہا ہوتا۔“ وہ خود سے مخاطب تھیں۔ پچھتاوے کسی ناگ کی طرح انہیں ڈس رہے تھے۔



وہ پریشان سا، کاربے مقصد دوڑاتا پھر رہا تھا۔ آفس میں بھی کوئی کام نہ ہونے کے سبب زیادہ دیر نہیں رکھا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا مسائل و پریشانیوں میں اضافہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ بینک والے زیادہ مہلت دینے سے معذرت کر چکے تھے۔ فیکٹری و کارخانوں میں ورکرز تک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ سکتے تھے۔ اب انہوں نے بھی آہستہ آہستہ احتجاج کرنا شروع کر دیا تھا۔

برزس کی پراہنر مسلسل بڑھ رہی تھیں دوسری طرف مشعل کی بد تمیزیوں نے اسے دوہرے عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ رات کو وہ کبھی حد سے تجاوز نہ کرتا۔ عورتوں پر ہاتھ اٹھانے والے مردوں سے اسے سخت چہ تھی مگر رات کو اس پر انکشاف ہوا کہ عورت پر ہاتھ اٹھانا بزدلی ہے مگر مشعل جیسی ڈکٹیٹر پر ہاتھ اٹھانا ہرگز بزدلی نہیں ہے۔ عورت، عورت میں بھی فرق ہوتا ہے۔

ایک فون کال سے ہی اس نے معلوم کر لیا تھا کہ وہ روز اپنا وقت کلب میں گزارتی ہے جہاں اس کے بوائے فرینڈز کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ جان کر اسے کوئی تعجب نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا وہ کس کیلگری کی ہے۔ مگر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کل تک اس نے یہ سب کیا لیکن اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ کل ساری رات طیش میں اس نے بیڈروم کے بربرو والے روم میں گزار لی تھی۔ مشعل کی بد تمیزی پر اتنا طیش اسے آیا کہ بے اختیار اس کا ہاتھ اٹھا اور اس کے رخساروں پر پھینک کر بھی اسے کسی قسم کی شرمندگی یا پچھتاوے کا احساس نہ ہوا تھا۔ ذہن الجھنوں و پریشانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور اسی کشمکش میں ایک اباؤٹ ٹرن لیتے ہوئے روڈ کر اس کرتی خاتون سے کا ٹکرا گئی۔

ایک دھماکا ہوا تھا..... خاتون کے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ سے سامان کل کل کر سڑک پر بکھر گیا تھا۔ لمبے لمبے کوٹو اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا۔ پھر لمحے کے ہزارویں حصے میں کوپا اس کے اندر حادثے کی نزاکت کا احساس جا گزیرا ہوا تو وہ برق رفتاری سے کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور تیر کی طرح ان کی طرف بڑھا جو سڑک سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”آپ..... آپ..... آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟“ درمیانی عمر کی خاتون کو آہستگی سے اٹھتے دیکھ کر حواس کچھ بحال ہوئے تو وہ بوکھلا کر استفسار کرنے لگا۔

”نہیں بیٹا، کوئی خاص چوٹ نہیں ہے۔“ وہ مثال درست کرتے ہوئے شفقت سے بولیں۔

”آپ کے ہاتھ پر چوٹ آئی ہے۔ خون نکل رہا ہے۔ آئیے میں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں آپ کو۔ شاہ ویز بھدھرا انہیں نزدیکی کلینک لے آیا جہاں ہاتھ پر ڈریسنگ کرنے کے بعد ضروری ٹریٹمنٹ کے بعد ڈاکٹر نے انہیں فارغ کر دیا۔ وہ انہیں لے کر کار کے پاس آ گیا۔

”بہت معذرت خواہ ہوں..... میری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف اٹھانا پڑی اور آپ کا سامان بھی ضائع ہو گیا۔“ وہ شرمندہ لہجے میں ان سے مخاطب ہوا۔

”نہیں، نہیں..... شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ غلطی میری ہی تھی کہ روڈ کر اس کرتے وقت بھی سوچوں میں غم تھی۔ اور سامان کوئی خاص نہیں، صبح ناشتے کے سامان کے علاوہ کچن کی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔“ انہوں نے شائستگی سے سارا الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ شاہ ویز ان کی سادگی سے کافی متاثر ہوا تھا۔

”مہربانی ہے آپ کی۔ ورنہ غلطی سو فیصد میری ہی تھی۔ بہر کیف آپ نے مجھے ذاتی شرمندگی سے بچا لیا۔ بے حد مشکور ہوں۔ آئیں میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔“

”نہیں شکریہ بیٹے! گھر نزدیک ہے، چلی جاؤں گی۔“

”پلیز اتنی خدمت کا تو موقع دیجئے تاکہ ضمیر کی ملامت سے سرفروٹی ملے۔“ اس کے خلوص و مہذب انداز نے انہیں مزید انکار نہ کرنے دیا۔ وہ بیٹھ گئیں۔ ان کے بتائے گئے راستوں پر وہ کار دوڑاتا ان کے مظلوم بٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ خوب صورت کانچ تھا جس کی دیواریں پھولوں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کار رکتے ہی اترنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہو پائیں تو شاہ ویز سے مخاطب ہوئیں جو گردن جھکائے ان کے اترنے کا منتظر تھا۔

”بیٹا! آپ کو مجھے سہارا دینا ہوگا۔ دراصل اس وقت ناگ میں اتنا درد نہیں تھا مگر اب لگ رہا ہے سن ہو کر رہ گئی ہے۔“

”آپ کی ناگ میں بھی چوٹ آئی ہے اور آپ نے مجھے بتایا نہیں۔“

”چوٹ نہیں آئی صرف گرنے کی وجہ سے درد ہو رہا ہے۔“ وہ اس کے سہارے سے آہستگی سے چلتی ہوئی گیٹ سے اندر داخل ہو گئی تھیں۔

لان میں بیٹھی دوسری خاتون گھبرا کر آگے بڑھی تھیں۔

”کیا ہوا آپ کی؟“ شدید پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ دوسری سائیڈ سے سہارا دے کر انہوں نے انہیں کرسی پر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تکلیف کا احساس تھا مگر لبوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔

”بیٹھیں بیٹا۔“ انہوں نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں ٹھیکس، میں اب جاؤں گا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔“

”بہت عرصے بعد کسی مخلص انسان سے ملاقات ہوئی ہے میں اس طرح آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ چائے کا ٹائم ہے، چائے پی کر جاییے گا۔“ وہ بھدھرا کوپا ہوئیں۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں جاؤں گا۔“

”چلے جائیے گا مگر چائے پینے کے بعد۔ حرافا فٹ چائے ہمیں لے آؤ۔“ شاہ ویز سے مخاطب ہونے کے بعد وہ قریب کھڑی حیران و پریشان سی خاتون سے مخاطب ہوئیں جو عمر میں ان سے چھوٹی تھیں۔ شاہ ویز ان کے خلوص کو اس بار ٹھکانہ نہ بنا۔ حرافا خاموشی سے اندر بڑھ گئی تھیں جب کہ وہ ان کے سامنے بیٹھا ان کے سوالوں کے جوابات دے رہا تھا جو عام سے اور معمولی تھے۔

”ماشاء اللہ، شکل سے ہی کسی مہذب و وضع دار فیملی کے دکھائی دیتے ہو ورنہ اس کٹھورو بے حس دور میں لوگ انسانوں کو نازوں تلے کچل کر مڑ کے بھی نہیں دیکھتے ہیں اور آپ سے معمولی سی لکڑی ہوئی تھی، کتنا ایثار کیا آپ نے۔“

”پلیز، شرمندہ نہ کریں..... یہ میرا فرض تھا۔“ اس نے انکساری سے کہا۔

”آپ نے اپنا نام بتا دیا، میرا نہیں پوچھا۔ مجھے فرح رضوی کہتے ہیں۔ میرے جاننے والے مجھے آپ کی کہتے ہیں لیکن آپ مجھے آنٹی کہہ سکتے ہیں۔“ وہ خاصی باتوں کی تھیں اور اتنی ہی باہمت بھی جو اتنی تکلیف کے باوجود بہت حوصلے و ہمت سے باتیں کر رہی تھیں۔

چائے کے دوران بھی وہ اس سے اس کے کاروبار کے متعلق کافی معلومات لیتی رہی تھیں جب کہ ان کی بہن حرافا بالکل خاموش تھیں۔



وہ سارا دن سوتی رہتی تھی۔ اب بیدار ہوئے بھی خاصا وقت گزر گیا تھا مگر وہ اسی طرح ساکت بیٹھی چھت کو گھور رہی تھی۔ چہرے کی جلن تو غائب ہو گئی تھی مگر اپنا پرہیزگاری آگ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ کھولتے ذہن کے ساتھ چھت کو گھورتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ ساکت مسلسل لینے سے کمزور کرنے لگی تو کروٹیں لیتی رہی مگر پھر ایک احساس نے اسے اٹھنے پر مجبور کر ڈالا۔ وہ اٹھ کر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ہاتھ لے کر باہر آئی، بال برش کرنے کے بعد وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی مگر دروازہ باہر سے لاک تھا۔ اس نے بہت کوشش کی، پینڈل ادھر ادھر خوب گھمایا مگر لاک نہ کھلا تھا۔ پہلے تو حیرانگی سے وہ بند دروازے کو دیکھتی رہی اور خود کو یہ تسلی دیتی رہی کہ وہ اس قدر پاورفل نہیں ہو سکتا کہ اسے کمرے میں بند کر کے جائے۔ لاکھ وہ خود دوسری گرا سے اس طرح بند کر کے جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی بے یقینی پر صداقت کی مہر چسپاں ہوتی گئی۔

”میں چھوڑوں گی نہیں تجھے..... جرأت کیسے ہوئی تیری مجھے بند کر کے جانے کی؟“ غصہ و خشم و جنون بن اٹھا۔ اس نے ڈشبیوں کی طرح دروازے پر کئے، لاتیں

برسا شروع کر دیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے پیچھے کی آوازیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

دروازہ بھاری و عمدہ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے جنونی کموں اور لاتوں کی معمولی سی دمک صرف اندر گونج رہی تھی۔ باہر معمولی سی بھی آواز پیدا نہ ہو رہی تھی۔ کافی دیر تک وہ دروازے پر طبع آزمائی کرتی رہی مگر سب بے سود تھا۔ شدید ترین بھوک کے احساس نے اسے جلد بڑھال کر دیا۔ وہ بے دم سی کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

رات کلب میں بھی اس نے ڈنر نہیں کیا تھا۔ فرینڈز کے اصرار پر ایک سینڈوچ کھایا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا وہ رات کو سوپ پیا کرتی تھی اور صبح ناشتے میں اپنی فیورٹ ڈشز شوق سے کھایا کرتی تھی۔ رات بھی اس نے یہی سوچا تھا کہ اس بڑھیا سے من پسند ناشتہ بنوائے گی اور ڈٹ کر کھائے گی لیکن ناشتے اور لچ کا نام گزر چکا تھا۔ وال کلاک گیارہ بجار ہوا تھا یعنی ڈنر کا نام بھی گزر رہا تھا بلکہ گزر چکا تھا۔ اس نے روم ریفریجر میٹر کھول کر دیکھا، وہ مشروبات کے کینز اور بوتلوں سے بھرا ہوا تھا۔ کل تک اس میں فرٹس بھی بھرے ہوئے تھے جو اب غائب تھے جو یقیناً جان بوجھ کر غائب کئے گئے تھے۔ اس نے جھٹکے سے ڈور بند کیا تھا۔ غصہ بھی بھرے پیٹ زور دکھانا ہے۔ خالی پیٹ غصہ، جھجھلاہٹ، انتقام و اناسب ہوا ہو گئی تھی۔ وہ جواز حدنا زور غم میں پٹی بڑھی تھی جس کی خدمت کے لئے خادمائیں دست بستہ حاضر رہا کرتی تھیں آج بھوک کی مار بہہ رہی تھی۔ اس نے جو ہونٹوں سے نکالو راپا کیا تھا۔ بھوک کیا ہوتی ہے؟ پریشانی کس بلا کا نام ہے، افلاس کس کو کہتے ہیں؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے گویا جنت میں آنکھ کھولی تھی۔ ہر شے کو اشارے پر پایا تھا۔ پھر آج یہ کیا ہوا تھا؟ وہ کہاں پہنچ گئی تھی؟ مزاحمت، مدافعت سب دم توڑ چکی تھی۔

پیٹ میں ایک بھونچال تھا، ہاتھ پاؤں بھوک کے مارے بے جان ہوئے جا رہے تھے۔ نگاہوں میں لذیذ و خوش رنگ کھانوں کی ڈشز گھوم رہی تھیں۔ اس کے ڈانٹنگ روم میں بہت لمبی ڈانٹنگ ٹیبل لذیذ کھانوں کی ڈشوں سے بھری ہوئی تھی۔ پاپا کو پا کستانی کھانے پسند تھے۔ اس کو چائینز اور امریکن، دو افراد کے لئے اتنا کھانا بنتا تھا جو برائے نام ہی کھاتے تھے۔ ظاہر ہے نوکروں کے خوب مزے تھے۔ وہ بہت بد تمیز و ہٹ دھرم تھی مگر کھانے پینے کے معاملے میں کبھی بھی اس نے ملازموں کو پریشان نہیں کیا تھا، نہ ہی کسی قسم کی روک ٹوک تھی۔

”آہ..... کیا میں بھوک سے مر جاؤں گی؟ میں مشعل انڈسٹریز کی اکلوتی وارث، اپنے پاپا کی لاڈلی بیٹی، جس کے صدقے میں ہزاروں لوگوں کا پیٹ بھرتا ہے، بھوک سے نجات ملتی ہے، آج وہی بھوک سے مر جائے گی کل نیو زیپیر زمین کتنی انوکھی و سنسنی خیز خبر شائع ہوگی کہ ملک کے مشہور صنعت کار حسن بیگ کی اکلوتی بیٹی بھوک کی تاب نہ لا کر ہلاک ہو گئی۔ اوہ، کیسی حسرت ناک و تعجب خیز موت لکھی ہے میری۔ کیا مرتے وقت میرے پاپا بھی میرے قریب نہ ہوں گے؟ آہ..... پاپا میرے پاس آئیں، میں مر رہی ہوں۔ بھوک سے مر رہی ہوں۔“ آنسو بھر بھر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ بھوک سے اسے اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے کی ہر شے کول کول داکڑوں میں گھوم رہی تھی۔

رات کے نہ معلوم کس پہر دروازہ کھلا تھا اس نے خود میں ہمت نہ پائی تھی اٹھ کر بیٹھنے کی۔ نیم وا آنکھوں سے اسے اس سنگدل کا چہرہ نظر آ رہا تھا جس پر ابھی بھی کرخنگی و درشتگی سرخی بن کر چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی بڑے ٹیبل پر رکھی۔ کمرہ اشتہا انگیز خوشبوؤں سے بھر گیا۔ ساتھ اس کے بھوک سے قریب المرگ حواس دوبارہ بیدار ہونے لگے۔ اس کی آنکھیں پوری طرح ابھو گئیں اور شاہویر پر چڑھ پڑتے ہی کل والی تذلیل از سر نو تازہ ہو گئی۔

”میرا خیال ہے پہلی ڈونر نے کافی اثر دکھایا ہے۔“ وہ اس کی نکھری، بگڑی حالت دیکھ کر تسخیر سے گویا ہوا۔ ”آؤ کھانا کھاؤ۔ میرے خیال میں اتنی سزا کافی ہے۔“ شاہویر کے لبوں پر کات دار مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں برتری کی چمک، لہجہ نرم تھا مگر انداز جارحانہ تھے۔ تیور بگڑے ہوئے چہرے کے تاثرات میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مشعل کسی مشعل کی طرح ہی جل اٹھی تھی۔

بھوک بھوک کرتے اعضا کو اس نے تھپک کر سلا دیا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس کے کھانے کھانے سے بہتر ہے بھوکے مر جانا، بھلا ایسے کم ظرف و چھپچھورے شخص کا کھانا زہر سے بھی بدتر ہے جو مار کھا کر، عزت نفس کو مار کر کھانے کو ملے۔

”آئیں مایڈم! آپ کی خدمت میں کھانا پیش ہے۔“ وہ آگے بڑھا اور کچھ جھک کر استہزاء سیہ لہجے میں مخاطب ہوا۔

”نہیں کھانا مجھے تمہارا کھانا۔ لے جاؤ یہاں سے۔“ وہ غرائی تھی۔

”آؤ شاباش۔ اب مجھے بچے ضد نہیں کرتے۔“ اس کا انداز سو فیصدی چڑانے والا تھا۔

”میں کہتی ہوں دفع ہو جاؤ یہاں سے..... ورنہ شوٹ کر دوں گی تمہیں۔“

”مجھے معلوم تھا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔“ یکدم ہی اس کے تیور بدلے تھے۔

”مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا..... ہر گز نہیں رہنا۔ تم انسان نہیں وحشی درندے ہو۔“ شاہویر کے اہانت آمیز سلوک نے اس کے باغی ذہن کو مزید باغی کر دیا تھا۔

”اب جیسا بھی ہوں تمہارا نصیب ہوں، جاہل، اجڈ، گوار، درندہ، وحشی، فقیر، حقیر، جیسا بھی ہوں تمہیں مجھے بھگتنا ہوگا کیونکہ خواہ نچا دکھانے کے لئے ہی سہی، خواہ انجوائے منٹ کی خاطر تم نے نکاح نامے پر اپنی مرضی سے سائن کئے تھے اس لئے مجھے برداشت کرنا تمہیں نا کوار نہ گزرے گا۔ اس معاملے میں تو میرے ساتھ زیادتی و زبردستی کی گئی ہے اس کے باوجود میں تمہیں برداشت کر رہا ہوں بلکہ آخری سانس تک بھگتے کا عہد کر چکا ہوں۔“ اس کا لہجہ از حد ہر سکون ہو چکا تھا۔ وہ اتنے ہر سکون و دھیمے انداز میں بات کر رہا تھا گویا بہت بیا رہی باتیں کر رہا ہو اور اس کے اسی انداز نے مشعل کو بھڑکا ڈالا تھا۔

”جب تمہارے ساتھ تمہاری مرضی و پسند کا خیال نہیں رکھا گیا تو کیوں مجھے بھگت رہے ہو؟ چھوڑ دو۔ اپنی دنیا اپنی پسند سے بساؤ اور مجھے آزاد کر دو۔“

”بہی تو فرق ہے..... یہی تو فرق ہے تمہارے اور میرے اسٹینڈرڈ میں جہاں شوہر بھی لباس کی طرح تبدیل کئے جاتے ہیں، بیویاں سینڈل کی طرح بدل دی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ایسی کوئی بے تمیزی کی مثال نہیں ہے۔ دل چاہے نہ چاہے پسند ہو یا نا پسند، فراخ دلی سے رشتہ نبھانا ہی پڑتا ہے۔“

”یوں کہو نام لوگ منافقت پسند ہو۔“ وہ پھٹکاری۔

”نہیں! ایثار پسند و جرأت مند۔“ دوبارہ جواب آیا۔

وہ خالی پیٹ اس سے مزید بحث نہیں کر سکتی تھی۔ خاموش ہو گئی۔ اسے تو قح قحی شاہویر آئے گا اور اپنے رویے پر معذرت کرے گا، ہاتھ اٹھانے پر شرمندگی کا اظہار کرے گا، معافی مانگے گا، غلطی پر گڑگڑائے گا۔ مگر اسے محسوس ہوا معافی مانگنا، شرمندگی کا اظہار کرنا تو درکنار اس نے سیدھے منہ بات بھی نہ کی تھی بلکہ وہ اسے جلی کٹی سنا کر برہم ہو رہا تھا۔ وہ ان مردوں میں سے تھا جو اپنے ہر عمل کو جائز سمجھتے ہیں، اپنے علاوہ کسی کو مقدم نہیں جانتے۔

وہ دوسرے آدمیوں سے مختلف تھا..... بالکل مختلف، بے حس و کٹھور۔

”کھانا کھا رہی ہو یا اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں؟ کوکہ یہ کافی نا پسندیدہ عمل ہوگا میرے لئے مگر کیا کروں، بچپن سے کافی رجم دل واقع ہوا ہوں، بھوکی بیویوں کو اپنے صبر کا دودھ پلا دیا کرتا تھا۔ پھر تم تو انسان ہو اور تم بھوک سے مر جاؤ یہ گناہ میں نہیں کر سکتا۔“ وہ ٹیبل پر برتن رکھتے ہوئے اطمینان سے کہہ رہا تھا اور اس کے تیور دیکھ کر مشعل کو یقین کرنے میں دیر نہ لگی کہ وہ سچ کچھ اسے زبردستی اپنے ہاتھ سے کھلانے پر آمادہ ہے۔

”کمینہ۔“ وہ دانت پیستی ہوئی آگے بڑھی اور ایک پلیٹ میں بریانی نکال کر کھانے لگی۔ اس کا ارادہ تھا چند لقمے لے کر اٹھ جائے گی مگر کھانا انتہائی لذیذ بنا ہوا تھا یا اس کی بھوک انتہائی درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔ ایسی نمدیوں کی طرح کھانے پر ٹوٹی تھی کہ کمرے میں شاہویر کی موجودگی بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔ کھانے کے بعد پانی پی کر سیدھی ہوئی تو سامنے بیٹھے شاہویر کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ وہ کس طرح کھانے پر ٹوٹی تھی اور بہت جلد ہر پلیٹ صاف کرتی گئی تھی۔ اس کی نگاہوں میں بھی نہ معلوم کیا تھا کہ پہلی بار اسے شرمندگی و شرمندگی کا احساس ہوا اور کچھ بے اختیار عارضوں پر جھکتی چلی گئیں۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اس بات کو جب اس کی شدید خواہش یہ رہتی تھی کہ وہ اس شخص کی جھکی جھکی گھنی پلکوں کے سائے میں چھپی رہنے والی آنکھوں کو دیکھے اور اس خوش فہمی میں بھی کہ وہ نگاہیں اس کے رعب حسن سے جھکی رہتی ہیں یا وہ اس کے سحر زدہ حُسن سے بچنے کے لئے نگاہوں کو جھکا کر رکھتا ہے۔ مگر اب جب کہ وہ اس کے ساتھ ازدواجی بندھن میں بندھ چکی تھی تو وہ بڑے استحقاق بھرے انداز میں وہ نگاہیں اس کی جانب اٹھتی تھیں جو بڑے سے بڑے چارمنگ شخص کو نگاہوں اداؤں کی مار سے گھائل کر دیا کرتی تھیں۔ نہ معلوم کیوں شاہویر جیسے عام سے بندے کو شکست نہ دے پائی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ بے حد عام سا نظر آنے والا بندہ عام شخص نہ تھا۔ اس کی سرفی مائل گندی رنگت والے نقوش بہت جاذب نظر تھے۔ اس کے چہرے کی وجاہت کو اس کی بنجیدگی و متانت نے مزید بڑھا دیا تھا۔ اس کے متناسب دراز قد میں عجیب کشش و وقار تھا اور آنکھوں میں بلا کی ذہانت و خود اعتمادی کے علاوہ ایسی سحر انگیز چمک تھی کہ جو مقابل کی جانب اٹھتی تو اسے اپنے سحر میں جکڑ لیتی تھی۔

ابھی بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا جو اس نے بے ساختہ نگاہیں جھکا لی تھیں۔ شاہویر نے اس کی جھینپ بھری شرمندگی کو پوری طرح محسوس کیا تھا اور اپنے بھوک پر ٹپکھڑ دینے کے پروگرام کو ملتوی کر دیا تھا۔ اس کے خیال میں جو پہلے سے شرمندگی کے بحر میں غوطہ زن ہو مزید اسے ڈبونا ذلت تھی۔

مشعل کو نمدیوں کی طرح کھانے پر ٹوٹنے دیکھ کر لمبے بھر کو تو اس کے ضمیر نے اسے کچوکے لگائے تھے اور اسے اس طرح بھوکے رکھنے پر خود کو ناظم تصور کیا تھا مگر پھر مشعل کی بد تمیزی و زبان درازی کے مناظر یاد آئے تو اسے اپنا فیصلہ بالکل درست و حق بجانب لگا۔ خود بخود ہی نگاہوں میں تفاخر و تسخیر چھلکے لگا تھا۔

”میرے خیال میں تمہاری عقل ٹھکانے پر آپکلی ہوگی۔“ اس نے کافی دیر بعد کمرے کی خاموشی توڑتے ہوئے گفتگو کا آغاز خالص اطمینان بھرے انداز میں کیا۔

”مطلب؟“ اس کی غراہٹ نما آواز ہونٹوں سے خارج ہوئی تھی۔

”مطلب یہ سبز شاہویر! کہ کل صبح سے آپ اس گھر کی بہو کے فرائض سنبھالیں گی۔ صبح کا بریک فاسٹ، دوپہر کا لچ، شام کی چائے، رات کے ڈنر کی تیاریاں اب آپ کی ذمہ داری ہوں گی۔ بے جی نے اپنے فرائض کی بہت ادائیگی کر دی۔ اب کل سے تم اپنی ڈیوٹی سنبھالو گی اور مجھے بار بار اپنی بات دہرانے کی عادت نہیں ہے سمجھیں۔“ جملے کی آخری ادائیگی میں اس کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔ مشعل نے پہلے چند لمحوں کی جانب گھور کر دیکھا مگر اس کی نگاہیں اٹھتی دیکھ کر یکجہت ہی رخ موڑ کر کھڑی ہو کر تنفر سے گویا ہوئی۔

”ہونہہ..... پہلے بیوی کے فرائض کی ادائیگی کے قابل تو بنو، پھر بہو کی بات کرنا۔“ اس کے لہجے میں ایسی کاری ضرب تھی کہ شاہویر کی نا اوجہ جیت جھنجھٹا اٹھی تھی۔ آن واحد

میں اس نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی تھی۔ وہ جواپنی جگہ اکڑ کر کھڑی تھی اس کے اچانک کلائی دبو پنے سے سنبھل نہ سکی اور کسی ٹوٹی شہتیر کی طرح اس کے سینے سے آگئی۔ کمرے کی فضا ایک دم ساکت ہو گئی۔ وقت کی تال رک گئی۔ ہر شے منجمد ہو گئی۔ مشعل اس کے آہنی سینے سے لگی کھڑی تھی۔ اس کے نزدیک، اتنی نزدیک کہ اس کے آہنی سینے کے اندر دھڑکنے دل کی دھڑکنیں با آسانی شمار کر سکتی تھی جو بالکل نارمل تھیں۔ جب کہ غلاف معمول اس کی دھڑکنیں اتنی منتشر اور بے قابو بے ہنگم انداز میں تھیں کہ لگتا تھا کسی بھی لمحے دل سینہ توڑ کر باہر نکل پڑے گا۔ اس کے مضبوط ہاتھوں میں ایسی تش تھی جس سے اسے اپنا جسم سن ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عجیب سی سنسنیات رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی کہ وہ کوشش کے باوجود اس کی گرفت سے خود کو نکال نہ سکی۔

”مرد کو جب مرداگی کے طعنے ملیں تو اسے وحشی بننے سے کوئی نہیں روک سکتا اور وحشی انسانیت و اخلاقیات سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں محترمہ! اور جب اخلاقیات کے تقاضوں پر حیوانی تقاضے غالب آجائیں تو کچھ باقی نہیں بچتا۔ شرافت، لحاظ، مروت، حیا سب احساسات منقود ہو جاتے ہیں اور میں چاہتا ہوں ہمارے درمیان حجاب و احترا م کا پردہ گرار ہے تو بہتر ہے۔“ وہ اسے بازوؤں کے حصار میں لئے ہوئے اس کے رنگ بدلتے چہرے پر نگاہیں گاڑے آہستہ آہستہ گہبھر لہجے میں ایک ایک لفظ کہہ رہا تھا۔ وہ بے جان انداز میں نگاہیں جھکائے سن رہی تھی۔

”میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں خود کو اس قابل بناؤ کہ تمہیں بیوی کے درجے پر فائز کیا جائے۔“ اس نے آہستگی سے اسے خود سے دور کیا تھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

□●□

”پڑ گئی ٹھنڈک..... سکون مل گیا؟“

بے جی جوا بھی نماز سے فارغ ہو کر کمرے سے نکلی تھیں، سامنے کڑے تیوروں سے کھڑی مشعل کو دیکھ کر رک گئیں۔ مشعل نے غصے سے انہیں مخاطب کیا تھا۔

”یہ..... کیا کہہ رہی ہو بیٹی..... میں سمجھی نہیں؟“ وہ پریشانی سے کوپا ہوئیں۔

”ہونہہ..... میرے سامنے معصوم بننے کی اداکاری کی ضرورت نہیں ہے۔ خوب جانتی ہوں تمہاری ان چالاکیوں کو۔ تم جیسی ڈل کلاس عورتوں کے بارے میں سنا تھا کہ کس طرح بیٹوں کو سکھا کر ان کی بیویوں کے خلاف کرتی ہیں۔ اپنی حکمرانی کی خاطر دوسروں کی زندگیوں میں آگ لگا کر رکھتی ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میرے مقدر میں بھی ایسی ہی کوئی چالاک عورت لکھی ہوگی۔“

”بہو! پھیلیوں میں بات مت کرو۔ جو کہنا ہے صاف کہو۔“ بے جی بڑے قتل و بردباری سے اس کی یکوا اس کے دوران کھڑکیاں بند کرتے ہوئے نرمی سے کوپا ہوئیں۔

”میری بات بالکل صاف ہے..... تم جان بوجھ کر انجان بن رہی ہو اولڈ وومن۔“

”میرے خیال میں تم کو میرا اعتبار، میری کسی بات بلکہ سچی بات پر یقین نہیں آئے گا اور میں ایسا ارادہ رکھتی بھی نہیں کیونکہ میں اپنے قول و عمل کی اپنے اللہ کے آگے جواب دہ ہوں اور بے شک وہ نیتوں کو درست پہنچاتا ہے۔“ بے جی سادہ مگر مضبوط لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”مجھ کو باہر جانے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا، کسی کے باپ میں ہمت نہیں ہے کہ مجھے میری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ کرنے سے روکے۔“ بے جی کو بر سکون انداز میں بات کرتے دیکھ کر وہ ہری طرح سلگ اٹھی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ ان سے بدتمیزی سے بولے گی، چیخنے چلائے گی تو وہ بھی جواباً اس سے منہ زوری کریں گی اور اسی بات کو بڑھا کر وہ شاہویر کی برتری کو زیر کرے گی۔ اسے بے جی پر بہت ناز ہے۔ مگر یہاں تو انہوں نے نرم مزاجی سے اس کی پلاننگ خراب کر ڈالی تھی۔

”میں نے تمہیں پہلے دن سمجھایا تھا کہ شاہویر کی اجازت سے قدم باہر نکالنا مگر تم نہیں مانیں، کوئی پروا نہیں کی۔ میں نے ہر طریقے سے تمہارے اس طرز عمل کو شاہویر سے چھپائے رکھنے کی کوشش کی تھی مگر ایسے طرز عمل چھپائے نہیں چھپتے ہیں۔ بالآخر پرسوں رات وہ سب ہو گیا جو میں کروانا نہیں چاہتی تھی۔ بہو! یہ بات الیہ سمجھ لو یا غیرت، مرد کتنا بھی پڑھ لکھ جائے، کسی بھی بڑے عہدے پر پہنچ جائے اندر سے وہ وہی روایتی مرد رہتا ہے۔ عورت کو اپنی ملکیت سمجھنے والا، جاہل و تنگ نظر، محض شک کی بناء پر قتل کر ڈالنے والا۔“

”ہونہہ..... میں ایسے مردوں کی جاہلیت و تنگ نظری اچھی طرح درست کرنا جانتی ہوں۔“ وہ منہ میڑھا کر کے نخوت سے کوپا ہوئی۔ بے جی کے اخلاق و نرم مزاجی نے ذرا بھی اس پر اثر نہ کیا تھا۔ بے جی بھی اس کے مزاج کو اچھی طرح سمجھنے لگی تھیں کہ وہ صرف اپنی بات اور مرضی کو اہمیت دینا جانتی ہے کسی اور کی کوئی اہمیت و وقعت اس کے نزدیک نہیں ہے۔ سو اس کا حل انہوں نے یہی نکالا کہ اکثر اس کی باتوں کو نظر انداز کرنے لگیں۔

اس وقت بھی اسے بحث کے موڈ میں دیکھ کر وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئیں۔

نامعلوم شاہویر کے تھپڑوں کا اثر تھا یا اس کے خطرناک تیوروں کا خوف کہ وہ پھر دوبارہ گھر سے باہر قدم نکالنے کی جرأت نہ کر سکی مگر اس کی ضد وہٹ دھری اپنی جگہ قائم تھی۔ اپنے بیڈ روم سے باہر نکلتا اس نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ سارا وقت ٹیلی ویژن دیکھنے اور سونے میں گزارتی تھی گھر کے کام سے اور بے جی سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ شاہویر کو چھ آنے کے لئے ناشتہ کھانا سب کمرے میں ہی کرتی تھی۔ اس دوران بے جی نے ہی شاہویر کو قابو کیا ہوا تھا ورنہ وہ تو بری طرح تپا ہوا تھا کہ اس کے اتنے سمجھانے کے باوجود اس کے طور طریقوں میں معمولی سا بھی فرق نہیں آیا تھا۔

بے جی نے مشکلوں سے اسے کچھ بھی کہنے سے روکا ہوا تھا اور بے جی کی کوئی بات وہ کسی طرح بھی نہیں رد کر سکتا تھا۔ نتیجتاً اس نے اس سے بالکل بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ کمرے میں صرف سونے کے وقت جاتا تھا۔

□●□

”ارے واہ، آج تو ہمارے بھاگ جاگ گئے۔ آپا جان، کیسے وقت مل گیا..... ہم غریبوں کی یاد کیسے آگئی؟“ کافی دنوں بعد بے جی کو اپنے گھر پر آتے دیکھ کر زینہ خوشی سے چمک کر کوپا ہوئیں۔

”میں بھولی ہی کب تھی، اپنوں کی یاد سے دل کا گلشن ہمیشہ ہی مہکتا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وقت کے ظالم ٹکٹے میں جکڑ کر ملنے کے مواقع کم ملتے ہیں۔ مگر اپنوں کو فراموش نہیں کیا جاتا۔“ وہ حسب معمول اپنے نرم و مشفق لہجے میں کہتی ہوئی ان کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

”آپا! آج تو رک جاؤ، قسم سے تم سے بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“

”سارا دن بہت ہوتا ہے باتوں کے لئے..... تم جانتی ہو میں رک نہیں سکتی۔ شاہویر کو میرے بغیر رہنے کی عادت کہاں ہے۔“

”اوہو..... کیا کہہ رہی ہو آپا! اخیر سے شاہویر شادی شدہ ہو چکا ہے۔ آج بیوی والا ہے کل بچے کا باپ بھی بن جائے گا اور تم اسی طرح اسے بچے کی طرح پلو پکڑا کر رکھو گی۔ چھوڑ دھکی ان باتوں کو، آخر کب اس کی بیوی کو ذمے داریاں سونپو گی۔ میں سب سمجھتی ہوں، تم نہ بتاؤ تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ میں بالکل ہی بے خبر ہوں۔“ زینہ اکثر ان سے ملنے گھر جاتی رہتی تھی۔ شروع شروع میں بے جی نے ممکن حد تک مشعل کے طور طریقے ان سے مخفی رکھے تھے مگر جب تک وہ مزید چھپا سکتی تھیں۔ پھر زینہ ایک حاضر دماغ، چالاک اور گہری نگاہ رکھنے والی تیز و طرار عورت تھیں۔ بھلا ان کی زیرک نگاہی سے کس طرح یہ طور و اطوار چھپ سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ بے جی کے کچھ نہ بتانے کے باوجود وہ باخبر ہو گئی تھیں۔

”تم سے بھلا میں کیا چھپاؤں گی۔ تم فضول سوچوں کو دل میں جگہ نہ دیا کرو۔“

”رہنے دو آپا، بہن بھی کہتی ہو اور سلوک غیروں والا کرتی ہو۔ حالانکہ میں تو رتی رتی بات جب تک تم کو نہ بتا دوں مجھے قرا نہیں ملتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن بھاگی بھاگی پہنچ جاتی ہوں دل کا بوجھ ہلکا کرنے تمہارے پاس اور ایک تم ہو پوچھنے پر بھی نہیں بتاتی ہو۔ ارے اپنوں سے دل کی بات کہنا کوئی گناہ تھوڑی ہوتا ہے اور مانو تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“ زینہ کو عادت تھی ہمارے معاشرے کی ان نوے فیصد عورتوں کی طرح جودل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بہانے یا غم غلط کرنے کی نیت سے معمولی و نا قابل توجہ بات کو بڑھا چڑھا کر دوسروں تک پہنچاتی ہیں اور یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ان کے گھروں کو برباد کرتی ہیں اور ذہنی سکون کو تباہ اور ساتھ ہی غیبت کر کے اپنے نامہ اعمال کو سیاہ کرتی ہیں۔

جب کہ بے جی ان دس فیصد عورتوں میں سے تھیں جو اعلیٰ ظرف و بلند اخلاق کی بدولت لوگوں کی بڑی سے بڑی خطا، زیادتی و دل شکنی کو درگزر کرنے، معاف کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ جو بڑے لوگوں کی برائیوں کو بھی ان کی چند اچھائیوں کے تناسب سے دیکھتی ہیں اور ہمیشہ اچھا اور بہترین کرنے کی سعی میں مگن رہتی ہیں۔ شاید ایسے لوگوں کی وجہ سے ہی رشتے استوار رہتے ہیں۔ شمع کی طرح خود کو جلا کر روشنی دینا ہی تو انسانیت کی معراج ہے۔

”کیا بتاؤں تمہیں؟ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تو آئی ہو۔“ وہ مسکرائیں۔

”ہاں..... بس اللہ میری آنکھیں سلامت رکھے۔“ وہ جل بھن ہی تو گئیں۔

”آمین، گھر میں خاموشی ہے۔ بہو گھر میں نہیں ہے کیا؟“ انہوں نے گھر پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ عام دنوں سے نسبتاً آج گھر چم چم کر رہا تھا۔

جس چارپائی پر وہ بیٹھی تھیں اس پر دھلی ہوئی پرنسز چادر بچھی تھی، ساتھ ہم رنگ گاؤ تکیے رکھے تھے جن سے وہ ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے آگن کا سرمی فرش چمک رہا تھا۔ دیوار کے سائیز میں رکھے گلوں میں گلاب، موتیا، صدا بہار کے پھول مہک رہے تھے۔ سائیز میں معمولی سی کھدائی کر کے توری کی تیل لگائی گئی تھی جو ایک ستون کے سہارے چڑھ رہی تھی اور اس میں ہرے پتوں کے درمیان پہلے پہلے پھول بہا رکھا رہے تھے۔ تار پر رنگ برنگے کپڑے سوکھ رہے تھے۔ کچن کا دروازہ بند تھا مگر لگ رہا تھا اس کی جالیوں کو خوب رگڑ رگڑ کر دھویا گیا ہے مگر اس سے قبل وہاں میل کی تہہ دور سے نظر آتی تھی۔

”گئی ہوئی ہے میکے ایک ہفتے سے..... جی تو گھر میں اتنا امن و سکون نظر آ رہا ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے کوپا ہوئیں۔ ان کے انکار کے باوجود لیوہوں کی سلکچین بنا کر لے آئی تھیں۔

”پی لیا آپا! مجھے معلوم ہے تمہیں بہت پسند ہے یہ۔“ وہ بالاب بھرا گلاس ان کی طرف بڑھا کر کوپا ہوئیں۔ دوسرا گلاس خود پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

”عجیب ہی دور چل پڑا ہے! اپنے آپ کو بچتو ہم نے بھی پیدا کئے..... ہر طرح کی مصیبتیں و تکالیف برداشت کیں مگر بچال ہے کبھی حکیم ڈاکٹروں کی شکل بھی دیکھی ہو۔ ہر در، ہر مشکل اپنی جان پر چھیل کر کبھی آف تک نہ کی۔ مگر یہ دور یہ وقت..... تو بتو بے، بے غیرتی و بے حیائی کی بدترین مثال ہے۔“ ان کے لہجے میں حقیقتاً دکھ تھا۔ چہرے سے شدید نا پسندیدگی عیاں تھی۔

”بہو امید سے ہے..... ابھی ابتدائی دن ہی چل رہے ہیں مگر ڈاکٹروں کے چکرتو بھلی! نامعلوم کون کون سے ٹیسٹ ہو رہے ہیں، کون کون سے ایکسے اتارے جا رہے ہیں اور دوائیں الامان، لگتا ہے کمرے میں پورا میڈیکل سٹور کھل گیا ہے۔ مزید افسوس تو یہ ہے کہ اتنا روپیہ بہانے کے باوجود، ہونیکم کو آرام نہیں ہے، وہ مطمئن ہی نہیں۔“ وہ گھونٹ گھونٹ شربت پیتے ہوئے اپنے من پسند موضوع پر شروع ہو چکی تھیں۔

”بات دراصل یہ ہے زینہ! تمہارا ہمارا وقت بہت اچھا تھا۔ خالص ہوا، خالص نضا، خالص غذا ہمیں میسر تھی۔ اس لئے ہمیں دواؤں سے نجات ملی ہوئی تھی اور جو چھوٹی موٹی بیماریاں ہوتی بھی تھیں تو وہ گھریلو ٹوکے استعمال کرنے سے رفع ہو جایا کرتی تھیں۔ اب نہ وہ دور رہا اور نہ صاف ستھری آب و ہوا، اب ہر جگہ آلودگیاں پھیل گئی ہیں جن سے نہ آب و ہوا محفوظ رہے ہیں اور نہ ماحول ہی محفوظ رہا ہے۔ اس وجہ سے نئی نئی بیماریاں بھی تیزی سے پھیل رہی ہیں اور حفاظتی طور پر حاملہ خواتین کو ایسے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے تاکہ آنے والی نسل صحت مند پیدا ہو۔“ بے جی نے گلاس خالی کر کے تدبیر سے انہیں سمجھایا۔

”آپا کبھی تو میری طرف داری بھی کر لیا کرو..... ہمیشہ بہو کی حمایت لیتی ہو۔ تم میری بہن ہو یا اس کی؟“ حسب عادت وہ بری طرح جھلا اٹھی تھیں۔

”میری طبیعت تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کبھی بھی حق و صداقت کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ غلط کو غلط کہنا ہی تو ایمان داری ہے۔ پھر میں کیوں تمہاری ہاں میں ہاں ملاؤں، تمہاری بہن ہوں کوئی دشمن نہیں ہوں جو تمہیں برائی کی طرف دھکیلوں گی۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ دانشمندی بھی ہے کہ وقت کے ساتھ اپنے آپ کو کبھی بدلو۔“ انہوں نے رسائی سے سمجھایا۔

”آپا! انسان، انسان ہوتا ہے کوئی کپڑے نہیں جو گرم سرد برسات کے لحاظ سے بدلے جائیں۔“ ان کی اپنی ہی منطق تھی۔ روٹھے انداز میں کوبہائیں۔

”انسان ہر خوبیوں سے مالا مال ہے۔ جو کرنے کی ٹھان لے اپنی قوت ارادی و استقامت سے کر سکتا ہے۔ خیر چھوڑو اس ذکر کو۔ کبھی تمہاری باتوں کو سوچنا۔“

”لو، میرا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ تو بتانا ہی بھول گئی کہ سارہ آئی ہوئی ہے۔“ وہ دھیرے سے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔

”کب آئی ہے..... کہاں ہے؟“ انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پرسرست لہجے میں کہا۔

”پرسوں آئی تھی، برابر والوں کے ہاں قرآن خوانی میں گئی ہے..... اب آتی ہی ہوگی۔“

”سارہ پرسوں آئی ہے اور تم نے مجھے خبر بھی نہیں کی۔“

”میں تو کروا رہی تھی مگر سارہ نے ہی منع کر دیا کہ اچانک جا کر خالد کو زیادہ خوش کروں گی۔ اس لئے میں بھی خاموش ہو گئی۔“ انہوں نے جھٹ صفائی دی۔

”سب خیریت سے تو ہیں نا اس کے سسرال میں..... اور باقر میاں کا کیا حال ہے؟“

”وہی بد حال ہے، باقر کجنت اور اس کے گھر والے لعنتی۔ نہ معلوم کب یہ زمین ان کے وجود سے پاک ہوگی۔“ ان کی زبان ایک بار پھر رواں دواں تھی۔

”تو بزرینہ! کسی کو تو بخش دیا کرو..... ہر ایک کے لئے دودھاری تلوار بنی رہتی ہو۔“ بے جی چھوٹی بہن کی بد کوئی سے اذ حد لانا تھیں۔

”ہاں، ہاں..... مجھ جیسی عورتوں کی زبان تو سب دیکھ لیتے ہیں گردل پر لگے زخم کسی کو نظر نہیں آتے۔ آگ لگتی ہے تو دھواں اٹھے گا ہی۔“

”کوئی بات ہو گئی ہے؟“ زینہ کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ کر بے جی پریشانی سے بولیں۔

”باقر کو کاروبار میں گھانا ہو گیا ہے اور اس نے گھانا پورا کرنے کے لئے سارہ کو یہاں پانچ لاکھ روپے لینے بھیجا ہے۔“

”پانچ لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ پھر نقصان ہوا ہے تو بیوی کے میکے سے رقم منگوانا کوئی شرافت والی بات نہیں ہے۔“

”اب یہی کوئی نہ کہے۔ اگر کہو تو بیوی کو ساری زندگی چھاتی پر بٹھا لو ورنہ خاموشی سے مطالبات پورے کئے جاؤ اور پورے کئے بھی۔ مگر ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ چور، ڈاکو بھی اپنا کوئی اصول بناتے ہیں لیکن بھائی باقر میاں کا تو کوئی اصول ہی نہیں ہے۔ جب کوئی نقصان ہوا بیوی کو اٹھایا، میکے بھیج دیا۔ جب کوئی ضرورت پڑی اندھے کی لاٹھی کی طرح بیوی کا استعمال کیا۔ میں تنگ آ گئی ہوں آپا۔ مجھ میں اب بالکل تاب نہیں ہے اور نہ ہی کوئی زیور ایسا بچا ہے جس کو فروخت کر کے باقر کی فرمائش پوری کروں۔“ دکھ، غصہ، جھنجھلاہٹ، پریشانی، آزدگی کیا کچھ نہ تھا ان کے بھیکے لہجے میں۔

”اس سے دود و بات کرو، سمجھاؤ کہ شریف لوگوں کا یہ شیوہ نہیں ہوتا، ہاتھ پھیلائے والوں کی نگاہیں اور گردن ہمیشہ نیچی رہتی ہیں۔“

”وہ اتنا شریف اور خاندانی ہوتا تو ایسی حرکتیں کرتا ہی کیوں..... اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ سارہ کے ہاتھ پن سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ذرا بھی کچھ کہو تو یہی دھمکی ملتی ہے کہ وہ دوسری شادی کر کے سارہ کو طلاق دے کر ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے گا۔“

”اوہ، اتنا کم ظرف و گھٹیا شخص ہے وہ۔ اولاد دینا یا نہ دینا اللہ کے اختیار میں ہے۔ اور جو اللہ کے کاموں میں دخل دیتے ہیں بہت عبرتناک انجام ہوتا ہے ان کا۔ پھر کون سی سارہ بوڑھی ہو گئی یا شادی کو ہزاروں سال بیت گئے۔ پانچ سال تو ہوئے ہیں۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ خوب نوازنے والا ہے۔“ بے جی نے انہیں تسلی دی۔ آنسو خشک کئے۔ پانی پلایا۔

کچھ دیر بعد ہی سارہ ہڑوس سے واپس آ گئی اور بے جی کو دیکھ کر بے ساختہ ان سے پٹ گئی۔ انہوں نے بھی از حد محبت سے اسے اپنی آغوش میں لیا تھا۔

”کب آئیں خالد جان آپ؟“ وہ ان سے علیحدہ ہو کر کوبہائیں۔

”کافی دیر ہو گئی ہے..... تم سناؤ کیسی ہو؟ باقر میاں کیسے ہیں؟“

”باقر ٹھیک ہیں اور میں آپ کے سامنے ہوں۔“ وہ دھیرے سے ہنسی تھی۔ ”شاہد ویز کی شادی کی مبارکباد قبول کریں، اماں نے بتایا ہے کہ افراتفری میں اچانک شادی ہوئی ہے اس لئے معاف کیا ورنہ آپ پر جرمانہ لگاتے اس طرح بہنوں کو بغیر بلائے بھائی کی شادی کرنے کا۔“

”ارے رہنے دو شادی، بس منہ نہ کھلو! میرا۔“ زینہ اٹھتے ہوئے برا بھائی تھیں۔ بے جی نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ وا کئے، پھر بند کر لئے تھے۔ جب کہ زینہ جو کسی کام کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں دھپ سے دوبارہ برا بھائی ہو کر کوبہائیں۔

”شادی کے بعد تو میں نے مردوں کو بغیر لگے آنے کی طرح پھولتے دیکھا ہے۔ خوشی و راحت کا احساس ان کے انگ انگ سے ظاہر ہوتا ہے۔ شادی کے پانچ بلکہ چھ ماہ بعد بھی شاہد ویز بیٹا بالکل نہیں بدلا، وہی سنجیدگی و خاموشی اس کی ذات میں رچی بسی ہے۔ بلکہ پہلے سے کمزور ہو گیا ہے۔ ابھی تک میں نے اس کے چہرے پر آنسو دیکھی۔“

”اماں اب باتیں ہی کرتی رہیں گی یا کچھ خالد جان کی خاطر مدارت کا بھی انتظام کریں گی؟“ سارہ نے بے جی کے چہرے پر پھیلنے تکلیف دہ رنگ محسوس کئے تو ماں کو ٹوکا تھا۔

”میں مہمان تھوڑی ہوں بیٹی! جو پکا ہے وہی کھالوں گی، گھر کی سدھری ہوئی حالت دیکھ کر ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میری بیٹیوں میں سے ہی کوئی آئی ہوئی ہے۔“ انہوں نے شفقت سے سارہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ہماری ہونیکم میں ایسی سلیقہ مندی و پھرتی کہاں ہے۔ دو سال میں ہی گھر سڑا کر رکھ دیا تھا اس نے اور کہنے پر ان کی زبان درازی سے کون جیت سکتا ہے بھلا؟“

”اماں! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ برائیاں کر کے کیوں تھکتی نہیں ہیں؟“ سارہ زچ ہو کر کوبہائیں۔ اس کے اس انداز نے ان کے پٹنگے لگا دیئے تھے۔

□●□

تم اپنے آپ کو کب تک چھپاؤ گے خود سے  
 بکھر گئے تو سمیٹے نہ جاؤ گے خود سے  
 بڑے جتن سے گھروندے بنا رہے ہو تم  
 وہ وقت آئے گا ہنس کر گراؤ گے خود سے

”سر! ایک میڈم ملنے آئی ہیں آپ سے۔“ وہ رانگ چیز سے سرٹکائے اپنی خیالی دنیا میں غلطیاں تھا جب بیون نے اندر آ کر اطلاع دی تو وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

”کون ہیں؟“

”معلوم نہیں سر! پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ انہوں نے آپ کا نام لے کر کہا کہ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ بیون نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

”بھیکو اندر.....“ اس کی یادداشت میں کوئی ایسی خاتون نہیں تھیں جو اس سے ملنے کے لئے آفس پہنچ جائیں۔ ساری زندگی صرف دو عورتوں سے اس کے تعلقات رہے تھے جن میں اول بے جی، دوم زینہ خالد کی ذات تھی اور اسے یقین تھا ان دونوں میں سے کوئی یہاں نہیں آ سکتی ہے۔ وہ اسی شیش و بیج میں مبتلا تھا کہ لائٹ پر پل سادہ ساڑھی میں ملبوس اندر داخل ہوتی فرح رضوی کو دیکھ کر وہ استراٹا کھڑا ہو گیا۔

”حیران ہو گئے نا؟ آپ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ میں یہاں پہنچ جاؤں گی۔“

”شیور، سر پر اتارے میرے لئے..... آپ بیٹھیں پلیز۔“ ان کے خلوص بھرے شوق لہجے نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

”آپ تو ایسا رخ بدل کر نکلتے تھے کہ دوبارہ حال پوچھنے بھی نہیں آئے۔“ انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مشکوہ کیا۔

”سوری، دراصل کچھ مصروفیات ایسی رہیں کہ میرے ذہن سے بچو ہو گیا سب۔“

”ہاں، میں سمجھ سکتی ہوں۔ اس مصروف ترین دور میں کہاں فرصت مل سکتی ہے..... لیکن وقت نکالا جائے تو نکل آتا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم وقت کے قیدی بن کر



رہ گئے ہوں۔ اپنی مرضی، اپنا اختیار سب کہیں کھو کر رہ گیا ہے۔“

”جی آپ کیا لیں گی..... ٹھنڈا یا گرم؟“

”کچھ نہیں، صرف آپ سے ملنا تھا۔“ انہوں نے افساری سے کہا۔

”بتائیں میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟“ انٹرکام پر کافی کا آرڈر دینے کے بعد وہ ان سے مخاطب ہوا۔ بہت خاموشی سے وہ ان کی کیفیت نوٹ کر رہا تھا۔ ان کی ہر جنبش بتا رہی تھی وہ اس سے یوں ہی ملنے نہیں آئی ہیں۔ ان کی آمد کے پیچھے ضرور کوئی مقصد ہے جسے بتاتے ہوئے وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہیں۔ انہیں حوصلہ دینے کے لئے ہی وہ خود مخاطب ہوا تھا۔

”خدمت نہیں ضرورت کہیں میٹا!“ وہ تنجیدگی سے کوہا ہوئیں۔

”جو آپ مناسب سمجھیں۔“

”ایک عرصہ ہوا مجھے لوگوں پر اعتماد کرنا چھوڑے ہوئے۔ سنا ہے سانپ سے ڈسا ہوا رستی سے بھی خوفزدہ رہتا ہے، یہی حال میرا بھی ہے۔ خیر مزید کیا بتاؤں، وقت کا چلن جو ہے اس سے سب ہی واقف ہیں۔ جب انسان پر ہر اوقات پڑتا ہے تو سب غیر ہو جاتے ہیں اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔“ وہ دھیسے لہجے میں کہتی ہوئی کوہا خود سے مخاطب تھیں۔ گہرے رنج و تاسف کی سرنخی ان کے بُرو تار چہرے پر پھیل گئی تھی۔ شاہد بیز خاموش بیٹھا ان کے بولنے کا منتظر تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی تھیں پھر آنکھوں میں اترتی نمی کو پلکیں جھپک جھپک کر زائل کرتے ہوئے نرم مسکراہٹ سے کوہا ہوئیں۔

”نا معلوم کیوں بعض دفعہ مجھ پر اسی طرح پاگل پن کا دورہ پڑ جاتا ہے اور میں فضول بولنے لگتی ہوں۔ میں یہ کہنے آئی تھی، میرے پاس خاصی رقم ہے اور میں چاہتی ہوں اسے بزنس میں لگا دوں۔“

”کون سا بزنس کرنا چاہتی ہیں آپ؟“

ہیون کافی لے آیا تھا اور دونوں کو سرو کر کے چاکا تھا۔ فرح رضوی خاصی بُر جوش دکھائی دے رہی تھیں۔

”میں خود کوئی بزنس کرنا نہیں چاہتی بلکہ چاہتی ہوں کہ کسی کے بزنس میں روپیہ لگا کر منافع حاصل کرتی رہوں۔“

”ہوں..... منافع کمانے کے تو اور بہت سے ذریعے ہیں۔ پھر آپ نے بزنس کو ہی کیوں سلیکٹ کیا؟ میرے خیال میں ایک دفعہ کی حادثاتی ملاقات میں کوئی کسی کو اچھی طرح چرکھ نہیں سکتا۔ آئی مین اعتماد نہیں کر سکتا۔“ اس کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔

”درست کہہ رہے ہو بیٹا! میں نے پہلے ہر ممکن کوشش کی اور دھوکا کھایا اور یہاں مشعل انڈسٹریز میں قدم رکھنے سے قبل میں نے بہت چھان بین کی ہے، ہر طریقے سے، ہر طرح سے تسلی کرنے کے بعد میں یہاں داخل ہوئی ہوں۔ حسن بیگ صاحب کی تو ایک دنیا معترف ہے اور پھر وہ تو اپنے حسن اخلاق سے پہلے ہی گرویدہ بنا چکے ہیں۔ مکمل پھروسے اور پورے اعتماد کے ساتھ میں آپ کے بزنس میں روپیہ لگانے کو تیار ہوں۔“

”آپ اتنی جلد بازی میں فیصلہ مت کریں۔ پہلے ایک ہفتہ آپ خوب سوچ سمجھ لیں۔“ فرم کی جو حالت تھی وہ سب سے چھپی ہوئی تھی ایسے میں ان کی طرف سے شراکت داری کی آفر خاصی پُرکشش تھی مگر ایسے میں کچھ عرصہ بہت صبر و ضبط سے کام لینے کا تھا۔ کسی بھی طرح وہ فوری رقم کی ادائیگی نہ کر سکتا تھا جس کی یقیناً وہ ڈیمانڈ کرتیں کہ وہ تو بیگ صاحب کی ایمانداری و بزنس کی شہرت سن کر آئی تھیں۔ انہیں کیا معلوم باہر سے خوب صورت نظر آنے والی عمارت اندر سے بالکل کھوکھلی اور بوگس ہے۔ جو اپنا وزن سہارنے کی ہمت کھوٹیٹھی ہو وہ بھلا کسی اور کے لئے کس طرح سہارا بن سکتی ہے؟ لیکن وہ انہیں کس طرح مطلع کرنا؟

”میں بہت سوچ سمجھ کر آئی ہوں۔ اب کسی سوچ و بچار کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ مطمئن انداز میں کوہا ہوئیں۔

”اوکے..... لیکن مجھے کچھ وقت چاہئے۔“

”اچھا میں انتظار کروں گی بہت بے چینی سے۔ کل آپ کو جواب دینے میرے گھر آنا ہوگا اور جواب بھی ہاں میں ہونا چاہئے۔

□●□

آفس سے واپسی پر وہ بے جی کو لینے کی خاطر خالد زرینہ کے ہاں گیا تھا۔ وہاں ساہرہ نے بڑے اصرار سے انہیں روک لیا تھا حالانکہ بے جی کی مرضی نہیں تھی۔ وہ انکار کر رہی تھیں۔ وجہ وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ گھر کی ذمہ داری کے خیال سے وہ رکنا نہیں چاہ رہیں ورنہ ساہرہ جو ان کی بہت چینیٹی اور لاڈلی بھانجی تھی اس کے لاڈ بھرے اصرار کو وہ کبھی نہ رد کرتیں مگر اب اس سے زیادہ انہیں مشعل کا خیال تھا۔ مشعل کا خیال آتے ہی اس نے انہیں وہاں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور کہہ آیا وہ رانچہ کی خوشی کی خاطر انہیں وہاں چھوڑے جا رہا ہے، کل واپسی پر ضرور لے کر جائے گا۔ وہاں سے چلا آیا تھا۔ گھر جانے کی اب کوئی جلدی نہیں تھی۔

بے جی کی خاطر، ان کی پریشانی کے خیال سے وہ فوراً گھر بھاگا کرنا تھا۔ اب بے جی گھر میں نہیں تھیں سوائے کوئی فکر و پریشانی بھی نہیں تھی۔

مشعل اپنی بدتمیزی و بد مزاجی کے باعث بالکل پس منظر میں چلی گئی تھی۔ شادی کو چھ ماہ ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں اس کے مزاج و انداز میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ موسم میں ہلکی خنکی تھی۔ دھیرے دھیرے چلتی ہو اکیف آور تھی۔ چاند آسمان پر تاروں کے جھرمٹ میں بڑی شان سے چاندنی لٹا رہا تھا۔ وہ کافی وقت تک بے مقصد سڑکوں پر کاروڑ اتار رہا تھا۔ کافی شاپ سے کافی پی کر اٹھنے کے بعد اس نے رسٹ وایچ پر نگہ ڈالی تھی۔ وقت خاما گزر چکا تھا۔ اس نے کار گھر جانے والے راستے پر ڈالی۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی۔ وہ رش ڈرائیونگ کرتا ہو اگھر پہنچا تھا۔

”کہاں گئے تھے؟“ اندر قدم رکھتے ہی مشعل ہم کی طرح بلاست ہوئی تھی۔

”اوہ! سو فیصد بیویوں والا سوال اور انداز بھی۔“ وہ شانے اچکا کر طعنے مسکراہٹ سے کوہا ہوا۔

”بیوی..... مائی ٹٹ، کسی خیال میں مت رہنا۔“ وہ پاؤں چنچ کر چینی۔

”میں بالکل حقیقت پسند بندہ ہوں..... اس لئے خیالوں، خوابوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔“

”میں کہتی ہوں آخر مجھے اس طرح نارجہ کرنے کا مقصد کیا ہے؟ کس بات کی مجھے سزا دی جا رہی ہے..... میں کب تک اس ڈربے میں بند رہوں گی؟“

”تمہیں کوئی سزا نہیں دی جا رہی۔ کون نارجہ کر رہا ہے تمہیں؟“ وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ کر پیروں سے موزے اور جوتے اتارتے ہوئے کوہا ہوا۔

”یہ سزا نہیں تو کیا ہے کہ میں اپنی مرضی سے کہیں نہیں جاسکتی۔ نہ میرے فریبنڈز مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں، مجھے قید کر کے رکھا جا رہا ہے یہاں۔“ وہ تیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔ جھنجھلاہٹ، اکتاہٹ، غصہ، کھسیاہٹ اس کے لہجے، اس کے چہرے، اس کے ہر عضو سے عیاں تھا۔

شاہد بیز صوفے کی بیک سے ٹیک لگائے بہت بیزی انداز میں بیٹھا تھا۔ اس نے لگے ہیں اس کے سراپے پر ڈالیں۔ بلیک ٹراؤزر پر ہاف آستین کی سرخ شرٹ جس پر بلیک فینسی ورک تھا، ٹراؤزر کے کھلے پانچوں میں بھی سرخ و سیاہی کام ہوا تھا۔ وہ سوٹ اس کے سانچے میں ڈھلے جسم پر غضب ڈھا رہا تھا۔ خروٹی سرنخی مائل بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ کانوں میں بلیک اسٹون کے خوب صورت ٹاپس جگمگا رہے تھے۔ چہرہ میک اپ سے بے نیاز ہونے کے باوجود بہت پُرکشش و شاداب لگ رہا تھا۔ وہ حسین تھی۔

چاندنی رات کی فوس خیز روشنی کی طرح۔

موسم بہار میں کھلے گلاب کی طرح۔

خُسن تو مرد کی کمزوری رہا ہے۔

پھر وہ بھی تو مرد تھا، کہیں نہ کہیں تو آدمیت غالب آہی جاتی ہے۔ اس نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی چست لباس میں دوپٹے، چادر سے بے نیاز وہ نئے انداز میں اس کے احساسات جگا گئی۔ اس کے اندر عجیب سی ہلچل مچی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے یہاں نہیں رہنا..... دم گھٹتا ہے میرا یہاں پر..... میں یہاں سے جاؤں گی۔“ مشعل اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہہ رہی تھی اور وہ اپنے اندر اٹھتے مضطرب کی کشش سے نبرد آزما تھا۔ جذبات کسی طوفان کی صورت اختیار کرنے لگے تھے۔

”یہ کیا ہوا مجھے؟ میں جو اپنے ارادوں میں اٹل ہوں، اپنی انا و خود داری کے آگے بڑی سے بڑی خواہش کی پرواہ نہیں کرتا۔ اب ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیوں اس لمحے اس کی قربت کی چاہ میرے دل میں پیدا ہوئی۔ کیا میں اتنا گھٹیا ہوں؟ اتنا گرا ہوا ہوں کہ محض نفس کی تمنا پر اس کا ساتھ چاہ رہا ہوں، جس کی بدتمیزی وہ ہٹ دھرمی کے باعث ایک نگاہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ کیا میں اتنا کمزور ہوں، اتنا بے بس..... نہیں مجھے خود کو سنبھالنا ہوگا۔ اس مغرور لڑکی کے آگے مجھے کبھی نہیں جھکانا۔“

مشعل کہہ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی، اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھی۔

اس کے جذبات، احساسات، خیالات سے بے خبر۔ وہ اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ کافی وقت شاوور کے نیچے گزارنے سے دل و دماغ میں سکون و ٹھنڈک سرایت کر گئی تھی باڈی اسپرے استعمال کرنے کے بعد نائٹ سوٹ پہن کر باہر آ گیا تھا۔

وہ اب تک کھڑی تھی۔

”کھڑی کیوں ہو..... بیٹھو!“ اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب ہی بٹھا لیا تھا۔ نا معلوم کچھ وقت پہلے جو اس کے اندر جذبات کا بحر بیکراں متلاطم ہوا تھا اس کا اثر تھا یا اس کے چہرے پر ایسی بے بسی تھی کوہا کسی آواز پرندے کے پُرکاٹ کر جنجرے میں ڈال دیا جائے تو وہ مضطرب و بد خو اس رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس لمحے مشعل کے چہرے پر تھی۔ فی الحال جو بھی تھا اس کے اندر نرم کوشہ پیدا ہو گیا تھا۔

”مشعل! اب تک جو ہو اسو ہوا لیکن اب میں پوری تنجیدگی و خلوص کے ساتھ کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں جس پر تمہیں بھی تنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ آج سے قبل جو بھی ہوا اس کا مجھے فحس ہے۔ وہ سب میں برداشت نہیں کر پایا اور یقیناً کوئی بھی مرد اتنا اعلیٰ ظرف اور اتنے بڑے دل کا مالک نہیں ہوتا کہ اپنوں کے متعلق بے بنیاد وجوہوں

الزامات برداشت کرے۔ غصے میں وہ سب ہو جاتا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میری بات سمجھ رہی ہوں؟“ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ آہستگی سے کہتا ہوا۔ مگر وہ اس طرح وہاں بیٹھی تھی کہ اس کا ہوا سب سمجھ رہی ہو۔ بصارت اور کوپائی سے محروم پتھر کی صورت ہو۔

”وقت کسی کی ملکیت نہیں ہوتا، یہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہے جو کسی کی گرفت میں نہیں آسکتا لیکن کسی نہ کسی انداز میں اپنے گزرنے کا احساس ضرور دلاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو وقت گزر جائے اور پچھتاوے چھوڑ جائے، پچھتاوے صرف تا سَف و دکھ دیتے ہیں۔ تم خاموش کیوں ہو؟ کچھ تو کہو۔“ وہ بڑے دوستانہ لہجے میں مخاطب تھا۔

ایک لمحے کو متشعل غیر شناسا احساسات سے دوچار ہوئی تھی مگر پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔

”کب تک خاموش رہو گی..... کچھ تو بولو۔“

”کیا بولوں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ وہ سرد و سپا لہجے میں بولی۔ وہ کسی طور بھی شکست ماننے کو تیار نہیں تھی۔ شاہ ویز کی نرم مزاجی، دوستانہ انداز، بدلا ہوا لب و لہجہ کچھ بھی تو اس پر اثر انداز نہ ہو سکے تھے۔

”یہی کہ جو ہوا سے ہلکا کر اس وقت سے ہم نئی اور خوبصورت زندگی کا آغاز کریں۔ جہاں خوشیوں و مسرتوں کی آبشاریں بہتی ہوں، محبت و یگانگت کے رنگ ہوں، پھول ہوں، کہکشائیں ہوں۔“ اس کے تھکے ہوئے اعصاب پر اس کی مدہوش قربت نشہ سا طاری کرنے لگی تھی اور اس کی حالت اس شرابی کی سی تھی جو نشے میں منہمک منہمکتے بھی لڑکھڑانے لگتا ہے۔ متشعل جو اکڑی بیٹھی تھی اس بار اس نے اس کے لہجے کی تبدیلی پر چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہاٹ ڈریس میں اس کی مردانہ جاہت نمایاں تھی۔ اس نے اسے پہلی مرتبہ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ بڑی روشن روشن مسکراہٹ تھی۔ سحر انگیز آنکھوں میں جذباتوں کا رنگ تھا۔ از حد بولڈ اور ماڈرن ہونے کے باوجود وہ اس لمحے اس کی نگاہوں سے ٹک جہن نہ ملا سکی۔

”کر رہی ہو دوتی؟“ غیر ارادی طور پر اس نے اس کے شانے پر بازو رکھ کر کہا۔ متشعل کو محسوس ہوا دیکھتے ہوئے انگارے اس کے بازو پر آ گئے ہوں۔ اس نے سر اسیٹنگی سے اس کی جانب دیکھا وہ سراپا آتش بنا ہوا تھا، ہوش و خرد سے قطعی بیگانہ۔ متشعل کے ذہن میں وہ الفاظ کو بچنے لگے جو بڑے فخر و اعتماد سے اس سے کہے گئے تھے۔ ”محترمہ! آپ سمجھتی ہیں مرد کا ٹھکانا ہوتا ہے جس کو انگلیوں کی جنبش پر با آسانی نچایا جاسکتا ہے۔ آپ کا خیال ہے حُسن بڑی طاقت ہے مرد کو زیر کرنے کے لئے۔ آپ سمجھتی ہیں عورت مرد کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس کمزوری کی بنا پر عورت اسے اپنا غلام بنا سکتی ہے؟ ہوں..... مرد کے بارے میں آپ کا ہر خیال، ہر سوچ، ہر فلسفہ بالکل غلط ہے۔ آپ کے خیالات و نظریات انتہائی گمراہ کن ماحول کی پیداوار ہیں۔ آپ ایک بھنگی ہوئی لڑکی ہیں۔ مرد کیا ہے یہ آپ جان ہی نہ سکیں۔ اب میری رفیق حیات بننے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ دراصل مرد ہوتا کیا ہے۔“ اس کی زبان سے نکلے لفظ انگارے بن کر آج تک اس کے اندر دھک رہے تھے۔ یکفخت ہی ان پر ٹھنڈے پانی کی پھوار پڑنے لگی تھی۔ چھن..... چھن..... چھن..... انگارے بجھتے گئے۔ فخر و انبساط کی لہریں سی جسم و جاں میں دوڑنے لگیں۔

”ہا..... ہا..... ہا.....“ اس نے اپنے شانے سے اس کا ہاتھ ہٹا کر اپنے گلابی خوب صورت ہاتھوں میں لے لیا، پھر ہستے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہتا ہوا۔

”مجھے یقین تھا تم بہت جلد کاٹھ کے آلو بن جاؤ گے۔ حُسن بڑی طاقت ہے اور عورت ہر مرد کی کمزوری ہے..... ہے ما؟..... ہا.....“ وہ ہنس رہی تھی۔ بڑی کاٹ اور زہر تھا اس کی ہنسی میں۔ از حد خفیر و امانت تھی۔ شاہ ویز نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ بے ساختہ کھینچا تھا۔ پیشانی پر شکنیں نمودار ہونے لگیں۔

”شٹ اپ..... میں نے کہا نا جو ہوا سے بھول جاؤ۔“ وہ تنجید تھا۔

”ہونہہ..... کیوں بھول جاؤں؟“ وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو کر پھنکار رہی تھی۔

”اس لئے کہ میں بات بڑھانا نہیں چاہتا۔“

”میں اس موضوع پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتی اور نہ ہی تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ اگر ڈیڈی نے کسی وجہ سے مجھے تم جیسے آدمی کے پلے باندھ دیا ہے تو اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ تمہیں اپنے قریب آنے دوں گی۔ مجھے آج بھی تم سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی اس وقت تھی جب تم نے آفس کے پارکنگ لاٹ میں جو جو سے جھگڑا کیا تھا۔ پھر نا معلوم کس چالاکی سے تم نے چالیں چل کر مجھ سے ہر رشتے کو جدا کر دیا اور اب تم چاہتے ہو میں خود کو تمہاری خواہشوں کی بھیجٹ چڑھا دوں، نو، امپا سبل، نو، نیور امپا سبل، وہ بولتی چلی گئی۔

اس کے بدن کا تمام خون چہرے پر آ گیا..... کان سنسنانے لگے۔ دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ سارا خمار، ساری سرشاری، تمام جذباتیت بھاپ بن کر اڑ گئی۔ ضبط سے رگیں تن گئیں۔ آنکھوں میں آہو چھلکنے لگا۔ اس نے مرد ہو کر پہل کی تھی۔ اپنی انا، اپنی حیثیت و مردانگی سب کو پس پشت ڈال دیا تھا اور جو اب کیسی تذلیل سے نوازا گیا تھا۔ وہ سامنے کھڑی لڑکی نہیں کوئی حسین مگر زہریلی ناگن لگ رہی تھی جو کوئل و معطر احساسات و جذبات سے بے بہرہ ہو جاتی ہے جس میں صرف اور صرف انتقامی جذبات پروان چڑھتے ہیں۔

وحشت، جنون و اشتعال سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”آئندہ میرے متعلق کبھی خواب میں بھی.....“

”شٹ اپ..... شٹ اپ..... اسٹاپ اٹ.....“ اس کی ضبط کی طنائیں چھوٹ چکی تھیں۔ ایک ادائے کافرانہ سے بولتی ہوئی متشعل بالکل خاموش ہو گئی۔

”تمہارے بارے میں مجھے ہر بار کچھ سوچ کرنی شرمندگی و ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تمہاری یہ اکڑ، یہ غرور اگر چاہوں تو لمحوں میں نکال سکتا ہوں مگر شکست کھا جاتا ہوں اپنی طبیعت، اپنے مزاج سے۔“ اس کے لہجے میں الاؤ دھک رہے تھے۔ متشعل کو وہ اس وقت کوئی وحشی دیوانہ لگ رہا تھا۔ ایک خوف اس کے اندر اتر گیا۔

وہ بیڈ پر لائٹ آف کر کے لیٹ گیا۔ پھر نہ معلوم کب سویا مگر متشعل ساری رات جاگتی رہی تھی۔ شاہ ویز کی طرف سے اسے بے اعتمادی تھی۔



حرانے بہن کی جانب دیکھا جو فون پر مصروف گفتگو تھیں پھر ایک گہری سانس لے کر بیڈ کی چادر تبدیل کرنے لگیں۔ ان کے چہرے پر اندر دگی و ملال کے رنگ گہرے ہو گئے تھے۔

”حرا! چائے کے ساتھ کچھ چیزیں بنا لینا..... شاہ ویز آ رہے ہیں۔“ فرح رضوی ریسور رکھ کر ان سے مخاطب ہوئیں۔ ”بہت مشکلوں سے راضی ہوئے ہیں ہماری رقم اپنے بزنس میں انویسٹ کرنے پر۔“

”آپ! آپ نے اپنی تسلی تو پوری طرح کر لی ہے نا؟“ وہ چادر اور تکیوں کے کور تبدیل کرنے کے بعد پہلے کورز، چادر سمیٹتی ہوئی فکر مندی سے کہتا ہوں۔

”ہاں..... ہاں خوب اچھی طرح۔ جی تو اتنا عرصہ لگا دیا ہے۔“

”نا معلوم کیوں مجھے یقین نہیں آتا۔ کہیں یہ ہماری رقم لے کر انکار کر بیٹھے تو ہم کیا کر لیں گے ان کا؟ پھر..... پھر ہمارے پاس کوئی اور ذریعہ اب نہیں ہے۔“ وہ اپنے دل کی بات زبان پر لے آئی تھیں۔ فرح نے دوسوں کی شکار چھوٹی بہن کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگا کر کہتا ہوں۔

”دنیا میں ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو یقین، اعتماد اور بچ کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ شاہ ویز پر میرا اعتبار و یقین کبھی رایگاں نہیں جائے گا۔“

”چہرے ہمیشہ دھوکا دیتے ہیں۔ معصوم و سادہ بے ضرر نظر آنے والے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ اس بے مہر وقت میں اپنی کا خلوص دھوکا اور محبت غرض سے لپٹی ہوتی ہے تو وہ نوجوان بالکل غیر اور انجانا ہے۔ میرے خیال میں آپ ایک مرتبہ پھر غور کر لیں آپ! اگر ہمارے ہاتھ سے یہ رقم چلی گئی تو بچے کا کیا؟“ حرا ان کے قریب بیٹھ کر جو گفتگو تھیں۔

”اللہ پر بھروسہ رکھ کر بے فکر ہو جاؤ حرا! میں نے ہر طرح سے تسلی کر کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ پہلے بے شک تمہاری آپلی بہت بے وقوف اور نا سمجھ تھی۔ اسی نا سمجھی اور بے وقوفی کے ہاتھوں از حد نقصانات سے دوچار رہی ہے۔ مگر میں سوچتی ہوں ہماری ہر غلطی ہماری رہنمائی کرتی ہے اور میں نے ان سے سبق سیکھا ہے۔ چہروں سے دھوکا کھانے کا وقت گزر گیا۔“ وہ بہن کو مطمئن کر کے تیار ہونے لگیں۔

سفید جار جٹ کی جاسنی بارڈروالی ساڑھی میں سادہ جوڑے میں ان کی پُرتا رفتار شخصیت خاصی نمایاں تھی۔ کوئلز فریم کی عینک آنکھوں پر لگا کر باہر نکلیں تو حرا نے شاہ ویز کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ وہ سیدھی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ آئیں۔

”السلام علیکم۔“ بلیک پیٹ اور اسکاٹی بوشرٹ میں ملبوس شاہ ویز سلام کرتا ہوا اتر آنا کھڑا ہو گیا۔

”وعلیکم السلام بیٹا! بیٹھیں آپ۔“ وہ جواب دیتی ہوئی اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ شاہ ویز نے ہاتھ میں پکڑے ڈاکومنٹس درمیان میں رکھی ٹیبل پر رکھ دیئے تھے۔

”میڈم! میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے گا اور مجھے امید ہے آپ نے مکمل تسلی کے بعد فیصلہ کیا ہے۔“ وہ تنجیدگی سے کہتا ہوا۔

”جی، ہر طرح کی تسلی کے بعد ہی میں نے آپ کو رنگ کیا تھا۔“

”اوکے، آپ ان ڈاکومنٹس پر سائن کر دیجئے۔ اس کی ایک کاپی آپ کے پاس رہے گی اور دوسری فرم کے لا کر میں۔ آپ کی رقم آپ کو گھر بیٹھے ملا کرے گی۔ لیکن ابھی چند ماہ فرم آپ کو بروقت ادائیگی نہیں کرے گی۔ انشاء اللہ چھ سات ماہ بعد آپ کو آپ کی رقم فرسٹ کو پہنچا دی جائے گی۔“ شاہ ویز حسن بیگ کی عزت اور فرم کی سادگی کے خیال سے انہیں یہ نہ بتا سکا کہ کاروبار کی حالت بالکل تباہ ہے۔ تسلی کے لفظوں میں اس نے جتا دیا تھا کہ وہ رقم ابھی ندے سکیں گے۔

فرح کاروباری پیچیدگیوں کو نہیں جانتی تھیں انہیں صرف اپنی رقم کے محفوظ و منافع بخش ہونے کی تسلی نے مطمئن و سرور کر ڈالا تھا اس لئے انہوں نے بہت خوشی سے تمام شرائط مان کر سائن کر ڈالے تھے۔

شاہ ویز نے ایک کاپی انہیں دی تھی اور دوسری اپنے پاس رکھ لی تھی۔ فرح رضوی کی رقم خاصی مالیت کی تھی۔ اس رقم سے وہ چند ضروری اور بڑے آرڈر تیار کروا کر ڈیپور کر سکتا تھا اور ان کے ڈیپور ہوتے ہی فرم پیروں پر نہیں گھٹنوں پر کھڑی ہو سکتی تھی اور وہ بھی چاہتا تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کر لی تھیں مگر کہیں سے رقم دستیاب نہ ہو سکی تھی۔

ایسے میں فرح رضوی کی پیشکش خزاں میں بہار کی سی تھی۔ اسے امید ہو چلی تھی خزاؤں کے ڈیرے اب زیادہ دن ٹھہر نے والے نہیں تھے۔



دوسرے دن بے جی دوپہر کے وقت زریں کے ہاں سے آگئی تھیں۔

گھر میں حسب معمول سنائے اور خاموشی کا راج تھا۔ شاہویر آفس جا چکا تھا۔ مشعل معمول کے مطابق اوپر اپنے بیڈروم میں براجمان تھی۔ بے جی جوتھوڑی سی اس خوش گمانی میں مبتلا ہو گئی تھیں کہ شاید ان کی غیر موجودگی میں مشعل گھر کی تنہائی یا اپنے فرائض و ذمے داری کو محسوس کر کے نیچے موجودہوسب بھاپ کی طرح تحلیل ہو گئی تھی اس نے اس بات کا ثبوت دے دیا تھا کہ اسے سچ مچ اس گھر کی، گھر کے کینوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ان سے کوئی واسطہ کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

”یا اللہ! یہ کس طرح گھر بنے گا؟ اس لڑکی کو معمولی سا بھی کوئی احساس نہیں ہے۔ میرے مولا! میں نے بہت بڑی بھول کی ہے۔ اب تو سب آپ کے ہی اختیار میں ہے کہ اس بے رحم و بے حس لڑکی کی تقدیر سنواریں، اسے اچھے برے کی تمیز بخشیں۔ گھر بنانے کی لگن اس کے اندر بیدار کریں۔“ بے جی تھکی تھکی سی کرسی پر گرنے کے انداز میں آزر دگی سے اپنے رب سے خطاب تھیں۔

وہ ایک گھریلو سیدھی سادھی عورت تھیں۔ انہوں نے عمر کا طویل عرصہ مشقت، صبر و قناعت میں گزرا تھا۔ ان کے نزدیک چھوٹی سے چھوٹی شے بھی قدر و منزلت رکھتی تھی۔ مشعل جیسی لڑکی جس نے آسانکسات میں زندگی بسر کی تھی، بڑی سے بڑی مہنگی سے مہنگی، اعلیٰ شے اس کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی بھلا بے جی اس کی ذہنیت و احساسات تک کہاں رسائی حاصل کر سکتی تھیں؟ وہ بھی سوچ رہی تھیں۔ بھلا کب تک وہ سب برداشت کرتی رہیں گی۔

”سلام بے جی۔“ چوکیدار کی بیوی سلام کرتی ہوئی آگے بڑھی اور نیچے بچھے کا رپٹ پر بیٹھ گئی۔

”ارے نیچے کیوں بیٹھ رہی ہو۔ یہاں اوپر بیٹھو۔“ انہیں اس کا نیچے بیٹھنا سخت برا لگا تھا، ساتھ اللہ کا خوف بھی۔“

”میں..... میں اوپر کیسے بیٹھ سکتی ہوں جی۔ میں نوکر ہوں، بھلا نوکر اور مالک برابر برابر کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟“ چوکیدار کی بیوی ہر اسام لہجے میں کوپا ہوئی۔

”نوکر ہوٹو کیا ہوا انسان تو ہو۔ پھر اللہ نے سب کو پیدا کیا ہے۔ اسنے انسانوں میں چھوٹے بڑے کی کوئی حد مقرر نہیں کی تو ہم کون ہیں فاصلے رکھنے والے۔“

بے جی کو خوف تھا کہ کہیں اللہ کو برا نہ لگے۔ پھر ان کی طبیعت بھی اسی قسم کی تھی کہ وہ کبھی بھی غرور و تکبر میں مبتلا ہوئی ہوں اور نہ ہی لوگوں سے فاصلہ رکھ کر ملنے کی عادی تھیں۔ نہ کبھی خود کو کسی سے برتر جانا نہ کسی کو خود سے کمتر سمجھا۔

چوکیدار کی بیوی ان کے ہاتھ پکڑ کر بٹھانے سے اوپر بیٹھی مگر وہ چھینی چھینی سی تھی۔

”میں نے صبح ناشتہ بنا دیا تھا اور دوپہر کے لئے آنا کوندھ کر فریج میں رکھ دیا تھا۔ صفائی کرنے والی سے صفائی بھی کروادی تھی۔“ اس نے اطلاع فراہم کی۔

”اس کا اجر اللہ دے گا تمہیں۔ میری ساری پریشانی سمیٹ ہی تم نے۔ بہو بیگم نے ناشتہ کیا تھا؟“ وہ مطمئن انداز میں استفسار کرنے لگیں۔

”جی کیا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ کوئی ان کی اجازت کے بغیر کمرے میں نہ جائے۔“

چوکیدار کی بیوی چلی گئی تھی۔ بے جی کچن میں چلی آئیں۔ کچن صاف ستھرا تھا۔ برتن اپنے ٹھکانوں پر چمک رہے تھے۔

انہوں نے فریج میں سے آنا نکالا اور کاؤنٹر پر لے آئیں۔ سالن کی دو ڈشیں کل ہی تیار کر کے رکھ گئی تھیں، اب انہیں صرف گرم کرنا تھا۔ برزجا کر اس پوتو ارکھا اور پھلکے بنانے لگیں۔ شاہویر کی روز بروز گرتی صحت کی طرف سے انہیں از حد فکر تھی۔ کاروبار کے الجھاؤ میں وہ کھانا اکثر بے وقت کھاتا اور کبھی صرف چائے کافی سے ہی گزارا کرتا تھا۔ بے جی نے شروع کے چند دن تو برداشت کیا مگر پھر زبردستی اس کا کھانا گھر سے پکا کر آفس بھیجے لگی تھیں۔ شاہویر نے بھرپور کوشش کی کہ وہ اتنی محنت نہ کریں مگر بے جی کی بات اس کے لئے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

اس نے آفس سے ملازم کو بھیج کر کھانا منگوانا شروع کر دیا تھا۔

رات کو شاہویر آیا تو بہت خوش تھا۔ آتے ہی بے جی سے کسی معصوم بچے کی طرح پٹ گیا۔

”آج میں بہت خوش ہوں بے جی، پہلی کامیابی ملی ہے مجھے آج۔“ وہ مسکراتے ہوئے پرجوش لہجے میں بول رہا تھا۔ اسے خوش دیکھ کر بے جی کا چہرہ کھل گیا۔

”ماشاء اللہ..... پروردگار تمہیں اسی طرح کامیابیوں، کامرانیوں، سرتوں سے نوازتا رہے۔“

”بے جی! پوچھیں گی نہیں یہ کس طرح ہوا؟“ وہ بازو کے سہارے انہیں لاؤنچ میں لے آیا۔

”جانتی ہوں..... یہ سب تمہاری محنت اور میری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“

”آف کورس بے جی..... آف کورس۔ آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ میرے ساتھ نہ ہوتیں تو میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ بیگ صاحب کا فون آیا تھا، وہ بھی بہت خوش ہیں اور ان کی ہی کوششوں سے فرم کو آرڈر زل گئے ہیں۔ فرح رضوی بھی ہمارے لئے لگی ثابت ہوئی ہیں۔“ اس کے وجہ چہرے پر اس وقت روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

”بھائی صاحب کا فون آیا تھا؟ وہ بہو کے بارے میں دریافت کر رہے ہوں گے؟“

”جی ہاں.....“

”کیا پوچھ رہے تھے؟“

”یہی کہ وہ کیسی ہے؟ اس کی خند اور سرکشی میں کوئی کمی واقع ہوئی یا نہیں وغیرہ، وغیرہ“ بے جی کو اس نے مختصر بات بتائی ورنہ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ مزید اس سرپھری لڑکی کی دلجوئی و خدمت میں لگ جاتیں جو اسے کووارہ نہ تھا۔

درحقیقت حسن بیگ صاحب کے اس ہفتے کئی فون آنچکے تھے اور ہر بار ان کی یہی باتیں ہوتیں کہ وہ مشعل کو خوابوں میں بہت رونا ہوا، پریشان دیکھ رہے ہیں۔

”وہ اس کی جانب سے از حد پریشان و فکر مند ہیں۔“ شاہویر نے مصلحت سے کام لے کر انہیں یقین دلایا کہ مشعل بالکل ٹھیک ہے۔ وہ دوسروں کو پریشان کرنا جانتی ہے، خود کیسے پریشان ہو سکتی ہے؟ بیگ صاحب نہ معلوم اس کی تسلیوں و دلاسون سے مطمئن ہوئے تھے یا نہیں مگر وہ اسے سمجھاتے رہے تھے کہ وہ اعلیٰ ظرف ہے، مضبوط اعصاب اور ذہانت کا مالک ہے۔ اپنی دانشمندی سے کام لے کر مشعل کی گستاخیوں و بدتمیزیوں کو نظر انداز کرے۔

شاہویر ان کی محبت سے خاصا متاثر ہوا تھا۔ اتنی دور رہ کر بھی بیٹی کی طرف سے غافل نہیں تھے بلکہ اس کے احساسات سے بھی باخبر تھے۔

اپنی محبت سے ہی مجبور تھے جو مشعل کو فون نہیں کر پارہے تھے کہ جانتے تھے اس کی آزر دگی ان کے حوصلوں و ضبط کے پندار کو چکنا چور کر دے گی پھر وہ اس سے دور نہ رہ پائیں گے۔ اس کی بھلائی کے لئے وہ اس سے دور تھے۔

وہ بے جی کے پاس سے اوپر آیا تو وہ بیڈ پر بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر ڈریمنگ روم تک بڑھ گیا۔

وہ نائٹ سوٹ بدل کر آیا وہ تب بھی بے خبر سو رہی تھی، پنک چادر میں لپیٹی ہوئی۔ بال ٹیکے پر نکھرے ہوئے تھے۔ گلابی چہرے پر اس وقت بلا کی معصومیت تھی۔

گلاب کی ہنگھڑیوں جیسے لب بند تھے۔

بند آنکھوں کی سیاہ پلکیں سرخی مائل عارضوں پر جھکی دکش لگ رہی تھیں۔ سوتے ہوئے وہ کس قدر دلکش، حسین اور معصومیت کا پیکر لگ رہی تھی۔

کمرے میں خوابناک تاریکی تھی، صرف ایک سائیز لیمپ سے نکلی فسوں خیز روشنی میں بیڈ پر اس کا جسم پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت وہ کوئی پسر ا دکھائی دے رہی تھی۔

وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ دل میں کوئی عیجان انگیز جذبات نہ تھے۔ سوچیں صاف ستھری تھیں۔ احساسات پر بیگ صاحب کی التجاؤں کا اثر تھا۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر اسے دیکھ رہا تھا جیسے کسی خوب صورت منظر کو شوق و ذوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اسے حاصل کرنے کی، پانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی ہے، صرف نگاہوں کو بھلا لگنے کے باعث بندہ بے اختیار نگاہیں جمائے رکھتا ہے۔

ما معلوم اس کی نگاہوں کی حدت کی تاثیر تھی یا کوئی اور احساس، اس لمحے جب وہ کچھ بھکا بڑی خوبیت سے اسے دیکھ رہا تھا، مشعل نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے تو غنودگی کی سی کیفیت میں اسے خود پر جھکے دکھتی رہی، پھر جیسے ہی غنودگی پر حواس غالب آئے، پہلے حیرت سے اس کی آنکھیں پھیلیں پھر وہ چیخ مارتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

شاہویر جو اسے اٹھتے دیکھ کر چونکا تھا اس کی چیخ نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

”کیا ہوا..... ڈر گئیں؟“

”حت..... تو..... تم کیا کر رہے تھے؟“ وہ گھبرائی، بوکھلائی اٹھ بیٹھی تھی۔

”میں کیا کر رہا تھا؟“ وہ بڑبڑایا پھر کوپا ہوا۔ ”میں تمہیں دیکھ رہا تھا کہ تم سوتے میں کتنی معصوم و بے ضرر لگتی ہو۔“

”ہونہہ..... یوں کیوں نہیں کہتے کہ میری نیند سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ تم جیسے گھنیا انسان سے اور توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے؟“ وہ کسی ناگن کی طرح غصے سے پھنکارتی بیڈ سے اتر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ چند لمحے قبل نظر آنے والی معصومیت غائب ہو گئی تھی۔ گلاب کی ہنگھڑیوں جیسے ہونٹ آتش فشاں بنے ہوئے تھے۔ شاہویر بھونچکا رہ گیا۔

”ہر بات کا الٹا مطلب مت لیا کرو۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”کیا الٹا مطلب؟ ابھی میری آنکھ نہ کھلتی تو..... تو.....“

”میری نرمی سے ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔ میرا ارادہ کچھ نہیں تھا۔ یہ سب فضولیات تمہارے گمراہ ترین دماغ کی اختراع ہیں۔ لیکن میرے نفس کا پتا نہ تمہارے ذہن کی طرح تنگ و تنار یک نہیں ہے۔ اور ویسے بھی میں اپنے آپ کو کسی ایسے گھنیا کام کے لئے آمادہ نہیں کر سکتا جو میرے ایمان، میرے ضمیر، میرے کردار، میری شخصیت کو منہج کر دے۔“ وہ بہت پرسکون لہجے میں کہتا ہوا بیڈ پر لیٹ گیا اور ساتھ ہی لیمپ آف کر دیا۔

اس کے لہجے میں پتھر ملی صداقت تھی۔ ایسی سچائی جو اپنا آپ منوالیتی ہے۔

مشعل کسی بھنگی ہوئی روح کی طرح کمرے کی تاریکی میں چکراتی پھر رہی تھی۔ شاہ ویز کے سکون و اعتماد نے اسے زبردست شکست سے دوچار کیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اپنی نگاہوں میں خود گر جاتی مگر وہ مشعل تھی، کوئی عام لڑکی نہیں۔ وہ شکست کھا کر بھی شکست کا اعتراف کرنے والوں میں سے نہ تھی۔



بے جی مصر کی نماز سے فارغ ہو کر جاء نماز لپیٹ رہی تھیں کہ کال بیل کی آواز پر انہیں دروازہ کھولنے جانا پڑا۔ دروازہ کھلتے ہی باہر کھڑی فیشن بلی خاتون کو دیکھ کر وہ کچھ کہہ بھی نہ پائی تھیں کہ وہ انہیں نظر انداز کر کے بڑے اعتماد سے اندر چلی آئی تھیں۔

”کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ بے جی ان کے اعتماد اور چہرے پر چھائی نخوت سے گڑبڑا کر کویا ہوئیں۔ کولڈن براؤن سلک کی ساڑھی، بغیر آستینوں کے مختصر بلاؤز میں نظر آتا سفید بدن، کانوں میں ڈامنڈ کے آویزے، گردن میں ڈامنڈ نیگلکس، دونوں ہاتھوں میں طلائی چوڑیاں اور ڈامنڈ جڑے کڑے پہنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں بھی ڈامنڈ اور کولڈ کی انگلیاں دمک رہی تھیں۔ چہرے پر تازہ میک اپ کی چمک تھی۔ سرخی مائل براؤن بال شانوں سے بھی اوپر تھے۔

”مشعل اس گھر میں رہتی ہے؟“ تفاسٹ سے بچے جائے خوب صورت لاؤنچ کو بڑی فخارت سے دیکھتے ہوئے اسی انداز میں کویا ہوئی تھیں۔

”جی ہاں، آپ بیٹھیں میں ابھی انہیں بلا کر لاتی ہوں۔“ بے جی ان کی نگاہوں کی کاٹ و لہجے کی فخارت سے خوشو اگھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھیں۔ وہ انہیں بیٹھنے کا کہہ کر بائیتی کا بیتی اوپر پہنچی تھیں۔

خلاف معمول آج کمرے کا دروازہ بند نہ تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کی اجازت بھی جلد ہی مل گئی تھی۔ انہوں نے اندر جا کر مشعل کو بتایا کہ کوئی خاتون اس سے ملنے آئی ہیں۔

”کون خاتون ملنے آئی ہیں؟“ وہ جواب بھی باتھ لے کر نکلی تھی اور گاؤن میں ملبوس تھی، بالوں میں برش چلاتے ہوئے کویا ہوئی۔

”یہ..... یہ تو میں نے معلوم ہی نہیں کیا۔“

”نہیں معلوم کیا تو کر کے آؤ۔ میں اس طرح ہر کسی سے نہیں ملتی۔“ وہ تیوریاں چڑھا کر درجنگی سے بولی۔

بے جی اس عورت کا نام معلوم کرنے کے لئے پلٹی ہی تھیں کہ اسی دم دروازے کا چینڈل گھوما تھا اور دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو گئی تھیں۔

بے جی تو اس کی جرأت مند بے تکلفی پر ہنسا کر رہ گئی تھیں جب کہ مشعل نے دروازے کی آواز پر مڑ کر دیکھا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

”مشعل میری جان! یہ..... یہ تم ہو؟“ وہ انہیں پھیل کر ان کی طرف بڑھی۔ مشعل جو آنکھیں پھاڑے ان کی طرف بے یقین نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، انہیں اس طرح بے قراری سے اپنی طرف بڑھتے دیکھتے اس کا سکتہ ٹوٹا تھا۔

”پھوپھو جان.....“ اس نے چیخنے کے انداز میں کہا اور دوڑ کر ان سے پلٹ گئی۔

وہ ایک جذباتی منظر تھا۔ کافی دیر تک وہ ایک دوسرے سے لپٹی رہی تھیں۔ بے جی ان کی نظروں سے کویا اوجھل تھیں۔

بے جی نے چند لمحے رک کر ان کا ملاپ دیکھا پھر خاموشی سے کمرے سے نکل آئیں اور کچن میں آ کر ان کی خاطر مدارات کی تیاریوں میں جت لگیں۔

بہو کے سینکے سے پہلی بار کوئی آیا تھا۔ انہیں تو دل کھول کر تیاریاں کرنی تھیں۔

”کہاں چلی گئی تھیں آپ؟“ جذبات متوازن ہوئے تو مشعل ان سے علیحدہ ہوتی ہوئی آہستگی سے کویا ہوئی تھی۔

”احمد کو ہارٹ سرجری کے لئے امریکہ جانا تھا، وہیں گئے تھے۔“ وہ صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کویا ہوئیں۔ ان کی نگاہیں باریک بینی سے مشعل کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”ہارٹ سرجری کے لئے؟ مگر آپ کے ملازم تو بتا رہے تھے کہ آپ ورلڈ ٹور پر نکلے ہیں۔“ وہ بالوں میں ہینڈ لگا کر ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے کویا ہوئی۔

یہ تو کبھی کمبخت بہت ہی کائیاں ہوتے ہیں۔ مالکوں کی ہر بات پر ان کے کان لگے ہوتے ہیں..... وہ دل ہی دل میں خوب تلملائیں پھر قصد اُدھیمے سے مسکرا کر کویا ہوئیں۔

”ارادہ تو ورلڈ ٹور کا ہی تھا مگر احمد کو اچانک ہارٹ کی تکلیف اتنی بڑھی کہ ہمیں ٹریٹمنٹ کے لئے امریکہ جانا پڑا۔ نامعلوم کیا لیا، دیا آگے آگیا جو صرف دواؤں پر ہی ٹلی، سرجری سے بچ گئے۔ روپیہ پانی کی طرح بہا نا پڑا تھا جب کہیں جا کر جان چھوٹی احمد کی۔“

مشعل کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ان کی نگاہیں بیڈروم کے ذرے ذرے کا معائنہ کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ بولتی بھی جا رہی تھیں۔

”انکل کو بڑی تکلیف سے نجات مل گئی۔ یہ خوشی کی بات ہے۔ روپیہ زندگی سے بڑھ کر تو عزیز نہیں ہوتا۔ انکل صحت مند ہو گئے ہیں، روپیہ بہت کم کر دے دیں گے آپ کو۔“ اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

اس کے انداز کی سادگی، سوچ کی تبدیلی و پُروتار لہجے کی شائستگی نے رانہ کو چونکے پر مجبور کر دیا تھا۔

آج سے قبل وہ کہاں اتنی شائستگی و اعتماد سے گفتگو کرتی تھی۔ اس کے انداز میں ہمیشہ سے لاپرواہی اور لالباہی پن شدت سے موجود تھا۔

وہ بچپن سے ان کے اندر میں رہی تھی۔

وہ ان کی آنکھوں سے، ان کے کانوں سے منتی، ان کے دماغ سے سوچتی تھی۔

انہوں نے اپنی خود غرض ولاچی نظرت کے باعث اپنے سحر سے نکلنے ہی نہیں دیا تھا۔ اس کے ذریعے ہی تو وہ اس کی دولت جتھیا کر عیش و عشرت کی زندگی گزار رہی تھیں اور اب چھ سات مہینوں کے اندر وہ بالکل بدلی بدلی لگ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں..... کوئی بات ماسکڈ کر گئی ہیں؟“ اپنی طرف انہیں آنکھیں پھاڑے دیکھ کر وہ پریشانی سے کویا ہوئی۔

”نہیں بھلا میں کبھی آپ کی کسی بات کا بردار مان سکتی ہوں۔“ وہ اس کی جانب محبت سے دیکھتے ہوئے شیریں لہجے میں کویا ہوئیں۔ مشعل ان کے انداز پر نہال ہو گئی۔

”بھائی جان نے بہت ظلم کیا ہے میرے ساتھ۔“ وہ سرد آہ بھر کے کویا ہوئیں۔ ”لڑائی، جھگڑے، ٹوٹو، میں میں کس خاندان میں، کس گھر میں نہیں ہوتی۔ سب جگہ ہوتا ہے ایسا، مگر جلد ہی ناراضگی بھلا دی جاتی ہے۔ لڑائی جھگڑے مٹا کر دوستی اور اپنائیت کے رشتے استوار ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن بھائی جان، آہ..... بھائی جان نے تو ساری زندگی کے لئے میرے اور جو جو کے دل پر داغ لگا دیا۔ ایسا گھاؤ لگایا ہے کہ جس کا زخم تا حیات نہ بھر سکے گا“ وہ دہائی دینے کے انداز میں کویا تھیں اور مشعل جو ان کی کیفیت سمجھ رہی تھی، جو جو کے نام پر ایک دم اس کا دل دھڑکا تھا۔ گزریے لمحوں کی فلم ذہن کی اسکرین پر چلنے لگی تھی۔ اس کے اندر فطرب سا پھیلنے لگا تھا۔

”بھائی جان کو اگر تم کو، مجھ سے، جو جو سے علیحدہ ہی کرنا تھا، تمہیں کسی دوسرے گھرانے کی بہو بنانا تھا تو کوئی اپنے اسٹینڈرڈ کا داماد، اپنی حیثیت کی فیملی تو منتخب کرتے۔ انہوں نے نہ اپنے اسٹینڈرڈ کا خیال کیا نہ اپنی حیثیت کا۔ صرف مجھے نچا دکھانے کی خاطر بیٹی کی شادی اپنی ہی فرم کے ملازم سے کر دی۔ ہائے ہائے کیسا غضب ہو گیا یہ؟

کس طرح میں اپنا منہ سوسائٹی کے لوگوں کو دکھاؤں گی؟ لوگوں کے غلط، الٹے سیدھے سوالوں کا جواب دوں گی؟ لوگ تو سیدھے سادھے معاملوں کو ہر اظہار کر بدنام کرتے ہیں۔ پھر یہ تو بہت ہی مشکوک معاملہ ہوا کہ نہیں۔ چھپ چھپا کر بیٹی کی شادی ملازم سے کر دینا جب کہ سب جانتے تھے کہ آپ کی اور جو جو کی منگنی ہوئی ہے اور جلد شادی ہونے والی ہے۔“

وہ ایک ایک زخم اوھیر رہی تھیں اور اس کے اندر درد بڑھتا جا رہا تھا۔

”پھپھو! آپ نے بھی بے مروتی ولا پر وائی کی حد و دوڑ ڈی تھیں۔ اس وقت ہر رشتے کو آپ نے اس طرح توڑا تھا کہ لگتا تھا ہم اب کبھی جڑ ہی نہ پائیں گے۔“

”کیسے نہ جڑ پائیں گے، رشتے کوئی کانچ کے برتن نہیں ہوتے جو ٹوٹ گئے تو ٹوٹ گئے۔ نہ ہی شاخوں سے ٹوٹے پھولوں کی طرح ہوتے ہیں کہ مرجھا کر فنا ہو جائیں۔ یہ تو سانسوں کی آمد و رفت کے ساتھ چلتے ہیں۔“

”جلد بازی اور غصہ انسان کو کبھی بھی درست راہ نہیں دکھاتا پھوپھو جان! آپ کی باتوں، آپ کے چیلنج نے مجھے اسی وقت ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔ مجھے یہ ضد ہو گئی تھی کہ میں اب آپ کو اور جو جو کو شادی کر کے ہی دکھاؤں گی، خواہ اس کے نتیجے میں کچھ بھی کر گزرا پڑے۔ میری ضد وہ بے سکونی کو دیکھ کر پاپا نے شاہ ویز کو سلیکٹ کیا تھا۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے، آپ پاپا کو الزام نہ دیں۔“ اس نے فریج سے پیپسی کے کین نکال کر ایک انہیں سرو کیا دوسرا خود سپ کرتے ہوئے صاف کوئی سے بولی۔

”جلد باز اور ہٹ دھرم تو آپ صدا کی رہی ہو۔ خیر یہ بتاؤ خوش تو ہونا؟“

”آف کورس..... آپ کو خوش نظر نہیں آرہی؟“ وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔

”نہیں۔“ وہ اس کے سادہ چیلے کا جائزہ لے کر اطمینان سے کویا ہوئی تھیں اور اپنے جواب پر اس کے چہرے کے بدلے رنگوں نے ان کے شکوک کو تقویت دی تھی۔

”ضد اور جلد بازی وقتی طور پر سرت فراہم کرتی ہے اور یہ سرت لمحاتی ہوتی ہے۔ ساری حیات کے لئے زاوراہ نہیں بن سکتی۔“ دھیر دھیر سے کین سے سپ کرتے ہوئے وہ بہت آہستگی سے کویا تھیں۔ ان کے چہرے پر عجب مسکراہٹ تھی۔

مشعل تجل سی ہو گئی۔ بے شک رانہ اسے غیر متوقع طور پر یہاں آ کر ملی تھیں۔ حسن بیگ سے اس کا کوئی رابطہ ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ دو ماہ ہو گئے تھے اسے گھر سے باہر نکلے، شاہ ویز کی طرف سے لگائی گئی پابندی کی اس جیسی سر پھری لڑکی کو ایسی کوئی پرواہ یا خوف نہ تھا کہ وہ ہر نگلنا چھوڑ بیٹھی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اسے سکون باہر بھی نہیں ملتا تھا۔ حسن بیگ سے دوری اس کے لئے سوا ہاں روح تھی۔

مستزاد یہ کہ انہوں نے ابھی تک پلٹ کر اس سے فون پر بات تک کرنا کو ارا نہ کیا تھا اور یہ امر اس کے لئے بڑا اذیت ناک تھا۔ وہ ان سے فضا تھی، مکمل طور پر ناراض۔ لیکن اس کے دل میں ہمہ وقت وہی رچتے، ایسے میں اسے ان کی زیادہ یاد آتی اور دل چاہتا کوئی اپنا ہو جس سے وہ گھل مل کر باتیں کرے، ہنسے مسکرائے۔ اس جس زدہ موسم میں رانہ بیگم کی آمد بہار کے سندیسے کی تھی۔

کچھ وہ اتنی بے تابانی سے ملی تھیں کہ وہ اپنی ناراضگی و کدورت ان کے پُر غلوں و پُر جوش انداز دیکھ کر بھول بیٹھی تھی۔ مگر ابھی اپنی پرسنل لائف ان سے ڈسکس کرنے میں



ایک جھجک مانتھی۔

”جو جو کیسا ہے؟“ اس نے موضوع ہی تبدیل کر دینا مناسب سمجھا۔

”جو جو؟..... آہ..... ہاں..... مت پوچھو، بس جی رہا ہے۔“ ان کے چہرے اور لہجے میں ایسی یا سیت ورنجیدگی درآئی کہ وہ خود کو مجرم سمجھنے لگی۔

”آپ کی شادی کی خبر میرے دل پر ہی بجلی بن کر گر گئی تھی۔ پھر میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ جو جو کو معلوم نہ ہو۔ جب میں اتنی رنجیدہ ہوں تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ مگر صدافسوس سچ بھی کبھی چھپا ہے۔ جیسے ہی اسے معلوم ہوا اس نے خاموشی سے سلپنگ پلیر بڑی اتحاد میں کھالیں۔ بڑی جان تو رحمت کے بعد وہ ہوش میں آیا تھا۔“

”وہاٹ..... کیا..... جو جو نے سوسائڈ کرنے کی کوشش کی؟“ وہ حیرانی سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر خوف و پریشانی پسینے کی صورت ابھری تھی۔

”ہاں..... ڈاکٹر ز نے بہت جدوجہد کے بعد اس کی جان بچائی تھی۔“

”اب کیسا ہے وہ؟“ وہ بے قرار سی ہو اٹھی۔

”کہہ تو رہی ہوں زندہ ہے۔“ انہوں نے طویل سانس لے کر آرزوگی سے کہا۔ کمرے کی فضا یکدم بوجھل ہو گئی۔ رافعہ نہ معلوم کیا سوچ رہی تھیں۔ مشعل کے اندر خطر اب و خطر ار پھیلتا جا رہا تھا۔ لفظوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔

کرنے کو جیسے کوئی بات ہی نہ رہی تھی۔

سکوت ہر شے سے برسنے لگا تھا۔ دونوں کے باوجود وہاں سناٹا تھا۔

نہ معلوم کب تک سناٹا رہتا کہ یکدم رافعہ بولیں۔

”تمہارا ہسپتال تو تمہیں بہت چاہتا ہوگا۔ ہے نا؟“

”ہاں.....“ غیر ارادی طور پر اس کے ہونٹوں سے جنش ہوئی تھی۔

”کیوں نہیں..... ایک دو ٹکے کے انسان کو ہیرے جواہرات سے بھرنا خزانہ مل جائے تو وہ خوش نہ ہوگا تو کون ہوگا۔ لیکن میں بتا دیتی ہوں ایسے مرد کا پیار دکھاؤ، محبت جھوٹی ہے۔ بھائی جان سدا کے ظاہر پرست، جو جیسا نظر آیا اسے ویسا ہی مان لیا اور اسی سادگی کو استعمال کر کے اس ملازم نے جال پھینک کر آپ کو ہکا کر لیا۔ آپ کو اس کی ریا کاریوں سے بچنا چاہئے۔ مرد اپنی جھوٹی محبت سے عورت کے دل میں جگہ بناتا ہے اور ہمیشہ کے لئے اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔ مشعل خاموشی سے سن رہی تھیں۔ اس نے انہیں خاموش کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ان کی کسی بات کو جھٹلایا نہیں۔ وہ یہی چاہتی تھیں۔

وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

نیچے بے جی نے بے حد اصرار سے انہیں روکا تھا۔ وہ رکتی تو نہیں، مگر ٹیبل پر بھی ڈشز سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے ان کے قدم جکڑ لئے تھے۔ اعلیٰ لباس زیب تن کرنے، مہنگے ترین زیورات استعمال کرنے کے علاوہ اچھا اور لذیذ کھانا بھی انہیں خوب پسند تھا۔ سودل لپکانے کے باوجود اس طرح خروں سے بیٹھی تھیں گویا بے جی کی سات پشتوں پر احسان عظیم کر رہی ہوں۔



”سارہ..... سارہ بیٹی! کیا ہوا..... کیا کہہ رہے تھے باقرمیاں؟“

زینہ، سارہ کے قریب بیٹھی ہوئی فکر مندی سے گویا ہوئیں جو چند لمحوں قبل فون پر اپنے شوہر سے گفتگو کرنے کے بعد وہیں کرسی پر رنجیدہ سی بیٹھ گئی تھی۔ زینہ کے دل میں فون آتے ہی کھد بگ گئی تھی گفتگو کے دوران وہ بلا وجہی وہاں چکر لگاتی رہی تھیں۔ اس کے ریسورر کھتے ہی قریب آ کر گویا ہوئی تھیں۔

”وہ پوچھ رہے تھے کہ ابھی تک رقم لے کر کیوں نہیں آئیں۔ وہاں لوگ انہیں پریشان کر رہے ہیں۔ کھانا پینا حرام کر ڈالا ہے۔ قرض داروں کے خوف سے انہوں نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔“ اس کی بھیگی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

”کیا اس کا باپ یہاں کوئی خزانہ چھوڑ کر مر گیا؟“ انہیں تو پتہ لگ گئے۔ اپنے مخصوص جلمے بھنے انداز میں وہ بیٹخ پا ہوئیں۔ ”جولائ صاحب کی اولاد ہر چھ ماہ بعد رقم لے کر ہضم کر جاتا ہے۔ بد بخت کے کبھی بھی مطالبات پورے نہیں ہوتے اور ہوں گے بھی کیسے۔ نیت ہی نہیں بھرتی، سسرال کو بینک سمجھ لیا اور بیوی کو چپک، جب دل چاہا رقم بتائی، بھیج دیا کہ بھئی جاؤ اور لے آؤ۔“ وہ تیز تیز بول رہی تھیں۔ ان کی پڑوسن حمیدہ جو کسی کام سے آئی تھیں انہیں چیتنے دیکھ کر تجسس سی اندر آئی تھیں۔

”کیا ہوا زینہ! کیوں غصے ہو رہی ہو۔ اور سارہ کیوں رو رہی ہے؟“

”اپنے نصیبیوں کو رو رہی ہے سارہ..... قسمت پھوٹ گئی میری بچی کی..... کیسا بد ذات ڈاکو مل گیا میری بچی کو۔“ وہ ماتم زدہ لہجے میں گویا تھیں۔

”ہائیں..... کیا اب ڈاکے ڈالنے شروع کر دیے باقرمیاں نے؟“ وہ حیرت سے آنکھیں نکال کر بولیں۔

”لو اب نہیں، بہت پہلے سے انہوں نے یہ کام شروع کر رکھا ہے اور یہ شوق صرف وہ سسرال میں ہی پورا کرتے ہیں۔ یہیں سے اتنا مل جاتا ہے کہ کہیں باہر ہاتھ پاؤں چلانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔“

”اچھا پھر اس نے سارہ بیٹی کو رقم لینے بھیج دیا ہے؟“

”ہاں..... اور رقم بھی اتنی ہے کہ میں نہیں دے سکتی۔ کہاں سے دوں بھلا؟ سارہ کے لبا کوئی دولت جائیداد چھوڑ کر مرے نہیں، سرکاری نوکری پیشہ شخص تھے وہ۔ اور تھے بھی بے حد ایماندار۔ اوپر کی آمدنی کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اب وہی بیٹے کا حال ہے ورنہ اصغر کے ساتھی سب ہی نوٹوں میں کھیل رہے ہیں۔ کاروں اور بنگلوں کے مالک بنے ہوئے ہیں۔“

”اچھی بات ہے نا اماں..... قبر میں کوٹھی، بنگلے، دولت و کاریں نہیں جائیں گی، صرف اعمال جائیں گے۔ اللہ کرے بھائی اسی طرح ایماندار کی کا دامن تھامے رہیں، زندگی تو ایک دھوکا ہے۔ نہ معلوم کب دغا دے جائے۔“

سارہ نے موضوع بد لنے کے لئے بات کی تھی اور خاموشی سے آنسو صاف کر لئے تھے۔ وہ حساس تھی۔ اپنی مجبوری اور باقر کی خود غرضی کو بخوبی جانتی تھی اور ماں بھائی کے حالات سے بھی واقف تھی۔

اس کی خود ار طبیعت بار بار ماں کے در پر ہاتھ پھیلائے کونہ چاہتی تھی مگر باقر جب دھمکی دیتا کہ وہ دوسری شادی کر لے گا اور اسے طلاق دے کر ہمیشہ کے لئے گھر بھیج دے گا تو بس یہی طلاق کا خوف اس کی خودداری پر غالب آ جاتا تھا پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مانگنے چلی آتی تھی۔

”بیٹی! یہی باتیں تم اپنے میاں کو کیوں نہیں سمجھاتیں؟ دیکھو نا اس طرح اچھا تھوڑی لگتا ہے۔ پھر وہ ایک ہی تو داماد نہیں ہیں اور بھی تو تین داماد ہیں۔ کبھی ان کے کانوں میں یہ بات پڑ گئی تو بہت برا ہوگا۔“ حمیدہ نے سارہ کی طرف دیکھتے ہوئے ناصحانہ انداز میں کہا۔

”وہ بیٹیوں داماد میرے ہیرا ہیں ہیرا..... بڑی عزت کرتے ہیں۔“ زینہ فخریہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

”دامادوں کو ہیرا سے کیڑا بننے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ بڑی حریصانہ طبیعت ہوتی ہے ان لوگوں کی سسرال کے معاملوں میں۔ بہوؤں سے زیادہ کانیاں اور خطرناک داماد ثابت ہوتے ہیں۔“ وہ قائل کرنے والے لہجے میں گویا تھیں۔

”میری بچی ماں نہیں بنی..... بس یہی خطا ہے اس بد نصیب کی، اس خامی کی بنا پر میاں نے انگلیوں پر نچا رکھا ہے ورنہ میری بیٹی میں کوئی عیب نہیں ہے۔ گھٹڑ ہے، سلیقے مند ہے، سسرال میں بھی ہر ایک کی خدمت کرتی ہے۔ پھر بھی کم بختوں کے دل موم نہیں ہوتے۔“

”مجھے تو اس کی ساس شکل سے ہی چنڈال لگتی ہے۔ یقیناً اس نے تعویذ گنڈے کروا کر بیٹے کو قابو میں کر رکھا ہے۔“ حمیدہ کوئی سوچھی تھی۔

”نہیں خالہ! ایسی بات نہیں ہے۔ وہ.....“

”تمہیں کیا معلوم، آج کل لوگ اپنا سکہ جانے کے لئے کیسے کیسے کام کرتے ہیں۔“ وہ اس کی بات قطع کر کے پُریعین لہجے میں گویا ہوئیں۔ ان کی بات سن کر زینہ کا بھی ماتھا ٹھنکا۔ انہیں بھی کچھ ان کی بات میں صداقت محسوس ہوئی۔

”میں نے تو کبھی اس بات کو محسوس ہی نہ کیا..... تم نے تو بالکل نئی راہ دکھائی حمیدہ۔“

”خود ہی سوچو..... کون سا مرد ہے جو آج کل کے دور میں بیوی کو اہمیت نہ دے۔ یہ تو کوئی چکر ہی لگتا ہے جو آدمی بیوی چھوڑ کر اطمینان سے بیٹھ جائے۔“

”ہاں یہ بات تو تم نے سچ کہی۔ دور ہی کیوں جاؤ، اپنے اصغر کو ہی لے لو۔ کتنی مجھ سے محبت کرتا ہے مگر بیوی کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا۔ بیوی میکے چلی جائے تو رات دن وہاں کے چکر لگاتا ہے۔ سسرالیوں کی آؤ بھگت تو پوچھو ہی نہ۔“

”آج کل ایسے ہی ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں..... میں تو بہت واقف ہوں ایسے کاموں سے۔“ وہ رازدارانہ انداز میں کہتی ہوئی ان کی جانب کھسک گئی تھیں۔

”کیا تم کسی ایسے کرنے والے کو جانتی ہو جو میری بچی کی زندگی سدھا رہے۔“

گھر میں ان بیٹیوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا پھر بھی وہ اس موضوع پر سرکوشیوں میں بات کر رہی تھیں۔

”ہاں جانتی ہوں میں..... ایک ہیں اللہ والے۔ بہت پیچھی ہوئی ہستی ہیں۔“

”سچ؟ کبھی تم نے کوئی کام کروایا ہے؟“ زینہ ایک دم ہڑجوش ہو گئیں۔

”کوئی ایک کام؟ بہت کام کروائے ہیں۔“ وہ فخریہ انداز میں مسکرائیں۔

”اماں! یہ کن چکروں میں پڑ رہی ہیں آپ؟“ سارہ نا کو اریلہجے میں بولی۔

”یہ کن چکروں سے کیا مراد؟ یو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جہاں دوا اثر نہ کرے وہاں دوا اثر دکھاتی ہے۔“ انہوں نے ڈپٹے ہوئے کہا۔ ”چلو جا کر حیدہ کے لئے چائے بناؤ۔“ وہ انہیں مطلب براری کے لئے موزوں لگیں تو انہیں ان کی خاطر کا بھی خیال آیا۔ سارہ جو پہلے ہی اس کام کے لئے اٹھ رہی تھی ان کے کہنے سے مزید پھرتی سے گئی۔

□●□

موسم بدل رہا تھا۔

گر میاں رخصت ہو رہی تھیں، سردیوں کی آمد آمد تھی۔ بدلتے موسم نے ماحول میں ایک اداسی و بے کلی سی بھر دی تھی۔

وہ جو رنگوں، روشنیوں اور چنگاموں میں زندگی بسر کرنے کی عادی تھی، ان وحشت بھری اداسیوں میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

رافعہ ایک مرتبہ کے بعد دوبارہ نہیں آئی تھیں اور نہ جاتے وقت اسے گھر آنے کی دعوت دے کر گئی تھیں۔ اسے یہ بات بری طرح کھلی تھی۔

انا پرست وہ سدا کی تھی، معمولی سے معمولی بات فوراً نوٹ کرتی تھی سوچا۔ ہنسنے کے باوجود پھپھو کی طرف نہیں گئی تھی۔

مگر دل کسی ضدی بچے کی طرح ہلک ہلک کر وہاں جانے کی ضد کر رہا تھا۔ دل کی بے سکونی تو اسی دم سے سوائی جب اسے معلوم ہوا تھا کہ جو جو نے اس کی شادی کی خبر سن کر صدمے سے خودکشی کر کے جان دینے کی کوشش کی تھی۔ اس انکشاف نے اس کے اندر سوئی ہوئی محبت کو از سر نو بیدار کر ڈالا تھا۔ اب وہ اسی نکلتش کا شکار ہو کر ڈوبتی تھکن کا شکار ہو گئی تھی۔ پھر موسم کی تبدیلی اور ذہنی تھکاوٹ نے اسے بخار میں مبتلا کر ڈالا تھا۔

کھانا اس نے کمرے میں ہی کھایا تھا۔ بخار کی شدت کے باعث نامعلوم کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ وہیں بیڈ پر لیٹ گئی۔ پھر اس کی آنکھ شاہوین کے مسلسل پکارنے پر کھلی تھی۔

”کیا ہے؟“ وہ اسے بیڈ کے قریب کچھ جھکے دیکھ کر غنودگی میں بولی۔

”محترمہ میں آپ سے گزارش کر رہا ہوں کہ سونا چاہتا ہوں۔“ اس نے اسی طرح کھڑے کھڑے قدرے جھک کر کہا۔

”تو سو جاؤ..... کس نے منع کیا ہے؟“ کچی نیندا بھی اس کے حواسوں پر سوار تھی۔

”اجازت نہیں لے رہا، آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ آپ اپنی زلفوں کو سمیٹنے کیونکہ ان کی چھاؤں میں سونے کا قطعی ارادہ نہیں رکھتا۔“ نظر میں ہمیشہ اس کا لہجہ از حد مہذب و شائستہ ہو جایا کرتا تھا۔

اس کی خوب صورت آنکھوں میں عجیب کاٹ و مسکراہٹ میں پنہاں تمسخر نے لمحوں میں اس کی نیندا ڈادی اور وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہونہہ..... ہزار بار جھوٹی ہوں میں اس گھنیا بیڈ پر۔“

”کوئی بات نہیں..... جھوک کر چائنا، آپ جیسے لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔“ وہ کہاں اس سے دبے والا تھا سواطمینان سے کہتا ہوا بیڈ پر دراز ہو گیا اور ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیپ آف کر دیئے تھے۔

”مجھے یہاں نہیں رہنا..... میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ اندھیرے میں اس کی زہریلی آواز ابھری تھی۔

”کہاں..... اپنی پھپھو صا حبہ کے پاس؟“

”ہاں..... بلکہ جو جو کے پاس۔“ اس کے لہجے میں عجیب سا طعنت تھا۔ وہ جو دن بھر کا تھا ہوا تھا اور اب سو کر اپنے اعصاب پر سکون کرنا چاہتا تھا، ہلکے پھلکے انداز میں کہی گئی اپنی بات پر مشعل کے لبوں سے نکلنے والے لفظوں نے کو یا اس کے اندر الاؤ دہکا دیا تھا۔

اسے ایسا لگا جیسے ہزاروں سانپ اسے ڈسنے لگے ہوں۔

”کیا کہتم نے.....؟“ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیپ آن کیا اور اس کی جانب گھورتے ہوئے سرد لہجے میں استفسار کیا۔

”وہی جوتم نے سنا۔“ وہ شانے اچکا کر اداسے کو یا ہوئی۔

”جو جو..... ہونہہ، کان کھول کر سن لو، جو جو کا جوک تمہارے میری زندگی میں شامل ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا اس لئے اب دوبارہ تمہارے لبوں پر اس کا نام نہیں آنا چاہئے۔ انڈرائسینڈ۔“

آن واحد میں اس کی آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں سی نکلتے لگی تھیں۔

”میں تمہیں پہلے بھی ہزار بار کہہ چکی ہوں اور اب بھی کہہ رہی ہوں، میں اس رشتے کو نہیں مانتی، اس نام نہاد تعلق کو توڑنا چاہتی ہوں۔“ وہ کھلے بالوں کو اسٹارف میں باندھتے ہوئے ہٹ دھرم لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”ہمارا تعلق، ہمارا رشتہ جوڑنا جس قدر آسان تھا توڑنا اتنا ہی کٹھن بلکہ ناممکن ہے..... بہتر یہی ہوگا کہ مکمل کوشش اس بندھن کو مضبوط کرنے میں لگاؤ..... ساری حقائق اب ختم کر ڈالو۔“

”اسٹوپیڈ میں نہیں تم ہو جو سمجھتے ہو کہ مجھے ہمیشہ اپنی قید میں رکھو گے۔“

”قیدی تم خود بن گئی ہو اپنی ضد کی، اپنی لانا کی۔ میں کسی پرندے کو قید رکھنے کا قائل نہیں ہوں..... پھر کسی انسان کو قید رکھنے کا گناہ کیسے کر سکتا ہوں؟ تم مجھے کی کوشش کرو۔“ اس نے قہقہے سے سمجھانا چاہا۔

”نہیں سمجھنا مجھے کچھ..... جب یہاں مجھے رہنا ہی نہیں ہے تو سمجھ کر کیا کروں گی؟“ وہ پاؤں پیچ کر چینی تھی۔

”میری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔“

”مجھے تمہاری نرمی، گرمی سے کوئی سروکار نہیں ہے، میں اس فضول رشتے کو مزید برداشت نہیں کر سکتی مسٹر شاہوین خان! بہتر یہی ہوگا کہ تم مجھے ڈائیورس دے دو، تم میرے اسٹینڈرڈ کے نہیں ہو اور نہ ہی میرے ساتھ کبھی انڈرائسینڈنگ ہو سکتی ہے۔ میں نے اتنا وقت یہاں گزارا صرف پاپا کے فیصلے کا احترام کرتے ہوئے، ان کی خواہش کی خاطر۔ لیکن اب میری برداشت کی نرمی ختم ہو چکی ہے۔ میں صبح چلی جاؤں گی۔“

پنک ناکی میں اس کے حسین چہرے پر از حد بے زاری اور لالچلی تھی۔ وہ بیڈ کے قریب ہی کھڑی تھی۔ اس کے تیز گہڑے ہوئے اور انداز فیصلہ کن تھا۔

شاہوین اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”میرے لئے یہ تعلق توڑنا ناممکن ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”کیوں؟ اوہ، مجھ سے تعلق توڑنا، مطلب دولت سے تعلق توڑنا ہے..... میں جانتی ہوں دولت کی طلب نے ہی تمہیں یہ کھیل کھیلنے پر مجبور کیا ہے۔“

”تم جو بھی سمجھو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”مجھے اعتراض ہے۔ مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے۔ تمہارے گھر ہم سے وابستہ ہر چیز سے نفرت ہے اور یہ نفرت کی انتہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ اب نہیں رہنا چاہتی، مجھے تم سے کوئی افسیت نہیں ہے نہ مجھے تمہاری پرواہ ہے۔ میرے سارے احساسات، تمام جذبات جو جو کے لئے ہیں۔“ وہ کو یا ہر قسم کے نارمل احساسات سے عاری حذر ذہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

وہ پہلے ہی اس کی جذباتیت سے آگاہ تھا۔ پھر جو جو کے ساتھ اس کی دوستی کے آزادانہ مظاہرے دیکھ بھی چکا تھا۔ شاہوین کے لئے یہ سب نیا نہ تھا۔ وہ اس سے ایسی باتوں کی توقع رکھتا تھا مگر توقع اور مشاہدہ دو علیحدہ قسمیں ہیں۔ توقع نے اسے مطمئن کر رکھا تھا مگر روبرو مشاہدہ تکلیف دہ اور ناقابل برداشت تھا۔

بے شک اس نے اسے صرف اپنا نام دیا، بیوی کا درجہ نہیں دیا مگر صرف نام کے حوالے سے ہی اس کے منہ سے نکلنے والے جو جو کے لئے الفاظ اس کی مردانگی و غیرت پر تازیانہ بن کر لگ رہے تھے جن پر وہ مشکل مضطرب کئے ہوئے تھے جب کہ مشعل پر تو جیسے کوئی دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ وہ جیسے خود فراموشی کے عالم میں کپے جارہی تھی۔

”جو جو کے ساتھ سے پہلے میں خود کو لڑکی ہی نہیں سمجھتی تھی۔ پاپا کی شخصیت سے متاثر ہو کر میرے سارے شوق سب کھیل حتیٰ کے لباس و انداز بھی مردانہ تھے۔ پھر جو جو کا ساتھ ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں لڑکی ہوں۔“

میرے سینے میں بھی دل ہے۔

میرے جذبات ہیں۔

میری آرزوئیں اور انگلیں ہیں۔

وہ میری بانہوں میں بانہیں ڈال کر مرغزاروں کی سیر کرتا تو ہوائیں گیت گاتی تھیں، ستارے گنگنا تے تھے، جھرنوں کے سرگم میں مجھے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دیتی تھی۔ سبزے پر اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا اچھا لگتا تھا۔

جب وہ میری شان میں تعسیدے پڑھتا تو مجھے محسوس ہوتا ساری کائنات میرے قدموں کے نیچے چلی آئی ہے اور میں جو جو کا ہاتھ تھامے نیلے آکاش کی عمیق وسعتوں.....“

”شٹ اپ..... شٹ پور ماؤتھ۔“ اس کا حوصلہ، اس کی برداشت، اس کا ضبط جواب دے گیا اور وہ چیخ اٹھا۔

وہ کو یا تصورات کی دنیا میں جو جو کے سنگ تھی۔ اس کے ایک دم اشتعال سے چیخنے پر وہ حواسوں میں لوٹ آئی تھی۔

اس کا غصے سے سرخ چہرہ، ہورنگ آنکھیں دیکھ کر وہ کاٹ دار مسکراہٹ سے کو یا ہوئی۔

”اب میرا منہ اس وقت تک بند رہے گا جب تک تم مجھے ڈائیورس دے کر یہاں سے نہیں بھیج دو گے۔“

”ہرگز نہیں..... میں کبھی بھی ایسا نہیں کروں گا۔ اس گھر سے تمہاری روح تو جاسکتی ہے مگر جسم نہیں۔“ بڑی مشکل سے وہ خود پر ضبط کئے ہوئے تھا۔

”میں نے تو سنا تھا مل کلاس مرد بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ عورت کے منہ سے کسی غیر مرد کا نام سن کر اسی وقت اسے طلاق دے دیتے ہیں..... مگر تم میں شاید حمیت نہیں ہے۔“ وہ جھکے پرچہ کے لگا رہی تھی۔

”خاموش ہو جاؤ..... مت میرے حوصلے کو آزمائش میں ڈالو۔“

”بیچ..... بیچ..... دولت بھی کیا شے ہے۔ بندے کو کس حد تک گرا دیتی ہے کہ وہ اپنے وقار، اپنی حمیت، اپنی مردانگی تک کو کھل ڈالتا ہے۔ کان کھول کر سن لو، میں جو جو سے ملوں گی۔“

”تم اس سے نہیں مل سکتیں۔“ وہ قریب آ کر غرایا۔

”کون روکے گا مجھے..... تم؟ ہوں، حیثیت کیا ہے تمہاری، صرف ایک نمائشی شوہر کی۔ دولت کے حریص منافق شخص کی میں کبھی پروا نہیں کرتی اور نہ ہی کروں گی۔“

ایک عرصے بعد پھر اس پر پرانا روپ چڑھا تھا، پُر اعتماد، بے باک، بڈر، ہٹ دھرم، ضدی اور اپنی بات منوانے والی سرشت عود کر آئی تھی۔

وہ برداشت کر رہا تھا۔ ضبط اور کڑے ضبط کے نئے نئے جہانوں سے گزر رہا تھا۔ مشعل کے لبوں سے نکلا ایک ایک جملہ اس کی حمیت، انا، قوت برداشت و حوصلے کی ردا کو تارتا رکھتا جا رہا تھا۔

”جو جو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میری شادی کی خبر سن کر اس نے سوسائڈ کی کوشش کی تھی۔ تھینکس گاڈ، وہ بیچ گیا۔ اگر وہ مر جاتا تو میں بھی مر جاتی۔ میں اس کے بغیر کیسے جی سکتی تھی..... جو جو..... مائی جو جو..... مائی ہارٹ..... مائی لائف..... مائی لور جو جو.....“

ضبط کی سرحدیں عبور ہو چکی تھیں۔

برداشت و حوصلے کی ردا کی دھجیاں بکھر گئی تھیں..... ایک دکھتا ہوا الاؤ تھا، شعلے اگتا لاوا جوشاہوین کی نس نس میں بہہ اٹھا..... اور اس کی رگ رگ سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

وہ کسی شعلے کی مانند ہی اس کی جانب بڑھا تھا اور میکا کی انداز میں اس کا دایاں ہاتھ متواتر چلنے لگا۔

تڑاخ..... تڑاخ..... تڑاخ..... کی زوردار آوازیں کمرے کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگیں۔

تھپڑاتنے زوردار اور طاقتور تھے کہ وہ بے ساختہ درد سے چیخنے لگی تھی۔

”میں نے کہا تھا نا، آئندہ کبھی میرے حوصلے کا امتحان مت لینا..... تمہاری زبان درازی بلکہ بد زبان درازی کا علاج میرے ہاتھ با آسانی کر سکتے ہیں۔ تم سمجھتی ہو اس طرح چپ گنگلو کے ذریعے تم مجھے مشتعل کر کے اپنا کام آسان کر لو گی۔ میں عام سطحی نام نہاد غیرت مندی کا مظاہرہ کر کے تمہیں ڈائیورس دے دوں گا اور تم آزاد ہو جاؤ گی۔ نہیں..... یہ ممکن ہی نہیں..... تمہاری اس چپ گنگلو سے میں کسی انتہائی فیصلے پر نہیں پہنچا لیکن یہ ضرور ہوا ہے کہ تمہاری اندر کی غلاظت پوری طرح عیاں ہو گئی ہے۔ تم ایک بد کردار، بد طبیعت و بد خصال لڑکی ہو بلکہ صنف نازک کے نام پر سیاہ دھبہ ہو۔“ شاہوین اسے نفرت انگیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا جب کہ وہ درد سے چیختے اعصاب، ہتھڑوں کی شدت سے سُس چہرہ اور آنکھوں میں پھیلنے پانی سے جلن کا احساس لئے ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

دونوں ہاتھ اس کے ابھی تک غیر ارادی طور پر رخساروں پر تھے۔

ساکت نگاہوں سے شاہوین کی جنوں خیزیاں دیکھ رہی تھی۔

”مجھ سے چھٹکارا صرف موت کی صورت میں مل سکتا ہے۔“

”مر گئی ہوں میں..... میری موت اسی دن واقع ہو گئی تھی جب تم جیسے وحشی سے میرا تعلق بندھا تھا، ان آتی جاتی سانپوں کا نام زندگی نہیں ہے۔ اس سے بہتر ہے تم میرا گلا دباؤ، نجات دلاؤ دو اس اذیت سے، مار دو مجھے..... مار دو، میں جینا نہیں چاہتی۔“ اس کا لہجہ بھگانا شروع ہو گیا تھا لیکن وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس سنگدل و بے درد شخص کے سامنے آنسو بہانے کا مطلب ہے اپنی شکست تسلیم کرنا۔

اس کے آگے خود کو بے وقعت و ارزاں کرنا۔

”اگر تمہاری پہلی جیسی حرکتیں رہیں تو خود ہی جہنم رسید ہو جاؤ گی۔ مجھے اپنے ہاتھ آلودہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ اس وقت اس کا غصہ، بدگمانی عروج پر تھی۔ از حد کراہیت و نفرت کا احساس اس کے لہجے اور آنکھوں سے ظاہر تھا۔

مشعل اس کے جارحانہ تیروں سے خائف ہو کر خاموش ہو گئی تھی۔ زبان درازی اور بد تمیزی میں وہ اس سے کبھی ہار نہیں مانتی تھی مگر شاہوین کی ہاتھ درازی اس کی زبان درازی پر مکمل طور پر حاوی ہو چکی تھی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ شاہوین بیڈ پر دراز ہو گیا۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ زبان خاموش تھی لیکن اندر ایک حشر برپا تھا۔

□●□

فرح رضوی کئی گھنٹوں سے لائبریری میں بیٹھی کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھیں۔ مطالعہ ان کا جنون کی حد تک شوق بن چکا تھا۔

جب بھی ان کو فراغت ملتی وہ اپنا زیا دہ تر وقت یہیں گزارتی تھیں۔ اب بھی وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر مصروف تھیں اور ایسے میں حراخت بوریت کا شکار ہو جاتی تھیں۔ ویسے تو وہ فطرتاً کم کو اور خشک طبیعت کی مالک تھیں۔ از حد تنہائی پسند اور سوچوں میں گم رہنا ان کی سرشت تھی لیکن فرح رضوی سے انہیں بہت محبت و لگاؤ تھا اور ان کی مسلسل بات چیت کرنے کی عادت سے وہ کافی بہل جاتی تھیں۔

جب انہیں مطالعے کا جنون اٹھتا تو وہ اسی طرح بوریت محسوس کرتیں اور اپنے گھر میں بولائی بولائی پھرتی تھیں۔

اب بھی ایسا ہی تھا۔ وہ ان کے ڈسٹرب ہونے کے خیال سے بے قدموں کئی چکر یہاں کے لگا چکی تھیں اور انہیں مصروف دیکھ کر خاموشی سے چلی جاتی تھیں۔ لیکن اس بار کتاب پر لگا ہیں دوڑاتے ہوئے وہ کوپا ہوئیں۔

”حرا! بیٹھ جاؤ..... کیوں بار بار چکر لگا رہی ہو؟“

”ارے آپ مجھے محسوس کر رہی تھیں؟“ ان کے لبوں پر نخوت آمیز مسکراہٹ پھیلی تھی جس سے پورا چہرہ روشن روشن لگ رہا تھا۔

”ہاں..... بالکل محسوس کر رہی ہوں۔“ جواباً وہ بھی شوفی سے کوپا ہوئیں۔

”سوری..... آپ یہاں آنے کے بعد باہر ٹکٹا بھول جاتی ہیں..... اور آپ جانتی ہیں کہ آپ کے بغیر میں نہیں رہ سکتی۔“

”اچھا بابا..... بیٹھ تو جاؤ۔“ انہوں نے بہن کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کس طرح اتنا وقت آپ ان کتابوں کے ہمراہ گزار لیتی ہیں..... مجھے تو کتابوں میں پھیلے لفظوں میں کوئی چارم نہیں محسوس ہوتا۔“

”محسوس کرو گی تو یقیناً ہوگا..... میرے خیال میں کتابوں سے بڑھ کر ہمارا کوئی دوست، کوئی ساتھی نہیں ہو سکتا۔ کتابوں سے دوستی کر کے تو دیکھو، خود ہی مان جاؤ گی۔ گھر بیٹھے بیٹھے یہ تمہیں اگلے پچھلے زمانوں کی سیر کروائیں گی۔ تمہاری تنہائی شیر کریں گی۔ تمہارے لبوں پر مسکراہٹیں نکھیریں گی۔ معلومات کے خزانے ملیں گے۔ سکون، امن، چین کی دنیا میں ان کتابوں میں آباد ہیں..... تم ایک بار ان سے دوستی تو کر کے دیکھو۔ ایک اچھی کتاب سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں ہو سکتا۔“

”میں شروع سے ہی تکلی ہوں اس معاملے میں۔ اخبار، رسالے، ڈائجسٹ مجھ سے پڑھے ہی نہیں جاتے۔ کیا کروں کہ اپنی طبیعت کے رجحان کی بات ہوتی ہے۔ اب انھیں یہاں سے..... بہت وقت ہو گیا ہے۔“ حرا کے اصرار پر انہیں وہاں سے اٹھنا پڑا۔ وہاں سے وہ لیونگ روم میں آ کر بیٹھ گئیں۔

”ہوں..... اب کہو، کیا بات ہے؟“ وہ کشنر کے سہارے نیم دراز ہو کر کوپا ہوئیں۔

”میں نے یہ سوچا ہے آپ! اہم اگر اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہمارے پاس کھانے کے لئے علاوہ خاک کے اور کچھ نہ ہوگا۔“ حرا چند لمحوں وقف کے بعد فکر مندی سے کوپا ہوئیں۔

”مشعل انڈسٹریز میں ہم نے رقم لگا دی ہے۔ ایک ماہ ہو چکا ہے، دو ماہ بعد ہمیں رقم ملنا شروع ہو جائے گی۔“

”مگر کب تک کھائیں گے ہم؟ ایک نہ ایک دن منافع ملنا بند ہو جائے گا اور ہم خالی ہاتھ ہو جائیں گے۔ پھر کیا کریں گے؟“

”میں نے تو کبھی اس انداز میں سوچا ہی نہیں۔“ ان کی آنکھوں میں بھی نظرات کی پر چھائیاں ابھری تھیں۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

”میں نے یہ سوچا ہے ہم کوئی چھوٹا سا بزنس اشارت کریں، کوئی ایسا بزنس جس سے ہماری فکر بھی ختم ہو جائے اور دوسری ضرورت مند عورتوں کو بھی باعزت کام مل جائے جس سے وہ اپنی ضروریات زندگی کا بوجھ بٹا سکیں۔“

”ایسا کیا کام ہو سکتا ہے؟ پھر ایسی ہنر مند عورتیں ہمیں کہاں سے ملیں گی؟“

”آپ! ہنر اور ذہانت ہماری عورتوں میں بے مثال ہے۔ ضرورت ہے انہیں استعمال کے مواقع دینے کی۔ ہمارے ملک کی عورتیں بہت باصلاحیت و ہنر مند ہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں وہ اپنا کردار، اپنے فرائض بخوبی انجام دے رہی ہیں۔“

”تم جانتی ہو، ہماری خواتین تین فیصد ناخواندہ ہیں۔“

”جی..... اس کے باوجود وہ اپنی بساط و صلاحیت کو بروئے کار لا کر اپنے گھر، اپنے فرائض کی ادائیگی کرتی ہیں۔ گاؤں ہوں یا شہر ہر جگہ کڑی مشقت کرتی ہیں۔ کڑھائی، بُنائی، سلائی کرنے میں ماہر، موہر خانہ داری میں طاق، کھیتوں، کھلیانوں میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے والی۔“

وہ چند لمحوں وقف کے بعد پھر کوپا ہوئیں۔

”تعلیم یافتہ ہیں تو اہم عہدوں پر ذمے داریاں نبھانے لگیں۔ ہمارے ملک کی عورتیں بہت باصلاحیت و ہنر مند ہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں وہ اپنا کردار، اپنے فرائض بخوبی انجام دے رہی ہیں۔“

”ہاں..... ہاں، اس سے کس کو انکار ہے۔ مگر بزنس کیا سوچا ہے تم نے؟ وہ کون سا کام ہے جو ہم با آسانی کروا سکیں؟“

”کل حیدہ آجائے، اس سے معلوم کروں گی۔“

”وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گئی ہوئی ہے۔ اس کی بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں نہ ایسا کریں ہم خود وہاں چلیں۔ حمیدہ بہت ہمدرد اور اچھی عورت ہے۔ برسوں سے ہمارے ہاں کام کر رہی ہے اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دیتی۔ جا کر اس کی بیٹی کو دیکھ آئیں گے تو خوش ہو جائے گی۔ اور اس کی ہستی میں دوسری عورتوں سے بھی معلومات کریں گے کہ وہ کون کون سے ہنر میں طاق ہیں۔“

حرا کو ان کا مشورہ پسند آیا اور وہ جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔



صبح اٹھا تو ذہن کو بوجھل محسوس کیا۔

معلوم نہیں یہ رات والی ٹینشن کا اثر تھا یا سوچوں نے اعصاب و بدن کو تھکن زدہ کر دیا تھا۔ وہ خود کو از حد مضطرب محسوس کر رہا تھا۔

اس نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھا۔ شاید رات کو بارش ہوئی تھی۔ فضا میں بھگی مٹی کی دلاویز مہک رچی ہوئی تھی۔

اس نے بے اختیار لمبی لمبی سانسیں لے کر اس مہک کو اندر انا را اور گویا پڑمردگی و انحلال برف کی مانند پگھلنے لگا۔

وہ کافی دیر تک دھلے دھلائے سبز پتوں پر چپکتے پانی کے شفاف قطرے دیکھتا رہا۔ پھولوں کے رنگ بارش سے دھل کر مزید شوخ ہو رہے تھے۔ بادل ابھی بھی سیاہ تھے۔

خوفناک سا اندھیرا اچھاپا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوا میں فرحت بخش ٹھنڈک تھی۔

ساتھی من چاہا ہو، حیات پر سکون و مسرت سے لبریز ہو تو ہر موسم دلکش و ہر بہار گلستا ہے کہ اصل موسم تو بندے کے اندر ہوتا ہے۔

اس کے اندر کا موسم جس زدہ و خزاں آلودہ تھا۔ ذہنی تفکرات نے اسے مضطرب و بے سکون کر ڈالا تھا۔ مستزاد رات مشعل کا اپنے سامنے بے باکی سے جو جو کے لئے جذبات کا اظہار اسے، اس کی حمیت کو بری طرح گھائل کر چکا تھا۔ وہ بمشکل اپنے آپ پر قابو پائے ہوئے تھا۔ ورنہ اس کی حمیت کا تقاضا تھا کہ مشعل کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ مشعل کے متعلق ذہن میں خیال آتے ہی اس کے خون کی روانی شریانون میں تیز ہو گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ہاتھ روم سے فارغ ہو کر آفس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس دوران اس نے غلطی سے بھی اس کی طرف ایک نگاہ نہ ڈالی جو صوفے کی بجائے نیچے کارپٹ پر بے سدھ پڑی تھی۔

”مجھے تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی بیٹے۔ کیا بات ہے، نیند پوری نہیں ہوئی کیا؟“ ناشتے کی ٹیبل پر بے جی اسے دیکھتے ہوئے فکر مندی سے استفسار کرنے لگیں۔

”کچھ تھکن محسوس ہو رہی ہے بے جی! آپ فکر مت کریں..... ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ اس کے وجہ چہرے پر دھیمی مسکراہٹ کافی انسر وہ تھی۔

بے جی بے چین ہو گئیں۔

”خوش رہا کرو شاہ وزیر! تمہیں انسر وہ اور اداس دیکھ کر میں خود کو مجرم محسوس کرتی ہوں..... مجھے یہ احساس بے کل کر ڈالتا ہے کہ میری جلد بازی، نا عاقبت اندیشی کی سزا تمہیں مل رہی ہے۔“ اس کی نگاہیں اس کے وجہ چہرے پر تھیں۔ گرے پیٹ کوٹ میں اس کی شاندار پرسنائی نمایاں تھی۔ از حد سنجیدگی نے اس کے وقار کو جاذبیت بخشی تھی۔

وہ ایسا تھا جس کی چاہ ہر لڑکی کر سکتی ہے۔ پھر وہ لڑکی کیوں خود کو نہیں بدلتی..... کیوں قدر نہیں کرتی؟

”اچھا بے جی! میں جا رہا ہوں۔“ وہ بریف کیس لے کر اٹھا تو بے جی چونک اٹھیں اپنے خیالوں سے۔

”اچھا بیٹے! اللہ کے سپرد، کار دھیان سے چلانا۔“ حسب عادت وہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئیں۔ اور جب تک اس کی کارنگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی کھڑی ہاتھ ہلاتی رہیں۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔



ساری رات سوتے جاگتے گزری تھی۔

شاہ وزیر سے وہ بدظن پہلے دن سے ہی تھی۔ پھر اس کے خشک و سرد دہانت آمیز رویے نے ان کے درمیان فاصلوں کی خلیج کھڑی کر دی تھی۔

وہ اپنے جس وجوہاتی کی دل ربائی و رعنائی پر نازاں تھی۔ اس احساس تقاخر نے اسے بہت غرور اور خود پسندی بخشی تھی۔

اپنے بے تحاشہ حسن کے زعم پر ہی اس نے فتح حاصل کی تھی مگر پہلی بار اسے شاہ وزیر جیسے کٹھورو بے حس شخص سے شکست محسوس ہوئی تھی۔

اپنی انا، اپنی خودداری اسے بے حد عزیر تھی۔

شاہ وزیر کا بار بار ہاتھ اٹھانا اسے احساس ذلت و توہین میں مبتلا کر گیا تھا اور اب وہ اس کے ساتھ ایک لمحہ بھی گزرنے پر رضامند نہ تھی۔

جب انسان کے اندر جذبات پھرے ہوں تو پھر وہ نفع و نقصان کے متعلق ہر گز نہیں سوچتا۔ اس وقت وہ بھی نفرت کے جذبات کے طوفان میں گھری ہوئی تھی۔ اس دم ہر چیز سے نفرت و کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

ہر قیمت پر وہ یہ گھر چھوڑنا چاہتی تھی پھر کبھی دوبارہ نہ آنے کے لئے۔ اس وقت اس پر صرف ایک جنون سوار تھا کہ شاہ وزیر نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ ایک بار نہیں بار بار.....

شاہ وزیر کے بیدار ہونے سے قبل وہ جاگ گئی تھی اور اس کے تیار ہونے اور کمرے سے جانے تک بے حس و حرکت پڑی تھی۔ پھر اس کے کمرے سے جانے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس کے گھر سے آفس جانے کا انتظار اسے تھا۔ جانتی تھی اگر اس کے ارادے کی بھٹک بھی اسے مل گئی تو وہ اسے قید کر ڈالے گا۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا، یہاں سے پھپھو جان کے پاس جانے کا۔ کل تک وہ خواہش کے باوجود اس لئے نہ جا سکی تھی کہ وہ اسے انوائٹ نہیں کرے گی تھیں۔ یہ بات اسے سخت ناگوار گزری تھی۔

یہ کل کی بات تھی اور اس کی انا پر کاری ضرب نہ لگی تھی؟

جس طرح ہر حادثہ چھوٹے حادثے کے اثر کو زائل کر دیتا ہے بالکل اسی طرح وہ یہ فراموش کر چکی تھی کہ وہ پھپھو کے ہاں بنا بلائے جا رہی ہے۔

اسے احساس تھا تو صرف یہ کہ شاہ وزیر نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے، اسے تھپڑ مارے ہیں، اس کی توہین و تذلیل کی ہے۔

منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے چھینج کئے تھے۔ بالوں میں برش کرنے کے بعد انتظار کرنے لگی شاہ وزیر کے گھر سے جانے کا۔ وقت مقررہ پر وہ گھر سے نکل گیا۔ احتیاطاً اس نے کھڑکی سے ذرا جھانک کر دیکھا۔ اس کی وائٹ کرو لاسزک پر فرائے بھرتی لمحوں میں اوجھل ہو گئی تھی۔

”کاش یہ سفر تمہاری زندگی کا آخری سفر ثابت ہو کیونکہ انسان!“

اس نے کھڑکی سے ہٹتے ہوئے دل ہی دل میں اسے بددعا دی۔

اس کے ٹوٹے، بکھرے اعصاب تیزی سے حیرت انگیز طور پر حرکت کرنے لگے تھے۔

سامان وغیرہ اسے کچھ نہیں لینا تھا۔

اس نے صرف چنڈ پرس لیا تھا۔ دروازہ آہستگی سے بند کر کے بنا آواز نہیروں سے وہ نیچے اتر کر آئی تھی۔ لاؤنج میں خاموشی تھی۔

اس نے محتاط انداز میں لاؤنج سے ملحقہ بے جی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ بے جی صبح سویرے اٹھنے کی عادی تھیں، شاہ وزیر کے جانے کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ سو جایا کرتی تھیں۔ اب بھی وہ اس کے منصوبے سے بے خبر اطمینان سے سو رہی تھیں۔ وہ اطمینان سے چلتی ہوئی گیٹ تک آئی، دروازے میں آٹومیک لاک تھا جو اندر باہر سے خود بخود دلا کلا ہو جایا کرتا تھا۔

اس نے آہستگی سے ٹن ٹن کیا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ باہر آئی۔ سرد ہوا کے جھونکوں نے باہر اس کا استقبال کیا تھا۔ موسم بہار آلود اور خشکی لئے ہوئے تھا۔ تیز بخار میں پتے اس کے جسم میں ٹپکی پیدا ہو گئی تھی لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

راہداری عبور کر کے وہ باہر آمدے میں آگئی تھی جس سے چند میٹر ہیاں عبور کر کے سامنے لان تھا اور لان سے تھوڑی دور گیٹ۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت لان اور گیٹ خالی تھا نہ صرف خالی تھا بلکہ کھلا ہوا بھی تھا۔ شاید چونکیدار کسی ضروری کام سے چلا گیا تھا۔

اسے لگا نصیب بھی اس کا ساتھ دے رہا ہے جو چونکیدار غائب تھا، وہ بھی گیٹ واکر کے۔ ورنہ جب سے شاہ وزیر نے اس پر باہر نکلنے پر پابندی لگائی تھی، چونکیدار بھی بہت سختی سے اپنی ڈیوٹی انجام دینے لگا تھا۔

موقع غنیمت جان کر وہ تیزی سے گیٹ عبور کر گئی تھی۔ باہر سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ چند قدم چل کر اسے ٹیکسی مل گئی۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گئی اور اسے لگا وہ قید سے آزاد ہو گئی ہو۔

ڈرائیور کو ایڈریس بتا کر سیٹ کی بیک سے ٹپک لگا کر بیٹھ گئی۔

ساری ہمت، سارے حوصلے پھپھو کو دیکھ کر بھر بھری مٹی کی طرح ڈھسے گئے۔ بڑی بے تابی سے ان کی جانب بڑھی۔ وہ بھی اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر افاں و خیر اس رہ گئی تھیں۔ بڑے پریشان انداز میں انہوں نے اسے سینے سے لگایا تھا۔ انہوں کی چاہت کی گرمی پاتے ہی وہ موم بن کر پگھلنے لگی۔ آنسوؤں کی یلغار اور ہونٹوں سے نکلنے والی آہ و فغاں کو اس نے ذرا نہیں روکا۔

”اتنی بری حالت ہے میری جان تمہاری۔ بخار سے پورا بدن جل رہا ہے۔ اور یہ چہرے پر کیسے نشانات ہیں.....؟“ اس کے بے اختیار رونے پر رافعہ بوکھلائی تھیں۔

چہرے پر مثبت انگلیوں کے نشانات نے انہیں دنگ کر ڈالا تھا۔

”اُس وحشی نے مارا ہے مجھے۔“ اس نے سکتے ہوئے کہا۔

”وہاٹ..... وہاٹ.....؟ اس جاہل نے تمہیں مارا..... اس دو ٹکے کے مردکی یہ جال کہ آپ پر ہاتھ اٹھائے؟“ اس کے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ جڑیٹش لہجے میں گویا تھیں۔



”پھچھو! وہ بالکل جنگلی ہے، ایک دم وحشی، خوب صورت احساسات تو اسے چھو کر بھی نہیں گزرے..... اس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ اس پر کوئی جذبہ، کوئی کوئل احساس اثر انداز نہیں ہوتا۔“

”آپ اندر چل کر لیٹو، میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں..... ٹیمپر پچر بہت ہو رہا ہے۔ اس کے بعد بات کریں گے۔“ وہ اسے سہارا دے کر کمرے میں لائیں پھر بیڈ پر لٹاتے ہوئے پریشان کن لہجے میں کویا ہوئیں۔

”پھچھو!“ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر لجا جت سے کہا۔ ”میں اب کبھی بھی اس وحشی کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں اس سے ڈائیورس لینا چاہتی ہوں..... وہ نہیں مان رہا۔“

”مائی سویٹ ہارٹ! فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں..... اب میں آگئی ہوں نا، دیکھنا کس طرح اپنی جان کے مسئلے حل کرتی ہوں۔“ وہ اس کے سرہانے پیچھے کر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

”کیا آپ مجھے ڈائیورس دلا دیں گی؟“ اس کی آنکھوں میں چمک ابھری تھی۔

”ہاں..... ہاں.....“

”کیا وہ ڈائیورس دے دے گا؟“

”وہ کیا اس کا باپ بھی دے گا، بس اب تم خاموش ہو کر لیٹ جاؤ۔ میں ڈاکٹر کو کال کرتی ہوں اور ملازمہ سے سوپ بنانے کا کہہ کر آتی ہوں۔“



صبح سے دوپہر ہونے کو آئی تھی۔ مشعل نے بیڈنی مانگی تھی اور نہ ہی ناشتے کے لئے کہا تھا۔ بے جی ظہر کی نماز سے بھی فارغ ہو گئی تھیں۔

اب انہیں بے چینی لگ رہی تھی کہ کیا بات ہے جو اس نے ابھی تک کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر تو نہیں آتی تھی، صرف انٹرکام پر اس کے آرڈر ز ملا کرتے تھے۔ اس کے حکم کے مطابق ٹرائل دروازے کے قریب بے جی رکھ کر آ جاتی تھیں۔ وہ کھاپی کر ٹرائی واپس دروازے کے باہر سرکا کر دروازہ لاک کر لیا کرتی تھی اور بے جی لے آیا کرتی تھیں۔

بے جی تذبذب کا شکار تھیں کہ کیا کریں؟ کیونکہ اس کی مرضی کے بغیر وہ کمرے میں جا نہیں سکتی تھیں۔ اسی الجھن میں وقت مزید بیت گیا۔

عصر کے بعد تو ان کی قوت برداشت بالکل ہی جواب دے گئی اور وہ پریشان سی اس کے کمرے کی طرف آ گئیں۔ غلافِ توقع دروازہ لاکڈ ہونے کی بجائے معمولی سا وا تھا جو خلافِ معمول تھا۔ ان کا دل انجانے وسوسوں سے لرزنے لگا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مشعل کو چند آوازیں دیں اور جواب نہ پا کر دروازہ کھول کر اندر چلی آئیں۔ کمرے میں مسکور کن خوشبوؤں نے ان کا استقبال کیا۔

”ہہو..... ہہو..... بیٹی کہاں ہو؟“ وہ کمرے کو خالی دیکھ کر ڈریسنگ روم اور پھر باتھ روم کے کھلے دروازوں سے جھانک کر آوازیں دے رہی تھیں۔ وہ موجود ہوتی تو جواب دیتی۔ وہ تو خود ان کی بے خبری میں جا چکی تھی۔ بے جی کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ اسے ہر جگہ دیکھ چکی تھیں۔ اس کا کوئی وجود نہ تھا۔

”چوکیدار! کہاں تھے؟..... کتنی بار کہا ہے گیٹ کے پاس سے نہیں ہٹا کرو۔“ گھر کی عزت کا سوال تھا، چوکیدار سے براہِ راست تو یہ سوال نہیں کر سکتی تھیں کہ اس نے مشعل کو گھر سے جاتے ہوئے دیکھا ہے اس لئے تمہید باندھنی پڑی تھی۔

”امتو رات سے ادھر ہی ہیں بڑا بیگم صاب!“ اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

وہ اندر آ گئیں۔ اتنا تو وہ سمجھ گئی تھیں وہ کسی وقت گھر سے چلی گئی ہے، کیوں گئی ہے؟ یہ انہیں معلوم نہ تھا۔ عجیب اندیشے پریشانیاں انہیں گھیرے ہوئے تھیں۔

اس کی یہ حرکت انہیں ناگوار گزری تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہاں گئی ہے؟ کیوں گئی ہے؟ اور کس طرح گئی ہے؟ اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟

کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے شاہ ویز کو فون کرنے کا ارادہ کیا کہ اس طرح اس کا معلوم ہو سکتا تھا۔ پہلے بھی اس کی پردہ پوشی کر کے وہ شاہ ویز کو پریشانی میں مبتلا کر چکی تھیں اور اب ایسا ممکن نہ رہا تھا۔

”ہیلو بے جی! خیریت ہے نا؟“ فون پر بے جی کی آواز سے ہی اسے کسی خطرے کی نو محسوس ہوئی تھی۔

”بیٹا وہ..... ہہو..... گھر..... میں..... نہیں ہے۔“

”کب سے بے جی؟“ اس کی آواز ایک دم ہی سپاٹ و سر دہو گئی۔

”معلوم نہیں..... میں انتظار کرنے کے بعد کمرے میں گئی تو وہ وہاں نہیں تھی اور چوکیدار سے معلوم کیا تو وہ کہہ رہا ہے وہ گیٹ کے پاس ہی رات سے بیٹھا ہوا ہے۔ مگر اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔“

”اوکے..... آپ فکر نہ کریں، میں معلوم کر لوں گا۔“

”معلوم ہے وہ کہاں جا سکتی ہے؟“

”جی ہاں..... ان کا واحد ٹھکانہ رانفہ بیگم کا مسکن یعنی ان کی پھچھو جان کا دولت خانہ ہوگا۔“ اس کے لہجے میں اڑدھوں کی سی پھنکار تھی۔ بے جی کانپ گئیں، آنے والے وقت کے خیال سے۔



شاہ ویز ریسیور کر پڈل پر رکھ کر سر تھام کر رانگ چیز پر دھیسے انداز میں بیٹھ گیا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ پیشانی پر آٹکا تھا جس کی دونوں سائیڈز رکوں میں خون کی روانی خطرناک حد تک رواں ہو گئی تھی۔ سر کو یا آہنی شکنجے میں جکڑا گیا تھا۔

شدید ترین ٹینشن اعصاب پر سوار ہوئی تھی۔

مشعل کے اس طرح گھر سے جانے کی اسے اتنی ٹینشن نہ تھی، جتنا غصہ و جنون بے جی کی لمرزئی، کانپتی، ڈری سہی، گھبرائی، فکر مند آوازیں کر رہا تھا۔

بے جی وہ واحد ہستی تھیں جن کی خاطر وہ ہر کام کرنے کو راضی تھا جو اپنے لئے کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ بات بھی ان کی خاطر ہی قبول کی تھی جو آج سوہاں روح بنی ہوئی تھی۔ ان کی خاطر ہی وہ مشعل کو برداشت کر رہا تھا۔

اس وقت بے جی کی فکر مندی نے اسے جھنجھوڑا لایا تھا۔

وہ غصے و جنون کی آگ میں حل رہا تھا۔

بے جی کوئی کمزور اعصاب یا متغیر کردینے والی عورت نہ تھیں۔ وہ ازحد صابر اور درگزر کرنے کی عادت کی مالک تھیں۔ وہ جانتا تھا اب بھی خوف و پریشانی کی انتہاؤں کو چھو کر انہوں نے اسے مطلع کیا ہے۔ تصور میں وہ ان کی پریشان صورت و کیفیت دیکھ کر مضطرب ہو رہا تھا۔ نہ معلوم کتنے لمحات اسی حالت میں گزر گئے۔ اس دوران فون کی کئی ٹیل بچ کر خاموش ہو گئیں مگر اس وقت وہ ایک قیامت سے گزر رہا تھا۔ کسی جانب یہاں اس کا دھیان نہ تھا۔

”سے آئی کم ان سر؟“ سیکرٹری کی آوازیں کر اس نے پیشانی سے ہاتھ ہٹایا تھا اور ساتھ اسے اندر آنے کی اجازت دیتے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

”سر! آپ ریٹروم سے آپریٹر نے پیغام دیا ہے کہ ضروری کال آرہی ہے اور آپ ریسیون نہیں کر رہے ہیں۔“ سیکرٹری نے مؤدبانہ انداز میں اطلاع بہم پہنچائی۔

”ہوں..... اوکے..... ٹھیکس..... ایک کپ کافی بھیجیں۔“

سیکرٹری ’لیس سر‘ کہہ کر چلا گیا۔ وہ ذہنی کثافت و غصے کے غبار سے آزار نہ ہوا تھا کہ دوبارہ ٹیلی فون کی ٹیل بجنا شروع ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

”سر! لائن پر حسن بیگ صاحب ہیں۔“ دوسری طرف سے آپریٹر کی مؤدبانہ آواز سنائی دی اور حسن بیگ کا نام سن کر غیر ارادی طور پر اس کے چہرے کی سرخی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پیشانی کی شکنیں مزید بڑھ گئیں۔ مٹھیاں جھنجھکی تھیں۔

”ہیلو..... ہیلو سر! آریو اوکے؟“ اس کی طرف سے جواب میں خاموشی نے آپریٹر کو ہراساں کر ڈالا۔ وہ پریشان کن لہجے میں کویا ہوئی۔

”لیس..... لائن کلیئر کرو.....“

آپریٹر نے لمحے میں لائن دے دی تھی۔

”ہیلو، شاہ ویز! ٹھیک تو ہیں نا آپ؟“ ریسیور سے حسن بیگ کی گھبرائی آواز سنائی دی۔ ان کی آوازیں کر اس کے اندر تک سرطہر دوڑ گئی اور دل میں پہلا خیال بھی آیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی خاطر ان کی پرسکون زندگی میں ایسے اذیت ناک و ناقابل برداشت دن رات چلے آئے ہیں جن کو برداشت کرنا اب مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آ رہا ہے۔

”ہیلو..... ہیلو..... شاہ ویز بیٹا! کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی ہے؟ کیوں خاموش ہو؟ میں کب سے کال کر رہا ہوں۔ آپ ریسیو ہی نہیں کر رہے تھے۔ میں نے آپریٹر سے معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ آپ آفس میں موجود ہیں۔ کافی دیر بعد آپ نے کال ریسیو کی ہے۔ اب بھی خاموش ہیں..... خیریت تو ہے نا؟ میری بیٹی، میری مشعل کیسی ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟“ ان کے لہجے کی بے قراری مضطرب میں ڈھل گئی تھی۔ وہ ایک سانس میں بولتے چلے گئے۔

”جنہیں دوسروں کی خیریت مطلوب نہیں ہوتی، جو کسی کی خوشیوں سے سروکار نہیں رکھتے۔ مجھے نہیں معلوم سر! وہ خود خیریت سے رہتے ہیں یا انہیں خوشیاں راس آتی ہیں یا وہ بھی اسی طرح نامراد، بے کل و بے سکون رہتے ہیں۔“

”کک..... کک..... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیا ہوا بیٹا! صاف کہو۔“ وہ ازحد بوکھلاہٹ و پریشانی کا شکار ہو گئے تھے۔ خطرے کی گھنٹی انہیں اپنے کانوں میں نہیں دل میں بجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”آپ کی صاحب زادی آج نامعلوم پہر میرے غریب خانے سے جا چکی ہیں، بغیر اطلاع و بغیر اجازت کے۔“ اس نے اپنے لہجے کی تلخی و تندہی چھپانے کی سعی بالکل بھی نہ کی۔ اس کے سخت و تند لہجے کی ناگواریت اس کے ذہنی دباؤ کی غماز تھی۔

”اوہ..... یہ کیا ہوا..... وہ کہاں گئی؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“ اس کا انداز لگاتاری و تفر سے بھر پور تھا۔

”یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے..... میں مشعل کو آپ کے اور بے جی کے سپرد کر کے آیا تھا۔“

”یہی غلطی ہوئی آپ سے۔ اپنی مرضی سے جینے والی لڑکی کو آپ نے فیڈر بنی بے بی سمجھ رکھا تھا جو اتنی معصوم و سعادت مند تھی کہ اس کے پاپا نے جس کی انگلی اسے تھام دی وہ ساری زندگی اسی انگلی کو تھام کر گزر دے گی۔“

”فارگا ڈسک شاہ ویز! میری کیفیت سمجھنے کی کوشش کرو..... میں اس سسپنس کو سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا..... کیا ہوا ہے؟“

”سرا! بچپن میں بے جی کہا کرتی تھیں، بیٹا کبھی غلط کام نہیں کرنا، کبھی برے کام نہیں کرنا۔ جو غلط اور برے کام کرتے ہیں اللہ میاں انہیں سزا دینے کے لئے دوزخ میں ڈال دیتے ہیں جہاں انسان جل کر بھسم ہو جاتا ہے مگر اسے سکون نہیں ملتا۔ وہ جلتا ہے پھر درست ہو جاتا ہے، پھر جلتا ہے، پھر درست ہو جاتا ہے۔ اس کے درد، تڑپ، تکلیف میں کوئی کمی نہیں آتی۔ دنیا میں ہر درد، ہر تکلیف، ہر تڑپ کی انتہا موت ہے مگر وہاں نہ راحت ملتی ہے اور نہ ان تکالیف سے نجات دلانے والی موت۔ بلکہ عذاب و در عذاب کا سلسلہ کبھی موقوف نہیں ہوتا، رواں رہتا ہے اور یہ میری بد نصیبی کہہ لیجئے یا قسمت کہ لوگوں کو مرنے کے بعد ان کے اعمال کی سزا ملتی ہے، میں زندہ ہی جہنم رسید ہو گیا ہوں۔ میں نے بڑی سادہ زندگی گزاری ہے، برے کاموں سے بھی بچتا رہا ہوں۔ لیکن اب سوچتا ہوں شاید انجانے میں مجھ سے بڑے بڑے گناہ ہوئے ہیں جن کا عذاب مجھے آپ کی بیٹی سے شادی کی صورت میں مل رہا ہے جو میری قوت برداشت کو شکست دے چکا ہے۔“

”ایسے نہ کہو بیٹا! آپ تو بہت نیک و سعادت مند بچے ہیں..... یہ سزا تو میرے لئے ہے جس کی لپیٹ میں آپ بھی آگئے ہیں۔ میں مانتا ہوں مٹی جیسی خدای، مہٹ دھرم لڑکی کے ساتھ گزارا کرنا خود کو امتحان میں، آزمائش میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے اور اس امتحان میں آپ جیسے بہادر و حوصلہ مند مرد ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ مٹی کم عقل و نا سمجھ لڑکی ہے۔“

”پلیز..... پلیز سر..... کم عقل و نا سمجھ نہیں بلکہ بد تمیز و اخلاق سے بے بہرہ لڑکی ہے جو نہ اپنے بڑوں کی عزت کرنا جانتی ہے نہ اپنے سے وابستہ لوگوں کی پرواہ ہے اسے بلکہ..... بلکہ میاں بیوی کے درمیان بندھے رشتے کی اس کے نزدیک کوئی وقعت نہیں ہے۔ یو ڈونٹ مائنڈ سر! وہ گھر رہنے والی لڑکی نہیں ہے۔“ مشعل کے خلاف بھرا ہوا زہر اس کے لہجے میں پھنکارس مار رہا تھا۔ وہ بہت سخت و بے مروت لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

دوسری طرف حسن بیگ کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ ان کے اندیشوں، خدشوں نے حقیقت کی ردا اور ذہنی شروع کر دی تھی۔ شاہ ویز کے لہجے اور طنز یہ گفتگو نے باور کرا دیا تھا کہ مشعل نے یقیناً اس سعادت مند و مخلص نوجوان کو ایسی ضربیں لگائی ہیں کہ وہ جو ہمیشہ آواز نرم کر کے، لگا ہیں جھکا کر شائستگی سے گفتگو کرنے کا عادی تھا اس وقت لموار بے نیام کے مصداق ان سے مخاطب تھا۔

”صبر سے میرے بیٹے! صبر سے کام لو چند دن اور میری خاطر۔“ کسی فاقہ زدہ سائل کی طرح انہوں نے اپنا کٹکول اس کے سامنے پھیلا دیا تھا۔ لہجہ نرم تھا۔

”میری صبر کی انتہا ہو چکی ہے۔ میں سب کچھ کوارہ کرتا رہا ہوں، مشعل کی ہر بد تمیزی، ہر زیادتی صرف آپ کی خاطر برداشت کی۔ آپ سے کئے گئے قول کی خاطر سب کچھ کیا مگر میں احساس کو فدا کر سکتا ہوں لیکن اپنی حمیت کو نہیں زیر کر سکا۔ اس سے میں شکست کھا گیا۔ ہار گیا، بری طرح ہار گیا۔“ اس کے سر دھڑکنے لہجے میں کچھ نرمی آئی تھی۔

”مشعل نے ایسا کیا، کیا جو آپ کی حمیت مجروح ہوئی؟“

”آپ کی سوسائٹی میں شاید یہ بات معیوب نہ سمجھی جاتی ہو لیکن میرا ضمیر و میری غیرت یہ بات بلکہ بات نہیں گالی کبھی برداشت نہیں کر سکی کہ میں اپنی بیوی کے منہ سے اس کے محبوب کے قصیدے سنوں۔“ وہ چند لمحے خاموش ہوا تھا اور بیگ صاحب پر مکمل صورت حال واضح ہو گئی تھی۔

چند ساعتوں تک دونوں طرف خاموشی رہی۔ شاہ ویز اپنے اندر یکدم اٹھنے والے اشتعال کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور حسن بیگ صاحب اسے تسلی دینے، سمجھانے کے لئے مناسب لفظوں کا چناؤ کر رہے تھے۔

”شاہ ویز! مرد، مرد ہوتا ہے۔ طبقات بہت ساری چیزوں کو بدل ڈالتے ہیں مگر مرد کی مردانگی کو نہ آج تک کوئی اسٹینڈرڈ، سوسائٹی بدل سکی ہے نہ بدل پائے گی۔ اپنی حمیت، اپنی عزت، اپنی غیرت کے معاملے میں سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔“

”آئی ایم سوسوری سرا! مجھے فہم ہے ہمارا ساتھ اب نہیں چل سکے گا۔ میری اندرونی حالت سے آپ واقف نہ ہو سکیں گے، میں اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی معاف کرنے کی ہمت رکھتا ہوں مگر بے جی کے ساتھ زیادتی کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنی محبت و انا سے کھیلنے والے کو معاف کر سکتا ہوں۔ اس معاملے میں، میں از حد خود پسند و خود غرض ہوں۔ جس طرح زمین و آسمان ایک نہیں ہو سکتے، سمندر کے کناروں کا کجا ہونا ناممکن ہے، رات دن کالا پ نہیں ہو سکتا، اسی طرح میرا اور مشعل کا ساتھ ممکن نہیں۔ میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کر رہا ہوں کہ مشعل کو.....“

”نہیں..... نہیں..... اللہ کے واسطے آگے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا ورنہ میں جی نہ پاؤں گا۔ یہ میری زندگی و موت کا مسئلہ ہے..... رحم کرو مجھ پر۔“ ان کی گڑ گڑاتی ہوئی آواز اس کی بات قطع کر چکی تھی۔

”کوئی بھی باپ اپنی بچی کو ایڑنا نہیں دیکھ سکتا۔“

”آپ کی بیٹی کسی ہی کب تھی؟“ اس کا دھیمہ لہجہ سفاک تھا۔

”میرے لئے یہ احساس ہی طمانیت کا باعث ہے بیٹا کہ وہ آپ جیسے اچھے و نیک لوگوں کے درمیان ہے اور اچھائی تو ایک ایسی روشنی ہے جو ہر تاریک شے کو نور کرا دیتی ہے۔ بے شک مشعل ابھی لاعلمی و لادینی کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ بہت جلد وہ خود روشن ہو کر دوسروں کے لئے مشعل راہ بنے گی۔“

”میں خوابوں پر یقین نہیں رکھتا اور آپ کو بھی ایڈوائز کر رہا ہوں کہ خواب دیکھنا چھوڑ دیجئے۔ خوابوں کی دنیا جتنی دلکش و حسین ہوتی ہے حقیقت میں اس قدر ہی بھیا تک بد صورت ہوتی ہے جن سے ہم کبھی کبھر واپس نہیں کر سکتے۔“ اس کا انداز دو ٹوک تھا۔

”اس وقت آپ بہت ڈسٹرب لگ رہے ہیں..... مجھے احساس ہے یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ آپ نے، بے جی نے بہت ساتھ دیا ہے میرا اور میں آپ کو بے جی کا ہی واسطہ دیتا ہوں، کسی انتہائی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے سوچ لینا، ایک مرد کی بربادی ایک خاندان کی بربادی ہوتی ہے اور عورت کی بربادی معاشرے کی بربادی ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے رافعہ جو اوکو لے کر پاکستان پہنچ چکی ہے اور اب وہ اپنی ناکام حسرتوں کا بدلہ لے گی۔ مشعل تو شروع سے ہی اس کی آنکھ کے اشاروں پر چلتی ہے۔ آپ کو میں نے بہت ذی شعور سمجھا تھا اور آپ ہیں بھی۔ اتنی آسانی سے آپ ان سے شکست تسلیم کر لیں گے؟ مٹی کے بارے میں، میں نے آپ کے کسی طرز عمل کو رد نہیں کیا، آپ کے کسی سلوک، کسی جبر کے خلاف کوئی بات نہ کی اور نہ آئندہ کبھی کروں گا۔ آپ نے کہا آپ انا پسند ہیں، حمیت کے بنا آپ ادھورے ہیں تو رافعہ سے جیتنا بھی آپ کی انا و حمیت کی جیت ہے۔ مشعل صرف ایک مہرہ ہے، اصل جنگ ہماری رافعہ سے ہے۔ اوکے، میری باتیں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچئے گا۔ غصہ ویسے ہی انسانی عقل کو زائل کر دیتا ہے۔ اوکے، پھر رنگ کروں گا۔“ انہوں نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

□●□

زرینہ پڑون حمیدہ کے ساتھ صبح سے ان کے بتائے ہوئے پھر صاحب کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ سارہ نے بہت منع کیا مگر ان کی عادت تھی جو کام کرنے کی ٹھان لیتی تھیں وہ ہر حال میں کر کے چھوڑتیں۔ سارہ کے مسلسل انکار پر وہ غصے سے چیخ کر کوبیا ہوئیں۔

”اس وقت تو کیا تیرے بابا بھی قبر سے نکل کر آجائیں تو مجھے نہ روک پائیں گے۔“ حمیدہ کے سنگ عجالت میں چلی گئی تھیں۔ اب دوپہر ہونے کو آئی تھی۔ وہ ہر کام سے فارغ ہو گئی تھی۔ کھانا پکا کر جمع شدہ کپڑے بھی دھو ڈالے تھے۔ ظہر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو زرینہ مسکراتی ہوئی گھر میں داخل ہوئیں۔ ہاتھ میں کپڑے شاپر سے پانی کی بوتل نظر آ رہی تھی۔

”اماں! اتنی دیر لگا دی؟“ سارہ ان کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لیتے ہوئے کوبیا ہوئی۔

”ارے رش ہی وہاں اتنا تھا..... اب بھی حمیدہ کے تعلقات کی وجہ سے نمبر آیا ورنہ شام تک ہی واپس آتی۔ اور ہاں یہ بوتل سنبھال کر رکھنا، اس میں پڑھا ہوا پانی ہے۔“ وہ پلنگ پر دراز ہوتی ہوئی تاکید کرنے لگیں۔ ”بہت ہی بچہ بنی ہوئی، ہستی ہیں..... میرے بغیر بتائے فر فر انہوں نے سارے حالات خود بتا دیے۔ میں تو حیران رہ گئی۔ کبھی سنا تھا اللہ والے بھی دلوں کا حال جانتے ہیں مگر یقین نہیں آتا تھا۔ آج تو عجیب ہی کرشمے دیکھ کر آئی ہوں۔“ وہ بہت پُر جوش و خوش تھیں۔

”اماں! بہت بھولی ہوتی..... خالہ حمیدہ پہلے ہی انہیں سب حالات بتا چکی ہوں گی، ورنہ اس دور میں مجھے یقین نہیں ہے کہ ایسے بھی لوگ ہو سکتے ہیں۔“

”یہ بدگمانی کی عادت تمہاری اچھی نہیں ہے..... بھلا ایسے لوگوں کو میں نہیں پہچانتی؟“

”بات یہ نہیں ہے اماں..... جب کوئی ہمارے رب کا نام لے کر بات کرتا ہے تو ہم خود بخود اس کی باتوں پر صداقت کی مہر لگا دیتے ہیں، اس پر یقین کر بیٹھتے ہیں کیونکہ ہمارا سارا ایمان و یقین اللہ کی ذات سے جڑا ہے اور بہت بد بخت و مردار ہوتے ہیں ایسے لوگ جو اللہ کا نام لے کر بندوں سے فراڈ کرتے ہیں۔ کتنے بڑے گناہ گار ہیں ایسے لوگ۔“

”بھیر صاحب ایسے بے ایمان آدمی نہیں ہیں۔ بے چارے کوئی ہدیہ بھی نہیں لیتے۔ فی سبیل اللہ کام کرتے ہیں۔ ہاں اگر کسی کی چوکی بھرنی ہو تو پھر اس سامان کے پیسے لیتے ہیں۔“

”اچھا، کتنے پیسے؟“

”پانچ ہزار..... میرے پاس صرف ابھی پانچ سو روپے تھے وہ میں دے آئی ہوں، باقی کل لے کر جاؤں گی۔ اور ساتھ تجھے بھی بلایا ہے۔“

”اوہو..... پانچ ہزار..... اماں، یہ کوئی چھوٹی رقم ہوتی ہے؟“ سارہ مارے پریشانی کے حیرانی سے بولی۔

”ابھی یہ رقم تو پہلی چوکی بھرنے کی ہے۔ پھر جیسے جیسے چوکی بڑھے گی، رقم بھی بڑھانی پڑے گی۔ گیارہ چوکیاں بھرنی ہیں پھر اس کے بعد سب مسائل حل ہو جائیں گے۔ تو اپنے گھر میں ملٹی خوشی رہے گی، تیرے اولاد ہوگی، باقر تیرا بن جائے گا، سسرال والے تیری مٹھی میں ہوں گے، عیش کرے گی تو عیش..... رات دن کی اس گھر پوری سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔ تو گھر میں خوش رہے گی تو مجھے بھی سکون ملے گا۔“ وہ بولتی چلی گئیں اور سارہ کی آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ آنسو ابل پڑنے کو بے قرار تھے۔

بنیاں ایسا بوجھ ہوتی ہیں جنہیں نہ پھینک سکتے ہیں اور نہ رکھ سکتے ہیں۔

یہ ایسا درد ہیں جو جسم کے کسی نہ کسی عضو میں پھیل کر بے چین رہتا ہے۔

وہ ان بیٹیوں میں تھی جو والدین کی دہلیز پر موجود ہوں تو فکر بن جاتی ہیں اور سسرال کی چوکھٹ پر درد۔ وہ آنسو بھری نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی جو اس کے حوالے سے دکھائے گئے کسی کے جھوٹے خوابوں کو سچ سمجھ بیٹھی تھیں اور بیٹی کی خوشیوں کی خاطر ہزاروں روپے دیئے کو تیار تھیں جو ادھار، قرض کر کے حاصل کرتیں اور اس جعلی نام نہاد پیر کے کشکول میں ڈال آتیں۔

پریشانی جب حد سے تجاوز کر جائے تو انسان فہم و ادراک کے دروازہ بھول جاتا ہے۔ ورنہ بہت سادہ سی بات تھی، اگر پیر صاحب اتنی ہی باکمال و روشن ضمیر و روشن نگاہ ہستی تھیں تو ان کی تو دعاؤں میں بھی اتنی تاثیر ہوتی کہ کسی کو چوکی بھرنے کے لئے روپوں کی ضرورت ہی نہ پڑتی کہ ایسے لوگوں کی ایک نگاہ، ایک دعا ہی بگڑوں کو سنوار دیتی ہے۔ اللہ سے محبت کرنے والے دنیا کے مال و زر کو ٹھوکر مارتے ہیں۔ دولت پرستوں و دنیا پرستوں کو دھن، دولت کی چاہ گمراہ کر دیتی ہے۔ ان کے ایمان خراب اور ضمیر مُردہ کر دیتی ہے۔ اور ایسے جعلی پیروں، فقیروں کی خانقاہیں گلیوں، گلوں میں بکھری پڑی ہیں جو اللہ کے نام پر اللہ کے بندوں کو لوٹتے ہیں، ان کی پریشانیوں اور تکلیفوں کے مداوے کی بجائے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سرعام ایسی عبرت ناک سزائیں ملنی چاہئیں کہ آئندہ آنے والی نسلیں ایسے کام کا تصور نہ کریں جس سے مسلمانوں کے تقدس کو زک پہنچے۔



سارا دن وہ دواؤں کے زیر اثر سوتی رہی تھی۔

شام میں بیدار ہوئی تو بخار اتر چکا تھا اور طبیعت بھی خاصی بہتر تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی کہ رانچہ ہاتھ میں ٹیوٹنگر پر لٹکا سوٹ لئے حاضر ہوئیں۔

”تھینک گاڈ! بخار اتر آ آپ کا۔ چلیں ہاتھ لے کر فریش ہو جائیں پھر چائے پیتے ہیں۔ یہ میں نے آپ کے لئے ڈریس منگوایا ہے، دیکھو اچھا ہے نا؟“ وہ اس کی جانب ٹیوٹنگر بڑھاتے ہوئے مسکرا کر گویا ہوئیں۔

”اوہ سوسوٹ آئی! آپ کو میرا کتنا خیال ہے۔“ وہ ان سے لپٹ گئی۔

”میں خیال نہیں کروں گی تو کون کرے گا۔“ وہ پیار سے اس کے الجھے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

بلیوڈ آؤز رسوٹ میں دیدہ زیب فینسی ورک تھا جو اس کی سرخ و سپید رنگت پر خوب منج رہا تھا۔ کولڈن براؤن بال پشت پر لہرا رہے تھے۔ چہرہ میک اپ سے بے نیاز ہونے کے باوجود دمک رہا تھا۔ چائے کے دوران رانچہ اسے از حد اصرار سے چیزیں پیش کرتی رہیں۔

ان کی نوازشیں عروج پر تھیں۔ مشعل نہال ہوئی جا رہی تھی۔

”کیا حشر کر دیا ہے اس کینے نے آپ کا..... میں اسی دن کھٹک گئی تھی کہ ضرور دال میں کالا ہے۔ بھلا شوہر کی من چاہی بیوی ایسی تو نہیں ہوتی۔ اجاڑ حلیہ، ویران صورت، اداس آنکھیں، شادی کے بعد بد صورت لڑکیاں بھی خوب صورت ہو جاتی ہیں۔ مگر تمہارا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ میں نے پوچھا بھی تم نے کہا بہت خوش ہو۔“ چائے سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں چلی آئیں۔ وہاں بیٹھے ہی رانچہ نے اپنا موضوع چھیڑا۔ ان کا لہجہ سنجیدہ تھا مگر آنکھوں سے چھلکتی معنی خیزی ہلتر خنی نہ تھا۔

اگر مشعل اس وقت سطحی جذباتیت و اہانت کے احساس سے شرابور نہ ہوتی تو ان کی تسخیرانہ نگاہوں کو ضرور پہچان لیتی، خود کو سنبھال لیتی مگر اس وقت وہ پوری طرح ان کی خوش مزاجی و محبت کے سحر میں جکڑی جا چکی تھی۔

شاید اپنی خودداری و انا بھی فراموش کر بیٹھی تھی ورنہ ان کے سابق روپوں نے ان کی اصلیت ظاہر کر دی تھی کہ وہ کس قدر خود غرض، مطلب پرست، کینہ و روحا سد فطرت عورت تھیں جو معاف کرنا نہیں جانتی تھیں۔ از حد ختم مزاج کی مالک تھیں۔

جب کہ مشعل ضدی، ہٹ دھرم، منہ پھٹ تھی مگر کینہ حسد اس میں نہ تھا نہ ہی دل میں کسی کے خلاف میل یا غبار رکھنے کی عادت تھی۔

اس کی ناراضگی، اس کا غصہ جب ہوتا تو وہ اظہار بھی کر دیتی اور ایک بار بات صاف ہونے کے بعد دل نشیے کی مانند ہر میل و غبار سے پاک ہو جاتا تھا۔

اب بھی رانچہ اس سے ملنے گئیں۔ پیار سے ملیں، شفقت سے پیش آئیں۔ اس کے دل میں ان کے خلاف بھر اتمام غم و غصہ غائب ہو گیا تھا۔ وہ فراخ دلی سے ان کی تمام زیادتیوں کو بھول گئی تھیں لیکن رانچہ بیگم کچھ نہ بھولی تھیں۔

”آئی! میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آپ پہلی مرتبہ آئی تھیں۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔ انداز میں شرمندگی تھی۔

”اچھا، بھائی جان کہاں ہیں..... ان کا کچھ انا پتا ہے؟ ان سے رابطہ کرو پہلے۔ ورنہ سمجھیں گے میں نے جان بوجھ کر تمہارا گھر اجاڑا ہے۔“

”بابا نے تو شادی کے بعد سے ایک مرتبہ بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا ہے۔“

”آئے ہائے، یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ بھائی جان بیٹی کی خاطر بہن کو چھوڑ سکتے ہیں مگر بیٹی کو نہیں، یہ نہیں مان سکتی میں کہ تم جانتی ہی نہ ہو کہ وہ کہاں گئے ہیں۔“ وہ گردن ہلا کر بے یقینی سے کہہ رہی تھیں۔

مشعل جو پاپا کے نام پر بے کل سی ہو گئی تھی ان کے انداز پر تڑپ سی اٹھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں..... میں نہیں جانتی پاپا کہاں ہیں۔ کبھی شاہ ویز کہتا ہے وہ بکاک میں ہیں، کبھی سڈنی کا بتاتا ہے تو کبھی نیویارک کی خبر دیتا ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی..... بھائی جان لا پتہ کیوں ہو گئے ہیں؟“

”میری خود مجھ میں نہیں آتا..... پاپا ایسا کیوں کر رہے ہیں۔“ اس نے پشیمردگی سے کہا۔

”مجھے تو شاہ ویز بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کتنی آسانی سے اس نے سب کچھ حاصل کر لیا۔ بھائی جان کا اعتماد آپ کا ساتھ، تمام دولت و جائیداد سب پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ نہ معلوم آدمی ہے یا جا دو گر؟“

”وحشی درندہ ہے وہ آئی! میں اسے جان چکی ہوں۔“ وہ نفرت سے بولی۔

”ہوں..... پریشان مت ہوں..... وحشی درندوں سے نمٹنا بھی ہمیں آتا ہے۔“ وہ اسے تسلی دے کر چکن کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ کمرے میں آگئی۔

جاڑوں کا گلابی گلابی موسم اپنی تمام اداسیوں سمیت آچکا تھا۔

ہر شے کو یا سرد ہو کر رہ گئی۔

اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا، باہر رات اپنے سیاہ گیسو پھیلا چکی تھی۔

ٹھنڈی ہوا سے پھول و پودے بھی ٹھٹھرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ آسمان پر چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ہر سکوت ماحول میں پر اسرار سی خاموشی اسے بے کل کرنے لگی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کی سوچ بے جی کی طرف سے پرواز کرتی ہوئی شاہ ویز کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”ہونہہ..... کیا کر سکتے ہیں میرا۔ اب مجھے وہاں جانا ہی نہیں ہے تو کیوں سوچ رہی ہوں میں ان کے بارے میں؟“ اس نے خود کو سرزنش کی۔

لیکن دل کی دنیا میں عجیب ہی خوف و ہراس کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

”ہیلو جان! تم یہاں کبھی بیٹھی ہو، میں ہر طرف تلاش کر رہا ہوں۔“ معا جو کو کپڑے جوش آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

اس نے چہرہ گھما کر دیکھا، جو جو اہلاناہ انداز میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

لمحے بھر کو اس کے اندر بھی ہلچل مچی، حسرت و انبساط کی لہریں متلاطم ہوئیں، اتنے ماہ بعد اسے سامنے دیکھ کر بے اختیار اس کی جانب بڑھی تھی۔

قل اس کے کہ جو جو کی کھلی بانہوں میں ماتی، نہ معلوم کیا ہوا کہ اس کے قریب جا کر اس طرح ٹھٹھک کر رک گئی جس طرح ریوٹ سے چلنے والے کھلونے کو اچانک اسٹل کر دیا جائے۔ یکثرت اس کے اندر ایک نامانوس سی کیفیت ابھری اور اس نے اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کو نظر انداز کر کے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر مسکرا کر کہا۔

”ہاؤ آر یو جو جو؟“

”فائن..... مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہی ہو۔“ وہ شدید حیرانی کے زیر اثر گویا ہوا۔

”آئی ایم پرنیکلفی فائن۔ تم نے ایسے کیوں کہا؟“

”یہاں میرا ہونے کے بعد پہنچ ہو گئی ہو، ویری امیزنگ۔“ وہ سنگلی صوفے پر بیٹھی تو جو جو دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے شانے اپکا کر گویا ہوا۔

”میں تو ویسی ہی ہوں، ہاں تم کافی چینیج نظر آرہے ہو، خاصے فٹنی ہو گئے ہو۔“ وہ اس کے بھرے بھرے جسم کو دیکھتے ہوئے شرارت سے گویا ہوئی۔

”ویسٹ کنٹری مجھے بہت سوٹ کرتی ہے..... میرا تو آنے کا ارادہ ہی نہ تھا۔ اپنی وے، تم سناؤ اس کنگو سے شادی کرنے کے بعد میں پاؤ نہیں آیا ہوں گا۔ تمہیں مشورہ کس نے دیا تھا اس سے شادی کرنے کا..... کسی ایسے سے تو شادی کرتی جو تمہاری شاہنگ کا بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ اس گھنیا شخص کی سنگت نہ معلوم تمہیں کیوں بھاگنی جو تم مجھے بھول کر اس کی ہو گئیں۔“

”پلیز جو جو! میں گٹھی نیل کر رہی ہوں..... مجھ سے نادانی میں بہت غلط فیصلہ ہوا ہے۔ وہ میرے لائق نہیں ہے، وہ وحشی ہے، ایک دم اجڑ۔ بات بات پر مارنا اس کی

سرشت ہے۔ مجھے کسی نے کبھی پھول بھی نہ مارا اور اس نے اپنے فولاد جیسے ہاتھوں سے میرا بار بار استحصال کیا ہے، بار بار مجھے ہرٹ کیا ہے۔“ اس کی ہمدردی پا کر وہ خود کو روک نہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”وہ تمہیں مارتا ہے۔ اوہ..... اوہ..... میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اس سن آف فنج کو۔“ غصے و جذبہ تہیت سے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں جو جو..... تم اس سے لڑنا مت۔ وہ بہت ڈنڈا کھسکتا ہے۔ بالکل کسی پاگل کتے کی طرح۔“ مشعل گھبرا کر گویا ہوئی۔

”اپنے ربو اور کی تمام پلٹس اس کے سینے میں اتار دوں گا۔ اس نے تم پر ہاتھ اٹھا کر اپنی موت کو دعوت دی ہے..... وہ بلڈی سمجھتا کیا ہے خود کو؟“

”پلیز..... پلیز جو! کول ڈاؤن، کول ڈاؤن پلیز۔“ اسے غصے سے بے قابو دیکھ کر مشعل اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے گویا ہوئی۔

”وائے کول ڈاؤن؟ وہ تمہیں مارے اور میں کچھ نہ کر سکوں۔“ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

”ابھی نہیں..... کچھ انتظار کرلو۔ مجھے اس سے ڈائیورس لینے دو۔“

”کیا وہ تمہیں ڈائیورس دے دے گا؟“

”ہاں..... ندی تو میں اس کی زندگی اجیرن کر دوں گی۔“ وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر سخت لہجے میں بولی۔

قبل اس کے کہ مزید کوئی بات ہوتی، باہر سنگ روم سے رافہہ کی آتی چیخنی چنگھاڑتی آواز نے ان دونوں کو ہی وہاں جانے پر بے قرار کر دیا۔

وہ اور جو جو ساتھ ساتھ داخل ہوئے تھے۔ اندر شاہ ویز کھڑا تھا۔ سرخ چہرہ، بگڑے تیوروں کے ہمراہ۔ مشعل غیر متوقع طور پر اسے وہاں دیکھ کر سکت و جامد کھڑی رہ گئی۔

”اس گھر میں پاگلوں اور آوارہ کتوں کا داخل ہونا منع ہے..... تمہیں جرأت کس طرح ہوئی اندر داخل ہونے کی؟“ رافہہ شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھیں۔

”میں اپنی بیوی کو لینے آیا ہوں..... دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی اندر آنے سے۔“ اس کے لہجے میں بھی طوفانوں کی گھن گرج تھی۔

وہ سرپا آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اس کا ہورنگ آنکھیں مشعل پر تھیں۔

مشعل کا چہرہ غیر محسوس انداز میں خوف سے سفید پڑتا جا رہا تھا۔

”بیوی؟..... اوہ، شکل دیکھی ہے اپنی؟ تم جیسے تو مشی کے جوتے اٹھانے کے بھی قابل نہیں ہوتے۔“ وہ حقیرانہ انداز میں بولیں۔

”مشعل چلو.....“ شاہ ویز انہیں انکوار کر کے سخت لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

”مشعل نہیں جائے گی..... تم دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ جو جو کو یکدم ہی طیش آیا تھا۔

”شٹ اپ..... تمہیں ہمارے درمیان بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میرے گھر میں آکر مجھے ہی ڈانٹا ہے..... میں تیرا خون پی جاؤں گا۔“ جو جو آپے سے باہر ہو کر اپنی جگہ سے ایک قدم آگے نہیں بڑھا۔

”ہاں..... میں جانتا ہوں، چھروں کی بہت پرانی نسل سے تعلق رکھتے ہو۔ مگر یا درکھنا تمہیں مسلمانے کے لئے ایک چنگی کافی ہوگی۔“

”اوائی گاڈ..... ہمارے گھر میں ہماری ہی بے عزتی کر رہے ہو..... چلے جاؤ یہاں سے..... ورنہ ابھی پولیس بلو اگر تمہیں حالات کی سیر کروادوں گی۔“

”اچھا بلو ایے پولیس..... میں بھی دیکھتا ہوں کون کون کون کی سیر کرتا ہے؟ سب سے پہلے تو پولیس پکڑے گی آپ کی اس بھتیجی صاحبہ کو جو زوجہ محترمہ ہونے کے باوجود

بہت خاموشی سے اس چمچر کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی ہے۔ پھر آپ بھی ان کے ساتھ اس جرم میں براہ کی شریک ہیں انہیں یہاں پناہ دے کر.....“

”نہیں..... یہ غلط ہے..... میں گھر سے تنہا آئی تھی۔“ مشعل بے ساختہ بولی۔

”پولیس تمہاری بات پر نہیں، میری بات پر یقین کرے گی۔“

”کتنی دولت چاہئے تمہیں..... میں دوں گی..... مگر مشی کا پیچھا چھوڑ دو۔ یہ تم جیسے آوارہ وحشی کے لائق نہیں ہے۔ بتاؤ اپنی قیمت بولو، کتنی دولت چاہتے ہو؟ ویسے تو سب

کچھ تھمیا چکے ہو۔ چھوڑا ہی کیا ہے۔ مگر میں مشی کی خاطر اپنی ہر شے بچھا کر کرنے کو تیار ہوں۔ کہو کیا قیمت لو گے مشی کو طلاق دینے کی؟“ وہ تسخرانہ لہجے میں اس سے

مخاطب تھیں۔

شاہ ویز رافہہ بیگم کی گھٹیا نظرت اور حسن بیگ صاحب کو دیوانہ کر دینے کی حقیقت سے واقف نہ ہونا یا حسن بیگ کی پُر شققت شخصیت کا لحاظ نہ ہونا تو ابھی ابھی تین لفظ کہہ

کر اپنا دامن بچا کر چلا جاتا۔ مگر یہاں نہ صرف قتل مزاجی سے رافہہ کی بکواس برداشت کرنی تھی اور مشعل کو بھی ساتھ لے جانا تھا کہ بات اب حسن بیگ کی تاکید کی ہی نہ

تھی بلکہ اس قیمت کی بھی تھی۔

”میڈم! دولت پرستی میرا معیار نہیں، وفا پرستی میرا شعار ہے۔ وحشی، پاگل، آوارہ جو بھی آپ کہیں یا سمجھیں اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جو آپ چاہ رہی ہیں وہ

کبھی نہیں ہوگا۔ یہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔“ اس کا سخت لہجہ اٹل تھا۔

”میں نے جو چاہا ہے وہ کیا ہے، کوئی مجھے روکنے والا پیدا نہیں ہوا۔“ وہ ہل کھا کر پھنکاری تھیں۔

”اپنے ہر قول و فعل میں آپ خود مختار ہیں، کوئی کیوں روکنے لگا آپ کو۔ مگر کبھی غلطی سے بھی میرے معاملات میں مداخلت کی کوشش مت کیجئے گا ورنہ آپ کو پچھتانے کا

موقع بھی نہیں ملے گا۔“ اس کے سخت لہجے میں ایسی کوئی بات تھی کہ رافہہ کچھ نہ بول سکیں۔

”سنائیں تم نے؟ چلو، میرے پاس نام نہیں ہے۔“ وہ مشعل سے غصے سے بولا۔ مشعل کو اس کے تیور پہلے ہی دکھلا رہے تھے۔ اب اس کے دھاڑنے پر دل بری طرح

دھڑکنے لگا تھا۔ بے اختیار قدم اس کی جانب بڑھنے لگے۔

”مشی! تم اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی پھر کیوں جا رہی ہو؟ مت جاؤ۔“ اس کو شاہ ویز کی طرف بڑھتے دیکھ کر جو جو بول اٹھا۔

”ہاں، ہاں مشی! ڈرو مت، تمہیں اس کے ساتھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کچھ نہیں کرے گا۔ کیا کر سکتا ہے؟ اس کی اوقات ہی کیا ہے..... اس کی چلتی بازیاں

صرف بھائی جان کو بے وقوف بنا سکتی ہیں۔“ وہ مشعل کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے بولیں۔

”میں کوئی بد مزگی نہیں چاہتا..... بہتر یہی ہوگا کہ آپ بات کو طول نہ دیں۔“

”بہتر و بدتر کی مجھے پرواہ نہیں ہے دو کوڑی کے انسان۔ یہ صرف بھائی جان کی وجہ سے تم اس گھر میں کھڑے نظر آ رہے ہو ورنہ تم جیسے اس گھر میں برتن مانجھتے اور پونچا

پھیرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سب بھائی جان کی وجہ سے ہے جو ہمارے پیر کی جوتی ہمارے سر پر آ رہی ہے۔“ ان کے لہجے سے، آنکھوں سے تحارت جھلک رہی تھی۔ شاہ

ویز کا خون شریانوں میں ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔

”مشعل! چلو.....“ وہ انہیں نظر انداز کر کے بولا۔

”مشعل تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔“ رافہہ مٹ دھرم انداز میں بولیں۔

”میڈم! میری شرافت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔“

”ارے جاؤ۔ بہت دیکھے ہیں تمہارے جیسے شریف ہونہ..... تمہاری شرافت یہی ہے کہ تم پھول سی پچی پر ہاتھ اٹھاؤ، جس کو کبھی کسی نے گرم نگاہ سے بھی نہ دیکھا ہو اس کو تم

نے مارا، ایک بار نہیں بار بار اور میں شرافت کا سبق پڑھا رہے ہو..... اگر ذرا بھی غیرت ہے تو ڈوب مرو۔“

”مام! کیوں اس بچے کے منہ لگ رہی ہیں۔ نوکروں کو بلا کر دھکے دے کر نکلو! اسے یہاں سے۔“ جو جو چیخ کر بولا۔

صورت حال خاصی گمبیر ہو گئی تھی۔

رافہہ کسی ناگن کی طرح پھنکارتی پھر رہی تھیں۔

جو جو بھی خالص پرجوش نظر آ رہا تھا۔

مشعل ان دونوں ماں بیٹے کے درمیان گم سم ہی کھڑی تھی۔ اس کی تمام تیزی و طراری ہوا ہونے لگی تھی۔ کچھ دیر قبل جو جو سے کبھی طلاق لینے والی بات وہ بھول چکی تھی۔

اب اسے ہر سمت، ہر شے سے شاہ ویز کا چہرہ جھانکتا نظر آ رہا تھا۔

لبورنگ آنکھیں، آگ برسانا لہجہ..... وہ سرپا قبیر بنا ہوا تھا۔

وہ اس کے مزاج کی گرمی سے بخوبی واقف تھی اور جانتی تھی کہ اس لمحے اس کے مزاج کا درجہ حرارت آخری ڈگری پر پہنچا ہوا ہوگا اور ایسے وقت میں وہ جو کچھ بھی کر گزرے

کم ہے۔

وہ خود کو شعلوں میں گھرا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ چاروں سمت آگ ہی آگ تھی۔

نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

فرار کی ساری راہیں مسدود تھیں۔

اس کے سر کی رگوں میں ایک دم ہی دباؤ بڑھنے لگا۔ دل کی دھک دھک بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ سرد موسم کے باوجود لمبے بھر میں پسینے میں شرابور ہو گئی۔ بے اختیار اس نے

سر کو تھاما تھا۔

ہر شے کو لکھوٹنے لگی تھی۔ صوفہ سیٹ، فانوس، سامنے لگی وال کلاک، دیواروں پر لگی پینٹنگز، سینرین، پردے سب چکرار ہے تھے۔

”اوکے، میں نے جو سمجھا تھا سمجھا لیا۔ اگر آپ یہی چاہتی ہیں تو یہی سہی۔“ وہ جنون میں آگے بڑھا تھا، مشعل کے آگے کھڑے جو جو کو ایک ہاتھ سے دوڑھکیلا تھا اور

مشعل کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا دروازے کی سمت گھسیٹا تھا۔ مشعل جو پہلے ہی بے دم ہو رہی تھی اس افتاد کو برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو گئی۔

”ارے..... ارے..... ارے کیسے جانور کی طرح میری پچی کو گھسیٹ رہے ہو..... یہ کیا ہو! میری مشی بے ہوش ہو گئی..... شو آدی ہے یا تھائی..... چھوڑ میری بیٹی کو۔“



پیچھے پیچھے بدحواس رانچہ آرہی تھیں چیختی ہوئیں۔ ان کے پیچھے جو جوتھا۔

”اس طرح نہیں مانے گا یہ باسٹرڈ..... میں ابھی پولیس کو کال کرتا ہوں۔“ جو فون کی طرف چلا ننگ لگاتا ہوا چیٹا۔

شاہ ویز نے جھک کر بے ہوش پڑی مشعل کو بازوؤں میں اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ رانچہ پیچھے پیچھے چیختی ہوئی آرہی تھیں۔ وہ کوہا ہراس سے عاری ہو گیا تھا۔ دیکھنے، سننے، سوچنے کی طاقت سلب ہو گئی تھی۔ وہ مشعل کو اٹھائے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ملازم جو کمرے سے آتی بلند آوازوں کو باہر سن رہے تھے، اب باہر کھڑے حیرت سے سب دیکھ رہے تھے۔

”حرام خور! کھڑے صورت کیا دکھ رہے ہو..... پکڑو اس جاہل کو۔“ رانچہ خود اس کے جارحانہ رویے کے سامنے خود کو بے بس محسوس کر کے ملازموں سے بولیں۔ ان کے حکم پر وہ تیزی سے آگے بڑھے تھے۔

”خبردار جو میری راہ میں آئے، ورنہ میں اسے نیچے پھینک دوں گا۔“ شاہ ویز سر دھری سے ٹیرس کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

ملازم اس کی آواز دلچسپ سے سمجھ گئے کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے۔ پھر کسی میں بھی ہمت نہ ہوئی آگے بڑھنے کی۔ اپنی جگہ پر ساکت کھڑے رہے۔

شاہ ویز تیزی سے میز چایاں اتر کر گیٹ کے باہر کھڑی اپنی کار کی طرف بڑھ گیا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر مشعل کو لا پرواہی سے سیٹ پر فینچ دیا۔ رانچہ اوپر ٹیرس پر کھڑی اسے جاہل عورتوں کی طرح گالیوں، کوسنوں سے نواز رہی تھیں۔ ملازم معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ شاہ ویز نے ان کی طرف ایک نظر دیکھا بھی کو اہ نہیں کیا تھا اور کار پوری رفتار سے آگے بڑھا دی تھی۔

□●□

شام سے رات ہونے کو آئی تھی۔

بے جی پریشانی سے بری طرح ہول رہی تھیں۔ ایک پریشانی مشعل کی تھی جو نہ معلوم کس وقت گھر سے بغیر بتائے چلی گئی تھی۔ دوسری یہ تھی کہ شاہ ویز ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ یہ سب سے بڑی پریشانی تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت سے وہ پوری طرح آگاہ تھیں۔

اسے دوبار فون کر کے انہوں نے کہا تھا کہ وہ مشعل کو لینے اس کے ساتھ جائیں گی تاکہ اس کے غصے کو کنٹرول کر سکیں۔ مگر شاہ ویز نے جاتے وقت انہیں فون نہیں کیا تھا۔ انتظار کر کے انہوں نے آفس فون کیا تو معلوم ہوا وہ جا چکا ہے اور اس وقت سے وہ پریشان ہو رہی تھیں۔ خیریت سے اس کے واپس آنے کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

کال ٹیل کی آواز پر وہ بے قراری سے دروازے کی طرف بڑھی تھیں اور دروازہ کھول کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

”انسپکٹر صاحب! یہ بڑھیا اس بد معاش کی ماں ہے..... یہیں لے کر آیا ہے وہ میری بچی کو زبردستی گھر سے اٹھا کر۔“ سامنے رانچہ کھڑی تھیں انسپکٹر اور سپاہیوں کے ساتھ۔ بے جی کو سکتہ ہو گیا تھا۔

”خاتون! شاہ ویز یہاں رہتا ہے؟“ انسپکٹر کی کراری، بارعب آواز انہیں جلد حواس میں لے آئی۔ ان کی زبان تو نہ اٹھ سکی صرف اثبات میں گردن ہلائی۔

”بلاؤ اسے..... کہاں ہے وہ؟“ وہ دندنا تے ہوئے اندر آگئے تھے۔ ساتھ دو لیڈی کانسیبل بھی تھیں۔

”وہ..... وہ گھر میں نہیں ہے۔“ بے جی کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ پولیس کا نام ہی خوف و دہشت کی علامت ہے اور بذات خود انہیں اپنی دہلیز پر موجود دیکھ کر وہ نیم مردہ سی ہو گئی تھیں۔

”جھوٹ بولتی ہے یہ..... وہ لو فریہیں ہوگا۔“ رانچہ بے جی کو نفرت سے گھور کر بولیں۔

”سچ بتاؤ.....“ انسپکٹر نے لیڈی کانسیبل کو اوپر کی جانب تلاشی لینے کا اشارہ کیا تو وہ دونوں اوپر کی جانب دھڑ دھڑ کرتی ہوئی غائب ہو گئیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ میرے بیٹے نے کیا، کیا ہے؟“ بے جی کا نپتی ہوئی آواز میں استفسار کرنے لگیں۔ نیچے سپاہی تلاشی لے رہے تھے۔ اوپر لیڈی کانسیبلر۔ پورے گھر میں ان کے بھاری بوٹوں کی دھمک کونٹ رہی تھی۔

دروازہ کھولنے بند کرنے کی آوازوں سے درود یوار لرز رہے تھے۔

ان کے بوٹ کی ہر دھمک، بند ہوتے ہر دروازے کی دھماکے بے جی کے دل پر ضرب بن کر لگ رہی تھی۔ ان کا چہرہ دھلے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔

”جیسے تمہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں، تمہارے بیٹے نے کیا، کیا ہے؟“ رانچہ ہاتھ لہرا کر طنز یہ کیا ہوئیں۔

”خدا کی قسم مجھے کچھ نہیں معلوم..... میں نہیں جانتی کیا ہوا ہے؟ شاہ ویز کہاں ہے؟ وہ آفس سے گھر نہیں آیا۔ میں اس کا ہی انتظار کر رہی تھی۔“ وہ روہانسی ہو گئیں۔ رانچہ کی چبھتی ہوئی نگاہوں کا سامنا کرنا دشوار تھا۔

”انسپکٹر صاحب! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ ان ماں بیٹے کی سازش ہے۔“ رانچہ انسپکٹر سے مخاطب ہوئیں۔ وہ ہاتھ پر چھڑی مارتے ہوئے بولا۔

”سب معلوم کر لیں گے..... کہاں جا سکتا ہے وہ اس شہر سے۔“

دونوں لیڈی کانسیبلر اور سپاہیوں نے بھی اطلاع دے دی تھی کہ گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔

”ہائے، ہائے..... کہاں لے گیا میری بچی کو؟ انسپکٹر صاحب! معلوم کریں اس چنڈال بڑھیا سے۔ اس نے بیٹے کے ساتھ مل کر مشعل کو چھپایا ہے۔“ وہ محل کر انسپکٹر سے مخاطب ہوئیں اور قبل اس کے کہ انسپکٹر صاحب کچھ کہتے دروازے سے اندر داخل ہونے والی شخصیت کو دیکھ کر انسپکٹر سمیت سب المٹ ہو گئے۔

”جائیں آپ یہاں سے۔“ شاہ ویز کے ہمراہ آئی جی پولیس بلاول خان تھا۔ اس کی سخت بارعب آواز پر لمبے بھر کو انسپکٹر بوکھلایا، پھر سیلوٹ مار کر وہ باہر نکل گیا تو اس کے ساتھی بھی سیلوٹ مارتے ہوئے باہر نکل گئے۔

”یہ سب کیا ہے شاہ ویز؟“ بے جی اس کی جانب بڑھیں تو اس نے انہیں بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ بے جی کے آنسو بے قابو ہو گئے تھے۔

”میری بیٹی کہاں ہے؟“ رانچہ جو ایک دم بدل جانے والی صورتحال سے بھونچا رہ گئی تھیں، بلاول خان کو انور کر کے اس سے مخاطب ہوئیں۔

”وہ میری بیوی ہے..... مجھے اختیار ہے جہاں چاہے اسے رکھوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”دیکھ رہے ہیں آپ آئی جی صاحب! آپ کے شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ دن دیہاڑے ایک شریف لڑکی کو یہ بد معاش گھر سے اٹھا کر لے آیا اور اب کہتا ہے یہ اس کا شوہر ہے۔ مشعل اس شہر کے بڑے بزنس مین کی بیٹی ہے، کسی گھسیارے کی اولاد نہیں ہے جو کوئی اٹھ کر آئے گا اور خود کو اس کا شوہر بنا کر اٹھا کر لے آئے گا۔ بولو، کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تمہاری اس سے شادی ہوئی ہے؟ کوئی کواہ ہے تمہارے پاس جو کواہی دے سکے؟“ وہ ہتھیار پھینکنے والوں میں سے نہ تھیں۔

”ایک کواہ تو میں خود ہوں اس شادی کا..... اگر چاہیں تو نکاح نامے پر میرے سائن دیکھ سکتی ہیں۔“ بلاول خان مسکرا کر کوہا ہوئے۔

”آئی جی صاحب! آپ مذاق کر رہے ہیں؟“ وہ بوکھلا اٹھیں۔

”میرا آپ کا مذاق کا رشتہ ہے اور نہ ہی موقع۔ یہ جو کچھ بھی آپ نے کیا جرم ہے۔ لیکن شاہ ویز کی سفارش پر میں آپ کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کر رہا۔ مگر یاد رکھیے گا آئندہ آپ نے کوئی دوسرا ذمہ کرنے کی کوشش کی تو میں بالکل رعایت نہیں کروں گا۔ شریف لوگوں کی عزت سے کھیلنا شریف لوگوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔“ بلاول خان نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

رانچہ کچھ دیر تو کھڑی رہیں، پھر پاؤں پیٹتی ہوئی چلی گئیں۔

”اب اجازت دیں شاہ ویز!“ وہ مسکراتے ہوئے کوہا ہوئے۔

”بہت شکریہ اٹھل! آپ نے بہت تعاون کیا میرے ساتھ۔“ شاہ ویز نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے مشکور لہجے میں کہا۔

”تو جینکس۔ اگر کوئی پراہمز ہوں تو ضرور یاد رکھنا۔ حسن بیگ کے بہت احسانات ہیں مجھ پر..... وہ تو میں کبھی اتار نہ پاؤں گا لیکن آپ کا کام کر کے مجھے دلی سرت ہوگی۔“ وہ انہیں ان کی کار تک چھوڑ کر آیا تو بے جی منتظر تھیں۔

”کیا ہوا ہے یہ سب؟ مشعل کہاں ہے؟ تمہیں کیسے معلوم تھا گھر پر پولیس آئی ہے؟“

”آرام سے..... آرام سے بے جی! اتنے سوالات کے جواب میں خالی پیٹ نہیں دے سکتا۔ پہلے کھانا لگائیں۔ بلکہ میں خود لگاتا ہوں۔“ بے جی کی حالت کے پیش نظر وہ کچن کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

بے جی نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کچھ لمحوں کی اس کا رروائی نے ان کے ہاتھ پاؤں بے جان کر ڈالے تھے۔ وہ خود کو بے جان محسوس کر رہی تھیں۔

شاہ ویز نے کھانا لگایا اور اپنے ساتھ زبردستی انہیں بھی شریک کیا۔ کھانے کے بعد اس نے چائے بنائی اور دو گلوں میں ڈال کر بے جی کے پاس لے آیا اور مختصر طور پر انہیں سب بتا ڈالا۔

”مشعل کہاں ہے..... اور تمہیں پولیس کا کس نے بتایا؟“

”رانچہ بیگم کی طبیعت کو جانتے ہوئے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ یقیناً پولیس کو لے آئیں گی اس لئے میں نے بلاول اٹھل سے رابطہ کر کے انہیں پوری تفصیل سمجھائی اور وہ میرے ساتھ آنے پر راضی ہو گئے۔“ وہ چائے پیتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

”مشعل کہاں ہے؟“ بے جی اس کی جانب دیکھتے ہوئے پھر بولیں۔

”آپ کی پہنچ سے بہت دور۔“ اس کے لبوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔

”پہیلیاں مت بکھواؤ..... بتاؤ کہاں ہے وہ؟“ بے جی کو اختلاف قلب ہوا۔

”پلیز بے جی، آپ مجھ سے معلوم مت کریں ورنہ میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گا۔“ وہ مگ ٹیبل پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ کیوں میرے ضبط کا امتحان لے رہے ہو؟“

”وہ ٹھیک ہے اور اس وقت تک آپ کی پہنچ سے دور رہے گی جب تک بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتی۔“ وہ ہنجیدگی سے کوپا ہوا۔

”شاہ وزیر!“

”بے جی! مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ آج جس ذلت کے سمندر کو میں عبور کر کے آیا ہوں اگر مجھے آپ کا خیال نہ ہوتا تو میں کبھی زندہ نہ آتا۔“

”ایسی بد فالیں منہ سے نہیں نکالتے۔“ بے جی نے ہول کر کہا۔

”آپ نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا ہے۔ اب بھی مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ دیں گی میرا ساتھ؟“ اس لمحے اس کے انداز میں اتنی بے چارگی و معصومیت تھی کہ بے جی کا موم سادل پگھل گیا۔

”ہاں..... میری مانتا تمہارے لئے ہی وقف ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

”شکریہ بے جی! بہت شکریہ..... آپ نے ایک بوجھ سے مجھے آزاد کر دیا۔“ اس کے وجہ پر چہرے پر مسکراہٹ کی کرنیں روشن ہو گئیں۔



حرارِ صوبی کو دھن سوار ہو گئی تھی غریب عورتوں کے لئے روزگار تلاش کرنے کی۔ اور اس کام کے لئے وہ مختلف علاقوں کے سروے کرتی پھر رہی تھیں۔ فرح ان کے ساتھ تھیں۔ روز وہ کچی آبادیوں کے علاقوں میں جا نکلتیں اور وہاں جا کر انہیں روزنی کہانیاں ملتیں جو بچی بھی ہوتیں اور پریشان کر دیئے والی بھی۔ غربت و افلاس کے جزے سے تلے بھنے غریب لوگوں کو جہاں ایک وقت کھانا بڑی محنت و مشقت کے بعد ملتا ہے، دوسرے وقت کی وہاں کوئی آس ہی نہ تھی۔ وہاں جا کر، ان لوگوں سے مل کر انہیں معلوم ہوا غربت کا آسیب کس طرح ان کی خوش حالی و سرتوئوں کے ساتھ ساتھ عصمتوں کو بھی نگل رہا تھا۔

غربت و مفلسی کی بدترین صورت حال نے بے شمار دوسری ہر ایوں میں بڑی برائی عصمت فروشی تھی جو تیزی سے پھیل رہی تھی۔

”آپ! کیا غربت اتنی خوفناک ہے کہ انسان سے اچھے برے، جائز ناجائز کی شناخت چھین لے؟“ رضیہ نام کی لڑکی سے اس کی داستانِ حیات سننے کے بعد گھر واپسی پر حراتا سف زدہ لہجے میں مخاطب ہوئیں۔

”اعتدال ہر جگہ ضروری ہے خواہ معاملات کی نوعیت کچھ بھی ہو اور ضروری نہیں ہے جہاں غربت ہو وہیں صرف بے راہ روی پائی جائے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ غربت و امارت، خوش حالی ہو یا بد حالی اگر ان میں توازن نہ ہو تو دونوں راستے بد حالی کی طرف مڑ جاتے ہیں۔“

”لیکن آپ! ان میں ایک بات مشترک ہے کہ ہم اس قسم کی بھٹی لڑکیوں اور عورتوں سے ملے ہیں وہ شوقیہ اس بدترین پیشے کو اپنائے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ اس گناہ آلود فعل سے بچنا چاہتی ہیں۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔ ان کے ضمیر مُردہ نہیں ہوئے، صرف مجبوریاں ہی انہیں اس غلاظت کو اپنائے رکھنے پر مجبور ہیں۔“ حرا پریشان تھی۔

”میں چاہتی ہوں آپ! ہم ایک ایسا انڈسٹریل ہوم بنائیں جہاں ان ہنرمند خواتین سے ان کے ہنر کے مطابق کام لیں اور پھر ان کے کام کو بونیکس، شاپس وغیرہ پر فروخت کر کے ان کی آمدنی کا ذریعہ بنایا جائے۔“

”ایسے انڈسٹریل ہومز تو یہاں ہر گلی، ہر محلے میں کھلے ہوئے ہیں جہاں سے ان ہنرمند عورتوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔“ فرح رُسوچ انداز میں بولیں۔

”فائدہ ہوتا ہے..... مگر بات ساری یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایسے بے حس و بے ضمیر لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ان غریب عورتوں سے کام تو بے حساب لیتے ہیں، ان کا کام آگے مٹکے داموں فروخت ہوتا ہے مگر انہیں جائز منافع دینے کی بجائے چند روپوں میں خریدا دیا جاتا ہے اور اپنا پینک بیلنس بڑھایا جاتا ہے۔ اسی منافقانہ طرزِ عمل کے باعث غریب، غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور سرمایہ داروں کے سرمائے آسمان تک جا گئے ہیں۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے کبھی بھی غریبوں کو حق نہیں دیا، معاشرے کے بگاڑنے لوگوں کے ذہنوں کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ وہ چوری، ڈکیتی، لوٹ مار، قتل و زنا جیسے گھناؤنے کام کو برا نہیں سمجھتے۔“

”پھر ہم کس طرح اتنا بڑا رسک لے سکتے ہیں؟“

”ہم حقدار کو ان کا جائز حق دیں گے تا کہ وہ بھی تین وقت کی روٹی سکون سے کھانے کے علاوہ تن بھی ڈھانپ سکیں۔ اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے آپ! تو سمجھیں ہم نے دنیا میں آنے کا حق ادا کر دیا ہے۔“ حرا پُر جوش لہجے میں کوپا ہوئیں تو فرح نے انشاء اللہ کہا۔



”سارہ بیٹی! پانی پلا..... بڑی مشکل ہوئی مگر کام ہو گیا۔ اب دیکھنا باقی کیسے سدھرتا ہے۔ نیم کے پیڑ کی سب سے اونچی شاخ پر بندھویا ہے تعویذ میں نے..... جیسے جیسے تعویذ ہوائے اُڑتا رہے گا ویسے ویسے باقر کی بے چینی و بے قراری بڑھتی جائے گی اور ایک دن وہ تمہیں لینے آجائے گا بغیر کسی فرمائش و مطالبے کے۔“ زریہ غڈِ حال کی پٹنگ پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے بولیں۔

”اماں! آپ درخت پر کس طرح چڑھیں..... خدا انخو استہ کچھ ہو جاتا تو؟“ سارہ گلاس انہیں پکڑاتے ہوئے خفگی سے بولی۔

”جے نا لگی۔ میں اس عمر میں درخت پر چڑھوں گی جب مجھ سے زمین پر بھی ٹھیک سے نہیں چلا جاتا..... اری ایک بچے کو دس روپے دے کر اوپر چڑھویا۔ وہ بچہ ہی باندھ کر آیا ہے سب سے اونچی ہنٹی پر تعویذ۔“ وہ پائوں سے چپل اتار کر دراز ہوئیں۔ ”تمہیں جو چیزیں استعمال کرنے کو دی ہیں کر رہی ہونا؟“

”میرا دل نہیں مانتا اماں! تم جو کر رہی ہو مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ سب فضول کام ہیں..... اگر ایسی باتوں میں دم ہوتا، سچائی ہوتی تو آج کوئی پریشان حال نہ ہوتا۔ پھر ہمارے مسائل ہماری تکلیفیں ہم بھگت رہے ہیں۔ کسی دوسرے کو کیا احساس ہو سکتا ہے؟“ وہ ان کے قریب بیٹھ کرنا صحنہ لہجے میں کہنے لگی۔

”جو نیک لوگ ہوتے ہیں وہ دوسروں کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں، دوسروں کی تکلیفوں کا انہیں پوری طرح احساس ہوتا ہے تبھی تو وہ لوگوں کے کام آتے ہیں۔“

”اماں! جب ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ صرف اور صرف اللہ پاک کی ذات سے ہمیں سب کچھ ملتا ہے، اس کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی جنبش نہیں کر سکتا، اس کے حکم کی ہر شے تابع ہے پھر ہم خود ہی کیوں نا اللہ سے مانگیں۔ ہمارے مانگنے میں جو تپ و لگن ہوگی وہ کسی اور میں نہیں ہو سکتی۔“

”میرا دماغ خراب مت کر سارہ..... یہ جو کچھ بھی میں کر رہی ہوں تیری خوشی، تیرے گھر بس جانے کے لئے کر رہی ہوں۔ مجھے شوق نہیں! دھڑا دھڑا دھکے کھانے کا۔ جوڑو نے کہا وہ بھی درست ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے..... ہر مسلمان کا ایمان یہی ہے کہ ہر کام اللہ کے حکم سے ہوتا ہے مگر ہمارے مذہب میں دعاؤں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ دعائیں وہ طاقت رکھتی ہیں جو تقدیر کو بدل ڈالتی ہیں۔“

”جو ہم مانگیں گے وہ دعائیں تاثیر رکھیں گی۔“

”چپ کر..... مجھے پیر صاحب نے پہلے ہی بتایا ہوا ہے کہ تو یہ سب نہیں مانے گی۔ کیوں کہ تجھ پر ہی کام کر دیا ہوا ہے۔“ انہوں نے سارہ کو ڈانٹا۔

”ایک واقعہ سناتی ہوں آپ کو ایسے ہی ایک پیر صاحب کا۔ ذرا خاموشی سے سننا۔ کسی گاؤں میں ایک پیر صاحب اپنے مرید کے ہاں گئے۔ صبح اذان ہوئی تو مرید نے وضو کر کے نماز فجر ادا کی لیکن پیر صاحب خرا لے لیتے رہے۔ مرید نے کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ پیر ہو کر نماز سے غفلت کر رہے ہیں، رہ نہ سکی۔ احترام سے بیدار کیا۔ یا حضرت! نماز قضا ہو رہی ہے۔ حضرت نے دل ہی دل میں گالیاں دیتے ہوئے چادر منہ سے ہٹائی کیونکہ ان کی ٹیٹھی نیند میں غفلت اندازی کی گئی تھی۔ وہ لگے انگڑائیاں لینے۔ سورج نکل آیا۔ اب خفت کی وجہ سے کچھ بن نہ سکا۔ ایک زالی منطق سوچھی، چادر سے منہ ڈھانپ کر اس طرح بیٹھے کو یا مراقبہ میں ہوں۔ دو چار منٹ بعد نمائشی جھرجھری لی اور کوپا ہوئے۔

”اللہ پتاہ میں رکھے..... کیا بات ہے، ہمارے ایک مرید دریاے جمن میں سفر کر رہے تھے۔ یکایک کشتی ڈانواں ڈول ہوئی۔ انہوں نے ہمیں پکارا لہذا ہم نے کشتی کو پیٹھ سے روکا اور بڑی مشکل سے راہ راست پر لے آئے۔“

”سبحان اللہ! کیوں نہ ہو..... آخر ہمارے مرشد صاحب کی کرامت ہے نا۔“ وہ سیانی عورت تھی۔ پلیٹ میں گھی اور چینی ڈال کر اوپر چاولوں کی تہہ جمائی اور لا کر پیر صاحب کے سامنے رکھ دی۔ چشم زدن میں پیر صاحب چاولوں پر لپکے لیکن گھی اور چینی نذر دیکھ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ مرید نے ادب سے بولی۔

”کھاتے کیوں نہیں؟“

پیر صاحب غصے سے کوپا ہوئے۔ ”کھاؤں خاک؟ گھی اور چینی تو ہے نہیں۔“

وہ پردہ ہٹنے کی منتظر تھی۔ چچے سے چاولوں کو ادھر ادھر ہٹایا تو بچے گھی اور چینی کی وافر مقدار نمودار ہوئی۔

”یہ کیا ہے، تمہارے باپ کا سر؟ چھ سو میل دوری سے ڈگمگاتی کشتی تو نظر آگئی لیکن شہرگ سے قریب گھی اور چینی کا پتہ نہ چل سکا۔“ یہ کہہ کر داڑھی پکڑ کر پیر صاحب کی مرمت شروع کر دی اور پیر صاحب خود کو چھڑا کر ایسے بھاگے کہ پھر کبھی پلٹ کر اس طرف نہ دیکھا۔“

”وہ کج بحث جعلی پیر ہوگا۔“ زریہ اطمینان سے بولیں۔



شاہ وزیر، مشعل کو ایک زیرِ تعمیر فلیٹ میں لے آیا تھا۔ یہ ایک غیر آباد علاقہ تھا جہاں بہت کم لوگ رہائش پذیر تھے۔

یہ اس کے دوست کا فلیٹ تھا جو ملک سے باہر تھا۔ فلیٹ اندرونی طور پر مکمل تھا۔ دوسروں میں کام ہو رہا تھا۔ مشعل کو یہاں بے ہوش چھوڑ کر گیا، گھر سے بے جی کو سمجھا کر آیا تھا کہ کچھ عرصہ انہیں یہ سب برداشت کرنا ہوگا۔ بے جی اس کی بہتری چاہتی تھیں انہوں نے وعدہ لیا کہ وہ مشعل پر سختی نہیں کرے گا، اس پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ اسے بھی اپنا رویہ درست نہ لگا، بار بار ہاتھ اٹھانا گھنیا فعل لگا۔

لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کسی طرح بھی رافعہ کو جیتنے نہ دے گا۔ جو بندھن اس نے مجبوری میں باندھا تھا وہ اب چیلنج بن گیا تھا۔

وہ سوچوں میں گم تھا کہ ایک کراہ کے ساتھ مشعل نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کی نگاہیں سیدھی سامنے بیٹھے شاہ ویز سے ٹکرائی تھیں۔

اس کی نگاہوں میں دھکتے شعلوں نے اس کے حواس لمحے میں بیدار کر دیئے تھے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھی تھی اور چونک کر کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ اجنبی و بالکل سادہ کمرہ تھا۔ ہر قسم کی آرائش و آسائش سے محروم۔

خاموشی اتنی دیر تھی کہ وہ اس دنیا کا حصہ نہ ہو۔ پہلی دفعہ اس کا دل خوف نامی شے سے آشنا ہوا تھا۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے شاہ ویز کی جانب دیکھا۔ وہ اس طرح خاموش بیٹھا تھا جیسے کوئی طوفان اپنے اوپر ہر سکوت سناٹا طاری رکھتا ہے۔ اسے سخت وحشت ہونے لگی۔

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کوپا ہوئی۔

”رہنے کی جگہ ہے۔“

”لیکن..... یہ وہ گھر تو نہیں ہے۔“

”اس گھر کے تم قابل نہیں ہو۔“

”میں..... میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“ اس وقت وہ بالکل بدلی ہوئی، ڈری، سبھی، خوفزدہ خام سی لڑکی تھی۔ تمام تیزی و طراری ہوا ہو چکی تھی۔

جب کہ وہ از حد پُرسکون انداز میں اٹھ کر کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا۔

باہر ایک کھراؤ اور رات تھی۔ شہر کی نسبت یہاں زیادہ خاموشی و سناٹے کا راج تھا۔ موسم سرما کی راتیں طویل و خاموش ہوتی ہیں کسی عمر رسیدہ کی طرح جو اپنی تمام عمر پُر شور ہنگاموں اور زندگی کی گہما گہمی میں گزار کے عمر ڈھل جانے پر خاموش ہو جاتا ہے اور یہ خاموشی اپنے اندر بہت معنی و اسرار رکھتی ہے۔

وقت زیادہ نہیں ہوا تھا۔ رات کا ابتدائی حصہ تھا مگر اندر باہر پھیلی جامد خاموشی اس کے اعصاب پر گراں گزرنے لگی تھی۔

ماحول کی ساری خاموشی و وحشت اسے اپنے وجود کا حصہ لگنے لگی تھی۔ چند گھنٹے قبل جس اذیت کے صحرانورد کو عبور کر کے وہ آیا تھا وہ اس کے بلند حوصلے، برداشت و ضبط کی کڑی مثال تھی۔ اسے خود اپنے آپ پر حیرت تھی، وہ خود کو اتنا مضبوط و بلند حوصلہ نہ سمجھتا تھا۔

مرد کتنا ہی اعلیٰ ظرف کا مالک کیوں نہ ہو، اپنی حمیت پر حملے برداشت نہیں کر سکتا۔

عزت نفس، انا، خودداری..... یہی تو انسانوں کی دولت، ان کی میراث ہوتی ہے۔

مشعل سے تعلق جوڑنے کے بعد اسے ان احساسات کو بار بار تھپک تھپک کر گہری نیند سلا پڑنا جو فوراً ہی کسی ضدی و بدتمیز بچے کی مانند مچلنے لگتے تھے۔

وہ ایثار پیشہ تھا۔

اس کی وسعت قلبی و قوت برداشت قابل ستائش تھی۔

مگر بار بار اپنی خودداری و حمیت کے ریزہ ریزہ ہونے کی تکلیف نے اسے اندر سے بڑھا لیا تھا۔ پھر آج رافعہ بیگم کی اخلاق سے گری ہوئی بکواس مستزاد اس پر گھر پولیس لے آنا، اسے سخت ناکوار گزرا تھا۔

اور جو بھی کچھ ہوا اس سب کی وجہ مشعل کی ذات تھی۔ جس کی بے حسی، بے وقوفی، و بے مروتی ہمیشہ ہی عروج پر رہتی تھی۔ جس کی آنکھوں پر ابھی تک خود غرضی و تکبر کی عینک لگی ہوئی تھی۔ وہ خود کو کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی سمجھتی تھی۔

وہ باپ جو کبھی کروڑوں کا مالک تھا، وقت کی بدلتی کروٹ نے جسے عرش سے فرش پر لا پٹا تھا اور وہ منہ چھپائے دور دراز علاقے میں اقامت پذیر تھا۔

اگر اس میں انسانیت نہ ہوتی، رشتوں کا تقدس، مروت، رواداری مزاج کا حصہ نہ ہوتی تو وہ بھی اسی طرح بے حسی و بے رحمی سے اسے اس کی حیثیت و وقعت کا احساس دلا کر اپنی تذلیل و تحقیر کا بدلہ لے سکتا تھا، جس طرح وہ اس کی عزت و وقار کو اپنی دودھاری زبان سے گھائل و پامال کرتی آئی تھی۔

اس کے لئے یہ سب کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔ وہ اس کو اس کے انداز سے سے بھی زیادہ ہزیمت پہنچا سکتا تھا۔ بات پھر اس کی قوت برداشت و صابرانہ تربیت کی آجاتی تھی۔ کاش اس کے مزاج میں اتنا تحمل و برداشت نہ ہوتی یا پھر اتنی برداشت و درگزر سے کام لینے والا نہ ہوتا تو آج یہ تعلق توڑ دیتا جس تعلق نے اسے ماسوائے اذیتوں اور رسوائیوں کے دیا کیا تھا۔

کہر بڑھتی جا رہی تھی۔

ہر شے کثیف دھوئیں میں ملفوف دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ ماحول ساکت تھا۔ ہواؤں کی سرسراہٹوں میں برقی ٹھنڈک کھلی تھی۔

کھڑے کھڑے اس کی مانگیں شل ہو گئی تھیں۔ سرائیک وزنی پتھر کی مانند ہو گیا۔ از سر نو اپنی توانائیاں کو نکجا کیا۔ ہمت و حوصلوں کو بلند کیا۔

اندر پھیلے مضطرب و منتظر اور دگر کے کھڑکی بند کر کے پلٹ آیا۔ مشعل کسی بے جان مجسمے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر ناہم سے تاثرات تھے۔ غصہ، طعمرات، جھنجھلاہٹ و بیزاراری مفقود تھی۔

اس پر آگہی کے نئے درواہ ہوئے تھے۔ ادراک و فہم کی پہلی میزھی پر اس کے قدم بڑھے تھے..... شعور کے درپچوں سے سچائی کے آنگن میں جھانکنے کی سعی اس نے شروع کر دی تھی۔

”مشعل.....!“ گہرے سکوت میں اس کی گہیر و بنجیدہ خوب صورت آواز ابھری تھی۔

مشعل نے چہرہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ لمحے بھر کو لگا ہوں کا تصادم ہوا تھا۔ شاہ ویز کی بولتی نگاہوں میں ایسی ہی کوئی کشش تھی جس نے اسے گہرا کر لگا ہوں کے ساتھ چہرہ جھکا نے پر مجبور کر دیا تھا۔

”میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے تمہیں سمجھانے کی، راہ راست پر لانے کی۔ بیار، نرمی، غصہ ہر حربہ حتیٰ کہ ہاتھ اٹھانے جیسا غیر اخلاقی فعل بھی میں نے آزمایا مگر تمہیں نہ سمجھنے سے دلچسپی تھی نہ تم سمجھیں۔ بلکہ تم نے ہر طریقے، ہر انداز سے مجھے ہرٹ کیا۔ نہ صرف مجھے بلکہ بے جی جیسی از حد شفیق و ہربان بزرگ کو بھی خاطر میں نہ لائیں اور ان کے کہنے پر ان کی خاطر ہی میں نے یہ سب برداشت کیا۔ لیکن آج جو کچھ بھی ہوا اس نے وہ سب ختم کر ڈالا جو میں برداشت کر رہا تھا۔“ وہ بیڈ کے ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔ اس کا لہجہ بے حد بنجیدگی لئے ہوئے تھا۔ وجہ یہ چہرے پر بھی بلا کی بنجیدگی تھی۔ مشعل سر جھکا کے لب بھینچنے خاصی فرمانبرداری کا مظاہرہ کر رہی تھی جو آج سے قبل مفقود تھا۔ ورنہ وہ ایک سوال کے متر جواب دینے کی عادی تھی۔

”اب سے تم اپنے ہر عمل کی جوابدہ خود ہوگی۔ بہت سوچ سمجھ کر چال چلنا کہ اب ہر چال تم پر واپس لوٹائی جائے گی۔ کوئی رعایت، کوئی بچت، کوئی مروت طوطا خاطر نہ رکھی جائے گی، رواداری و لحاظ کا رشتہ ہم میں اب استوار نہیں ہے۔ اس لئے سوچ سمجھ کر آگے بڑھنا۔“ وہ سختی سے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

□●□

کتنی دیر سے وہ اماں کو ادھر سے ادھر پھکر لگاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ رات کو اصغر نے اطلاع دی تھی کہ فریجہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے، وہ ہسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ بتا کر وہ رکا نہیں تھا، غلٹ میں چلا گیا تھا۔

زیرینہ بیگم کو بیٹے کا اس طرح اجنبی انداز میں اطلاع دینا ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ پھر اس کا غیروں کی طرح اطلاع دے کر فوراً چلے جانا ان کا دماغ گھما گیا۔

”اماں! بھائی سے معلوم تو کرتیں کہ بھابھی کس ہسپتال میں ہیں؟“ سارہ اندر آتی ہوئی پریشان کن لہجے میں بولی۔

”کیا معلوم کرتی اور کیوں معلوم کرتی؟ میں لگتی کون ہوں بھلا اس کی؟“ حسب عادت وہ غصے میں آ چکی تھیں۔

”اماں! یہ وقت شکوؤں کا نہیں ہے..... ہمیں ہسپتال چلنا چاہئے۔“

”پتہ، ٹھکانا بتا کر گیا ہے وہ؟ اس طرح چلتے چلتے بتا کر گیا ہے جیسے کسی غیر کو بتایا کرتے ہیں۔ کیا میں اس قابل نہیں تھی مجھے وہ ساتھ چلنے کے لئے کہتا یا بتا کر چلا جاتا کہ بہو کس ہسپتال میں ہے۔ کیا ہم جاتے نہیں، ہمارا حق نہیں ہے؟ اگر وہ باپ بننے والا ہے تو میں داوی نہیں بنوں گی؟ تم پھپھو نہیں کہلاؤ گی؟ کیا ہم خوش نہیں ہیں؟ ہمیں ارمان نہیں ہے اپنے بچے کے بچے کا دنیا میں آنے کا؟“ آخر میں ان کا لہجہ آنسوؤں کی یورش سے بھیگ گیا اور وہ چہرہ دوپٹے میں چھپا کر رونے لگیں۔ سارہ دکھ سے ڈھسے سی گئی۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی اس کی ماں زبان کی جس قدر کڑوی ہیں، ان کا دل اس قدر ہی گداز و کدورت سے پاک ہے۔ وہ کبھی بھی کسی کی کوئی بھی بات خواہ وہ ہری ہو یا اچھی صاف کوئی سے اس فرد کے منہ پر کہہ دیا کرتی تھیں۔ اس کے بعد ان کے اندر اس کے لئے کوئی بغض یا کینہ نہ رہتا تھا۔

صاف کو اور منہ پھٹ لوگ کبھی بھی لوگوں کے پسندیدہ نہیں ہوتے لیکن ایسے لوگ ان چالوس و کینہ ور لوگوں سے بہتر ہوتے ہیں جو آپ کے منہ پر آپ کی تعریف و توصیف کے پُل باندھ دیتے ہیں اور پیچھے پیچھے عیب جوئی و بد کوئی میں ملوث رہتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت خطرناک و ناقابل اعتبار ہوتے ہیں۔

زیرینہ بھی اپنی صاف کوئی کے باعث لوگوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھی جاتی تھیں اور ان کی اس عادت نے ان کی بہو فریجہ کو اول روز سے ان سے متنفر ہونے کا موقع دیا تھا۔

پھر اب تو یہ دستور سامن گیا ہے کہ شادی سے قبل بھائی بیٹے کتنے ہی چاہنے والے، محبت کرنے والے، خیال رکھنے والے ہوں بہوؤں کے آتے ہی وہ رفتہ رفتہ پہلے والے سارے رویے و محبتیں بھول جاتے ہیں۔

پھر وہ ہر بات نیوی کے کانوں سے سننے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

ہر منظر نیوی کی نگاہوں سے دکھائی دینے لگتا ہے۔

زبان ان کی ہوتی ہے، لفظ زو جہ مجترمہ کے از بر کرائے ہوئے۔

یہاں بھی یہی ہوا تھا۔ اصغر بیوی کی چند روزہ رفاقت میں ماں، بہنوں کی برسوں کی محبت فراموش کر بیٹھا تھا۔ اور آج اس اہم موقع پر ماں کو ساتھ لے جانے کی بجائے سرسری طور پر بتا کر گیا تھا۔ ایک ماں کی اس سے بڑھ کر تڑپا لیل مزید کیا ہو سکتی تھی۔

”اماں روؤ نہیں..... سزا اور جزا کا سلسلہ صرف آخرت کے لئے وقف نہیں ہے، یہ یہاں بھی جاری ہے۔ جو بھی ہم کرتے ہیں اچھا برا، جائز و ناجائز یہ سب مکافات عمل بن کر قدرت ہمارے ساتھ دہراتی ہے۔ مکافات سے کوئی نہ بچ سکا۔ بھائی باپ بن جائیں گے، بھابھی ماں۔ اور یہ رشتے ہی انہیں آپ کے درد کا احساس دلائیں گے۔“ سارہ خود کو سنبھال کر ماں کو تسلی دے رہی تھی۔

اصغر نہیں آیا۔ ساری رات ان دونوں کی پریشانی و فکرات میں گزری۔ فریج کی فیملی کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔ اس نے وہاں فون کر کے معلوم کیا تو جواب ملا وہ لوگ گھر خالی کر کے جا چکے ہیں۔ ان کی موجودہ رہائش کا کسی کو معلوم نہ تھا۔

دوسرے دن شام کو اصغر آیا۔ خاموش خاموش، پُریشان لباس، بکھرے بکھرے بال، بے ترتیب حلیہ۔ وہ کسی سے مخاطب ہوئے بنا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

”دیکھا؟ ساری رات ہم پر قیامت بن کر گزری اور وہ منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا..... میری کوئی اوقات اس کی نگاہوں میں نہیں ہے۔ گھر میں پڑی دھول مٹی بن گئی ہوں۔“ وہ دلا سہ دیتی سارہ سے غصے و دکھ سے مخاطب ہوئیں۔

”اماں میرا دل گھبرا رہا ہے..... اللہ خیر کرے، بھائی کا اس طرح آنا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے جانا..... کوئی بات ہوئی ہے۔“ سارہ پریشان نگاہوں سے بھائی کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھ کر روہانے لہجے میں کوپا ہوئی۔

”یہ کوئی پہلی دفعہ نہیں ہوا۔ شادی کے بعد اس کا یہی وتیرہ بن گیا ہے۔ دل چاہتا تو اس سے بات کی ورنہ بیگانوں کی طرح صبح شام یونیورسٹی گزرتا ہے۔“

”اسی عادت نے تمہیں خوار کر رکھا ہے اماں..... موقع محل دیکھ کر بات نہیں کرتیں۔“ بھائی کی اس طرح آمد نے اس کے اندر عجیب بے چینی پھیلا دی تھی۔ زریزہ کا عادت کے مطابق شروع ہوتے دیکھ کر وہ زچ لہجے میں بولی۔

”ہاں..... ہاں..... سب کو میری زبان نظر آتی ہے..... کوئی میرا دل نہیں دیکھتا۔“ ان کو چھوڑ کر سارہ اصغر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

دروازہ اندر سے لاک نہ تھا۔ ہاتھ لگاتے ہی کھل گیا۔ اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے اصغر کو آواز دی اور اس کے آجاؤ کہنے پر اندر داخل ہو گئی۔

اندر صوفے پر وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھا تھا۔ ارد گرد کھلو نے کھڑے ہوئے تھے۔

”بھائی! بھابھی کیسی ہیں؟“ اصغر کی متورم آنکھیں دیکھ کر اس کے اندر صوفے جاگ اٹھے۔ وہ بے اختیار اس کی جانب بڑھی تھی۔

سارہ! فریج ٹھیک ہے..... لیکن منا نہیں رہا۔ وہ مُردہ پیدا ہوا تھا۔ ابھی اسے دفن کر آ رہا ہوں، اپنے ہاتھوں سے اس کی نعش مٹی قبر بنا کر آ رہا ہوں۔“ اصغر رو رہا تھا۔ سارہ بھی اس خبر پر رو پڑی تھی جب کہ اس کے پیچھے آنے والی زریزہ جو تجسس کے باعث دروازے کے پیچھے کھڑی پوتے، پوتی کی خوش خبری سننے کو بے تاب تھیں، اس خبر نے ان کے حواس جامد کر ڈالے۔ انہیں محسوس ہوا کسی نے ان کا کلیجہ نوچ ڈالا ہو۔ انہوں نے لڑکھڑاتے وجود کو چوکھٹ پکڑ کر سنبھالا۔ اس وقت وہ دہرے صدمے کے زیر اثر تھیں۔ اول ان کا پہلا پوتا مُردہ پیدا ہوا، دوم انہیں اس قابل ہی نہیں سمجھا گیا کہ وہ اس کا پہلا و آخری دیدار کرتیں۔

اذیت ہی اذیت تھی!

وہ اپنا بے جان ہوتا وجود گھسیٹ کر کمرے میں بند ہو گئیں۔

سارہ ان کی حالت سے بے خبر اصغر کو دلا سے دے رہی تھی۔ اس کا دکھ بانٹ رہی تھی۔ اسے احساس تھا۔ اس کی بیگانگی و اجنبیت کا سلوک جو اس نے ان کے ساتھ کیا اسے ان رویوں کی بد صورتی کا پوری طرح احساس تھا۔

وہ ٹھنڈا مارا گرکھنے کی عادی تھی۔ ماں کی طرح جذباتی نہیں۔ بہت ہمت و حوصلے سے اپنی کیفیت کو چھپا کر وہ دلجوئی کر رہی تھی۔

اصغر اس وقت دکھ و ملال کے گہرے ساگر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے خوشی و دکھ ایک ساتھ پایا تھا۔

پہلی بار باپ بننے کی سرت میں نوناہ سرشار رہا تھا..... انوکھے سرور جذبات کے ساتھ ایک دن میں ہی اولاد کو پانے اور کھونے کے تکلیف دہ عمل سے بھی گزرا تھا۔ اولاد کو کھونے کا دکھ سو بپان روح ہوتا ہے۔ اس دکھ میں انسان موم کی طرح کچل کر ختم ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اس کی دلجوئی نہ کرے تو۔ مگر دکھ، دکھ ہوتا ہے۔

سارہ نے اس کے کپڑے پر پس کئے۔ وہ نہا کر آیا تو زبردستی چائے پینے پر مجبور کیا۔ اس کی محبت رائیگاں نہ گئی۔ اصغر پہلے والا اصغر بن گیا۔

سرت کے لمحات میں ساتھ دیئے والے ہمارے دھیان سے محو ہو جاتے ہیں لیکن جو ہمارے دکھ و تکلیف میں شریک رہتے ہیں وہ کبھی فراموش نہیں ہوتے۔ وہ ہمارے قلب میں دھڑکنوں کی طرح بستے ہیں۔ رکوں میں خون بن کر دوڑتے ہیں، دکھ میں اپنائیت کی شناخت ہو جاتی ہے۔

وہ اس وقت خود کو سنبھال چکا تھا۔ دکھ کی گہری چھاپ اس کے لہجے میں موجھتی۔

”یہ کیسی عجب بات ہے سارہ! میں نے اسے پہلی بار دیکھا اور مجھے محسوس ہوا میرا اس کا صدیوں کا رشتہ ہے۔ اس کی صورت میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا ہے میں اس سے جدا ہو کر جی نہیں پاؤں گا۔ میں کیسے بھلاؤں گا اسے؟“ اصغر ایک بار پھر بے اختیار ہو گیا تھا۔

”بھائی! آپ اپنے بیٹے سے چند گھنٹوں میں اتنے مانوس ہو گئے کہ آپ کو اب کسی چیز میں کشش و زندگی محسوس نہیں ہو رہی۔ پھر اماں کا سوچیں، انہوں نے کتنے سال آپ کو لاڈ و پیار و محبت سے پالا، آپ کی خوشی کو اپنی خوشی، آپ کے دکھ کو اپنا دکھ جانا، پھر آپ ان سے اتنی دور کیوں ہوئے کہ آج یہ فُسوس ناک صورت حال پیش آگئی کہ آپ ان کے پوتے کو کھد میں بھی اتار آئے اور وہ کل رات سے اب تک بے تابی سے کوئی خوش خبری سننے کی منتظر ہیں۔ انصاف سے سوچئے گا بھائی! دکھ آپ کا برا ہے یا ان کا؟ زیادتی کس کے ساتھ ہوئی ہے، آپ کے ساتھ یا ان کے ساتھ؟“ سارہ کو انہی لمحات کا انتظار تھا۔ وہ لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگانے کی عادی تھی۔

سارہ اسے آئینہ دکھا کر جا چکی تھی۔ وہ ضمیر کے اس آئینے میں اپنی صورت کو بد صورت و کریمہ دیکھ کر لرز اٹھا۔

آج سے قبل جو اس نے کیا وہ رتی رتی اسے یاد آنے لگا۔ اسے اپنا دکھ ماں کے دکھ کے آگے حقیر و بے وقعت لگا۔

□●□

”حمیدہ! کتنی عورتیں ہیں ایسی جو سلائی، کٹائی کر رہی ہوں گی اور کتنی تعداد ہوگی ان عورتوں کی جو کڑھائی کرنا جانتی ہیں؟“ فرح اپنے آگے رجسٹر کھولے تیزی سے اندراج کرنے میں مصروف تھیں۔

حمیدہ انہیں تفصیل بتا رہی تھی۔ ان کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔

”بیگم صاحب! عورتیں بڑی خوش ہیں جی، جب سے انہیں معلوم ہوا ہے کہ آپ ان کی محنت کا معاوضہ بھی اچھا دیں گی۔ دراصل ہمارے ہاں اس طرح کے کام تو بے حد کروائے جاتے ہیں مگر دام دیتے وقت بے ایمانی دکھائی جاتی ہے۔“

”ایسا کوئی کرنا نہ بھی چاہے تو دوسرے لوگ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔“ حرا اس کے ساتھ ل کر منر کے دانے نکلاتے ہوئے کوپا ہوئی۔

”وہ کس طرح چھوٹی بیگم صاحبہ؟“ حمیدہ حیران ہوئی۔

”ایک پارٹی کسی مارکیٹ سے مال اٹھا رہی ہے اور وہ اپنے کام کرنے والوں کو معاوضہ بھی برحق دیتی ہے پھر اسی مارکیٹ سے دوسرے ایسے لوگ آ جاتے ہیں جو اس پارٹی سے کم معاوضے پر مال اٹھا لیتے ہیں اور ان علاقوں میں بے لوگوں سے کام کرواتے ہیں جہاں پسماندگی و افلاس انتہاؤں پر پہنچا ہوتا ہے۔ وہاں کام تو ہزاروں کے کروائے جاتے ہیں اور اجرت آٹے میں نمک کے برابر ملتی ہے۔ غریب اور ضرور مند لوگ یہی سوچ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ان کی محنت کے عوض ان کے گھر میں ایک وقت چولہا تو جل رہا ہے اور وہ بے حس و بے ضمیر لوگ ان ضرورت مندوں کا حق مار کر اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔ خود تو اللہ کے غضب کا شکار ہوتے ہی ہیں ساتھ میں دوسروں کو بھی بے ایمانی کی راہ دکھاتے ہیں۔“

”بیگم صاحبہ! اگر آپ لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا تو پھر؟“

”نہیں..... انشاء اللہ ہمارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ہم اچھے و نیک لوگوں سے رابطے رکھیں گے جو درد مند دل، ایمان، ضمیر کے مالک ہیں۔“ فرح رضوی نے رجسٹر بند کر کے مسکرا کر کہا اور کوچ پر نیم دراز ہو گئیں۔

□●□

اسے انجان راستوں سے گزر جانے کی خواہش تھی

محبت میں امر ہو جانے، مرجانے کی خواہش تھی

وہ کہتا تھا جیون تیرگی ہے

رنگ بھرنے ہیں اس میں روشنی کے

اور یہ ہم کو مختصر سے چند لمحے جو میسر ہیں

یہ لمحے ہمیں آباد کرنے ہیں

کسی کو دور سے دیکھنا، کسی سے بات کرنی ہے

جہاں یہ دن گزر جائیں، وہیں پہ رات کرنی ہے

وہ کہتا ہے محبت کا کوئی موسم نہیں ہوتا



یہ ہر موسم کا جذبہ ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا

اڈھوری سی محبت ہے ہمیں تکمیل کرنی ہے

محبت کو سننے ڈھب سے بسر کرنے کی خواہش اسے ہر شب جگاتی ہے

نہ جانے کون سی چاہت اسے ہر پہل جگاتی ہے

شنا سنا تھا ہر ایک پہل سے پر انجان رہتا تھا

بہت آباد تھا لیکن بہت ویران رہتا تھا

اسے ہر شخص کو حیران کر جانے کی عادت تھی

محبت میں امر ہو جانے کی، مر جانے کی خواہش تھی

شاہ ویز نے چونک کر دیکھا، وہ رسالے پر جھکی ہوئی تھی۔

”تمہیں کب شوق ہو گیا اردو میگزین پڑھنے کا؟ وہ بھی پوئٹری!“

”اردو میگزین بھی میں پڑھتی ہوں اور پوئٹری میری فیورٹ ہے بلکہ میں نے خود بھی پوئٹری لکھی ہے۔“ وہ اٹک اٹک کر کہہ رہی تھی اور شاہ ویز نے اس کی بات کے جواب میں بھر پور استہزاء سیہ قہقہہ لگایا تھا۔

”تم اور شاعری..... میں کبھی مان ہی نہیں سکتا کہ تم شاعری کر سکتی ہو۔“ اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کی مسکراہٹ، ہر نقوش میں گہرا تسخرو استہزاء تھا۔ وہ کھول اٹھی۔

”کیوں، وہ لوگ انسان نہیں ہوتے؟ اس دنیا سے تعلق نہیں رکھتے؟“

”تمہاری دنیا سے تعلق نہیں رکھتے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب، رائٹرز بہت حساس لوگ ہوتے ہیں۔ مروت، خلوص و حساسیت ان کے وجود کا حصہ ہوتی ہے۔ ان کی پہچان ہوتی ہے۔ اور تم تو ان احساسات سے بالکل ہی نابلد و نا آشنا ہو۔ ان کی دنیا تمہاری دنیا سے بالکل الگ ہے۔ تمہاری دنیا سے تعلق چنگیز خان، ہلاکو خان، بظرف وغیرہ کا محسوس ہوتا ہے۔“ وہ ہنس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں، چہرہ، ہر نقش ہنس رہا تھا۔

اس وقت وہ بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ روشن چہرہ، روشن مسکراہٹ، روشن آنکھیں..... کتنا اعتماد و اطمینان تھا اس کے انداز میں۔ مشعل دیکھتی رہ گئی۔

”کیا دیکھ رہی ہو نظر لگاؤ گی؟“ نا معلوم کس موڈ میں تھا۔ بہت خوش و شوخ۔ وہ کچھ بولی نہیں، بولتی بھی کیا۔ اپنی موجودہ حیثیت کا تعین اس نے کر لیا تھا۔

وہ بھری دنیا میں بالکل تنہا ہو گئی تھی۔ اس کا کوئی اپنا نہیں تھا۔

نہ کوئی دوست

نہ کوئی ہمدرد

نہ کوئی غمگسار

لحق و حق صحرا میں وہ تنہا کھڑی تھی۔ ہر سمت گھپ اندھیرا تھا، دبیز تاریکی۔

”کیا ہوا.....؟“ اس کے چہرے کے بدلے تاثرات اس کی ذہین آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔

”میں پاپا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے سوچ لیا تھا اب وہ پاپا سے ناراض ہی رہے گی۔ جب انہیں اس کی پروا نہیں ہے تو وہ بھی انہیں یاد نہیں کرے گی۔ مگر یادوں پر کسی کا زور چل سکا ہے کبھی؟ وہ بن بلائے مہمانوں کی طرح وارد ہوتی ہیں اور بے چینی، مضطرب و بے کلی پیدا کر ڈالتی ہیں۔ پھر یاد بھی باپ کی تھی۔

جنہوں نے اسے صرف باپ کا ہی پیار نہ دیا تھا بلکہ ماں، بھائی، بہن، دوست، احباب، تمام رشتے اس ایک رشتے میں پنہاں تھے۔ انہوں نے محاورنا نہیں، حقیقتاً پھول کی طرح اس کی نگہداشت کی تھی۔ خود سے بڑھ کر چاہتا تھا۔ متاع حیات کی طرح وہ چاہ کر بھی ان کی محبت فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ اس وقت بھی بے تاب ہو کر اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

”کیوں..... شکایت لگاؤ گی میری؟“

”وہ میرے پاپا ہیں..... جو دل چاہے گا بات کروں گی۔“ وہ زچ ہو کر بولی۔

”اوکے، میں نے کب دعویٰ کیا کہ وہ میرے پاپا ہیں..... جو دل چاہے بات کرو۔“

”لیکن کیسے بات کروں؟ مجھے کیا معلوم وہ کہاں ہیں؟“

”اوہ..... یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔“ اس نے شانے اچکا کر فسر دگی سے کہا۔ مشعل اس کے انداز پر کھول کر رہ گئی۔ صاف لگ رہا تھا وہ بن رہا ہے۔

”جھوٹ بول رہے ہو، تمہیں معلوم ہے۔“ وہ زیادہ دیر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔

”لہجہ درست کرو اپنا۔“ ٹیکتھ اس کی شکستگی و شوخی غائب ہو گئی۔ کسی شیر کی طرح غریبا تھا۔ وہ تھرا کر رہ گئی۔

”پاپا تمہیں بتا کر گئے ہیں، پھر تمہیں کس طرح معلوم نہیں ہے؟“ اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی، لہجہ پست۔

”میں نے کہہ دیا نہیں معلوم تو بس نہیں معلوم۔“ اس کا انداز ہٹ دھرمی و برتری لئے ہوئے تھا۔ وہ اسے خود پر چھایا ہوا لگ رہا تھا۔ کوپا اس سے اب مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ وہ تنہا ہزاروں سے قوی و مضبوط تھا۔

وہ جتنا جائز کو جائز، ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی، اب محسوس کرنے لگی اپنی حق بات بھی منوانے کی صلاحیت و اہلیت کھو بیٹھی ہے۔

شاہ ویز کے چہرے سے مسکراہٹ و شوخی غائب ہو گئی تھی۔ کچھ لمحے پہلے روشن روشن نظر آنے والا چہرہ یکدم ہی درخشنگی و کرننگی سے بگڑ کر رہ گیا تھا۔ اس کا موڈ دیکھ کر اس کے تمام حوصلے دھتیس جواب دے گئیں۔ بہت غیر محسوس طریقے سے وہ اس کے زیر اثر آ چکی تھی۔

اس کا کرخت لہجہ، درشت انداز اور پھر ناقابل برداشت ہاتھ اٹھانے والا جنون، مارنے ہی اس کے اندر شاہ ویز سے خوف و وحشت کا شکار کر دیا تھا۔ اگر وہ یہ طرز عمل نہ اپناتا تو وہ بالکل بھی اس کے رعب میں آنے والی نہ تھی۔

چند لمحے وہ اسی طرح منہ بگاڑے بیٹھا رہا پھر اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ مشعل نے کل کر سانس لی اور کمرے پر نظریں دوڑاتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

ہر قسم کی آرائش و زیبائش سے لاتعلقی، بالکل عام و سادہ کمرہ تھا۔ دیواروں پر گرے پیٹ تھا۔ سامنے دیوار پر سنہری شیڈ والی وال کلاک کے علاوہ دیواروں پر پینٹنگ، سینٹری کچھ نہ تھا۔ دائیں دیوار میں درمیانی سائز کھڑکی پر سرمئی و سیاہ پرنٹ کا پردہ تھا۔ ایسا ہی پردہ کمرے کے دروازے پر بھی نظر آ رہا تھا۔ نیچے فرش پر سادہ سرمئی کارپٹ بچھا تھا۔ چھت و اسٹ پیٹ کی تھی جس کے درمیان میں پکھا ہوا دے رہا تھا۔ فرش کے وسط میں ڈبل بیڈ تھا جس پر اجلی اجلی چادر و تکیہ رکھے تھے۔ اس کے علاوہ صرف ایک کارزریک تھا جس میں کچھ سامان نہ تھا۔

کمرہ بے حد چھوٹا تھا۔ بیڈ اور کارزریک کے بعد بہت تنگ سی جگہ کھڑکی تک جاتی تھی۔ کمرہ کیا تھا ایک تنگ کوٹھڑی تھی۔ کسی کپوتر کے کبابک کی طرح۔

وہ متوحش نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔ بھلا اس جگہ کس طرح رہا جاسکتا ہے؟ یہاں انسان تو کیا کوئی جانور بھی نہ رہ پائے گا۔

وہ از حد ہراساں و بدحواس ہو رہی تھی۔ سرد موسم میں بھی اس کی پیشانی عرق آلود تھی۔ تیور تو پہلے ہی شاہ ویز کے خطرناک نظر آرہے تھے، اب عزائم بھی مخفی نہ رہے تھے۔ یقیناً وہ کسی خوفناک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر یہاں آیا تھا۔

”وہ منصوبہ کیا ہو سکتا ہے؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔

لیکن کوئی جواب وہ سوچ ہی نہ سکی، ماسوائے اس کے کہ الگ اسے یہاں کچھ دن رکھا گیا تو وہ زندہ نہ رہ پائے گی۔ ساری زندگی آسائشوں، راحتوں میں گزری تھی۔ جن کی اس حد تک عادت پڑ چکی تھی کہ ان سے علیحدگی کا تصور ہی ایسے تڑپا دیا کرتا کوپا بن جل کے مچھلی تڑپ اٹھے۔

نا معلوم کتنے لمحے یا گھنٹے گزرنے کے بعد شاہ ویز اندر داخل ہوا تھا..... ایک ہاتھ میں کچھ شاپرز تھے دوسرے میں دسترخوان، ٹیلیں، چمچے اور گلاس۔ وہ سب اس نے بیڈ اور دیور کے درمیان میں تھوڑی سی جگہ میں رکھ دیا اور بہت ترتیب سے شاپرز میں سے کھانا نکال کر پلیٹوں میں سجا کر دسترخوان پر رکھے لگا۔ تمام سامان سیٹ کرنے کے بعد اٹھ کر کمرے سے گیا۔ واپسی چند سیکنڈ بعد ہوئی۔ ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔ وہ سائیڈ میں رکھ کر وہ دوزانو بیٹھ گیا۔ مشعل ایسے گم صمم بیٹھی تھی کوپا موجود نہ ہو وہاں۔

”آپ کو کھانے کے لئے انویٹیشن دینا پڑے گا یا ہاتھ جوڑ کر درخواست کرنی پڑے گی؟“ اسے خاموش بے حس و حرکت بیٹھے دیکھ کر وہ طنز یہ لہجے میں کوپا ہوا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”میرا ساتھ دو، مجھے تنہا کھانے کی عادت نہیں ہے۔“

”میں زبردستی نہیں کھا سکتی۔“ اس کا انداز بیزار کن تھا۔

”مجھے بھی زبردستی کرنے کی عادت نہیں ہے۔ جب سے تم سے رشتہ جوڑا ہے مجھے اپنی کافی عادتوں کو ترک کرنا پڑا ہے۔ کچھ تو ناپسندیدگی کے باوجود اپنا پڑا ہے ان میں ایک اس عادت کو بھی اپنا نا ہی پڑے گا۔“ وہ اطمینان سے کہتا ہوا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ اس کی جان جل کر رہ گئی۔

کیا بگڑ جاتا اگر تھوڑے سا ذخروں کو برداشت کر کے اسے کھانا کھانے پر مجبور کر دیتا۔ عورت مار سے نہیں، پیار سے پگھل جاتی ہے۔ وہ یہ کیوں نہیں سمجھتا۔ ہر وقت اپنی انا و

برتری کا احساسِ تفاخر اسے جھکنے نہیں دیتا۔ خود کو نہ معلوم کیا سمجھتا ہے۔ کتنی جلدی اپنی اوقات بھول گیا ہے۔

غصہ و جنون اس کے اندر کسی طوفان کی طرح تباہی پھیلا رہا تھا۔

”نہاری تو بے جی پکاتی ہیں زبردست، اعلیٰ سے اعلیٰ۔ ہوٹل کی نہاری ان کے آگے مات ہے۔ اور بریانی میں تو ان کا جواب ہی نہیں۔ ایسی خوشبو والی پکاتی ہیں کہ پورا محلہ مہک اٹھتا ہے۔ پراٹھے گیارہ پرت والے بناتی ہیں، اتنے خستہ و کراہے کہ پیٹ بھر جاتا ہے مگر نیت سیر نہیں ہوتی۔ اور شامی کباب اس قدر لذیذ ہوتے ہیں کہ ایک بار کھانے والا بار بار کھانے کی فرمائش کرے۔“ وہ کھانے کے ساتھ ساتھ بے جی کی قصیدہ گوئی میں مصروف تھا۔

اس وقت اس کے چہرے پر ملامت و محبت کے رنگ تھے۔ پیشانی پر شکنوں کے ناکوار جال نہ تھے، غصے کے وقت مقابل کو بھسم کر ڈالنے والی نگاہوں میں بڑی عقیدت بھری روشنی تھی۔ لبوں پر معصوم سا تبسم۔ چہرے کے نقوش اپنی جگہ تھے۔ کوئی ناکواریت، کوئی کرخنگی و درشتگی کا جلال نہ تھا۔ اس وقت دھیمے دھیمے باتیں کرتا وہ کتنا وجہ و پُر وقار لگ رہا تھا۔ بلیک جینز، پر پل شرٹ اس کے شاندار سراپا پر غضب ڈھا رہی تھی۔ بلاشبہ وہ ہر کششِ شخصیت رکھتا تھا۔ کوئی بھی لڑکی اس جیسا جیون سا تھی پا کر فخر محسوس کر سکتی تھی۔ وہ ایک آئیڈل پرسنالٹی رکھتا تھا۔

”آہ..... میں یہ کیا سوچ رہی ہوں؟ پل پل گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا یہ شخص میرا آئیڈل کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ خود غرض و خود پسند بندہ، جس کی نگاہ میں صرف اپنی مہٹ دھری کی ویلیو ہے۔“ اس نے جھٹ خود کو سرزنش کی لیکن ذہن بار بار اس کی جانب بھٹک رہا تھا۔

جس اہتمام سے وہ کھانے بیٹھا اس اشتہا سے کھایا نہ تھا، جلد ہی ہاتھ کھینچ لیا تھا اور سب سمیٹ کر رکھ آیا تھا۔

”رات یوں ہی بیٹھ کر گزارنے کا ارادہ ہے؟“ اسے اسی طرح بیٹھے دیکھ کر بولا۔ ”اور گزرا بھی سکتی ہو۔ کیونکہ سارا دن تمہارے پاس ہوتا ہے سونے، آرام کرنے کے لئے۔ لیکن مجھ پر جم کرو۔ میں ایک محنت کش آدمی ہوں، کمانے کی ذمہ داری ہے مجھ پر۔ میں ایسی عیاشیاں انورڈ نہیں کر سکتا۔“ بات بات پر طنز کی بوچھاڑ کرنا اس کی عادت بن گئی تھی۔ چند لمحات قبل خوشگوار نظر آنے والا مزاج ہر ہم ہو چکا تھا۔

”سوؤ..... منع کس نے کیا ہے؟“ وہ آہستگی سے کویا ہوئی۔

”ایک سائیڈ پر ہو۔ پوری مسہری پر قبضہ جما کر بیٹھی ہو۔“

”وہاٹ؟ ایک بیڈ پر سوئیں گے؟“

”ہوں تو کیا ہوا؟ ہم میاں بیوی ہیں، کوئی پڑوسی تھوڑی ہیں جو اس قدر حیرانگی کا اظہار کر رہی ہو؟“ وہ بیڈ پر بیٹھتا ہوا تسخراں انداز میں کہنے لگا۔

وہ چند لمحے شدید حیرانگی و بے یقینی کی کیفیت کے زیر اثر رہی۔ اس اثنا میں شاہ ویز نیوب لائٹ آف کر کے نائٹ بلب روشن کر چکا تھا۔ نائٹ ڈریس پہنچ کرنے کے بعد اس نے حسبِ عادت اپنا پسندیدہ پرفیوم استعمال کیا تھا۔ ایک دلاؤیز مہک ہر سو پھیل گئی۔

کیا خوشبو تھی۔

حواسوں پر چھا جانے والی، دھڑکنوں کو مہکانے والی، جذبات بھڑکانے والی، خوشبوؤں کا وجود نظر نہیں آتا مگر طاقت و سرحر انگیز قوت ہوتی ہے ان میں پل بھر میں انسان کو دیوانہ بنا ڈالتی ہیں۔

بے خود و مست کر دیتی ہیں۔ انسان خود کو بھول کر ان میں کھو جاتا ہے۔

وہ بھی سب کچھ بھول کر احساسِ تفاخر سے کھل اٹھی۔

”ہونہہ..... بڑے بے حس و سنگدل بنے تھے۔ عورت و مرد کے درمیان جذباتی تعلق کی تمہاری لاجک میں کوئی جگہ و ضرورت نہ تھی۔ خُسن و جوانی تمہاری کمزوری نہیں بن سکتی تھی۔ تم نفس کو پیروں تلے کچلنے کے عادی تھے۔ پھر اب..... پھر اب سارے دعوے اور فخر کا کیا ہوا؟“ وہ سرت و کامرانی سے دل ہی دل میں قہقہے لگا رہی تھی۔ آج تو اس کی جیت کا وہ وقت آیا تھا جس کا اسے کب سے انتظار تھا۔

وہ پتھر موم بن گیا تھا جس کو وہ اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کو تیار تھی۔

”مشعل ہوں میں..... وہ مشعل جو اپنے خُسن کے شعلوں سے بڑے بڑے پتھر دلوں کو موم بنا ڈالتی ہے، مٹا ڈالتی ہے، فنا کر ڈالتی ہے..... بابا بابا۔“

”میڈم! میں نے کہا تھا میں سونا چاہتا ہوں..... صبح فخر جانا ہوتا ہے مجھے۔“ وہ جو بغور اس کے چہرے کے بدلنے رنگ دیکھ رہا تھا، قدرے جھک کر کویا ہوا۔ اس کے چہرے سے اس کی گرم سانسیں لکرائیں اور ایک لطیف سی سرشاری اس کے وجود کو گدگدائی۔

اس نے مخمور لگے ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک جھکا ہوا تھا۔ اس کی دلکش آنکھیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

مسکراتی، جھلملاتی فہوس خیز لگتی ہیں۔

صیا د آج خود اپنے ہی جال میں آ پھنسا تھا۔ شکاری خود شکار ہونے چلا تھا۔

اپنا پن بھی اس بے گانے پن میں ہے

پورا عالم ایک دیوانے پن میں ہے

یہ جو تم سے انجان بنا پھرنا ہوں

ساری بات اسی انجانے پن میں ہے

”کیا ارادے ہیں؟“ اس کا انداز سرکوشیا نہ تھا مگر مشعل اس کے انداز کو سمجھ نہ سکی تھی جو سو فیصد تسخراں و طعنے کا تھا۔

(اپنے دل سے پوچھو؟) وہ قصد اُسمکائی اور ادائے دلربائی سے کھڑی ہو گئی شاہ ویز بہت دلچسپی سے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔

پھر ایک دم ہی اس کا قہقہہ کمرے میں گونجا تھا۔

وہ ہنس رہا تھا۔ مشعل نے اس کی جانب دیکھا اور اس کے چہرے سے چھلکتے طعنے، تسخراں و اتنی نگاہوں نے اس کی تمام خوش فہمی و خوش گمانی ایسے غائب کر دی جیسے تلیوں کو چھونے سے ان کے رنگ غائب ہو جاتے ہیں۔ جسم برف کی سل بن گیا۔ صدمے و خفت کے احساس نے آنکھیں موندنا بھلا دیا۔

احساس تو جین و ذلت۔

احساسِ ندامت و پشیمانی۔

ایسا بھی بھلا ہونا تھا اس کے ساتھ؟ دل تو رُنا اس کا مشغلہ تھا، جذبات سے کھلیا اس کی سرشت تھی۔ آج ساری بازی الٹی ہو گئی۔

اس شخص سے شکست کھا گئی جس کو شکست دینے کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔ وہ سوچ سوچ کر پچھتا رہی تھی۔ پچھتا پچھتا کر سوچ رہی تھی۔

”میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا شاید آپ بھول گئی ہیں تو دوبارہ دہرا دیتا ہوں۔ جو آپ مجھے سمجھ رہی ہیں اور نہ ہی وہ جتنا چاہوں گا جو آپ بنانے کی سعی میں ہمہ وقت مگن رہتی ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔ انداز خاصا سادہ و معصومانہ تھا لیکن مسکراتی نگاہوں کی مضحکہ خیز چمک اس کے حواس گم کر رہی تھی۔

”بات صرف یہ ہے محترمہ! اس فلیٹ میں کمرہ یہی اکلوتا ہے اور کمرے میں یہ بیڈ، بیڈ پر بستر اور بستر پر یہ کمرل اکلوتا ہے اس لئے مجھے بستر شیئر کرنا پڑ رہا ہے۔ سردی بہت لگتی ہے مجھے، بغیر کمرل کے سو بھی نہیں سکتا۔ مجھے تو نیند بہت زبردست آرہی ہے۔ اوکے گڈ نائٹ۔“ وہ اس کا تیزی سے سرخ پڑنا چہرہ اور کھپے ہوئے ابرو دیکھ کر دلکشی سے مسکرایا اور کمرل منہ تک تان کر لیٹ گیا۔

وہ کتنی دیر تک یوں ہی بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

پہلی بار اسے محسوس ہوا وہ زمین کی تہہ در تہہ گہرائیوں میں دفن ہوتی جا رہی ہو۔ اعصاب کچے دھاکوں کی طرح ٹوٹنے لگے تھے۔ رگوں میں خون کی بجائے آگ دوڑنے لگی تھی۔

دل کی رفتار آہستہ آہستہ مہم ہوتی جا رہی تھی۔ مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔ جسم کی پتنگ کی طرح ڈولنے لگا تھا۔ آنکھوں میں اندھیرے کی یلغار بڑھنے لگی تھی۔

اس نے گھبرا کر بیٹھنا چاہا، خود کو سنبھالنا چاہا مگر بے سود..... وہ ٹوٹے شہتیر کی طرح بے جان ہو کر گر گئی تھی۔ سر بیڈ سے لکڑیا تھا۔ خون کا فوارہ سا پھوٹ گیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

□●□

حرارِ شیدہ کے ہمراہ شاپنگ کو آئی تھیں۔ شاپنگ تو معمولی کرنی تھی اس بہانے مارکیٹ میں فروخت ہونے والی اشیاء کا انہیں جائزہ لینا تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے کئی بوتیکس دیکھے تھے۔ اس سروے میں انہیں کافی معلومات ہوئی تھیں جو آگے چل کر ان کے لئے از حد معاون ثابت ہوں گی۔

وہاں سے فارغ ہو کر وہ سامان خرید نے لگیں۔

رشیدہ، حمیدہ کی بہن تھی جو حمیدہ کے مقابل بہت خاموش طبع و خوش مزاج عورت تھی۔ محنتی تھی، بلا کی پھر تیلی، حمیدہ سے بالکل متضاد طبیعت تھی اس کی۔ وہ بیوہ تھی۔ پچھلے دنوں گاؤں سے آئی تھی۔ حرا کو وہ بہت بھائی تھی۔ سو اس نے اسے بھی کام پر رکھ لیا تھا۔

اب رشیدہ اس کے ساتھ اور حمیدہ فخر کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ ان کی طرح باتونی لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے کی شوقین تھی جب کہ حرا کی طرح رشیدہ کم کو، آدم بے زار و تنہائی پسند تھی۔ اپنی انہی خوبیوں کے باعث وہ دونوں میں مانوس ہو گئی تھی۔

شاپنگ سے فارغ ہو کر اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ اسی لمحے دوسری جانب سے گرے پیٹ سوٹ میں ملبوس شخص مو بائل کان سے لگائے آگے بڑھا تھا مو بائل پر بات کرنے کے باعث اس کا چہرہ اوپر کو اٹھا تھا۔

حرا حسب عادت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اسی لمحے ان کا تصادم ہوا تھا۔ ان کا شانہ اس شخص سے لکرایا تھا۔ بے اختیار ان کے ہاتھ میں پکڑا کالج کے برتنوں کا شاپر چھوٹ گیا۔ تیز آواز کے ساتھ برتن ڈبوں میں ہی ٹوٹ گئے۔ حرا کے پیچھے آتی رشیدہ کے لبوں سے بے ساختہ ہی ہائے اللہ نکلا تھا جب کہ حرا کو لگو کی حالت میں فرش پر گرے شاپر سے ٹوٹ کر بکھرے کالج کے ٹکڑوں کو دیکھ رہی تھیں۔ آن واحد میں یہ سب ہوا تھا۔ وہ سنبھل بھی نہ پائی تھیں۔

”سوری..... آئی ایم سوسوری میم!“ اس نے پُر وقار انداز میں معذرت کی تھی۔ حرا کی سماعتوں میں برتن ٹوٹنے کی آواز سے زیادہ زبردست چھٹا کا اب ہوا تھا۔ ان کی دھڑکنیں بری طرح منتشر ہوئی تھیں۔ میکا کی انداز میں اس کی جانب دیکھا تھا۔ یہ وہی تھا جس کے خوفناک تصور سے بیس سال بعد کچھ عرصہ قبل ہی تو چھٹکارا پایا تھا خود کو محفوظ تصور کرنا شروع کیا تھا۔

بے خونی کی پہلی سیرمی پر ہی وہ مل گیا تھا۔

جو مجسم خوف و دہشت تھا۔

گرے سوٹ والے نے بھی سرسری نگاہ ان پر ڈالی تھی مگر نگاہ اٹھی تو جھٹکا بھول گئی۔ یہ وہی لمحہ تھا جب حرا نے بھی ان کی طرف دیکھا تھا۔

دونوں کی نگاہیں ملی تھیں۔

ایک میں خوف و وحشت تھی۔ دوسری میں ناقابل فہم تاثرات۔ چند لمحے وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔ اس شخص نے آگے ایک قدم بڑھایا تھا۔

حرا پیچھے ہٹی تھیں۔ ایک قدم، دو قدم، تین قدم..... پھر ارد گرد لوگوں کے ہجوم کی پرواہ کرتے ہوئے سر پٹ بھاگ لی تھیں۔

وہ شخص بھی ان کے پیچھے باہر کو لپکا تھا مگر اسی دم اندر کی جانب آنے والے لوگوں کے ہجوم میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

بھیڑ سے نکل کر باہر کی جانب گیا تو کافی تلاش کے باوجود وہ نہیں ملی تھیں۔ وہ جھیلی پر مکا مار کر رہ گیا۔

حرا ایسی بدحواس ہو کر بھاگی تھیں کہ انہوں نے کسی کی پرواہ نہیں کی تھی۔ انہیں دیکھ کر رشیدہ بھی افتاں و خیزاں ان کے پیچھے چلی آئی تھی۔ ہر ٹیکسی والے کو منہ مانگا کرایہ دے کر وہ گھر پہنچی تھیں۔

راستے بھر وہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی رہی تھیں کو یا انہیں کسی کے تعاقب کا احتمال ہو۔ ٹیکسی بھی انہوں نے گھر سے ایک اسٹریٹ پیچھے رکوائی تھی۔ اور گھر میں داخل ہو کر تیزی سے گیٹ بند کر کے تالا لگا دیا تھا۔ اندر سے بھی تمام دروازے کھڑکیاں لاک کر ڈالی تھیں۔ رشیدہ باہر سے ہی رخصت ہو گئی تھی۔ فرح گھر میں نہیں تھیں۔ ان کی موجودگی اس کے لئے تحفظ و ڈھارس کا باعث بنتی مگر اب ان کی آمد تک انہیں اسی طرح خوف و پریشانی کا شکار رہنا تھا۔

ہر طرح سے محفوظ ہونے کے باوجود وہ خود کو محفوظ تصور نہیں کر رہی تھیں۔ ابھی بھی اطمینان و سکون سے بیٹھنے کی بجائے مضطربانہ کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔

اس شخص کا چہرہ ذہن کی اسکرین پر روشن تھا۔

برسوں کی دہلی راکھ اڑنے لگی تھی۔ زخموں پر جتنے کھرندوں سے خون رسنے لگا تھا۔ ماضی کبھی خوش حال حقیقت، بھی کربناک یا دہن کر رہ جاتا ہے۔

ماضی ہماری حیات کا وہ اہم ترین حصہ ہے جو خوب صورت ہو بد صورت، خوشنما ہو پادہ نما، ہر حال میں ہماری ذات سے جڑا رہتا ہے۔ ہم اسے لاکھ فراموش کرنا چاہیں، بھولنا چاہیں، جھٹلانا چاہیں، رد کرنا چاہیں نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ماضی زور آور ہوتا ہے خواہ کیسا بھی ہو۔

حرا بھی اس وقت ماضی کے عقاب کے نوکیلے بچوں سے بچنا چاہ رہی تھیں لیکن ان سے فرار ممکن نہ تھا جلد ہی بے دم ہو کر وہ ماضی میں گم ہو گئی تھیں۔

فرخ آفندی اپنے شہر کے امراء میں شمار ہوتے تھے۔

دہلی میں ان کا مختلف کیمیکل کاربائز نس تھا۔ ان کی فیملی میں ایک بیٹا عرفان، بیٹی سارہ تھی اور ماں آفندی بیگم شامل تھیں۔ دونوں بچے شادی شدہ تھے اور زیادہ تر ملک سے باہر رہنا پسند کرتے تھے۔ ان کی بیوی کوفت ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔

وہ کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر ملک سے باہر رہتے تھے۔ بہت پُرسکون زندگی گزر رہی تھی۔ بیوی کے مرنے کے کچھ عرصے بعد تک وہ ان کی کمی محسوس کرتے رہے تھے مگر گزرتا وقت جانے والوں کو بھلا ہی دیتا ہے۔ وہ بھی تقریباً انہیں بھلا چکے تھے۔

ان کی پُرسکون زندگی میں تھکنی بھری ہلچل اس وقت پیدا ہوئی جب امی حضور بستر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ شوگر اور دل کی بیماری نے ان کو بستر پر ڈال دیا۔ ایسے میں نوکروں کے مزے آگئے۔ وہ اپنی مرضی کے مالک بن بیٹھے۔

پورے گھر کا نظام گڈ کر رہ گیا۔ وقت پر انہیں کوئی چیز تیار ملتی تھی نہ امی حضور کو دوغند امل رہی تھی۔ غصے میں انہوں نے تمام ملازمین بدل ڈالے۔

نتیجتاً بے ترتیبی کے ساتھ ساتھ مکن کے سودا سلف کے ساتھ ساتھ گھر کی اشیاء بھی چوری ہونے لگیں اور نظام میں کوئی بہتری نہ آئی۔

کئی دفعہ ملازم بدلنے کے باوجود حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے تو انہوں نے گھبرا کر بیٹے بہو کو کہا کہ وہ امی حضور کی صحت یابی تک یہاں رہیں مگر عرفان بیوی کی وجہ سے آنے پر راضی نہ ہوئے۔ پھر انہوں نے بیٹی سارہ سے کہا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آ کر رہ لے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے بھی صاف کہہ دیا وہ اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتیں۔ سگی اولاد کی بے رخی و بے حسی نے انہیں بھی بیمار کر ڈالا تھا۔ ایسے میں ان کی ملاقات ایک پارٹی میں حرا کے ماموں سے ہوئی جو اپنی جواں سال بھانجی کی شادی کے لئے کسی ابھیرے رشتے کی تلاش میں تھے اور اس وقت ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ شادی کر لیں۔ اولادوں نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ وہ اپنی سرتوں میں اتنے مگن ہیں کہ انہیں باپ اور دادی کی پریشانیوں و مشکلات کا کوئی احساس ہی نہیں ہے اور وہ گھر اور کاروبار ساتھ نہیں چلا سکتے۔ ایک خیال کا کوندہ سالہ کا تھا اور دوسرے دن ہی وہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اشفاق صاحب کے ہاں جا پہنچے۔

اشفاق صاحب کا چھوٹا سا مکان ان کی سفید پوشی کا نشانہ تھا جسے دیکھ کر ان کے حوصلے اور زیادہ بلند و مضبوط ہوئے۔ اور وہ یقین کر چکے تھے کہ یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔ اور ان کے یقین کو ٹھیس نہیں لگی تھی۔ دولت ایسی شبہ زور ہے جو اپنے مالک کی ہر برائی و بد صورتی کو چھپا دیتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ان کی دولت نے ان کی بڑھتی ہوئی عمر، دوسری شادی، جوان شادی شدہ بچوں کی موجودگی جیسے ہر قابل اعتراض عیب کو چھپالیا تھا۔ وہ بخوبی جانتے تھے ان حالات اور اس عمر میں ان کا ساتھ صرف متوسط گھرانے کی لڑکی بھاسکتی ہے۔ کیونکہ ایسی لڑکیوں کی فطرت میں ہی صبر و برداشت و خدمت گزاری شامل ہوتی ہے اور ان کے طبقے میں سارہ جیسی بد لحاظ، بد احساس بیٹی اور عرفان جیسے غلط و ناجار بیٹے ہوتے ہیں جو مشکلات پڑنے پر ٹھیکنگا دکھا کر بھاگ جاتے ہیں۔

شادی بہت سادگی سے ہوئی تھی۔

حرا ان کے لئے ویسی ہی ثابت ہوئی تھیں جیسا انہوں نے چاہا تھا۔ وہ نہ صرف خوبصورت تھی بلکہ خوب سیرت بھی تھیں۔ چند دنوں میں ہی اس نے گھر کو گھر بنا ڈالا تھا۔ ملازم بھی ٹھیک کام کر رہے تھے۔ امی حضور کو بھی دو آئیں اور غنڈا وقت پر ملنے لگی تو وہ بھی تندرست ہو رہی تھیں۔

”سنا تھا عورت ہی گھر کو جنم دیتی ہے اور عورت ہی جنت۔ اب یقین ہو گیا کہ بالکل درست بات ہے جب سے میری زندگی میں آئی ہو خود کو جنت میں محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ اس کے ہاتھ سے مگ لیتے ہوئے محبت پاش نگاہوں سے اس کو دیکھتے ہوئے کوپا ہوئے۔

”چینی تولیں۔“ حرا ان کی نظروں سے شرما کر شوگر پاٹ میں سے چینی پیچھے میں سے بھر کر ان کے مگ کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

”تم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے..... چینی کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ شرارت سے بولے۔

”پلیز جلدی سے چئیں..... امی حضور کی دوا کا نام ہو گیا ہے۔“

”کبھی مجھ غریب کے لئے بھی نام نکال لیا کرو۔“ ان کے شانستہ لہجے میں دھیمی سی شوخی تھی۔ حرا مسکرا کر رہ گئیں۔

”حرا! ایک بات بتاؤ مگر بالکل سچ سچ..... ذرا جھوٹ مت بولنا۔“ وہ کچھ دیر تو قف کے بعد چائے کا مگ ٹیبل پر رکھ کر سنجیدگی سے کوپا ہوئے۔

”مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے۔“ حرا کو ان کا انداز غیر معمولی محسوس ہوا۔

”کیا تم مجھ سے شادی کر کے خوش ہو؟“ پہلے دن سے اپنے دل میں مچلتے سوال کو وہ زیادہ عرصہ رد نہ کر سکے بالآخر فراغت و تنہائی کے ان لحظات میں پوچھ بیٹھے۔

”دراصل تم کو شادی سے پہلے دیکھا نہ تھا۔ جب میں نے اشفاق صاحب سے تمہارے متعلق سنا تو میں یہی سمجھا تھا کہ ان کی بھانجی کچی عمر کی، معمولی شکل و صورت کی، عام سی لڑکی ہوگی۔ عموماً سناپ کی لڑکیوں کے رشتے صحیح عمر میں نہیں ہو پاتے۔ عمر نکل جانے کے بعد ہر قسم کے رشتے کو قبول کر کے اپنا فرض ادا کر دیا جاتا ہے۔ مگر شادی کی رات تمہیں دیکھا، مجھے یقین نہیں آیا کہ قسمت مجھ پر اس طرح بھی مہربان ہو سکتی ہے۔ تم نہ صرف بے حد حسین اور کم عمر ہو بلکہ مکمل لڑکی ہو۔ دوسری شادی ایک جواہوتی ہے، جس میں آپ ہار بھی سکتے ہیں اور جیت بھی۔ میں سو فیصد کامیاب رہا ہوں..... میں بہت خوش ہوں، از حد نازاں ہوں اپنے نصیب پر..... مگر پھر سوچتا ہوں تم میرے ساتھ خوش ہو یا نہیں؟“ ان کی بات کی لمبی چوڑی تمہید ان کے اندر پلٹے اپنی عمر کے کمپلیکس کی غماز تھی۔

”یہ آپ نے کس طرح سوچا کہ میں آپ کے ساتھ خوش نہیں ہوں؟“ وہ از حد سنجیدہ تھی۔

”میں بزنس مین ہوں۔ اس فیلڈ میں زندگی گزر گئی۔ اب ہر بات خواہ وہ بزنس کے حوالے سے ہو، گھر سے تعلق رکھتی ہو یا بچوں سے، ہر تعلق معاملے میں نفع و نقصان پر کھنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ تمہارے بارے میں سوچتا ہوں تو خود کو منافع بخش پاتا ہوں۔ مالا مال محسوس کرتا ہوں مگر جب تمہارے پوائنٹ آف ویو سے دیکھتا ہوں تو سراسر لوں نظر آتا ہے۔ خود کو ایک طرف رکھ کر حق بجانب بات کروں تو تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ تمہیں اپنی عمر سے دگنی عمر کا شوہر ملا۔ میرے دونوں بچے تم سے عمر میں کئی سال بڑے ہیں پھر.....“

”آپ کی سوچ بالکل غلط ہے۔“ وہ ان کی بات قطع کر کے کوپا ہوئی۔ ”میں بہت خوش و مطمئن ہوں..... عمروں کا تضاد کم از کم مجھ جیسی لڑکی کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا، نہ ہی میں ناخوش ہوں، نہ اپنے نصیب سے شکوہ کناں ہوں۔ دراصل خرم صاحب! عورت مرد سے تحفظ چاہتی ہے، عزت و وقیر حاصل کرنا اس کی چاہ ہوتی ہے، چاہت و الفت پانا اس کی خواہش۔ ضروریات زندگی کے حاصل کے لئے بھرپور تعاون کی بھی طلب گار ہوتی ہے۔ جو خاوند اسے یہ سب دے سکتا ہے، وہی اس کا آئیڈل ہوتا

ہے اور آپ میں یہ سب موجود ہے۔ میں آپ کے ساتھ بے حد خوش ہوں، آپ کی رفاقت کو زیادہ دن نہیں گزرے ہیں پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے ہمارا تعلق صدیوں پرانا ہے۔“ اس کے شرمائے لجائے لہجے میں یقین و صداقت کی خوشبو تھی۔ خرم جو بنو راس کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے، لہجے کو کھونچ رہے تھے، آنکھوں کو پڑھ رہے تھے، کیونکہ زبان جھوٹ بول سکتی ہے پر آنکھیں نہیں۔ لہجہ مصلحت کا لبادہ اوڑھ سکتا ہے، آنکھیں صرف سچ بولتی ہیں۔ لیکن یہاں سب پر صداقت کی روشنی جگمگا رہی تھی۔ ان کے دل سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ وہ طمانیت سے مسکرائے تھے۔



”آنکھیں کھول دیجئے محترمہ! اور کتنا پریشان کریں گی؟“ شاہ وزیر: جو کل رات سے خوار ہو رہا تھا، دن میں دس بجے کے بعد اسے آنکھیں کھول کر دوبارہ تیزی سے بند کرتے دیکھ کر چڑچڑائے انداز میں کویا ہوا۔

”میں..... کہاں ہوں؟“ وہ آنکھیں کھول کر فضاہت سے بولی۔

”مائی گاڈ! اب یہ مت پوچھ لینا کہ ”میں کون ہوں۔“ چوٹ تمہارے ماتھے پر لگی ہے، دماغ پر نہیں جو یادداشت گم ہونے کا بہانہ کرو گی۔ بلکہ دماغ نامی شے سے تمہاری کھوپڑی خالی ہی ہے۔ ایسی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔“ وہ نوز بگڑے موڈ میں طنز پر طنز کر رہا تھا۔

”میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“

”سمجھ دار بھی تم کبھی نہیں رہیں۔“

”میں کیا کروں؟“ وہ زچ ہو گئی بری طرح۔

”یہ بار بار بے ہوش ہونے کا نالک بند کرو۔ تمہیں ہاتھوں میں اٹھائے گھومتا ہوں تو ایسی ندامت محسوس ہوتی ہے کہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کو دل کرتا ہے بلکہ ایسے محسوس ہوتا ہے کویا اپنے بد اعمالوں کی گتھڑی اٹھا رکھی ہے۔“ وہ اس کے سر ہانے سے اٹھتا ہوا نا کواریت سے بڑبڑا رہا تھا۔

رات کو وہ آنکھوں پر بازور کھجھریوں سے مشعل کی تمام کیفیت نوٹ کر رہا تھا۔ اس متغیر چہرے اور وحشت برساتی آنکھوں نے لمحے بھر کو اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ عورت کی تذلیل کرنے و نیچا دکھانے کی تربیت اسے نہ ملی تھی مگر فوراً ہی اس نے اپنے جذبات کو دھنکا رکھا کہ مشعل ذرا بھی نرمی و التفات کے قابل نہیں ہے۔ اس نے معمولی سی بھی نرمی دکھائی تو وہ حاوی ہو جائے گی اور وہ یہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس جیسی لڑکی اس پر حاوی ہو۔ یہ سوچ کر اس نے کروٹ لی ہی تھی کہ ہلکے سے دھماکے کے ساتھ مشعل کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ وہ گھبرا کر سیدھا ہوا تھا۔

مشعل کا رپٹ پر اونٹنی پڑی تھی اور اس کے سر سے خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ خون دیکھ کر وہ بدحواس سا آگے بڑھا تھا۔ اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹا کر خون بند کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر خون بند نہیں ہوا تو وہ اسے اٹھا کر کار میں ڈال کر قریبی ہسپتال میں لے آیا۔ وہاں ڈریننگ کرویائی اور ڈاکٹر کے کہنے پر ڈرپ بھی لگوانی پڑی تھی۔

ڈرپ دو گھنٹے میں ختم ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے ہوش چند گھنٹے بعد آئے گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ مشعل کو ہوش ہسپتال میں آئے اور وہ وہاں کوئی نیا ڈامہ کرے۔ سو وہ دوائیں وغیرہ لے کر اسے فلیٹ میں لے آیا تھا۔

تب سے اب تک وہ جاگ رہا تھا۔ بے چینی و بے خوابی نے اسے جڑجڑا دیا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود وہ اس سے الجھ رہا تھا۔

مشعل خاموش ہو گئی۔ اس سے لڑنے جھگڑنے کی اس میں طاقت نہیں تھی۔ سر کے ساتھ جسم کا ہر عضو درد کرنا محسوس ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں کویا جان نہ رہی تھی۔ معدہ اندر کی جانب کویا دھنستا جا رہا تھا۔ زبان اکڑ کر رہ گئی تھی۔ اسے یاد آیا کل سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ گھر سے وہ بھوک پیاسی نکل گئی تھی۔ پچھو کے ہاں بھی دوپہر میں دلیہ اور سوپ برائے نام کھایا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک بھوک تھی اور بھوک نے ہی اس کے جسم و جان میں فضاہت پیدا کر دی تھی۔

”جانتا ہوں میں کہ آپ میری صورت دیکھنے کی روادار نہیں ہیں اور یہی خواہش کچھ میری بھی ہے۔ لیکن ہمارے ساتھ یہی ٹریڈی ہے کہ جنہیں ہم دیکھنا نہیں چاہتے، انہیں بار بار دیکھنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح یعنی میری طرح صابر بن کر مجھے برداشت کیجئے۔ میرا مطلب ہے آنکھیں کھول لے۔“

کچھ دیر بعد وہ ایک ٹرے میں بسکٹ کی پلیٹ اور گلاس میں دودھ لئے حاضر تھا۔

”اب یہ مت کہنا مجھے بھوک نہیں ہے کیونکہ مجھے خواتین کے مازخ سے اٹھانے کی کوئی پریکٹس نہیں ہے اور نہ ہی ارادہ۔“ اس نے ٹرے اس کے قریب رکھ دی۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ اس کے مزید طنز کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

”پھر کس کا انتظار ہے..... شروع ہو جاؤ۔“ وہ کہہ کر کمرے سے چلا گیا۔ شاید اس کے آرام سے بے تکلف کھانے کے خیال سے۔ مشعل نے اٹھنے کی کوشش کی مگر سرینچے سے اٹھاتے ہی اتنی شدید تکلیف ہوئی تھی کہ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ دوبارہ لیٹ گئی تھی۔

بھوک شدید لگ رہی تھی۔ ناشتہ قریب ہی رکھا تھا لیکن بے بسی کیسی تھی کہ وہ قریب رکھی ٹرے سے جھک کر کھانہ نہیں سکتی تھی۔ ایک بار نہیں کئی بار مگر ہر بار نا کامی سے سانبھ پڑا۔ شاید بے بسی کی انتہا یہی تھی اور اس کے ضبط کی بھی۔ دل نا آشنا جذبات سے ہمکنار ہوا تھا۔ آنسو بے بسی کا اظہار بن کر آنکھوں سے بہنے لگے۔ اس نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ آنسو اس کی شکست کا اعتراف تھے۔ بے بسی کا تماشا تھے۔ اس کی اکڑ، ہٹ دھرمی، ضد اور برتری کا فخر، جس دولت کا غرور سب ان آنسوؤں میں بہہ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ہونٹ بھیچنے لگے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد شاہ وزیر: اندر داخل ہوا تھا۔ وہائٹ شلوار سوٹ میں ملبوس فریش، نازہ شیو کی نیلا ہٹ اس کے چہرے کی وجاہت کو بڑھا رہی تھی۔ وہ نہا کرناشتے سے فارغ ہو کر چائے کا کپ ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا تھا۔ سامنے کا منظر اس کے خلاف توقع تھا۔ وہ ٹھٹھک گیا۔

بیڈ پر رکھی ٹرے میں ناشتہ جوں کا توں تھا۔ برابر میں لیٹی مشعل کے چہرے پر بستے آنسوؤں نے لمحے بھر کو اسے ہراساں کر ڈالا تھا۔ اسے صورت حال سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ ایک مجروح مسکراہٹ اس کے سرخی مائل ہونٹوں پر رقٹاں ہو کر غائب ہو گئی۔ بھوک زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس کی بے رحمی و سفاکی سے وہ بھی کئی بار نبرد آزما ہوا تھا۔ پھر بھلا وہ آسانشوں میں پروان چڑھی کس طرح بھوک کی سختی برداشت کر سکتی تھی۔

”مشعل..... مشعل!“ ہمدردی تھی یا ترس، انسانیت کا تقاضا تھا یا اخلاقیات کا اصرار۔ مشعل نے آنکھیں کھولیں تو اسے خود پر جھکا پایا۔

وہ محسوس کر رہی تھی، اس کی موجودگی، گرم سانسوں کی پیش چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے ملبوس سے نکلتی مخصوص مہک اس کے بھوک، بھوک پکارتے وجود کو مزید مٹا ہال کر رہی تھی۔

”مشعل..... مشعل!“ اٹھو ہمت کرو، اٹھو، ہری اپ!“ اس کا انداز بالکل بچوں کو بہلانے والا تھا۔

غصہ، تنیدی، جھنجھلاہٹ، طنز و بے زاری لہجے سے بالکل منقوڈ تھی۔ اس کے تھکے تھکے، دگداز ہال، پڑمردہ اعصاب پر وہ شیریں لہجہ، دگداز انداز گلاب برسانے لگا۔ سکون و سرور کی نئی کیفیت سے وہ اس لمحے آشنا ہوئی تھی۔

خوب صورت آواز ایک جادو ہے۔

تن کو سرور، من کو سکون بخشنے والا سحر۔

وہ کتنی نرمی و اپنائیت سے پکار رہا تھا اور اسے اچھا لگ رہا تھا اس کا یوں اپنائیت و غلوص سے پکارنا۔

اس نے آنکھیں سختی سے بند کر لیں مگر بستے آنسوؤں پر بند نہ باندھ سکی۔ یکدم ہی خواہش ابھری تھی کہ کاش وہ اسے اسی طرح پکارتا رہے اور حیات کی جاں گسل گھڑیاں تمام ہو جائیں۔

”پلیز مجھ پر ترس کھاؤ..... کیا مجھ کو آنسوؤں میں ڈبو کر مارنے کا ارادہ ہے؟“ نرم نرم گرتی پھوار یکدم ہی کنکریوں میں تبدیل ہوئی۔

گلابوں میں یکدم ہی کانٹے نکل آئے۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر کچھ ہیں ڈالنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ بھی اس وقت کسی نیکی کے موڈ میں تھا۔ بغیر کچھ بتائے، کچھ کہے، بنا خاموشی سے بسکٹ دودھ میں ڈبو کر کھلانے لگا۔ وہ کسی سعادت مند بچی کی طرح فرمانبرداری سے کھا رہی تھی۔



وہ دور بھی کتنا اچھا دور تھا

جب جگنوؤں کو پکڑا کرتے تھے

جب نادانی میں ہوا کوٹھی میں جکڑا کرتے تھے

جب پھولوں کو اکٹھا کرتے تھے

پھر دوستوں کی نظر کرتے تھے

جب مٹی کے گھروندے بناتے تھے

تب خوشی دیدنی ہوتی تھی جب وہ

ایک ٹھوکرے سے ڈھے جاتے تھے

جب چاندنی راتوں میں کھیلا کرتے تھے

جب کوئی نہ ڈھونڈ پاتا تو پھر کیسے

ہنس کر بے حال ہو جاتے تھے

اک وہ دور تھا اک یہ دور ہے



اب ہم کو کہیں بھی جگہ نظر نہیں آتے

نہ ہوا کو ہم ہاتھوں میں جکڑ پاتے ہیں

دوست تو ملتے ہیں اب بھی لیکن پھول نہیں ملتے

اب مٹی کے گھروندے بنانے سے بہت ڈر لگتا ہے

جب کوئی گھروندہ لٹوٹ جائے تو دل کو کچھ ہونے لگتا ہے

اب چاندنی رات تو ہوتی ہے

پر اب ہم کھیل نہیں پاتے

نہ ہمیں کوئی ڈھونڈ سکتا ہے

نہ ہم کسی کوں میں ڈھونڈ پاتے

رات سرد تھی۔ فضاؤں میں عجیب سوز پھیلا ہوا تھا۔

سارہ نے ماں کو ہنر تہہ کا کپ پکڑ لیا اور خود وضو کر کے حسب عادت قرآن پاک کی تلاوت کرنے بیٹھ گئی اور فارغ ہوئی تو زرینہ کو بے خبر سوتا ہوا پایا۔ وہ چند لمحے کھڑی ماں کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

گہری نیند سونے کے باوجود ان کے گندمی رنگت والے چہرے پر بے سکونی و اداسی زردی بن کر بھلک رہی تھی۔

اصغر کو اپنے گزشتہ رویوں پر ہچکچتا ہوا تھا۔ وہ ان سے معافی مانگ کر گیا تھا۔ زرینہ کو ساتھ ہسپتال چلنے کو بھی کہا مگر وہ اتنی جلدی بہو کو معاف کر دینے والی نہ تھیں۔ اصغر کے جانے کے بعد خوب روئی تھیں۔ بیٹے سے بدگمانی مٹ گئی تھی

بہو سے اختلاف یا شکایات موجود تھیں لیکن دل کے کسی کونے میں بیٹے کی اولاد کے لئے جو محبت و ممتا کا پھول کھلا تھا، اس کے مرجھانے پر دل کے چمن میں ایسی آگ لگی تھی جو صرف آنسوؤں سے ہی بجھ سکتی تھی۔ سو انہوں نے آنسو روکنے کی کوشش نہ کی، سارہ نے بھی انہیں نہ ٹوکا۔ وہ خود چاہتی تھی کسی طرح وہ اپنا آپ ہلکا کر لیں۔

ماں آنسوؤں سے نبرد آزما ہو کر سو گئی تھی۔ لیکن اس کے نصیب میں نیند نہیں تھی۔ بے چینی، ہنظر اب و ہنظر اس کی ذات کا حصہ بن گئے تھے۔ چند لمحے ماں کو دیکھنے کے بعد وہ ہاں سے ہٹ کر باہر چمن میں بچھے تخت پر آکر بیٹھ گئی۔

گلوں میں لگے پودوں سے رات کی رانی کی خوشبو سفید پھولوں سے پھوٹ رہی تھی۔ جس سے درود یو ار مہک اٹھے تھے۔ آسمان پر چاند کی کلرانی تھی۔

ہر سو چاندنی کی فسون خیزی بکھری ہوئی تھی۔

لائسنس سب آف تھیں ماسوائے زرینہ کے کمرے میں جلتے ٹائٹ بلب کے جس کی مدھم روشنی کمرے تک ہی محدود تھی۔ چمن چاندنی میں بھیگا سحر انگیز لگ رہا تھا۔ رات، تنہائی، خاموشی و پراسرار چاندنی میں سرد فضا..... وہ کبھی اس ماحول میں تنہا نہیں رہ سکتی تھی لیکن وقت کے بدلتے تیور ہر شے کو بدل دیا کرتے ہیں۔ وہ بھی بدل گئی تھی، ایسے لمحوں سے اسے گھبراہٹ ہو کر تھی۔ پر اب یہ تنہائی، اداسی و خاموشی اسے سکون پہنچا کر تھی۔

”ہم لڑکیوں کی فطرت میں مانوسیت و قبولیت کا عنصر کتنی وافر مقدار میں قدرت نے ڈالا ہے۔“ اس نے تخت پر نیم دراز ہوتے ہوئے سوچا۔

”شادی سے قبل ماں، باپ، بہنوں، بھائیوں کے درمیان جب زندگی گزرتی ہے تو محبت و اپنائیت اس قدر قوی ہوتی ہے کہ ساتھ چھوڑنے کا تصور ہی سوہاں روح لگتا ہے۔ پھر دستور کے مطابق بنیاں سسرالوں میں جا رہتی ہیں تو پھر وہی مرحلہ گزرتا ہے جلد یا بدیر، وہ اپنے اس گھر سے بھی مانوس ہو جاتی ہیں جو ان کا ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا۔“

ایک سرد چھونکا آیا اور وہ کپکپا اٹھی۔ مگر اندر جانے کو دل نہ چاہا۔

تین ماہ گزر گئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے اور اس عرصے میں کئی بار چاہا وہ گھر لوٹ جائے، نہ معلوم وہ گھر اس کا تھا یا نہیں، اپنی حیثیت و عزت کا تعین وہ ابھی تک نہ کر سکی تھی۔

وہ بھرے پرے کنبے میں گئی تھی جہاں چار مندریں، دو دیوار کنوارے تھے۔ ایک جیٹھ اور دو دیوروں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ وہ سب ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ میکے کے مقابل سسرال خاصا منہ بھی گھرا نہ تھا۔ ساس، سسر نماز اور دوسرے معمولات کی کڑی نگرانی کرتے تھے۔ شادی کے ابتدائی ایام میں وہ بہت بدحواس و شرمندہ رہتی تھی کہ میکے میں مذہب کے معاملے میں ایسی سختی نہ تھی۔ باقی بہنیں اور اماں ایک وقت۔ یعنی صبح کے وقت نماز فجر سے فارغ ہو کر تلاوت کرتی تھیں اور پانچوں نمازوں کا اہتمام ہوتا تھا وہ بھی آرام و پرسکون انداز میں۔ وہ نماز پڑھنے میں تسامع سے کام لیتی تھی، کبھی پڑھی، کبھی نہیں پڑھی۔ یہی حال تلاوت کا تھا اور اس کی یہ عادت، بہنوں کے نرم رویوں کے باعث پڑی تھی جو اماں سے چھپا کر نرمی سے سرزنش کر دیا کرتی تھیں۔

شادی کے بعد ان کی نرمی اس کے لئے ندامت و شرمساری بنی۔ ساس جو ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہا کرتی تھیں بڑے فخر سے کہتیں۔ ”اپنی بچیوں کو تو ہم نے بچپن سے ہی نماز و تلاوت کی عادت ڈالی ہے۔ میری بنیاں کھانا چھوڑ سکتی ہیں مگر نماز و تلاوت قرآن نہیں۔ نامعلوم کیسی عورتیں ہوتی ہیں جو اپنی بچیوں کو مذہب سے غافل رکھتی ہیں۔“

نماز پڑھی تو مندریں شکوہ کنائیں ہوتیں۔ ”اوہو بھائی! اتنی دیر میں نماز پڑھتی ہو کہ بندہ پانچ نام کی پڑھ کر فارغ ہو جائے۔“

دوسری مندر یہ کہتی۔ ”سمجھا کرو، ابھی نئی نئی ہیں۔ کل کو ہماری طرح دھڑ دھڑا ہوا سجدے مار کر فارغ ہو جایا کریں گی۔“

”تم نہیں سمجھتی ہو! یہ لمبی لمبی نمازیں محض دکھاوا ہیں..... بلکہ بہانے ہیں کام سے جان چھڑانے کے۔“ جیٹھانی مذاق میں ہر بات کہنے کی عادی تھیں۔

”ہاں بھئی۔ ان کے مزے ہیں۔ جودل چاہے کریں، ہمیں تو اتنی آزادی نہ تھی۔“ دوسری دیو رانی سرد آہ بھر کر کہتی۔

”ہماری اماں نے تو کسی بہو پر پابندی نہ لگائی۔ سب شروع سے اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ ہماری ماں جیسی ساس تو نہ کسی کو ملی ہے اور نہ ملے گی۔ بہوؤں کو اپنی مرضی پر چلانے کی بجائے ان کی مرضی پر چلتی ہیں۔“ شادی شدہ مندر کسی جنگلی بلی کی طرح نیچے نکال کر غرائے لگتی۔ کبھی بات دب جاتی اور کبھی وہ طوفان مچا کہ دبائے نہ دیتا۔ لڑائی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ ہی خوفزدہ رہتی تھی۔ ایسے میں وہ کونوں کھدروں میں گھسی جلد سے جلد لڑائی ختم ہو جانے کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔

باقر سے ملاقات رات میں ہوتی تھی وہ کبھی خوشگوار موڈ میں ہوا تو چند غیر ضروری باتیں کرتا پھر سونے کے بعد صبح ناشتہ کر کے کام پر چلا جاتا۔ بس یہ چند گھنٹوں کا ساتھ ہوتا تھا جس میں وہ باقر کو سمجھ نہ سکی۔

گھر کے عجیب گھٹے گھٹے ماحول نے اس پر منفی اثر ڈالا تھا۔ ساس بظاہر خاموش رہا کرتی تھیں مگر ان کی نگاہوں کی کاٹ اسے بوکھلا کر رکھ دیا کرتی تھی۔

مندروں کے مزاج شاہی تھے۔ دل چاہتا تو بات کی ورنہ منہ پھلا کر رکھنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا۔ اگر دل چاہتا تو بھابیوں کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹا دیا جاتا ورنہ بچے روکیں، بیماری ہو یا کوئی تکلیف وہ اپنا کام خود کیا کرتیں۔ ایسے میں ہر وقت تسبیح گھماتی ساس کی آنکھیں اور کان بند ہو جایا کرتے تھے۔ جب دونوں شادی شدہ مندریں آتیں تو گھر میدان جنگ بن جایا کرتا تھا۔ کیونکہ ایک تو ان کو بیٹھ کر کھانے کی عادت تھی پھر ہر کام میں عیب جوئی اور فضول طعنے ماحول کو بارود میں بدل دیا کرتے تھے۔

سارہ اول روز سے ہی اس احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھی کہ اس کی تربیت مذہبی انداز میں نہیں ہوئی۔ اس احساس نے اور گھر والوں کے منفی رویوں نے اس کی ذات سے اعتماد و افتخار کے احساسات کو بھی کھرچ ڈالا تھا۔ وہ سب کے لئے سوچتی تھی۔ سب کی فکر رہتی تھی۔ ایک خوف اس کے حواسوں پر کسی آسیب کی طرح چٹ گیا تھا کہ کوئی یہ نہ کہے سارہ مذہب سے نا بلند لڑکی ہے، اس کے سر سے کبھی دو پند نہ ڈھلک جائے، فجر میں آنکھ اذان سے پہلے کھل جائے، ہر کام وقت پر تیار ہو جائے، کسی کو اس سے کوئی شکایت نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ اسی جنون میں وہ خود کو فراموش کر بیٹھی۔ اپنی مرضی، اپنی خوشی، اپنی اہمیت، اپنا وقار و مرتبہ سب تھج ڈالا تھا۔

خصوصاً شادی شدہ مندوں کی زبان کے خوف سے از حد آیا گیری کرتی تھی۔ ایک سال میں گھر کے ماحول اور لوگوں کو سمجھنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہو گئی۔ باقر کی طبیعت بھی عیاں ہونے لگی تھی۔

دو سال بعد اس گھر آنے اور اس ماحول سے الجھن و گھٹن ہونے لگی تھی جہاں نمازیں اس طرح پڑھی جاتی تھیں جیسے کوئی وزنی ناکواری بوجھ سر سے اتار پھینکنے کی سعی کی جاتی ہے۔ سربجروں میں ہوتے اور دلوں میں عناد و جد او تنی تھرک رہی ہوتیں۔ دوسروں کو افہام و تفہیم کا درس دینے والوں کے دل آپس میں ہی حسد و نفص کا شکار تھے۔ قرآن روز پڑھا جاتا مگر سمجھنے و عمل کرنے کی کوشش نہ تھی۔ بڑوں کو چھوٹوں کا خیال نہ تھا، چھوٹے بڑوں کی عزت کرنے سے نا بلند تھے۔ عجب دو غلہ و بہر و پنے لوگ تھے جو نماز پڑھنے و تلاوت کرنے کا دکھاوا تو کرتے تھے مگر ان کے کسی بھی طرز عمل سے ان کے عملیات کی مہک نہ اٹھتی تھی۔ جہاں گھر کے سارے لوگ پانچوں وقت اللہ کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہوں، درس کی محفلوں میں ہر نیکی و بدی، اچھائی و برائی، اخوت و مساوات کے معنی سمجھتے ہوں تو ایسے لوگوں میں تو یگانگت و محبت، شفقت و اپنائیت کی ایسی مثالی، لٹوٹ ڈور بندھی ہو، ایسا شفاف اور مہکتا، چمکتا ماحول ہو کہ دیکھنے والے رشک کر اٹھیں اور بلا جھجک خود کو مذہب کے مطابق ڈھال لیں۔

مگر وہاں سب متضاد تھا۔ کسی کو کسی کی پروا نہ تھی۔ جو ہٹ دھرم و زبان دراز تھیں ان سے صرف مطلب کی بات کی جاتی تھی۔ وہ باقر سمیت سب کے لئے بے دام کنیر تھی۔ اس کی وہاں موجودگی کا مقصد ہی صرف کام تھا۔

ایک دفعہ اچانک ہی اس کے کانوں میں مندوں کی بات پڑ گئی تھی۔

”بڑی بھابیوں سے تو چھوٹی بھابھی اچھی ہیں۔ قائد اعظم کے اس فرمان پر دل و جان سے عمل پیرا ہیں کہ ”کام، کام اور صرف کام۔“ چھوٹی کنواری مندر ہنس کر کویا ہوئی۔ ”سب سے زیادہ خطرناک ہے وہ۔ بڑی بھابیاں صاف دل کی ہیں۔ جودل میں ہوتا ہے منہ پر کہہ کر لڑ جھگڑ لیتی ہیں۔ مگر سارہ تو پوری گھٹتی ہے۔ اور ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ جڑیں تک کاٹ ڈالتے ہیں اور محسوس نہیں ہوتا۔“ یہ وہ مندر صا حبہ تھیں جو سب سے زیادہ خدشہ کیرواتی تھیں اور بھابیوں کی رتی بھر عزت کرنے کی قائل نہ تھیں۔ اس کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ وہ دیوار تھام کر رہ گئی۔

”وہ کیا جڑیں کاٹے گی بانجھ، پہلے اپنی جڑیں تو تلاش کرے۔“ ساس کی کھلکھلاتی آواز پر مشترکہ تہقید ابھر اٹھا۔

وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ آنسوؤں کا سیلاب اند پڑا تھا۔ وہ کمرے میں جا کر خوب روئی تھی۔

بے لوث خدمت و پُر خلوص اپنائیت کا کتنا شاندار انعام ملا تھا۔

یادیں اتنی تلخ و تند تھیں کہ آنسو ابھی بھی بے ساختہ اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اپنی حراماں نصیبی کا دکھ تھا ہوتے ہی در آتا تھا۔ گھر کا ماحول، لوگوں کے رویے، ہنوز برقرار تھے۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو بدظن ہو کر ان کی طرح ہی منافقت و دروغ کوئی کا لبادہ اوڑھ لیتی لیکن جو خلوص، وفا و مروت کے خمیر سے وجود پاتے ہیں وہ ایسے غلیظ لبادے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتے، اس نے بھی یہی کیا۔

جب برے لوگ اپنی برائی نہیں چھوڑتے تو اچھے لوگ اپنی اچھائی کیوں چھوڑیں؟ یہی اس کی سوچ تھی۔

آہستہ آہستہ کئی سالوں کی رفاقت میں گھر والوں کے علاوہ باقر کا مزاج و عادات بھی وہ بخوبی جان چکی تھی۔ باقر ایک بے حس و خود غرض شخص اور شوہر تھا۔ اسے اس کی ذرا بھی فکر و پرواہ نہ تھی۔ اس کی ہر ذمہ داری سے آزاد تھا۔ بلکہ ذرا بھی اسے کاروبار میں پریشانی ہوتی یا نقصان ہوتا تو بہت سہولت سے وہ اسے میسرے روانہ کر دیا کرتا تھا۔ اس بے جہتی و بے ضمیر کی کارستہ بھی اس کو ماں اور بہنوں نے دکھایا تھا۔ ایک دفعہ یہ سلسلہ نکلا تو نکلتا چلا گیا۔ شروع شروع میں اماں اور بھائی نے بغیر کسی جھنجھلاہٹ و کھسیاہٹ کے منہ مانگی رقم مہیا کی لیکن بار بار کس کے پاس اتنا فالتو پیسہ ہوتا ہے دینے کے لئے پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ بھائی نے اس کی آمد پر کسی گرجوٹی اور محبت کا اظہار نہیں کیا۔ بہت روکھا و جان چھڑانے والا انداز ہوتا تھا۔ البتہ اماں کے رویے و محبت، شفقت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ ہر بار اسی طرح سے والہانہ استقبال کرتی تھیں اس کا اور کسی نہ کسی طرح باقر کا مطالبہ پورا کرتی تھیں۔ اس بار پہلی دفعہ ہوا تھا جو وہ اتنے ہفتے یہاں رہی تھی اور اماں رقم کا بندوبست کرنے کی بجائے تعویذوں کے چکر میں پڑ کر مزید پیسہ بردار کر رہی تھیں اور وہ خود کو زمین میں دھنستا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا وہ چلی جائے یہاں سے۔ یہ گھر جو کبھی اس کا اپنا تھا، یہاں بہت ساری خوشیاں دیکھی تھیں۔ راحتیں پائی تھیں۔

بچپن، لڑکپن، جوانی۔

زندگی کے تین سنہرے دور اسی دہلیز پر گزرے تھے۔

اب وہ اُنوسیت و وابستگی نہ رہی تھی، دل ان ہی درو دیوار کی طرف کھینچ رہا تھا، جہاں رشتے خلوص و محبت سے عاری تھے مگر وہ ان سے مانوس ہو گئی تھی، ان کی عادی ہو گئی تھی۔

”سارہ! آدھی رات کو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے تُو؟ ٹھنڈ دیکھ کس غضب کی پڑ رہی ہے؟“ زرینہ جو ٹو اٹلٹ جانے کے لئے آگئی تھیں، اسے صحن میں تخت پر بیٹھی دیکھ کر گھبرا کر اس کی طرف بڑھی تھیں مگر جواباً اس کے ہونٹوں سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ آنسوؤں کی روانی بڑھ گئی۔

”ارے..... رے..... کیا ہو میری بچی!“ وہ بولکھلا کر اس کے قریب بیٹھی تھیں۔

”اماں..... اماں! میں کب تک آپ پر بوجھ بنی رہوں گی؟ کب تک میری زندگی مھرائی رہے گی؟ مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا اماں! میری اماں، میری خودداری، سب خاک ہو گئی..... میں تنگ آ گئی ہوں اس زندگی سے۔ مجھے زہر دے دیں، مار دیں، میں جینا نہیں چاہتی۔“ وہ ان کے بازو سے ماتھا ٹیک کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”تجھے زہر ہی دینا ہوتا تو کیوں اتنے سال تیرا خیال رکھتی۔ مت رو، چل اندر چل، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

”مجھے اتنا عرصہ ہو گیا یہاں آئے ہوئے۔ باقر اپنے مطالبے پر اڑے ہوئے ہیں۔ کیا ان کے علاوہ گھر میں کسی اور کو میری کمی محسوس نہیں ہوتی؟ یاد نہیں آتی؟ میری موجودگی، غیر موجودگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی؟“

”پتھروں سے صلہ نہیں مانگتے، گلہ بھی نہیں کرتے، صبر کرو صبر۔ انصاف کرنے والا اوپر بیٹھا ہے۔ وہ سب دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے۔ کوئی عمل، کوئی حاجت، کوئی شغل اس سے مخفی نہیں ہے..... نہ ہی وہ بندوں کو ایک مقررہ حد سے زیادہ ڈھیل دینے کا روادار ہے۔ اس کی رضا میں راضی رہنا ہی اس کے پسندیدہ بندوں کا کام ہے۔“

□●□

بے جی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ٹیک کو اپنی آنکھوں سے ہٹا کر دوپٹے سے صاف کر کے دوبارہ لگا کر انہوں نے نووارد کی جانب دیکھا تھا۔

”السلام علیکم بہن جی! کیا آپ مجھے پہچان نہیں پا رہی ہیں؟“ حسن بیگ صاحب نے تبسم ریز ہونٹوں سے دوبارہ سلام کرتے ہوئے کہا تو بے جی بھی حیرانگی کی زد سے نکل آئیں اور سلام کا جواب دیتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود بھی صوفے پر بیٹھ کر بولیں۔

”مجھے ابھی تک اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہو رہا ہے۔ آپ بن بتائے چلے آئے۔ بالکل اچانک۔“

”ہوں..... میں چاہتا تو نہیں تھا لیکن پرسوں شاہ ویز سے بات ہوئی تھی اور پہلی مرتبہ میں نے انہیں از حد ڈسٹرب محسوس کیا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب میرا دور رہنا سودمند نہیں ہوگا، اس لئے میں چلا آیا۔“ وہ چند لمحے خاموش ہو کر کویا ہوئے۔ ”در اصل شاہ ویز پر دہری ذمہ داری آ پڑی ہے، بزنس کی بھی اور مشعل کی بھی۔ بزنس کو بہت جلدی انہوں نے ہینڈل کر لیا ہے کہ مخفی اور لگن سے اپنا کام کرنے والے ہیں۔ بزنس کی شکایت انہوں نے کبھی نہیں کی۔ پر مجھے محسوس ہوا میرا اس طرح منہ چھپا کر فرار ہو جانا دانشمندی نہیں ہے۔ نقصان مجھ سے ہوا ہے تاوان بھی مجھے ادا کرنا چاہئے۔ راحتیں میں نے سمیٹی ہیں، صعوتیں بھی مجھے برداشت کرنی چاہئیں۔ کیوں ایک بے قصور، بے گناہ شخص کو پھنسا کر بزدلوں کی طرح روپوش رہوں۔“

”ایسا مت سوچیں بھائی صاحب! آپ ٹیک اور پُر خلوص انسان ہیں۔ آپ کسی پر زیادتی نہیں کر سکتے۔ آزمائش سے تو سب کو ہی گزرنا پڑتا ہے۔ یہ آپ کی اچھائی و ٹیک نامی ہی کا تو انعام ہے کہ اتنے بڑے مسئلے سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس طرح نکالا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی ورنہ جن کے حالات جھڑ جائیں، سنوارے بھی نہیں سنوڑتے۔ رسوائی و بدنامی بعد از مرگ بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہ اللہ کا بہت بڑا کرم ہے، شاہ ویز کا ارادہ بھی آپ کو چند ماہ بعد بلائے کا تھا۔ کاروبار ماشاء اللہ روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ اب تمہا اس سے کیا منہلتا۔“

”جی مجھے معلوم ہے۔ بزنس کے معاملے میں معمولی سے معمولی بات سے مجھے آگاہ رکھتا ہے۔ یہ سب اس کی انتھک کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ میں خوش اور مطمئن ہوں اس سے۔ فکر مجھے مشعل کی جانب سے رہتی ہے۔ بچھتاؤں اور اندیشوں میں، میں اس کی جانب سے بتلا رہتا ہوں۔ آپ کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ بہت خوش و مطمئن تھا کہ آپ کی صحبت میں رہ کر وہ اپنی گزشتہ زندگی کی بدتمیزیاں و گستاخیاں بھول جائے گی۔ مگر میرا یہ خیال محض خیال ثابت ہوا۔ اس کی ہٹ دھرمی اور رافضہ کے طرز عمل نے مجھے ہمیشہ کے لئے آپ اور شاہ ویز بیٹے کے سامنے لگا دیں جہاں پر مجبور کر دیا ہے۔“

”ارے نہیں بھائی صاحب! یہ آپ کیسی غیریت والی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا جو آپ کو لگا ہیں جہاں پر مجبور کر دے۔“ بے جی جیسی نرم دل اور رشتوں کا مان رکھنے والی عورت کس طرح ان کی شرمندہ صورت و پشیمان لہجہ برداشت کر سکتی تھیں۔ بامروت لہجے میں کویا ہوئیں۔

”آپ چائے لیں گے یا کافی؟“

”فی الحال تو مشعل کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”مشعل کے متعلق بھی بات ہو جائے گی۔ پہلے آپ کافی پی کر آرام کریں۔ طویل سفر طے کر کے آئے ہیں۔ اتنی بے آرامی آپ کی صحت کے لئے مناسب نہیں ہوگی۔“ ان کے اصرار پر حسن بیگ کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

□●□

کتنی اچھی ہوتی ہے پُر خلوص مسکراہٹ۔

چہرے کو پُر نور کر دیتی ہے۔

دل کی کشافت دھوڑا لیتی ہے۔

محبوب کو پروان چڑھاتی ہے۔

رشتوں کو مضبوط کرتی ہے، چاہت کو کشادگی بخشتی ہے۔

سنگدل و بے حس انسان مسکراتا ہے تو کچھ زیادہ ہی جاذب نظر آتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس وقت شاہ ویز کسی سے موبائل پر باتیں کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں روشن روشن تھیں۔ سیاہ گھنی مونچھوں تلے سرخی مائل ہونٹوں پر جاندار مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے یک ٹک دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کوئی مرد بھی مسکراتا ہوا اتنا دلآویز و وجہ لگ سکتا ہے؟ اس نے ہمیشہ عورتوں کی مسکراہٹ کی تعریف و توصیف سنی تھی۔ وہ سمجھتی تھی صرف عورتوں کا حسن ہی تباہ کن ہو سکتا ہے۔

قلو پطرحہ کے حسن کے قصیدے اس نے پڑھے تھے۔

مونا لیزا کی محور کن مسکراہٹ کی وہ بھی شیدائی تھی۔ کئی پورٹریٹ مونا لیزا کے اس نے پاپا سے کہہ کر اپنے بیڈروم میں لگوائے تھے۔ وہ حسین تھی اور حسن ہی اسے اٹریکٹ کرنا تھا۔

اس وقت بھی وہ بے خودی کے سے انداز میں شاہ ویز کو دیکھ رہی تھی۔

”بے جی! پلیز بتائیں! کیا سر پر اتز ہے میرے لئے؟“ وہ کچھ لاڈ بھرے لہجے میں بولا تو آواز مشعل کے کانوں تک بھی آئی۔

”وہیں آکر معلوم ہوگا..... اوکے، پھر میں آ رہا ہوں۔ ہاں، ہاں..... کھانا آپ کے ساتھ ہی کھاؤں گا، یہ ممکن نہیں ہے بے جی، پلیز، میں آپ سے گستاخی نہیں کر رہا۔ میں نے آپ سے وعدہ لیا تھا کہ دشمن پارٹی سے آپ کا بالکل بھی رابطہ نہیں ہوگا اور آپ معاہدے کی خلاف ورزی کرنا چاہ رہی ہیں۔ اوکے، اگر آپ اپنے اصول توڑیں گی تو میں بھی پابند نہیں ہوں گا۔“ بیکھت اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ مشعل حیران تھی۔ وہ کون سے کوڈورڈز میں بات کر رہا تھا جو لفظوں سے شناسائی کے باوجود معنی سے بے جا تھی۔

”میں ضد نہیں کر رہا بے جی۔“ دوسری طرف سے کسی ایسی خواہش کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ آپ کا اس طرح بے تاب ہونا، میرے نزدیک آپ کی بے وقعتی ہے جو مجھے کسی طور منظور نہیں۔“ وہ نا فہم گفتگو کر رہا تھا۔ مشعل کو الجھن ہونے لگی۔ وہ شانے اچکا کر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو وہ گہرے کوٹ سوٹ میں ملبوس آئینے کے سامنے کھڑا بال بنارہا تھا۔ اس کے انداز میں خاصی پھرتی تھی کوپا اڈ کر کہیں پہنچنے کا ارادہ ہو۔ بال بنا کر پھرتی سے اسپرے کیا، جرائیں اور شو ز بھی قابلِ داد پھرتی سے پہنے گئے۔ جھک کر ٹیبل سے رسٹ واچ، ہینڈ کرچیف، موبائل اور والٹ اور سن گلاسز اٹھائے تو اس کا دل خوف سے دھڑکا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ وہ بے ساختہ کوپا ہوئی تھی۔

”بے جی کے پاس۔“ رسٹ واچ کلائی پر باندھنے کے بعد دوسرا سامان کوٹ کی جیبوں میں منتقل کرنا ہوا، مصروف انداز میں بولا۔

”مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر؟“

”ہم نے کبھی ساتھ ساتھ رہنے کی قسمیں تو نہ کھائی تھیں شاید۔“

”کبھی کوئی بات بغیر منظر کے بھی کر لیا کریں آپ، تو مہربانی ہوگی۔“ وہ زیادہ دیر عاجزی کا مظاہرہ نہ کر سکی۔“

”آپ.....؟ ماشاء اللہ بھئی، آپ صرف ایک دن میں ہی اتنی باتیں ہو گئیں، گنڈ..... ویری گنڈ۔“ وہ اس کی جانب دیکھتا ہوا طنز یہ لہجے میں دوبارہ کوپا ہوا۔

”میری مجبوری سے لطف اندوز ہو رہا ہے کمینہ کہیں کا۔“ وہ اندر اندر کوپا ہوئی۔

”میں تمہیں اس گھر میں نہیں لے کر جاؤں گا جس گھر کو تم اپنی مرضی سے چوروں کی طرح چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔“ وہ تندہی سے کوپا ہوا۔

”میں یہاں قیدیوں کی طرح بند نہیں رہ سکتی۔“

”میں تمہیں بند کر کے نہیں جا رہا، ہر سے دروازہ لاکڈ نہیں ہوگا۔ تمہیں آزادی ہے گھومنے پھرنے کی۔ کیونکہ مجھے امید ہے اس دن جیسی غلطی بھاگنے کی پھر نہ دہراؤ گی۔“ اس نے لفظ بھاگنے پر ایسا زور دیا کہ وہ جو اس کی طرف دیکھ کر بات کر رہی تھی، ہندامت سے نظریں جھکا نے پر مجبور ہو گئی۔

”مجھے واپسی میں رات ہو جائے گی۔ لیکن میں فریج کے اندر سب موجود ہے۔ جودل چاہے پکانا اور کھانا۔“

”پکانا؟ مجھے تو پکانا نہیں آتا۔“

”پکانا نہیں آتا؟ اوہ، میں بھول گیا، آپ ایک بہت بڑے انڈسٹریالسٹ کی اکلوتی بیٹی ہیں جن کے صرف کچن میں کام کرنے کے لئے ہی ایک درجن خانا ماں ہوتے ہیں۔ اپنی وے وہ کل کی کمرٹ پہل لائف تھی جو آپ نے اپنے باپ کے ہاں گزاری۔ آج بے چارے شوہر کے ہاں ہیں جو آپ کی ایسی عیاشیاں انورڈ نہیں کر سکتا۔ یہاں تو آپ کو خود پکانا ہوگا، خود بھی کھانا ہوگا اور مجھ غریب کے پیٹ کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔“

اسے پریشان و فکر مند دیکھ کر اس کی زبان روانی سے چل رہی تھی۔

”آئی ایم سوری، آئی ایم ناٹ کوئنگ۔“ وہ حواس باختہ تھی۔

”اوکے..... اوکے، پریشان مت ہو۔ کوئنگ آجائے گی تمہیں۔ ابھی کچھ پکا ہوا نہیں ہے جو تمہارے لُچ میں کھایا جائے۔ بلکہ میرے پاس نام نہیں ہے جو بازار سے کچھ لے آؤں۔ رات میں تو میں لیٹا آؤں گا۔ کیا پکانا چاہئے؟ کیا پکانا چاہئے جو جھٹ پٹ تیار ہو جائے۔“ وہ نرم دل تھا زیادہ دیر اس کی ہونق صورت نہ دیکھ سکا۔

”انڈا..... ہاں انڈا جھٹ پٹ تیار ہو جائے گا۔ آؤ لیکن میں تمہیں آملیٹ بنانا سکھاؤں۔“

وہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی کچن میں آگئی۔ بیوٹکاز کا چھوٹا سا کچن صاف ستھرا پڑا تھا۔ دائیں طرف ریک میں پلیٹیں، گلاس، جگ اور ڈشیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ چائے کے مگ، مگ فوگر میں لٹکے ہوئے تھے۔ اسپون کیبن میں اسپون چھمارے تھے۔ ناف بک میں چاقو، چھری رکھی تھی۔ بائیں طرف فریج رکھا تھا اور سامنے کاؤنٹر تھا اور کاؤنٹر سے ملحق سنک تھا جو دھلا دھلایا خشک پڑا تھا۔

”جائزہ کھانے کے بعد لے لینا، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ پہلے میری مدد کرو۔“ وہ چولہا جلا کر فرائی چین رکھتا ہوا غماط ہوا۔ ”فریج میں سے انڈے نکال کر لاؤ جتنے تمہیں کھانے ہیں۔“ فرائی چین میں گھی ڈالتا ہوا بولا تو وہ ایک انڈا نکال کر لے آئی۔

”اے تو ڈر دو۔“ اس نے بیاز کاٹتے ہوئے حکم دیا۔ ”کیا ہوا؟..... ابھی تک انڈیوں ہی لئے کھڑی ہو؟“ وہ بیاز اور ہری مرچ کاٹ کر مڑا تو اسے کھڑے دیکھ کر کوپا ہوا۔

”وہ..... وہ یہ انڈا کس سے توڑوں؟ آئی مین کیسے توڑوں؟“ وہ پریشان کن لہجے میں بولی اور وہ حیرت سے چیخ اٹھا۔

”وہاٹ..... تمہیں یہ نہیں معلوم کہ انڈا کیسے توڑتے ہیں؟ مائی گاڈ! کیا بنے گا میرا؟“ وہ اس سے انڈا لیتا ہوا آہستگی سے بڑبڑایا اور چھوٹے باؤل میں انڈا توڑ کر ڈالتے ہوئے بولا۔

”غور سے دیکھو کس طرح آملیٹ بنتا ہے۔ بریڈ فریج میں ہے وہ نکال لینا۔ چائے تھرماس میں موجود ہے۔ انڈا ابھی کھا لینا کیونکہ ٹھنڈا ہونے کے بعد بڑی طرح ہو جاتا ہے اور بد ذائقہ بھی۔“ وہ تیزی سے انڈا اسپینٹ رہا تھا۔ فرائی چین میں بیاز اور ہری مرچ لائٹ براؤن ہو رہی تھی۔ ہاتھ کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی چل رہی تھی۔

”میرے خیال میں دنیا میں واحد شے انڈا ہے جو جھٹ پٹ تیار ہو جاتا ہے اور ہوتا بھی سب کو پسند ہے۔ بچے، بڑے، بوڑھے، جوان سب ہی شوق سے کھاتے ہیں۔ کئی طریقوں سے اسے بنایا جاتا ہے۔ مجھے زیادہ تر ناشتے میں ہاف فرائی پسند ہے۔ کبھی کبھی فل فرائی پر کا لائمنک جھڑک کر بھی شوق سے کھاتا ہوں۔“ مردوں کو اپنی برتری بتانے کا موقع مل جائے تو وہ کچھ زیادہ ہی ترنگ میں آجاتے ہیں۔ وہ بھی محسوس کر رہی تھی۔ اس کی ناواقفیت نے اس کو کس قدر تقویت پہنچائی تھی۔ وہ مسلسل بول رہا تھا۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

پانچ منٹ کے قلیل ترین وقت میں وہ آملیٹ تیار کر کے اسے تھا چکا تھا۔ وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے میں مشغول ہو گئی۔

ناشتہ کرنے کے بعد سرعت سے گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔ اسے یقین نہیں تھا وہ بچ گئیٹ باہر سے لاک کر کے نہیں جائے گا۔ مگر اس وقت اس کے تحیر کی انتہا نہ رہی جب گیٹ ان لاک ملا۔

”کیا وہ چاہتا ہے میں بھاگ جاؤں؟ خود موقع دے کر گیا۔ نہیں..... شاید وہ جانتا ہے کہ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ نہیں..... نہیں..... وہ اتنی جلدی دوسروں پر اعتماد کرنے والا بندہ نہیں ہے۔ پھر کیوں گیٹ لاکڈ کر کے نہیں گیا؟ شاید اسے یقین ہے کہ میں کہیں نہ جاؤں گی۔ بچ میں کہاں جاؤں گی؟ راستے تمام مسدود ہیں، پاپا تو مجھے بھول ہی گئے ہیں۔ آئی جو کتنے دعوے کر رہی تھیں شاہ ویز سے ڈائورس دلوانے کے وہ سب باطل ثابت ہوئے۔ انہوں نے کہا تھا شاہ ویز اس کی گردنیں پاسکتا اور آج وہ شاہ ویز کے پاس تھی۔ وہ خود اس کی گردنوں پاسکی تھیں۔ جو جو نے شاہ ویز کو مارنے کی قسمیں کھائی تھیں، اس کے خون کا آخری قطرہ تک مٹی میں ملانے کے لئے جنونی ہو رہا تھا۔ کیا کیا تھا اس نے..... شاہ ویز ان کے سامنے اسے گھسیٹتے ہوئے لے آیا تھا۔ وہ اس سے اسے چھڑانے کی سعی میں ایک منکا تک نہ مار سکا تھا۔ آج وہ اس کے ساتھ تھی، جس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔

”اے بی بی! کہاں جاتا ہے؟“ چوکیدار کی کڑک آواز پر وہ چوکی تھی۔ سوچوں میں وہ فلیٹ سے نکل آئی تھی۔

”تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟“ اس کی رعونت و دبدبہ عود کر آیا۔

”ام چوکیدار ہے.....“ ادھیڑ عمر چوکیدار نے فخر سے سینہ پھلا کر کہا۔

”چوکیدار وہ تو یہاں کی چوکیداری کرو، میری چوکیداری کرنے کی ضرورت نہیں ہے سمجھے۔“ وہ تیوریاں چڑھا کر غصے سے بولی۔

”ام اس وقت آپ کا چوکیداری کے لئے بیٹھا ہے۔“

”وہاٹ..... وہاٹ..... میری چوکیداری کے لئے کس نے کہا ہے؟“

”صاب نے.....“ چوکیدار گھبرا گیا تھا۔

”کون سے صاحب نے؟“

”شاہ ویز صاب نے۔“

”کیا کہا ہے؟“ وہ کسی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔

”صاب نے بولا ان کا بیوی کو پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے۔ ایسے میں وہ باہر کا طرف جاتا ہے۔ اگر بی بی نیچے آئے تو اس کو باہر نہیں جانے دینا ہے۔ اگر وہ ضد کرے تو کتے کو پیچھے چوڑ دینا۔“ چوکیدار جو غصے سے اسے بری طرح جھڑپا رہا تھا وہ اسے دورے کے اثر میں سمجھ کر خوفزدہ انداز میں کتے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ تو جین وشر مندی کے احساس سے اس کی رنگت سرخ پڑ گئی تھی۔ اس نے قہر آلود نگاہ چوکیدار پر ڈالی جو گھبرا کر پیچھے ہٹا تھا۔ دوسری نگاہ سامنے بادام کے درخت سے زنجیر سے بندھے سیاہ بل ڈاگ پر ڈالی اور تن فن کرتی اوپر آگئی۔

”لو کا پٹھا..... کمینہ..... سمجھتا کیا ہے خود کو؟ مجھے پاگل کہا..... خود ہو گا پاگل..... بلکہ اس کا باپ پاگل، پورا خاندان پاگل..... ہونہ..... جی میں سوچ رہی تھی گیٹ کیوں لاک کر کے نہیں گیا؟ اطمینان ہو گا نا اسے کہ نیچے چوکیداری کے لئے اپنے دو باپ چھوڑ کر جا رہا ہے۔“ وہ ٹھوکر سے گیٹ کھولتی ہوئی بڑبڑاتی اندر داخل ہوئی۔



”جگ جگ جیو بہو! بہت خدمت کرتی ہو۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے، صداسکھی رہو۔“ حرانے ان کے سر میں نیم گرم تیل کی مالش کر کے نرمی سے بال سلجھائے، پٹیا باندھی پھر کتنی دیر تک سردبانے کے بعد ٹانگیں دبار ہی تھی اور جواباً امی حضور اسے دعاؤں سے نوازا رہی تھیں۔

”میں نے سنا تھا سسرال اچھا نہیں ہوتا، وہاں لڑکیوں کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہوتا اور خصوصاً ساس تو پوری بڑا دہوتی ہے، یہ سنا تھا۔ میں بہت خوفزدہ رہتی تھی یہ سوچ کر مگر نہ معلوم کس نیکی کے بدلے مجھے آپ جیسے اچھے لوگ ملے۔“

حراعتِ قدرت بھرے لہجے میں بولی تو امی حضور کو بایا ہوئیں۔

”یہ جہاں اچھے اور برے لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ جس طرح سارے لوگ اچھے نہیں ہوتے اسی طرح تمام لوگ برے بھی نہیں ہوتے۔ اور یہ ساس بہو کا بھگڑا تو بہت پرانا ہے۔ دراصل بیٹا بھی ونا عاقبت اندیشی کا کھیل ہے۔ ساس کے قبضے میں جب گھر یلو اقتدار ہوتا ہے تو بہو کو وہ رعایا سمجھتی ہے جو ہر دم اس کے قدموں تلے چلی جاتی ہے۔ وہ یہ بھول جاتی ہے کہ سو دن ساس کے کتو ایک دن بہو کا آتا ہے۔ اور بعض بہوئیں گھر کی دلیلیز پر قدم رکھتے ہی ساس و فندوں سے ایسا بیر باندھتی ہیں کہ بدترین دشمن بن جاتی ہیں۔ وہ یہ بھول بیٹھتی ہیں کہ آگے اسی منصب پر انہیں بھی فائز ہونا ہے اور جو کر رہی ہیں وہی پانا ہے۔ مکافاتِ عمل سب کے لئے ہے، نیکی کے لئے نیکی، بدی کے لئے بدی تیار ہوتی ہے۔“

”شکر ہے امی حضور آپ ایسی نہیں ہیں۔“

”تم بھی بہت اچھی ہو۔ اصل بہو کا کچھ تو تم نے ہی مجھے دیا ہے ورنہ پہلی بہو کے درشن سے ہی ہم محروم رہتے تھے، ہماری خدمت تو وہ کیا کرتیں اپنے خاوند اور بچوں کو ہی کبھی وقت نہیں دیا۔ بچوں کو کونسل نے پرورش کیا، کچھ سمجھدار ہوئے تو ہاضل بھجوا دیا۔ ان کے رات دن پارٹیز میں گزرتے تھے۔ خرم بھی ان کے ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ کوئی روک ٹوک، کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ خرم کو سکھا، پڑھا کر میرے خلاف کر دیا۔ وہ ایسا بدظن و بد لحاظ ہو گیا کہ میری پرواہ اس نے کرنا چھوڑ دی اور آج بہو کو مرے اتنے سال گزرنے کے باوجود وہ پہلے والا خرم نہ بن سکا۔“ اس کے لہجے میں حسرت پنہاں تھی۔

”ایسی بات نہیں ہے..... وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ از حد خیال رکھتے ہیں۔ آپ رنجیدہ نہ ہوں۔“

”خیال رکھنا اور محبت کرنا مختلف جذبے ہیں۔“ ملازمہ کی آمد پر وہ خاموش ہو گئیں۔ ملازمہ نے دوسری بار خرم کی طرف سے پیغام پہنچایا تھا کہ وہ اسے بلارہے ہیں۔

”میں تمہیں یہاں اپنے لئے لے کر آیا ہوں کہ امی حضور کی چاکری کے لئے؟“ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو خرم کو بلیوریشمی نائٹ گاؤن میں ملبوس ٹھٹکتے پایا۔ وہ اسے دیکھتے ہی خفگی سے کویا ہوئے۔ وہ آہستگی سے دروازہ لاک کر کے ہاتھ کی طرف بڑھ گئی۔ وہ آسانی رنگ کی نائٹ بدل کر باہر آئی تو وہ صوفے پر بیٹھتے تھے۔

”آپ خفا ہیں مجھ سے؟“ ان کی گہیر خاموشی کو محسوس کر کے کویا ہوئی۔

”نہیں..... لیکن آج تمہاری حیثیت کا تعین تمہیں کروادوں۔ تم کوئی معمولی عورت نہیں ہو، اس گھر کی ملکہ ہو، میری بیوی ہو، کوئی عام عورت نہیں ہو جو ملازموں کی طرح دوسروں کی خدمتیں کروگی۔ نہ آج کے بعد ملازموں کی طرح تمہیں کچن میں کام کرتے دیکھوں۔ ان سب کاموں کے لئے ڈھیروں ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ تم صرف حکم چلایا کرو۔“

”ملازموں پر سب کچھ نہیں چھوڑا جاسکتا۔ میں صرف اپنی نگرانی میں کام کرواتی ہوں۔ اس طرح ان پر پریشور ہوتا ہے۔“

”کوئی ضرورت نہیں..... دو ہیڈ سروس ایڈمٹ کر دیئے ہیں۔ وہ اپنی مانیٹرنگ میں کام کروائیں گے۔ ہر تعلق، ہر رشتے کو ایک لیبل میں رکھنا چاہئے ورنہ وقت وہ ہے کہ ہمارے پاؤں کا جوتا ہمارے ہی سر پر لگتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے سمجھا رہے تھے۔

”امی حضور کوئی غیر نہیں، آپ کی والدہ ہیں۔ اس رشتے سے میرے لئے بھی قابل احترام ہیں۔ میں نے ماں نہیں دیکھی، امی حضور کی محبت و شفقت پا کر مجھے احساس ہو رہا ہے جیسے میری ماں مجھے مل گئی ہو۔ ان کی خدمت کر کے، ان کا خیال رکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔“ بلیونائٹ بلب کی نشاط آمد روشنی میں حرا کا حسین چہرہ کھلے ہوئے گلاب کی مانند لگ رہا تھا۔ مستزاد اس کی غزالی آنکھوں میں چمکتے شفاف موتی..... خرم جو بہت کچھ سنانے کا ارادہ رکھتے تھے مہبت سے رہ گئے۔ انہوں نے اپنے ارد گرد بے تحاشہ حسن دیکھا تھا۔

حسین چہروں سے شناسائی تھی لیکن حسن و معصومیت پہلی مرتبہ ان کے سامنے تھا۔ وہ چٹنی باہر سے خوب صورت تھی اندر سے بھی اتنی ہی پُرکشش و دلربا تھی۔



وہ بے جی کے پاس پہنچا تو بہت خفگی سے انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا ان کی ناراضگی۔ ان کے قریب بیٹھ کر خوشی سے بولا۔

”آپ ایک پرانی لڑکی کے لئے اپنے بیٹے سے خفا ہو رہی ہیں؟“

”پرانی لڑکی..... شرم کرو۔ وہ تمہاری بیوی ہے اور میری بہو۔“

”آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”اچھا، کیا بگڑ جانا اگر میں اس بچی سے دو گھڑی بات کر لیتی، صورت سے تو اس کو ترسائی ڈالا ہے، آواز سے بھی محروم رکھنا چاہتے ہو..... اتنا ظلم تو مت کرو پچی پر۔“

”جی ہاں..... میں ظلم کر رہا ہوں۔ آپ دونوں کے درمیان تو قابل رشک، قابل ستائش تعلقات تھے۔ وہ اس قدر ہونہار، تابعدار، فرمانبردار، ہوشی آپ کی بھلا آپ کا اس کے بغیر دل کیسے لگ سکتا ہے۔“ اس کا لہجہ دھیما اور لفظ کاٹ دار تھے۔

”وقت کے ساتھ ساتھ انسان سب سیکھ جاتا ہے۔“

”جی..... بشرطیکہ سیکھنے والا انسان ہو۔“ وہ پھر شوخ ہوا۔

بے جی نے کچھ کہنے کے لئے لب واکٹے ہی تھے کہ سامنے سے آتے حسن صاحب کو دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ شاہ ویز کی اس طرف پشت تھی۔

”بے جی! کیا سر پر از ہے وہ جس کے لئے آپ نے مجھے کال کیا تھا؟“

”السلام علیکم!“ حسن بیگ کی آواز اسے اپنی سماعت کا دھوکا لگی۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ وہ کھڑے مسکرا رہے تھے۔

”سر..... آپ..... کب..... آئے.....؟“

”صبح پہنچا ہوں۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ باتیں کریں، میں اتنے میں کباب فرائی کر لیتی ہوں۔“ بے جی دانستہ انہیں باتیں کرنے کا موقع دے کر چلی گئیں۔ وہ صوفوں پر براجمان ہو گئے۔

شاہ ویز حیران تھا ان کی اس طرح اچانک غیر متوقع آمد پر۔ جب کہ حسن بیگ گفتگو کے لئے لفظوں کو ترتیب دے رہے تھے۔

”مشعل کیسی ہے؟“ ان کے دل کی بے تابی پہلے زبان پر آئی۔

”جیسی آپ چھوڑ کر گئے تھے۔“

”میرا مطلب..... میرا مطلب ہے کہ بتا رہی تھیں، پچھلے دنوں اسے فلو وغیرہ ہو گیا تھا۔ آپ نے بتایا تھا انہیں۔“ وہ بری طرح فحالت کا شکار تھے کیونکہ شاہ ویز کے انداز میں ذرا بھی لچک نہ تھی۔

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ کو لے چلوں گا اس کے پاس۔“

”نہیں..... میں ابھی اس سے ملنا نہیں چاہتا، جب تک وہ اس گھر کے لائق نہیں ہو جاتی میں اس سے نہیں ملوں گا۔“

”یہ تو بہت بڑی مشکل میں آپ نے خود کو ڈال لیا ہے۔ اس طرح آپ کبھی بھی اس سے نہ مل پائیں گے۔“ اس کی صاف کوئی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ بیگ صاحب ہونٹ بھیجنے کر رہ گئے۔

پھر کھانے کے دوران اور بعد تک ان کے درمیان کاروباری گفتگو ہوتی رہی تھی۔ اس دوران انہوں نے محسوس کیا مشعل کے ذکر پر اکھڑا اکھڑا بے زار دکھائی دینے والا شاہ ویز اب وہی پہلے والا شاہ ویز لگ رہا تھا۔ نرم خو، مہذب و مؤدب، بے انتہا خیال رکھنے والا۔

”ہوں..... کھوٹ صرف مشعل میں ہے۔“ انہوں نے دکھ سے سوچا تھا۔

شاہ ویز جاچکا تھا۔ بے جی عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے مخصوص وظائف میں مصروف تھیں۔

حسن بیگ سوچ رہے تھے ان کی جدائی، مکمل طور پر مشعل سے دوری نے بھی مشعل پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا۔ وہ ویسی ہی تھی۔ ہٹ دھرم، بے حس۔

گھر محبتوں سے پروان چڑھتا ہے، آپس کا تعلق، خلوص و صروت سے مربوط ہوتا ہے۔ جہاں وفا، ایثار، الفت نہ ہو وہاں ایسے زبردستی کے بندھن زیادہ دیراستہ نہیں رہتے۔ اور یہ تعلق علیحدہ ہو جائے یہ تو انہیں مر کر بھی کوارا نہ تھا۔

”بھائی صاحب! خیریت تو ہے نا؟“ بے جی وظیفے سے فارغ ہوئیں تو حسن بیگ کو کوریڈور میں منظر ابی انداز میں غمگین دیکھ کر فکر مندی سے کویا ہوئیں۔

”جی بالکل..... میں دراصل آپ کا انتظار کر رہا تھا کچھ ضروری باتیں کرنے کے لئے۔ اگر آپ کو رحمت نہ ہو تو پلیز کچھ وقت دیں مجھے۔“ وہ اپنے مخصوص دھیمے دھم لہجے میں بولے تو بے جی اثبات میں سر ہلاتی ہوئی خاصے فاصلے پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”مجھے خوشی یہ دیکھ کر محسوس ہوئی ہے کہ میری طرح آپ کی بھی یہی کوشش ہے کہ مشعل اور شاہ ویز خوشگوار زندگی گزاریں اور اس میں یقیناً شاہ ویز کی کوشش بھی رہی ہے کیونکہ وہ آپ کے بغیر ایک وقت کا کھانا پسند نہیں کرتا کجا کہ اب آپ سے دوری برداشت کر رہا ہے۔ یہاں آپ کے حوصلے، شاہ ویز کی ہمت کو داد دینے کے لئے میرے پاس لفظ نہیں ہیں۔“

”کوشش تو ہماری بھرپور ہے..... آگے جو اللہ کی مرضی۔“

”بے شک..... اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ مگر یہاں میں آپ سے ایک مشورہ لینا چاہتا ہوں۔“

”جی آپ بلا جھجک کہیں بھائی صاحب!“

”میرا خیال ہے ہم انہیں کچھ عرصہ تہا رہنے کا موقع فراہم کریں تو شاید بہتری کی کوئی سیمبل نکل آئے۔ انہوں سے دوری انسان کو بہت دکھی اور تنہا کر دیتی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی ہمدرد و نمگسائل جائے تو دوستی ہو نے میں کوئی تا مل نہیں ہوتا۔ ایسے میں انہیں ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملے گا، ایک دوسرے کو جان پائیں گے، ان



کے درمیان جوٹج ہے وہ رفاقت میں بدل جائے گی۔ آپ کا کیا خیال ہے کہن جی؟“

”میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ وہ جلد ایک ہو جائیں۔“ بے جی نے رضامندی دے دی تو وہ مطمئن انداز میں مسکرا اٹھے۔

”ملک سے باہر جانے پر شاہ وزیر راضی نہ ہوں گے یہ میں بخوبی جانتا ہوں بلکہ اس شہر سے باہر جانے پر بھی آپ کو رضامند کرنا پڑے گا۔“

”بہتر بھائی صاحب! اسے راضی کرنا میرا کام ہے۔“ بے جی اٹھتے ہوئے اعتماد سے کوپا ہوئیں۔



رات شاہ وزیر آیا تو دوپہر کا غصہ و ہنگ کا خیال عود کر آیا اور شدت سے دل مچلا اپنے لیے بنا خونوں سے اس کا چہرہ بگاڑ ڈالنے کو مگر پھر اپنا انجام سوچ کر رک گئی۔

حقیقت یہ تھی وہ اس کی مار سے ڈر گئی تھی۔

مستزاد اس کے خوفناک تیور اور خونخوار لہجہ اسے مار ڈالتا تھا۔

”سارا دن کیا، کیا ہے تم نے؟“ اس نے کمرے کی بے ترتیب حالت دیکھ کر ناقہ اندہ لہجے میں کہا تو وہ اسی طرح لاتعلقی بیٹھی رہی۔ کمرے کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔

صبح تک صرف بیڈ کی چادر ہٹ گئی تھی، کمرے بغیر تہہ ہوا پڑا تھا۔

دوپہر کو چوکیدار کی باتیں سننے کے بعد اس کا دماغ الٹ سا گیا۔ پرانی والی ضدی، خود سر، کسی کو خاطر میں نہ لانے والی مشعل بیدار ہو گئی تھی اور اس نے اشتعال میں کمرے

میں رکھی ہر شے الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی اور خود سو گئی تھی۔

”میں تم سے پوچھ رہا ہوں کیا حالت بنا رکھی ہے کمرے کی؟“ اس کو ہنوز خاموش دیکھ کر وہ چپ کر گیا ہوا۔

”مجھ سے بات مت کرو..... میں پاگل ہوں۔“ وہ غرائی۔

”واہ..... کیا خود شناسی ہے۔“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”کیا ضرورت تھی تمہیں چوکیدار سے کہو اس کرنے کی؟“

”کیا ضرورت تھی تمہیں قدم باہر نکالنے کی؟“

”تم نے خود کہا تھا میں یہاں قید نہیں ہوں۔“

”مجھے معلوم تھا تم یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرو گی، اس لئے مجھے چوکیدار کو الٹ کرنا پڑا تھا۔“ اس نے کوٹ اتار کر چیئر پر ڈالتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

”کہاں جاؤں گی یہاں سے؟ سارے درتو مقفل کر دیئے ہیں۔“

”اوکے..... میں تھا کہ ہوا ہوں، کسی فضول بے معنی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ ڈریس چینج کر کے آ رہا ہوں، تب تک بیڈ کی حالت درست کرو۔“

”مجھے نہیں یہ سب کرنا۔“

”آجائے گا جب کرنے کی کوشش کرو گی تو۔“

”مجھے کوشش نہیں کرنی، نہیں کرنے مجھے ایسے کام۔“

اس کے چہرے سے کوفت و عیاری عیاں تھی۔ شاہ وزیر کے تیور بگڑنے لگے۔ چند لمحے کھڑا وہ اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا مگر پھر خود ہی پیش رفت کرنی پڑی تھی۔

”پہلے بیڈ کو درست کرو، نیکی ترتیب سے لگاؤ، بلیک تہہ کر کے پائنتی رکھو۔ تم نے کام کیا نہیں ہے مگر دیکھا تو ہے۔ کم آن ہری اپ، میں اتنے میں کپڑے چینج کر کے آتا

ہوں پھر مل کر ڈسٹنگ کرتے ہیں۔“ اس کا لہجہ دوستانہ مگر تیور اتنے سخت تھے کہ مجبوراً اسے اٹھنا پڑا تھا۔ نیکی اٹھا کر بیڈ سے نیچے پھینکے۔ کمرے سمیٹ کر ایک طرف رکھا۔

”پاپا، کہاں چھنسا دیا آپ نے مجھے..... ایسا لگتا ہے کسی خطرناک جرم کی عمر قید کاٹ رہی ہوں، بلکہ..... بلکہ آپ کے لئے تو میں مر ہی گئی ہوں جو آپ نے پلٹ کر میری

خبر ہی نہ لی۔ مجھے اگر اس طرح زندگی گزارنی تھی تو پھر کیوں اس قدر عیش و عشرت میں رکھا۔ میں تو کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کروڑوں کی مالک ہونے کے باوجود اس

طرح بے بس و بے اختیار ہو جاؤں گی۔“ وہ تصور میں پاپا سے مخاطب تھی۔ بڑی مشکل گھڑی تھی۔ چادر سنہل کر نہ دے رہی تھی۔ ایک طرف سے درست کرتی تو دوسری

جانب سے بگڑ جاتی۔ دوسری جانب پھیلاتی تو تیسری طرف سے سمٹ آتی۔ بیڈ کے تینوں اطراف وہ چہنی کی طرح گھوم گئی تھی۔ اسے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ بیڈ کو رچھانا

دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ نامعلوم کس طرح ملازماؤں منہوں میں کورز چینج کر دیا کرتی تھیں اس عمدگی و نفاست سے کہ ایک فنکار تک نہ ہوتی تھی۔ ان کے ہنر، مہارت

اور جانفشانی کا اسے ان لمحوں میں ادراک ہوا جن کو کبھی وہ انسان بھی نہ گردانتی تھی۔

پندرہ منٹ کی جان توڑ مشقت کے بعد وہ بیڈ پر چادر بچھا پائی تھی۔ نیکی رکھنے کے بعد بھاری بھر کم فل سائر کمرے تہہ کرنے کی ہمت وہ خود میں نہ پاتی تھی۔ اسے ایسے ہی

اٹھا کر بیڈ پر رکھ دیا تھا۔ پندرہ منٹ کی مشقت سے سانس ابتر ہو گیا اور پھر یکلخت پاپا کی یاد آتے ہی اس کے آنسو ابھر آئے۔ وہ بیڈ پر بے ساختہ رونے لگی۔

پاپا کہتے تھے سب کچھ دولت و پیسہ ہی نہیں ہوتا کوئی شے تقدیر بھی ہوتی ہے۔ بعض انسانوں کو شاہ سے فقر بنا ڈالتی ہے تو کبھی فقیر بادشاہ بن جایا کرتے ہیں۔ تقدیر زور آور

و ناقابل تغیر ہوتی ہے۔ کبھی بھی اپنے سے کمتر لوگوں کو حقیر نہ سمجھا کرو۔

وہ نخت سے کہتی تھی۔

”یہ نصیب، تقدیر، قسمت، غریب لوگوں کے دکھڑے ہوتے ہیں۔ وہی اس کی پرواہ کرتے ہیں کہ کب سنوریں؟ کب تقدیر کھل جائے؟ کب قسمت چمک اٹھے؟ ہمارا

پر الہم نہیں ہے پاپا یہ۔“

کبھی بڑے گھمنڈ، تکبر و عنوت سے کہی بات اسے نام کر رہی تھی۔ وہ بھی تو ایک دم عرش سے فرش پر آگری تھی۔

وہ جو خود کو بہت خاص و بلند بخت سمجھتی تھی اب محسوس کر رہی تھی وہ بھی نصیب، تقدیر، قسمت کے چکروں میں جکڑی خاص ہونے کے باوجود عام لڑکی تھی۔

”اوہ گاڈ..... یہ تم نے بیڈ کو ریٹ کیا ہے..... بالکل اپنے مزاج کی طرح۔“ وہ شب خوابی کے لباس میں باہر نکلا تو بیڈ پر نگاہیں ڈالتا ہوا حیرانگی سے چیخا تھا۔ جب کہ مشعل

گریہ وزاری میں مصروف تھی۔ اس کی زندگی میں داخل ہونے سے قبل وہ آنسو نامی شے سے ناواقف تھی اور رونے والوں سے اسے سخت چڑھتی۔ اب یہ عام تھا کہ

آنکھوں میں ساون کا موسم ہمہ وقت وارد رہتا تھا۔

”ایک تو کام بالکل پھوہڑ پن سے کیا ہے اب یہ آنسو کس وجہ سے بہا رہی ہو؟“ وہ اس کے قریب بیٹھ کر سنجیدگی سے بولا۔

”مجھ سے نہیں ہوتا اتنا مشکل کام۔“ اس نے چہرہ اٹھا کر کہا۔ ”پلیز..... مجھے بتا دو پاپا کہاں ہیں؟ میں ان سے صرف ایک مرتبہ بات کرنا چاہتی ہوں۔“ اسے ابھی موڈ

میں دیکھ کر اسے حوصلہ ہوا اپنے دل کی بات کہنے کا، جھٹ بولی۔

”کیوں..... شکایت لگاؤ گی میری کہ میں نے تم سے بیڈ پر چادر بچھوائی ہے یا بہت ساری شکایتیں ہوں گی؟“ اس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ وہ اس سے خاصا قریب بیٹھا

دیکھی سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”اس خوف سے مجھے پاپا سے بات کرنے نہیں دیتے کہ میں آپ کی پاپا سے شکایت کروں گی؟“ اسے نیا خیال سوچا۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں اللہ کے علاوہ اور کسی سے خوفزدہ ہو سکتا ہوں؟“ میکا کی انداز میں اس کی گردن انکار میں مل گئی تھی۔

”پھر تمہیں یہ خیال کیوں کر آیا؟“

”ایسے ہی..... مجھے پاپا بہت یاد آ رہے ہیں۔“

”تمہیں ایک فیصلہ کرنا پڑے گا کہ حسن بیگ کے ساتھ یا میرے ساتھ رہنے کو کہا جائے تو تم کس کے ساتھ رہنا پسند کرو گی؟“ وہ اس کی جانب دیکھتا ہوا کہنے لگا۔ ”بہت

سوچ سمجھ کر جواب دینا کہ تمہاری آئندہ زندگی کا انحصار اس جواب پر ہوگا۔“

”تمہارے ساتھ۔“ وہ تیزی سے بولی تھی۔

”وہاٹ.....؟“ اس کے بے ساختہ جواب نے اسے حیرت سے لنگ کر ڈالا تھا۔ حیرانی سے کہہ اٹھا۔

”نہ..... نن..... نہیں..... میرا مطلب ہے پیپا کے ساتھ۔“ جوش و روانی میں بے اختیار وہ اس کا نام لے بیٹھی تھی۔

شاہ وزیر کے لبوں پر ایک مجروح مسکراہٹ لمحے بھر کو وارد ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا اس سے ہر لمحہ، ہر ساعت جان چھڑانے والی لڑکی بھلا کس طرح تا حیات ساتھ رہنا کو ارا کر

سکتی ہے۔ اس کا جواب یہی متوقع تھا۔

”بہت چاہتی ہو اپنے پاپا کو؟“

”ہوں.....“

”ان سے ملنا، ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟“

”ہاں۔“

”اوکے۔“ شاہ وزیر نیم دراز کچھ سوچتا رہا، اس کے وجہ بہ چہرے پر دبیز سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا تھا۔ سوچیں طویل ہو جائیں تو فیصلے

کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اور وہ ایسے کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آنا نہیں چاہتا تھا، سوتیزی سے سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے مخاطب ہوا۔

”پھر تمہیں کچھ عرصہ ان طریقوں پر چلنا ہوگا جو میں تمہیں بتاؤں گا۔ وہی کرنا ہوگا جو میں تمہیں گائیڈ کروں گا۔“

”کیا کرنا ہوگا مجھے؟“ وہ تجر سے کوپا ہوئی۔

”ایک مکمل لڑکی بننا ہوگا..... ایک ایسی آئینہ دل بیٹی جو باپ کے لئے انعام ہوتی ہے، جن سے والدین کے سر اور نگاہیں فخر و افتخار سے بلند رہتی ہیں۔“ وہ دھیسے لہجے میں

”کویا ہوا۔

”میں مکمل لڑکی ہوں، اینڈ بل بیٹی ہوں۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں ادھوری ہوں یا میرے پیپا مجھے پسند نہیں کرتے؟“ اس کے لہجے میں ناکواریت درآئی تھی۔

شاہویر نے ایک جلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی تھی پھر خود بخود ہی اس کے لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ درآئی۔ ذہن کی اسکرین پر وہ یکے بعد دیگرے تمام مناظر روشن ہونے لگے جن میں حسن بیگ کسی سائل کی طرح کشتکول دراز کئے اس سے اور بے جی سے اس کے لئے عاجزی و انکساری سے مخاطب تھے۔ اگر ان مناظر میں سے کسی ایک کی جھلک بھی مشعل دیکھے تو شرمندگی و شرمندگی کے احساس سے ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ اپنی شان میں اپنی ہی زبان سے نکلنے والے الفاظ طمانچے بن کر اس کے چہرے پر لگیں۔

مگر وہ اپنی وسعت قلبی و معاف کردینے والی عادت سے مجبور کوئی ایسی بات کہے بنا صرف مسکرانے پر اکتفا کرتا تھا۔

لیکن اس کی اس مسکراہٹ و خاموشی میں ایسی کوئی کاٹ ضرور ہوتی تھی جو مشعل کے انگ انگ کو اس بری طرح گھائل کیا کرتی تھی کہ وہ زخمی ناگن کی طرح بل پر بل کھاتی تھی۔

”تم اس طرح مت مسکرایا کرو۔“ بالآخر وہ پاؤں پیچ کر بولی۔

”کیوں؟ مسکراہٹ تو دوستانہ انداز ہوتا ہے۔“ اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

”لیکن مسکراہٹ، مسکراہٹ میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ وہ بدستور چڑھے ہوئے انداز میں بولی۔

”مسکراہٹ، مسکراہٹ ہوتی ہے۔“

”نہیں..... مسکراہٹ میں بھی اتنا ہی فرق ہوتا ہے جتنا دن و رات میں ہوتا ہے، صبح و شام میں ہوتا ہے۔ ہر مسکراہٹ کا الگ رنگ ہوتا ہے۔“

”ایمزنگ..... ویری ایمزنگ..... آج سے قبل میں مسکراہٹوں کی اتنی کوالیٹیز سے لاعلم تھا۔ اچھا بتائیے میری مسکراہٹ کس کوالٹی کی ہے..... کون سا رنگ ہے اس میں؟“

”تھارت وٹلز کا تمہاری مسکراہٹ یہ تاثر دیتی ہے کویا میں اسٹوڈینٹان سٹینڈ اینڈ اگلی گرل ہوں۔“

”ایمزنگ..... آج تو حیران کر رہی ہو۔“

”صرف مسکراہٹ ہی نہیں، تمہارے ہر انداز کے کئی رنگ، کئی پہلو ہوتے ہیں۔ تمہاری زبان ہی نہیں، تمہارے اعضاء، تمہارے وجود کی ہر جنبش اظہار کے ذرائع ہیں۔

”یہ کیلکولیٹو بہت حساسیت سے لبریز ذہنوں کے لئے ہوتی ہیں۔ تمہارا ذہن ان باریکیوں کو کہاں چھوسکتا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم..... تم مجھے کیا سمجھتے ہو..... شاید کوئی روباوٹ جو ہر احساس و جذبات سے عاری ہو..... جو کبھی سمجھو مجھے اس سے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں پاپا کے پاس رہنا اور اس کے لئے میں تمہاری خواہشات پر چلنے کے لئے تیار ہوں۔“ وہ پہلے کی طرح زبان چلانے سے اجتناب برتی تھی، دیکھی تھی بات بڑھ رہی ہے تو خاموش ہو جایا کرتی تھی۔ اب اس وقت تو بات بھی اس کے مفاد کی تھی۔

پاپا کو دیکھنے، ان سے ملنے کی خواہش حسرت بن کر رہ گئی۔ اس وقت وہ اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کے لئے بے چین و بے قرار ہو گئی تھی۔

”اوکے..... صبح سے تمہاری کلاسز اسٹارٹ ہو جائیں گی۔“



سرما کی نرم و چمکیلی دھوپ پر تکلف مہمان کی طرح کچھ دیر کو ہی آنگن میں آتی تھی۔ کوئی اس کی آمد کی تمازت سے فیض یاب بھی نہ ہو پاتا کہ وہ جھٹ کسی مغرور، تک چڑھی و شیرازہ کی مانند اپنا آنچل سمیٹ کر غائب ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ دھوپ نے ابھی آنگن میں قدمہ رنجہ ہی فرمایا تھا کہ زریہ جو ابھی ناشتے سے فارغ ہوئی تھیں، کپ میں مزید چائے انڈیل کر پھرتی سے تخت پر جا کر بیٹھ گئیں۔

”سردی میں دھوپ کے کتنے نخرے ہوتے ہیں۔ ذرا کی ذرا مثل دکھا کر غائب ہو جاتی ہے اور گرمی میں کم بخت منہ اندھیرے ہی چلی آتی ہے اور ہر جگہ ایسے ٹھاٹھ سے جم جاتی ہے کہ پینہ پینہ کر ڈالتی ہے انسانوں کو۔ اب ضرورت ہے تو مجال ہے جو تک جائے۔“ زریہ اپنے مخصوص جلمے کے لہجے میں بولے جا رہی تھیں۔

”اماں! اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمیں اس کی اہمیت کا، افادیت کا احساس کس طرح ہو..... قدرت کی ہر شے میں ہمارے لئے فوائد بہتری ہے۔“

”ہاں، یہ ہم ہی ناشکرے و ناقدرے ہیں۔ صرف وقت پر مطلب کی شے کی قدر کر پاتے ہیں اور بعد میں کون شکر کرتا ہے۔ اصفہ کل سے ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔ بہو کی چھٹی تو ہو گئی ہوگی نا؟“

”ہاں اماں! کل بھابھی ہسپتال سے ڈسچارج ہو گئی ہوں گی۔ شاید بھائی ان کی دلجوئی کے لئے وہاں رک گئے ہوں۔ ابھی تازہ چوٹ ہے، تازہ زخم ہیں، انہیں ہمدردی و پیار کی اشد ضرورت ہے۔“ سارہ ناشتے کے برتن دھو کر فارغ ہوئی تو سبزی کی ٹڑے اٹھائے وہیں تخت پر چلی آئی۔

”دلجوئی کرنے کے لئے بھی وہی احمق رہ گیا۔ کہاں گئیں اس کلبوہی کی ماں، بہنیں۔ جنہوں نے میرے بیٹے کو تو مجھ سے جدا کیا ہی تھا میرے پوتے کو بالکل ہی جدا کر دیا۔“ ان کی آواز بھر گئی۔

”جو ہمارے نصیب میں لکھا تھا وہ ہوا..... اس میں بھلا کسی اور کیا کیا دوش۔ کیوں کسی کو الحرام دیں۔ چھوڑیں اماں، سارے گلے شکوے فراموش کر ڈالیں۔ بھابھی کو گھر لے آئیں۔ مجھے بھائی کا خیال آتا ہے۔ روز روز وہ یہاں کے اور وہاں کے چکروں میں ڈسٹرب ہو گئے ہیں۔ بھابھی گھر آجائیں گی، گھر میں رونق بھی لوٹ آئے گی اور بھائی بھی اس دہری مشقت سے خلاصی پالیں گے۔“

سارہ نے گاجر، منر، آلو اور میتھی نکال کر تخت پر اخبار پھیلا کر اس پر رکھتے ہوئے اپنی جانب سے اچھی طرح صلاح دی تھی مگر زریہ تو سوکھی لکڑیوں میں لگی آگ کی طرح بھڑک اٹھیں۔

”اس کمبخت کو یہاں لاتی ہے میری جوتی۔“

”اماں! یہ غلط بات ہے..... آپ بڑی ہیں، بزرگ ہیں۔“

”ارے بڑی ہوں، بزرگ ہوں تو اپنی ناک کٹواؤں؟“

”میرا یہ مقصد نہیں ہے۔“

”سب سمجھتی ہوں میں..... تجھے زیادہ امن کی فافتہ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کی یا اس کے گھر والوں کی نگاہ میں بڑی ہوتی، بزرگ ہوتی تو اس طرح کرتے میرے ساتھ؟ ہونہہ..... میں جو ہوں خوب جانتی ہوں اپنی اوقات کو۔ آج کل تو لوگوں کا چیلن ہی بدل گیا ہے۔ بیٹی دینے سے قبل اس طرح چیلتے ہیں جیسے گنے پر مکھی۔ اور جب بیٹی ٹھکانے لگ جاتی ہے تو اس طرح نکال کر پھینکتے ہیں جیسے دودھ سے مکھی۔ اور تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی بھائی کی فکر کرنے کی۔ بھائی نے تم سے ایک دفعہ بھی پوچھا؟ ایک بار بھی فکر کی کہ بہن کتنے عرصے سے دلہنیز پر آکر بیٹھی ہے، اس کا مسئلہ حل کرنا ہے یا نہیں۔“

”کب تک کریں وہ مسئلہ حل؟ ایک بار، دوبار، تین بار..... میرے پاس تو کوئی حد بھی نہیں۔ ابھی جاؤں گی، انہیں دوبارہ ضرورت کب پیش آتی ہے معلوم نہیں۔ مجھے اپنی جانب سے کوئی گلہ نہیں ہے کسی سے بھی۔“ سارہ کے بھیکے لہجے میں دھیمپن تھا۔

”بس اسی طرح خود پر ترس کھاتی رہ اور دوسروں کو معاف کرتی رہ۔ سارہ! یہ دور بہت خراب ہے۔ زیادہ نہیں تھوڑا بہت اپنے آپ کو بدل ورنہ ہر طرف سے خسارے میں رہے گی۔“ زریہ اس کو روہانسا دیکھ کر زری سے کویا ہوئیں۔

”وقت سب سے بڑا استاد ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی اس کی لہر میں، میں بھی بدل کر وہ کچھ سیکھ جاؤں جو اس کا تقاضا ہے۔“

”تجھ کو سمجھانا ایسا ہی ہے جیسے تین کے آگے بیس، بجانا..... چل چھوڑ اس قصے کو۔ یہ پکا کیا رہی ہے؟“

”گاجر، میتھی، آلو ہنزہ پسند ہیں نا اماں تمہیں بہت۔“ وہ سرخ سرخ گاجر میں چھپتے ہوئے مسکرا کر کویا ہوئی۔

”میرے لئے اتنی محنت مت کیا کر.....“ ان کے لبوں پر ممتا بھری مسکراہٹ تھی۔

”میتھی میں نے رات کو ہی صاف کر کے رکھ دی تھی۔ منر کے دانے تم نکال لو، میں اتنے میں گاجر اور آلو صاف کر کے آنا کوندھ لوں۔ پھر سبزی اور پراٹھے ساتھ تیار کر لوں گی۔“

”گاجر ابال کر ڈالنا۔“

”کیوں؟“

”گاجر بغیر لالے ڈالو گی تو تمام سبزی میٹھی ہو جائے گی۔ جس سے ذائقہ تبدیل ہو جائے گا اور بالائے وقت آدھا چھج ٹمک ڈالنا نہ بھولنا۔ ہاں ٹماٹر زیادہ ڈالنا۔ سردیوں میں سبزیاں بہت آتی ہیں اس لئے مجھے یہ موسم بے حد پسند ہے۔ کھانا بھی دل سے کھایا جاتا ہے اور نیند بھی بڑی اچھی آتی ہے۔“ وہ منر کے دانے نکالتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”گردے کی درد کی وجہ سے ٹماٹر کا استعمال میں نے ترک کر دیا۔“

”ارے کچھ نہیں ہوتا..... ٹماٹر ضرور ڈالنا سبزیوں میں۔ دہی کا استعمال مجھے قطعی کوارا نہیں۔ پھر آج کل تو مولیٰ خوب آرہی ہے۔ گردے کے درد میں اس کا استعمال فائدہ مند ہے۔ درد سے نجات مل جاتی ہے۔“



”حرا! فافٹ پیکنگ کریں..... ہم فارن ٹور پر جا رہے ہیں۔ صرف چند سوئس پیک کرنا، شاپنگ آپ کو وہیں سے کرواؤں گا۔“ خرم نے آفس سے آتے ہی اس سے کہا۔ اس وقت وہ بے حد خوش و ہر جوش نظر آرہے تھے۔

”فارن ٹور زپر..... مگر کہاں.....؟“ حرا ان کے ہاتھ سے کوٹ لے کر پیگ کرتی ہوئی حیرانی سے استفسار کرنے لگی۔

”بہت ساری کنٹریز میں۔ دراصل ہے تو بزنس ٹور ہی، اس میں، میں نے کچھ گنجائش نکال لی ہے۔ مجھے احساس ہے۔“ انہوں نے بہت پیار سے اس کے شانوں پر بازو

رکھتے ہوئے مدھ بھرے لہجے میں کہا۔ ”ہماری شادی کو چھ ماہ ہو چکے ہیں اور میں بزنس مصروفیات کے باعث آپ کو کہیں لے جا ہی نہ سکا۔ بہر حال اب میں نے پروگرام سیٹ کر لیا ہے۔“ ان کی نگاہوں میں والہانہ پن تھا۔ چہرے پر فرط سرت سے چمک تھی جو ان کی محبت والو ہی جذباتوں کی گواہ تھی۔

حرا یکدم جا کر رہ گئی۔ اس کی کیفیت کو وہ بھی بھانپ گئے۔ ہلکا سا تہقہ لگا کر اسے انہوں نے اپنی بانہوں سے آزاد کر دیا۔

”کیج پوچھو تو آپ کی اس شرمائے گھبرانے والی ادا نے ہی ہمیں تمہارا اسیر بنا ڈالا ہے جو ہم آفس میں شدت سے نام دیکھتے رہتے ہیں کہ کب قید ختم ہو اور ہم آپ کے حضور حاضر ہوں۔“

”آپ بھی بس..... چائے لاؤں آپ کے لئے؟“

”کچھ دیر بعد لے آنا..... لیکن ایک بات بتاؤ، ٹور پر جانے کی تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی؟ تم باہر جانا نہیں چاہتیں؟“

ان کی زیرک نگاہوں سے اس کی الجھن و بیگانگی چھپ نہ سکی۔ از حد چاہنے لگے تھے اس کو اس چھ ماہ کے قلیل عرصے میں۔ حالانکہ ناکہ ان کی پہلی بیوی تھیں، حسین و طرح دار جوان کی سوسائٹی میں مو کو کتنی تھیں۔ ان کی رفاقت میں زندگی کے انیس سال گزارنے کے باوجود انہوں نے کبھی ایسی دیوانگی و سرخوشی محسوس نہ کی تھی جو حرا کی سنگت میں وہ محسوس کرنے لگے تھے۔ عجیب ہی پُر کیف و نشاط اور احساسات ان کے اندر موجزن ہونے لگے کہ دل چاہتا تھا ہر پل، ہر ساعت وہ حرا کی من مو ہنی صورت دیکھتے رہیں۔

”کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ..... کیا کوئی مسئلہ ہے؟“ وہ اس کے مقابل بیٹھ کر سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

”نہیں مسئلہ تو کوئی نہیں مگر.....“ وہ تذبذب کا شکار تھیں۔

”یہ اگر مگر مجھے پسند نہیں، بکسر بات کرو۔“

”میں..... میں سوچ رہی ہوں اگر ہم چلے جائیں گے تو امی حضور کا خیال کون رکھے گا؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہم انہیں بھی ساتھ لے جائیں۔ ہمارے پیچھے وہ تمہارے جائیں گی اور.....“

”اسٹاپ اس..... میں تمہیں مدلل کلاس انوائرنمنٹ سے نکالنا چاہتا ہوں لیکن تم مجھے کامیاب ہونے نہیں دیتیں۔ کتنی بار سمجھایا ہے یہ چھوٹے چھوٹے مسئلے ہی ہماری کلاس میں نہیں ہوتے۔ امی حضور کی دیکھ بھال کے لئے ڈھیروں ملازم ہیں اور وہ عادی ہیں ایسے ٹورز کی۔ مت عادت بگاڑو ان کی۔“ ان کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا۔

”عادت بگاڑنے کی کیا بات ہے خرم! ماں تو ماں ہی ہوتی ہے خواہ وہ کسی بھی کلاس سے تعلق رکھتی ہوں۔“ اس نے رسائیت سے سمجھایا۔

”نہیں..... تم ابھی ہماری کلاس کی خرابیوں سے ناواقف ہو۔ یہاں ایک چہرے پر بہت سارے ماسک چڑھے ہوتے ہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ دوسروں کی فکر کرنے کی بجائے خود کو اتنا پورفل بناؤ کہ لوگ تمہارا موڈ دیکھ کر بات کریں نہ کہ تم ان کی خوشامد میں لگی رہو۔“ وہ غصے سے تن فین کرتے باتھ روم کی طرف بڑھ گئے۔



شاہ ویز نے پاپا سے ملانے کی یقین دہانی کروا کر کوہا مردہ تن میں نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ ان سے ملنے کی آس میں ہر وہ کام کرنے کو تیار تھی جو عام حالات میں کبھی بھی ممکن نہ تھا۔ شاہ ویز پر اس کی سرت و لگن نے خاص اثر ڈالا تھا۔ اس کا رویہ بھی آہستہ آہستہ چھینچھن ہو رہا تھا۔

ہر وقت ناک پر دھرا رہنے والا غصہ کبھی کبھار نمود کرتا تھا مگر طفر کے تیر چلانا نہیں بھولا تھا۔ جب بھی موقع ملتا ناک کرنتنا نہ مارتا کہ وہ تملتا کر رہ جاتی تھی۔

”ارے یہ کیا حلیہ بنایا ہوا ہے؟“ وہ آفس سے آیا تو اسے دیکھ کر حیرانی سے چیخ اٹھا تھا کہ اس وقت اس کا حلیہ تھا ہی خاصا مضحکہ خیز۔ شاہ ویز کے بلیک ٹراؤزر اور پنک ٹی شرٹ میں وہ باتھ روم سے برآمد ہوئی تھی۔ ٹی شرٹ اس کے بدن پر کافی ڈھیلی تھی اور ٹراؤزر کے پائچے کافی فولڈ کرنے کے باوجود پاؤں میں آرہے تھے۔

”ایک ہی ڈریس میں، میں ساری زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس ڈریس کو دو ہفتے گزرنے کے باوجود میں نے مجبوراً اپنے رکھا تھا مگر کچھ دیر قبل میری شرٹ ریک میں پھنس گئی۔ میں نے کھینچی تو وہ پھٹ گئی اور پھٹی ہوئی شرٹ میں کس طرح پہن سکتی تھی؟“ اپنے حلیے پر وہ خود بھی خفت کا شکار تھی مگر اس پر شاہ ویز کے انداز نے اسے پزل کر ڈالا تھا۔ وہ خاصی دلچسپ و گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ نہا کر نکلی تھی۔ گلابی شرٹ میں اس کی دودھیارنگت دکھ رہی تھی۔ کولڈن سرخی مائل بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے جن سے قطر قطرہ پانی موتیوں کی صورت میں ٹپک رہا تھا۔

شرمندہ، شرمندہ ہی وہ دلچرپ لگ رہی تھی۔

اس کا انداز بناوٹ و ریاسے پاک تھا۔ شاہ ویز کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ ابھری تھی۔

”آئی ایم سوری..... تمہیں مجھے بتانا چاہئے تھا کہ تمہیں کپڑوں کی ضرورت ہے۔“

”کیوں..... تم خود تو ایک دن میں کئی ڈریس چھینچھن کرتے ہو اور میں تمہیں ایک ہی ڈریس میں نظر نہیں آتی؟“

”تم نے مجھے ایسی نظر سے دیکھنے کا اختیار ہی کب دیا ہے۔ میں تو خاصا بے اختیار رسابندہ ہوں۔“ اس کا دھیمالہجہ سلگتا ہوا تھا۔ مشعل نے بے ساختہ اس کی جانب نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہ بھی اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ نامعلوم کیا تھا ان نگاہوں میں کہ اس جیسی بولڈ اور بڈ رٹل کی بے اختیار رخ پھیرنے پر مجبور ہو گئی۔

”اوکے، آج کام چلا لو۔ کل تمہارے لئے ڈریسر لے آؤں گا۔ میں چھینچھن کر کے آ رہا ہوں تب تک تم چائے بنا کر لاؤ۔“ وہ واش روم کی جانب بڑھتا ہوا بولا تو وہ کچن میں چلی آئی کل کی نسبت آج کچن بالکل الٹا پڑا تھا۔

کوئی شے اپنی جگہ پر موجود نہ تھی۔ سنک جھوٹے برتنوں سے بھرا تھا۔ کاؤنٹر پر تمام سامان پھیلا ہوا تھا۔

نیچے فرش پر انڈوں کے پھلکے پڑے تھے۔ ڈسٹ بن کے پاس رات شاہ ویز کے لائے ہوئے پھلوں کے پھلکے بکھرے ہوئے تھے۔

یہ سب اس کا ہی پھیلا لیا ہوا تھا مگر بہتر حالت میں۔ اسے خود یہاں بھی الجھن ہونے لگی اور دل چاہ رہا تھا لائے قدموں بھاگ جائے مگر معاہدے کی رو سے اسے شاہ ویز کو چائے بھی بنا کر دینی لازمی تھی اگر وہ ایسا نہ کرتی تو یہ سمجھوتے کی خلاف ورزی تھی اور خلاف ورزی کا مطلب تھا وہ مقصد سے ہٹ رہی تھی۔

اور مقصد تھا پاپا کا ہمیشہ کا ساتھ۔

ان کا ساتھ وہ کسی طور چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

یہی آرزو.....

یہی خواہش.....

یہی لگن

اسے سمجھوتے کی راہ دکھا رہی تھی۔ پھر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کچن میں داخل ہو گئی۔ کیتلی میں چائے کا پانی رکھا اور سوئچ آن کر کے پتی کی تلاش میں کمینز دیکھ رہی تھی کہ بے دھیانی میں اس کا پاؤں کیلے کے پھلکوں پر پڑا تھا، وہ سنہلنے سنہلنے بھی پھسلتی چلی گئی

کیتلی پر اس کا ہاتھ لگا تھا، وہ ایک زوردار آواز سے نیچے گری تھی۔ کھولتا ہوا پانی اس کے پاؤں پر گر رہا تھا۔

شدت تکلیف سے اس کی چیخ نکل گئی تھی۔

شاہ ویز جو ابھی ڈریس چھینچھن کرنے کے بعد بال بنا کر فارغ ہوا تھا اس کی چیخ کی آواز سن کر کچن کی طرف تیزی سے بڑھا تھا۔ سامنے ہی وہ پاؤں پکڑے فرش پر بیٹھی ہوئی چبکوں پہلوں رونے میں مصروف تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے کچن کی حالت کو نظر انداز کر کے اس کے قریب بیٹھ کر پوچھا۔

”گرم پانی گر گیا ہے۔“ اس نے آنسوؤں کے درمیان بتایا۔

”ایک معمولی سا بھی کام تم سے نہیں ہوتا۔ کچن کی حالت کیا بنا رکھی ہے تم نے؟ صبح تک صاف تھرا چھوڑ کر گیا تھا۔“

وہ نرم لہجے میں سرزنش کر رہا تھا۔ جب کہ وہ درد سے بے دم ہو رہی تھی۔ اپنی صفائی میں وہ کچھ نہ بولی۔ صرف آنسوؤں کی روانی میں تیزی آتی گئی۔ وہ اسے سہارا دے کر کچن سے کمرے میں لے آیا۔ بیڈ پر بٹھا کر کوئی کریم اس کے پاؤں پر لگائی جس کے لگانے سے جلن میں کچھ کمی ہوئی تھی مگر تھوڑی تکلیف ہی اس کو بے چین کرنے کے لئے کافی تھی۔

”بہت تکلیف ہو رہی ہے؟“ اسے مسلسل روتا دیکھ کر شاہ ویز اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کا پاؤں بے تحاشا سرخ ہو رہا تھا۔ شدت تکلیف سے وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔

”ہاں..... مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا..... میں مر جاؤں گی۔“

”اتنی معمولی سی تکلیف میں مرنے کا سوچ رہی ہو؟“

”یہ معمولی تکلیف نہیں ہے..... یہ جان نکال رہی ہے۔“

”ٹھیک ہو جائے گا..... آنکھیں بند کرو۔ کچھ دیر سو جاؤ گی تو آرام محسوس کرو گی۔ شاباش، سونے کی کوشش کرو۔“ اس وقت اس کی حالت کچھ ایسی ہی مظلوم و مسکین سی تھی کہ اس کی ہمدرد طبیعت پوری طرح اس کی طرف راغب ہو گئی تھی۔

آگے بڑھ کر اسے لیٹنے میں مدد دی تھی۔

وہ لیٹ گئی تو دھیرے دھیرے اس کے سلکی بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ اس کا یہ عمل بالکل غیر ارادی و بے اختیار تھا۔ مشعل کے روانی سے بہتے آنسو اور شدید ترین تکلیف اور غمناک کیفیت میں مبتلا وجود نے اسے بے خود کر ڈالا تھا۔ جذبے غلوں و مروت سے مربوط ہوں تو زخموں کے لئے مرہم بن جایا کرتے ہیں۔ اس وقت بھی

ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کی بے غرض مروت اثر پذیر ہوئی تھی۔ وہ جو تکلیف سے مدھال ہو رہی تھی یکدم ہی جیسے جلن میں ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی تھی۔ ذہن سبک چلتی

ہوئی ہوا کی مانند ہو گیا تھا۔

دھیرے دھیرے حرکت کرتی ہوئی اس کی انگلیاں طمانیت بخشنے لگی تھیں۔ خمار اس کی رگ رگ میں سرور بن کر اترنے لگا۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ بے خبر سو رہی تھی۔ شاہویر، طویل سانس لے کر اس کے قریب سے اٹھ گیا۔ تمام کھینچڑ اسے خود ہی سمیٹا تھا۔

□●□

”بہن جی! آپ نے شاہویر سے بات کی؟“ حسن بیگ کھانے سے فارغ ہوئے تو کافی کے مگ اندر لاتی ہوئیں بے جی سے مخاطب ہوئے۔ ان کے لہجے میں بے چینی و اضطراب تھا۔

”جی بھائی صاحب! میں نے کہا تھا اس سے۔ پہلے تو وہ مانا نہیں۔ مجھے چھوڑ کر اور مشعل کو ساتھ لے جانے پر تو قطعی رضامند نہ تھا۔“ انہوں نے کافی کا مگ انہیں پکڑاتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”پھر اب کیا ہوگا؟“ وہ از حد متفکر ہو گئے۔

”آپ اتنی جلدی پریشان مت ہو جایا کریں بھائی صاحب۔ میں نے شاہویر کی پرورش اس وقت سے کی ہے جب یہ چھ ماہ کا تھا۔ شاہویر کے والد میرے خالہ زاد بھائی تھے لیکن ہمارے اندر محبت سگے بہن بھائی جیسی تھی۔ کیونکہ میرے والدین فوت ہو جانے کے بعد میری خالہ یعنی شاہویر کی نانی مجھے اپنے گھر ہی لے آئی تھیں اور خالہ خالو نے مجھے ماں باپ کی محبت دی اور بیٹی کی طرح ہی بہت دھوم دھام سے میری رخصتی کی تھی۔ میرے نصیب میں دوبارہ اس گھر میں آنا لکھا تھا اور میں شادی کے چھ سال بعد ہی بیوہ ہو کر دوبارہ اس دلہیز پر آ گئی۔ شاہویر کی ماں شاہویر کی پیدائش کے بعد اللہ کو بیماری ہو گئی تھی۔ اس کی پرورش دادی دادا اور باپ کر رہے تھے اور حادثے میں اس کا باپ بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلا گیا تو اس کے دادا دادی تو کو یا نیم مردہ ہو گئے۔ ایسے میں، میں نے آگے بڑھ کر ان کو سنبھالا۔ ننھا شاہویر خود بخود ہی میری کود میں آ گیا۔ شاید اسی لئے میری کود برسوں سے سونی رہی تھی۔ شاہویر میری کود میں کیا آیا میری روتی تڑپتی متا کو قرار آ گیا۔ اسے پا کر میں خود کو مکمل محسوس کرنے لگی۔ میری تفنگی، میری آزدگی، محرومی مٹ گئی۔ خالہ خالو کو جو ان بیٹے کی موت کا غم دیکھ بن کر چٹ گیا جس نے ایک سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے ان کی جان لے لی۔ میں اور شاہویر ایک دوسرے کے سہارے زندہ رہ گئے اور انہیں سے ہم ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن گئے۔

شاہویر بچپن سے ہی بہت حساس، ذہین اور کم کوجہ تھا۔ جب بڑا ہوا تو میرے لئے سایہ دار درخت کی طرح بن گیا۔ ایک مضبوط قلعے کی مانند۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس کی ماں نہیں سمجھو ہوں، اس کی محبت، یگانگت، عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں آئی۔ میری کوئی خواہش وہ رد نہیں کرتا، کوئی بات نہیں مانتا۔ میں اس کے مزاج کے ہر رنگ، ہر روپ سے آگاہ ہوں۔۔۔۔۔ بات منوانے کا ہنر جانتی ہوں۔ میں نے اسے راضی کر لیا ہے مشعل کو ساتھ لے جانے کے لئے۔“ بے جی نے دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا تو حسن بیگ صاحب جو کو گلو کی کیفیت میں بیٹھے ہوئے تھے بے جی کے آخری جملوں نے ان کے چہرے پر بٹاشت بھری مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ ان کے چہرے سے تفکرات کی سیاہ گھٹائیں چھٹ گئی تھیں۔ از حد طمانیت بھری مسکراہٹ چہرے کو روشن کرنے لگی۔

”تھینکس گاڈ! بیو آپ نے بہت اچھی خبر سنائی ہے بہن جی۔ پھر کب روانہ ہوں گے وہ دونوں؟“

”کل سہ پہر تک۔ شاہویر کافی دیر تک آپ کا انتظار کر کے گیا ہے۔ اسے تیاری کرنی تھی اس لئے مزید انتظار نہ کر سکا۔“

”کاروباری معاملات وہ مجھے پہلے ہی سمجھا چکے ہیں۔ میرے لئے کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔ ہاں آپ نے انہیں فارم ہاؤس وغیرہ کے بارے میں سمجھا دیا تھا؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ ابھی یا جانے سے قبل شاہویر آپ سے رابطہ ضرور کرے گا آپ سمجھا دیجئے گا۔“ بے جی کافی کے مگ اٹھاتے ہوئے کو یا ہوئیں تو حسن بیگ نے جواب دیا۔

”جی ضرور۔۔۔۔۔ وہاں انہیں کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ میں نے وہاں موجود اپنے ملازموں کو پہلے ہی حکم دے دیا ہے۔“

□●□

کسی نظر کو تیرا انتظار آج بھی ہے

بے جان جسم کو روح کی تلاش آج بھی ہے

کوئی تو پوچھے میرے دل سے حال میرا

یہ کیا مذاق ہوا ہے میرے مقدر سے

اسی نے زہر پلایا جو تھا میا میرا

کسی نظر کو تیرا انتظار آج بھی ہے

بے جان جسم کو روح کی تلاش آج بھی ہے!

رشتوں کے درمیان حائل فاصلوں کو سمیٹنے کی سعی نہ کی جائے تو فاصلے بڑھ کر حیات سے تمام رنگ و روپ چھین کر انتظار لا حاصل بن جاتے ہیں۔ فاصلوں کو قریبوں میں بدلنے کی سعی دونوں جانب سے ہوتو کامیاب ہوتی ہے لیکن جہاں ایک فرد کو فاصلے ملانے کی جستجو ہو اور دوسری جانب سے خود غرضی و لا تعلقی کا رویہ برقرار رہے تو فاصلے مٹنے کی بجائے صدیوں پر محیط ہو جاتے ہیں۔

رشتے بلا غرض ہوں تو نبھائے جاسکتے ہیں۔

تعلق پُر غلوں ہوں تو روابط کبھی نہیں منقطع ہوتے۔

اگر ان تعلقات میں لالچ، غرض، کھوٹ و دغا شامل ہو جائیں تو پھر ان تعلقات کی بنیاد کمزور ہو جاتی ہے۔ دیواریں کھوکھلی ہو کر گرنے لگتی ہیں۔ رشتے گھائل ہو کر دم توڑ دیتے ہیں۔

یہ سب اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

باقر نے ابھی کچھ دیر قبل فون کر کے دھمکی دی تھی یا اطلاع وہ سمجھ نہ سکی تھی۔ اسے صرف یہ یاد تھا کہ وہ پرسوں تک اس کی مطلوبہ رقم لے کر گھر نہ پہنچی تو باقر نہ صرف دوسری شادی کر لے گا بلکہ ساتھ ہی اسے طلاق بھی دے گا اور طلاق کا لفظ اس کے ہوش و حواس گم کر گیا تھا۔ اس سے قبل بھی طلاق کے مکروہ لفظ کو وہ کئی بار بطور ہتھیار استعمال کر چکا تھا۔

وہ ہر بار اس گالی کے خوف سے ہاتھ پھیلائے آ جاتی تھی۔

طلاق ایک گالی ہی تو ہے عورت کے لئے۔۔۔۔۔ خواہ اس میں عورت قصور وار ہو یا بے قصور، سزا دونوں کو ایک ہی ملتی ہے۔

لوگوں کے نظر یہ اور کاٹ دار جملے، تمسخرانہ کچ ہیں، تضحیک آمیز رویہ، مطلقہ عورت کا نصیب اس کا مستقبل بن جایا کرتے ہیں۔

کوئی گہرائی میں نہیں جاتا۔ سطحی ذہنیت والے سطح کا ہی جائزہ لیتے ہیں۔ ان کے لئے زبان اور کچھ ہوں سے سنگسار کرنے کے لئے یہ جواز ہی کافی ہوتا ہے کہ ایک عورت کو اس لئے علیحدہ کیا گیا کہ مرد کے لئے ناقابل قبول، ناقابل برداشت تھی۔

بات بچ ہو یا جھوٹ، نسا نے ہزاروں تراشے جاتے ہیں اور وہ ایسے کسی نسانے کا کردار نہ بنیں چاہتی تھی۔

”ارے دیکھا پیاری خالہ کو، بالوں کے ساتھ ساتھ ان کا تو خون بھی سفید ہو گیا۔ دو پیسے کیا آگے اپنوں کو ہی بھول گئیں۔“ زریہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے حسبِ عادت تیز تیز لہجے میں بول رہی تھیں۔

”کیا ہوا اماں۔۔۔۔۔ پیاری خالہ آپ کو کہاں مل گئیں؟“ سارہ مصروف انداز میں کو یا ہوئی تھی۔

”وہیں آئی ہوئی تھیں اچھے میاں کے ہاں۔۔۔۔۔ پہلے تو مجھے دیکھ کر ایسی بن گئیں جیسے دیکھا نہ ہو۔ میں نے قریب جا کر کہا خالہ مجھے پہچانا نہیں؟ تو کہنے لگیں میری دور کی نگاہ کمزور ہے۔ حالانکہ نگاہوں پر ایسے مولے شیشوں کا عینک لگا رکھا تھا کہ وہ عورت کی بجائے بھینس کی آنکھیں لگ رہی تھیں۔ میں نے کہا خالہ سنا ہے تم نے محل جیسا گھر بنایا ہے، بڑے چہرے پر ہیں برادری میں تمہارے گھر کے، میں دیکھنے آؤں گی۔ تو پتہ ہے کیا کہنے لگیں؟“

”کیا؟“

”کہنے لگیں ابھی تو ہمارے پاس فرصت نہیں ہے۔ جب کبھی فرصت ہوگی تو آ جانا مگر اطلاع کر کے آنا۔ جہاں ہم رہ رہے ہیں وہاں یہ رواج نہیں ہے کہ جب جس کے ہاں چاہا منہ اٹھا کر چل دیے۔ وہاں آنے سے پہلے خبر کی جاتی ہے کہ ہم آرہے ہیں تاکہ کوفت و پریشانی سے بچا جائے اور صاف بات یہ ہے کہ میرے بیٹوں کو پرانے ملنے جلنے والے رشتے داروں سے ملنا پسند نہیں ہے۔ ایک بار گھر دیکھنے آتے ہیں دوسری بار پیسہ مانگتے۔“

”ارے اماں! پیاری خالہ تو بہت ملنسار و ہمدرد طبیعت کی مالک تھیں۔ ایک دم سے اتنی بے مروت و بد لحاظ کس طرح بن گئیں؟“

”یہ سب اس گٹھڑے پیسے کی پٹی ہے جو ان کی آنکھوں پر بندھ گئی ہے۔ خیر میں نے بھی کون سی کسر چھوڑی۔ وہ اگلی کچھلی کھولی کہ اسے اپنی اوقات یاد آ گئی۔

”کیا ضرورت تھی اماں فضول میں کسی کے منہ لگنے کی؟“

”میں کیوں کسی کے منہ لگنے لگی۔ وہ جو بد لحاظ بنی منہ در منہ کو اس کر رہی تھی۔ کل ہمارے برابر پڑوس میں رہ رہی تھی تو ہم بڑے اچھے لگ رہے تھے۔ رات دن کچھ نہ کچھ مانگنے پٹی آتی تھی بلکہ اکثر میں یا اصغر اس کا راشن بھرواتے تھے۔“

”ہائے اللہ اماں۔۔۔۔۔ تم نے ایسی باتیں بھی بول دیں؟“ سارہ کا انداز استعجابیہ تھا۔

زریہ نے فخر سے کو یا ہوئیں۔ ”ارے باتیں؟ میں نے ایسے ایسے طعنے دیئے کہ چھپنے کے لئے شرم سے جگہ بھی نہ ملی۔ بڑی بڑی باتیں بگھا رہی تھیں۔ جس پڑوس کو فخر سے



ساتھ لے کر آئی تھیں، ان کی اصلیت سن کر وہ بھی دنگ رہ گئی۔ اب دیکھنا امیروں کے محلے میں اس نے خود کو خاندانی امیر بتایا تھا کل تک دیکھنا سب کو ان کی اصلیت معلوم ہو جائے گی۔ عورتیں امیر گھرانے کی ہوں یا غریب گھرانے کی عادت سب میں مشترک ہوتی ہے۔ چغلی کھانے کی، گھر گھربات پھیلانے کی۔“

”بہت برا ہوا..... تمہیں اس طرح نہیں کرنا چاہئے تھا ماں! ایک تو تم ان کی راز کی باتیں بتا کر گناہ گار ہو گئیں۔ پھر ان پر کئے گئے احسانات گنوا کر وہ نیکیاں بھی ضائع کر ڈالیں جو احسان کے بدلے میں ملی تھیں۔“

”ارے چھوڑو، تم تو بس مجھے ہی سمجھاتی رہا کرو۔ ہائے یہ کیا یہ تمہارا بیگ کیوں تیار رکھا ہوا ہے؟ کہاں جا رہی ہو؟“ باتیں کرتے کرتے معان کی نگاہ کمرے کے وسط میں رکھے سیاہ چرمی بیگ پر پڑی تو وہ استعجاباً انداز میں اس کی طرف دیکھ کر گویا ہو گئیں۔

”میں جا رہی ہوں ماں!“

”تم جا رہی ہو..... مگر کہاں؟“

”جہاں سے آئی تھی، باقر کے ہاں۔“ اسے اپنی آواز خود ہی از حد دھیمی کھو کھلی لگی۔ جب کے زریہ سٹپٹا کر گویا ہو گئیں۔

”دماغ تو نہیں خراب ہو گیا تیرا؟ میں تجھے جانے نہیں دوں گی۔“

”مجھے مت روکو ماں!“ وہ اٹھ کر ان کے سینے سے لگ کر رو دی۔

”باقر کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہے ہیں پرسوں تک میں رقم لے کر ان کے پاس نہ پہنچی تو وہ..... مجھے..... طلاق دے دیں گے..... اور دوسری شادی کر لیں گے۔“

”آسان کام ہے کیا طلاق دینا؟ اور کون اس کے کروٹ دیکھ کر اپنی بیٹی دے گا؟ یہ تو میں ہی عقل کی اندھی تھی جو اپنی بیٹی بلا کسی چھان پھنک کے ان حریص لوگوں کو دے دی۔“

”اس دور میں ہر کسی کو لڑکیاں مل جاتی ہیں خواہ وہ چور ہو، قاتل ہو یا ڈاکو اسمگلر، رشتوں کی قلت، عدم دستیابی کے باعث ماں باپ وقتی طور پر آنکھوں پر پٹی اور ہونٹوں پر قفل ڈال لیتے ہیں۔ انہیں جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہونا ہوتا ہے خواہ بعد میں وہ بوجھ مزید وزنی ہو کر دوبارہ ان کے سینوں پر ہمیشہ کے لئے جم جائے۔

یہ اس معاشرے کی بد نصیب بیٹیوں کا المیہ ہے۔

باقر کے متعلق سب جانتے ہیں، ان کی ہڈ حرام اور کامل فطرت کو جاننے کے باوجود ان کے گئے چچا اپنی بیٹی دے رہے ہیں جو رشتوں کی آس میں انتظار کرتے کرتے چالیس کے ہند سے عبور کر چکی ہے اور باقر سے سات سال بڑی ہے۔“

”چالیس سال کی بڑھیا سے شادی کرے گا؟“

”وہ چالیس لاکھ بھی تولائے گی جینز میں ساتھ۔“

”ارے لعنت ہو ایسے چیز اور دولت پر۔ لو بھلا اپنی ماں کی عمر کی عورت سے شادی کرے گا وہ بد بخت۔ میرا دل نہیں مانتا۔ یہ اس کی چال ہے۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔“ وہ جوش و غصے سے اٹھی تھیں اور اس کا بیگ اٹھا کر اسٹور میں رکھ آئی تھیں۔

□●□

کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے اپنی ذات کی نفی کرنا، خلاف سرشت وہ کام کرنا جس کو دل نہ مانتا ہو۔ ایک ایسے شخص کی ہمارا ہی قبول کرنا جس سے کوئی قلبی وابستگی نہ ہو لیکن جو حیات کا مالک بن بیٹھا ہو۔

کارٹیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف کھیتوں کا سلسلہ تھا اور دوسری جانب میدان، ٹوٹی پھوٹی پہاڑیاں یا جھونپڑیاں تھیں۔ دوسری جانب منظر بدل رہے تھے۔ ایک طرف مسلسل کھیتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ہر سو خاموشی و گمبیر اداسی چھائی ہوئی تھی۔

ایسی بے معنی خاموشی و بے نام اداسی خواہ مخواہ ہی من کو بوجھل، طبیعت کو بے کل کر ڈالتے ہیں۔ وہ بھی اس کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ گزرا ہوا وقت تیزی سے نگاہوں میں گھومنے لگا تھا۔

پاپا کی بے مثال محبت، چاہت کے بے شمار مناظر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے تھے۔

جو جو کی بے قراریاں، جنوں، عشق، اسے پالنے کی تدبیریں، رافعہ آئٹی کی محبت، اس کے ناز اٹھانے کے انداز، منظر نگاہوں میں اس طرح ہی بدل رہے تھے جیسے ٹی وی اسکرین پر ایک کے بعد ایک منظر بدلتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں دھواں بھرنے لگا۔ یادوں کا۔ ان کے قریب تھی تو اسے ان سے بہت ساری شکایتیں بھی تھیں۔ کئی موتوں پر وہ پاپا سے تھا ہوئی تھی۔

جو جو سے اکثر لڑائی ہو جاتی تھی۔ اپنی غلطی نہ ہونے کے باوجود وہ اسے منایا کرتا تھا۔ وہ بہت پرواہ کرتا تھا اس کی۔ از حد خیال رکھتا تھا، بے حساب چاہت لانا تھا۔

رافعہ آئٹی بھی بہت چاہتی تھیں حالانکہ اس نے کافی بدتمیزی ان سے کی اور کئی بار کی۔ وقتی طور پر انہوں نے بھی کوئی لحاظ و مروت نہ برتی تھی لیکن اب وہ جس والہانہ محبت سے ملی تھیں اور اسے کھو کر جس ندامت و گہرے دکھ کا اظہار انہوں نے کیا تھا ان احساسات نے اس کے دل پر چھائی تمام کدورت و بے اعتنائی کی دھند صاف کر ڈالی تھی۔ وہ اس کے لئے وہی پہلی والی آئٹی بن گئی تھیں۔ کبھی کبھی پرانی یادیں اتنی اچھی لگتی ہیں جیسے سخت جس کے موسم میں یکدم ہی ٹھنڈی ٹھنڈی عطر پیڑ ہوائیں گنگنا نے لگیں۔

یادوں میں اتنا سوز کیوں ہوتا ہے؟

جو چھن جاتا ہے وہ متاع حیات کیوں محسوس ہونے لگتا ہے؟

جو بڑا اہم چھوڑ آتے ہیں، زندگی پلٹ کر اس جانب کیوں جانا چاہتی ہے؟

محبت اگر شمار کرنا تو عدد اوتیس بھی شمار کرنا

جو میرے خلاف کی گئیں وہ سازشیں بھی شمار کرنا

تم اپنی مجبوریوں کے قصے بھی ضرور لکھنا وضاحتوں سے

جو میری آنکھوں میں جل بھی ہیں

وہ حسرتیں بھی شمار کرنا

شاہ ویز نے کارڈ رائیو کرتے ہوئے کئی بار اس کی جانب اچھتی نگاہ سے دیکھا اور محسوس کیا وہ یہاں ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں تھی۔

’تم اس وقت یہی سوچ رہی ہو میری جگہ جو جو ہوتا تو یہ سفر کس قدر حسین اور خوشگوار ہوتا..... ہے نا؟‘ اس کی سنجیدہ آواز مشعل کو سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔ اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ سیاٹ تھا جیسے اس نے کوئی اچھی بات کہی ہو مگر اس کے ٹھنڈے لہجے میں ایسی ہی آگ تھی جس طرح سمندر میں شعلے بھڑک رہے ہوں۔ پانی اور آگ کا ملاپ ہر ذی روح، ذی شعور کو چونکا ڈالتا ہے۔ مشعل بھی تیر زدہ تھی۔

وہ کس طرح اس کی سوچوں تک رسائی پا جاتا ہے؟

کوکہ جو جو کا ساتھ وہ اس وقت نہیں چاہ رہی تھی پھر بھی سوچیں ان لوگوں کے ارد گرد ہی گھوم رہی تھیں۔

شاہ ویز نے اس کی جانب دیکھا۔ مشعل نے اس کے نظریں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر اس کے رنگ بدلتے چہرے نے اس کے لبوں پر تسخرا نہ مسکراہٹ سی نمودار کی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔

اقبال بانو کی پرسوز آواز جا دو پھیلا نے لگی۔

دشت تہائی میں اے جان جہاں

لرز ایں ہیں تیری پلکوں کے بھگکے ہوئے رخسار

دشت تہائی میں.....

مشعل نے گہرا کر شاہ ویز کی جانب دیکھا تھا۔ وہ بھی اس وقت اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نگاہیں لکرائیں۔ از حد پرسکون چہرے پر۔ بے حد چمکتی روشن براؤن آنکھوں میں کوئی الیلا، انجانا، ان دیکھا جذبہ نہ تھا۔ دھیمی سرخی نمایاں تھی۔

اس سرد مزاج، کم سخن شخص کی بولتی آنکھیں عجیب سا سوز، ان کہا سادہ لہجے ہوئے تھیں۔ اور بھی بہت کچھ تھا ان نگاہوں میں۔ مشعل نے گہرا کر نہ صرف آنکھیں جھکائیں بلکہ تیزی سے رخ بھی موڑ لیا تھا۔

اٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تیری سانسوں کی آغ

اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم

دور افق پار چمکتی ہوئی قطر قطرہ

گر رہی ہے تیری بے داغ نظر کی شبنم

دل بری طرح دھڑکے جا رہا تھا۔ ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا کہ اس نے صنف مخالف سے آنکھیں چار کی ہوں۔ شادی سے قبل وہ سب سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی عادی تھی۔

جو جو، مائیکل، سہنی، اے، امرا، پیٹر، راجیش..... اس کے دوستوں کی فہرست طویل تھی۔

لڑکیوں سے وہ فرینڈ شپ کرنے کی عادی نہ تھی۔ جو جو کا ساتھ زیادہ رہا تھا اور اس کی سنگت میں بھی ایسا کوئی لمحہ نہ آیا تھا جس نے اس کا دل دھڑکا ڈالا ہو بلکہ کسی بات پر وہ ہی جو جو یا کسی فرینڈ ز کو گھورتی تو وہ گڑبڑا کر نکلا ہیں جہاں لیتے تھے۔

دشت تنہائی میں اے جان جہاں

کس قدر پیار سے اے جان جہاں رکھا ہے

دل کے رخسار پر.....

اس نے ہاتھ بڑھا کر کھٹاک سے کیسٹ پلیئر بند کر دیا۔

ماحول میں پھیلی ہوئی اداسی و ویرانی پہلے ہی اسے ڈسٹرب کئے ہوئے تھی۔ مستزاد غزل نے اداسیوں کو مزید سوا کر ڈالا تھا۔

اس نے وحشتوں سے گھبرا کر ٹیپ آف کر دیا تھا۔

”کیا ہوا.....؟“ شاہویر نے استعجابیہ لہجے میں دریافت کیا۔

”مجھے پسند نہیں ہے اس طرح کی میوزک۔“ اپنے دل کی حالت کس طرح عیاں کرتی۔

”اوہ..... تمہیں تو وہ کان پھاڑ دینے والی، دل دہلا دینے والی میوزک پسند ہے جس کے سارے سُر بے سُر ہوتے ہیں بلکہ سُر ہی نہیں ہوتے۔“

”میں سُر اور سنگیت نہیں جانتی۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ ایسی میوزک مجھے پسند نہیں جو موڈ فریش کرنے کے بجائے پزل کر دے۔“ بہت دھیمے، بہت آہستگی سے اس نے وضاحت کی تھی۔ ورنہ وہ چہرے کے لگائے جاتا۔

”میں اس فقرے پر یقین نہیں رکھتا کہ موسیقی روح کی غذا ہے، بلکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں اتنا کہوں گا کہ تلاوت قرآن روح کی غذا ہے اور ہماری زندگی کے لئے سکون و اطمینان بھی۔ البتہ کبھی کبھی لائٹ میوزک اچھی لگتی ہے۔ اگر شاعری اچھی ہو تو سماعت پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے

ہمارے دل کی آواز شعروں میں ڈھل رہی ہے۔ پھر ہم اس بحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔“

”ابھی کتنی دور کا راستہ باقی ہے؟“ اس کے لہجے میں جھکن تھی۔

”تین چار گھنٹے تو لگیں گے۔“

”اوہ..... کوئی شارٹ کٹ وہ نہیں ہے؟“

”ہاں ہے..... مگر وہاں جراثیم پیشہ افراد گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں جو موقع ملتے ہی مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں اور اگر کوئی ٹھیک ٹھاک لوگ مل جائیں تو انہیں مار لیتے ہیں اور تانہ لے کر چھوڑتے ہیں۔ اگر کہو تو وہاں لے چلوں؟“

”نن..... نہیں..... مجھے ڈاکو، چوروں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ ہم اسی راستے سے چلیں گے، خواہ زیادہ ٹائم لگ جائے۔“ وہ خوف سے جھرجھری لے کر کوپا ہوئی۔ شاہویر زیر لب مسکرا رہا تھا۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔

تھرماس میں کافی ختم ہو چکی تھی۔ شاہویر کو چائے کی طلب شدت سے ہونے لگی تو اس نے کار بھونپڑی نما ہوٹل کے سامنے روک دی تھی۔

ابھی وہ اس کا مقصد صحیح طور پر سمجھ نہ پائی تھی کہ وہ ڈرائیونگ ڈور کھول کر باہر نکل گیا۔

سفید چمکتی ہوئی لمبی کار وہاں رکتی دیکھ کر ہوٹل سے ایک نوٹرز کا بڑی مستعدی سے آگے بڑھا تھا اور ماتھے تک ہاتھ لے جا کر شاہویر کو سلام کیا تھا۔

”چائے تو لے آؤ راز و دراز قسم کی۔“ سلام کا جواب دینے کے بعد شاہویر مسکرا کر اس لڑکے سے مخاطب ہوا تھا۔

لڑکا جس تیزی سے آیا تھا اس سے بھی زیادہ پھرتی سے واپس گیا تھا۔

”چائے چوگی نا؟“ وہ کھڑکی سے جھانک کر اس سے مخاطب ہوا تھا۔ اس کی نظریں مشعل کے چہرے پر تھیں۔

سرخ و سیاہ امتزاج کے سوٹ میں اس کی شفاف رنگت دمک رہی تھی۔ غصے، ضد، جھنجھلاہٹ، بدتمیزی، خود سری، ہٹ دھرمی، تنفر و غرور سے پاک انداز چہرے پر اس قدر نرمی و دلکشی پھیلائے ہوئے تھا کہ وہ بلا ارادہ اسے دیکھ رہا تھا۔

”ہم..... یہاں کی چائے پیئیں گے؟“ اس کے لہجے میں کراہیت تھی۔

”ہاں..... وہ جو سامنے چائے پی رہے ہیں۔“ اس نے انگلی سے ان لوگوں کی جانب اشارہ کیا جو سامنے چار پائیوں اور لکڑی کے بیچوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور جن میں سے زیادہ تر لوگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ”وہ انسان نہیں ہیں یا ہم؟“ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں بولا تو اس نے خاموشی سے ہونٹ

بھینچ لئے۔

لڑکا اپنے ساتھ دوسرے لڑکے کو بھی لایا تھا جس نے سلور کا بدرنگ جگ پکڑا ہوا تھا اور ساتھ ہی چوڑے منہ والا بے ڈھب گلاس بھی اس بچے کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

دوسرے لڑکے کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ٹرے میں دو پلیٹیں رکھی تھیں جن میں ایک میں ایک پیس اور دوسری میں زیرے کے بسکٹ تھے۔ ساتھ ہی دو صاف ستھرے کپ ساسر پر رکھے تھے جن میں بھاپ اڑاتی چائے تھی۔

”میں چائے نہیں پیوں گی۔“

چائے کے معمولی برتن، چائے لانے والے بچوں کا حلیہ اس کی نفاست پسندی و نازک مزاجی کبھی ہضم نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے قطعی انکار کر دیا تھا اور شاہویر نے بھی اصرار کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہیں قریب پڑی ٹوٹی پھوٹی کرسی میز پر بیٹھا اطمینان سے چائے کے ساتھ کیک پیس کھا رہا تھا۔ قریب ہی وہ دونوں بچے کچھ شرما کر، مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ یقیناً ان سے وہ انٹرویو لے رہا تھا اور اس سے اس کی مسکراہٹ ہونٹوں پر کوپا چپک کر رہ گئی تھی اور چہرے پر بھی بڑی نرم و روشن مسکراہٹ تھی۔ بہت دوستانہ تھا اس کا انداز۔ مشعل کار کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”کتنی سوٹ کرتی ہے اس پر بیڑم مزاجی و خوش دلی۔ کیسا روشن روشن ہو جاتا ہے سراپا۔ کوئی اس شخص کا وہ روپ دیکھے تو یقین نہ کرے کہ اتنا مہذب و خوش مزاج شخص اس قدر بد دماغ، منہ زور اور ہاتھ چھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔“

اس کے ہونٹوں پر طعنے مسکراہٹ پھیل گئی۔ سامنے وہ اس کی سوچوں سے بے خبر مگن بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا اسے اندر بیٹھے انتظار کرتے ہوئے جب کہ شاہویر بڑی بے فکری سے اندر ہوٹل میں چلا گیا تھا اور وہاں لوگوں سے باتیں کرتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آدھا گھنٹہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ نہ آیا تو اس کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے دوسرے ہارن بجانے کے بعد تیسری مرتبہ ہاتھ نہ ہٹایا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے کیا تمہارا؟ ہاتھ ہٹاؤ۔“ وہ آتے ہی غرایا تھا۔

”مجھے یہاں بٹھا کر وہاں آرام سے بیٹھے باتیں بنا رہے ہو۔ ابھی نہ معلوم کتنا سفر باقی ہے اور تمہیں کوئی فکر ہی نہیں۔ ہر جگہ تمہیں اپنی کیلنگری کے لوگ مل جاتے ہیں۔“ کار کے ساتھ ساتھ اس کی بڑبڑاہٹ بھی شروع ہو گئی تھی۔

”انسان ہوں، انسانوں سے ہی روابط بڑھانے میں سکون محسوس کرتا ہوں۔ کیلنگری کبھی میرا کمپلیکس نہیں رہی۔ جو چاہتوں کے اسیر ہوتے ہیں وہ مادیت پسند نہیں ہوتے۔ کیا ملتا ہے انسان کو زہر، زمین، جاسید احوال کر کے؟ سب ہمیں رہ جاتا ہے۔ کچھ بھی تو ساتھ نہیں جاتا۔ پھر کیوں یہ کیلنگریاں بنائی جاتی ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”اس شخص سے کچھ کہنا ہی فضول ہے..... فوراً تقریر شروع کر دیتا ہے۔“ اس نے جل کر سوچا تھا اور خاموشی میں ہی عافیت جانی تھی۔

□●□

خرم کا بیٹا عرفان آج کل آیا ہوا تھا۔ اس دن خرم گھر میں تھے۔ وہ سارا دن بیٹے کا انتظار کرتے رہے کہ وہ ان سے ملنے آئے گا۔ ان کی شادی کو چھ ماہ ہو چکے تھے اور وہ اس سے بھی کئی ماہ قبل ملے تھے اور ان کی شادی کے بعد تو انہوں نے احتجاجاً اس سے فون پر بات کرنی بھی چھوڑ دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے باپ نے دوسری شادی

کر کے نہ صرف ان کی معاشرے میں بے عزتی کی ہے بلکہ ان کی مری ہوئی ماں سے بھی بے وفائی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ تیسری اور اہم بات جو انہیں مشتعل کر گئی وہ یہ تھی کہ ان، بہن اور بھائی کی جاسید اد میں تیسری، سستی شامل ہو گئی تھیں جو زیادہ گراں ثابت ہوئی تھی۔

ابھی بھی ان کی یہی شرط تھی کہ وہ حراً کو طلاق دے دیں تو وہ اپنی ناراضگی بھلا کر ان سے ملنے لگیں گے ورنہ وہ ان سے نہیں ملیں گے۔ خرم صاحب کو پہلے ہی بچوں کی خود غرضی و بے حسی سے شکایت تھی اور اب تو وہ ان کا بد لحاظ و بے ادب روپ خوب اچھی طرح دیکھ چکے تھے لہذا انہوں نے بھی ان کی فکر کرنا چھوڑ دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عرفان کی آمد کی خبر سن کر دل میں باپ ہونے کے ناتے ایک موہوم سی امید کی کرن جا گئی تھی کہ شاید اتنے عرصے کی جدائی ان کے اندر کوئی محبت کی تڑپ جگا دے مگر سارا

دن اپنے کمرے میں انتظار کرنے کے بعد انہوں نے بھی کوشش نہ کی باہر نکل کر اس سے ملنے کی۔

وہ از حد خود دار، ضدی و باوقار اور با اصول انسان تھے۔ بے تحاشا دولت نے انہیں لاپرواہ اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والا بنا ڈالا تھا۔

برنس کے سلیٹے میں ایک ہفتے کے لئے انہیں نیپال جانا تھا اور جانے سے قبل انہوں نے بہت سوچا کہ وہ بھی ساتھ چلی جائیں مگر وہ امی حضور کو چھوڑ کر جانے کے لئے راضی نہ تھیں۔ سو وہ بے دلی سے انہیں ہمیں چھوڑ گئے تھے اور جاتے جاتے سمجھا گئے تھے کہ وہ عرفان سے بالکل گفتگو نہ کریں، جب اسے توفیق نہ ہوئی کہ سوتیلی ہی سہی

ماں سمجھ کر سلام کرنے آ جاتا حالانکہ اسی گھر میں رہ رہا تھا۔ امی حضور کی بیماری کے دنوں میں ان کی تیمارداری کرنے سے وہ اور اس کی بیوی صاف انکار کر چکے تھے۔ اب امی حضور سے خوب خاطر میں کروا رہا تھا۔

وہ جواب میں خاموش رہی تھی۔ خرم چلے گئے۔ وہ تنہا ہو گئی اور موقع دیکھ کر امی حضور کے کمرے میں آ گئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ ڈھکا پٹی لہجے میں کوپا ہوئیں۔

”خوب رہی بہو یہ بھی..... کوئی مہمان بن کر تمہارے گھر آئے اور تم ایسی مصروف کہ مہمان داری تو ایک طرف، رواداری نبھانا بھی کوارانہ کرو۔“

”مجھے احساس ہے امی حضور! لیکن خرم کی اجازت نہیں ہے۔ وہ بہت خفا ہیں عرفان سے کہ اتنے عرصے بعد آنے کے باوجود بھی وہ ان سے ملنے نہیں آئے۔ کتنا انتظار کیا

تھا۔“ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے وہ لاجب جت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”کوئی انہونی بات تو نہیں ہوئی۔ اگر عرفان ملنے نہیں گیا تھا تو خرم خود آجاتے بیٹے سے ملنے۔ آخر بیٹا دوسرے شہر سے طویل عرصے بعد آیا ہے۔“

”امی حضور! یہی بات آپ عرفان کو سمجھاتیں تو زیادہ مناسب ہوتا۔“

”آخر آگئی نہ وہی سوتیلے اور سگے والی بات۔ سوتیلی ماں ہونا، کس طرح سوتیلے بیٹے کی طرف داری کر سکتی ہو۔ خاوند کو سمجھایا نہ گیا کڈرانا کی نیچی کر کے بیٹے کو منائے۔

کیا باپ آکر بیٹے کا ہاتھ پکڑتا تو بیٹا باپ سے ملتا نہیں؟ وہی بات ہوئی کہ باپ کو پرواہ کہاں ہے، انہیں بیوی مل گئی اب کسی اور کی انہیں کیا ضرورت ہے؟“ آج تو ان کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ جن لبوں سے پھول جھڑا کرتے تھے ان سے انگارے نکل رہے تھے۔ وہ دم بخود بیٹھ گئی تھی۔

”اگر تم چاہتیں تو وہ عرفان سے مل سکتا تھا۔ مرثو ایسے ہی لا پرواہ و بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہ عورت کا کام ہوتا ہے کہ اپنے مرد کو رشتوں کی سمجھ بوجھ دے۔ مرد عورت سے رشتوں، ماتوں کے بارے میں جانتا ہے۔“ آج تو ان کی جون ہی بدلی ہوئی تھی۔

وہ ہونٹوں کی طرح امی کی شکل دیکھ رہی تھی۔ انسان تو وقت سے بھی زیادہ تیزی سے بدلتا ہے۔ ان کی منطق لڑائی و فلسفہ بعد از عقل تھا۔

عورت ہو یا مرد، اس کی پہلی درس گاہاں کی آغوش ہوتی ہے۔ وہیں سے وہ ابھرتے ہیں۔ اخلاق و آداب کو سمجھتا ہے، اپنے پرانے کافر ق جانتا ہے۔ دور اور قریب کے رشتوں سے واقفیت و اُنسیت حاصل کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کی بنیاد ماں کی پرورش رکھتی ہے۔ وہاں سے ہی ماں کے، ایک عورت کے، ایک مستقبل کے مثبت و منفی رویوں کا آغاز ہوتا ہے جو آگے چل کر اس کی شناخت بنتا ہے۔

عورت کا کام مرد کو رشتوں سے باور کرانا نہیں ہوتا بلکہ ہر ماں کی یہ ذمہ داری ہے اسے ہی ایک نسل کو پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ وہ جس نیچر کی ہوگی، وہی تربیت بچوں کو دے گی۔ پھر وہ جس کو خرم کی زندگی میں داخل ہوئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا، ابھی وہ ان کی مزاج کی باریکیوں سے ناواقف تھی۔ صرف ان کے ماننے کی محاذ تھی۔ کس طرح ان کی ذہنی رو بدل سکتی تھی۔ وہ کسی کو خاطر میں لانے والے بھی نہ تھے اور اس سے زیادہ باپ و اولاد کا رشتہ سمجھنے والے تھے۔ از حد کروفر و دبدبہ تھا ان کی شخصیت میں۔ وہ خود بہت سنبھل کر گفتگو کرتی تھی۔ مبادا ان کا موڈ خراب نہ ہو جائے۔ ان کو سمجھانے یا بتانے کی پوزیشن میں ابھی کیا، کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ امی حضور کے تلخ رویے سے خائف ہو گئی تھی۔ ان کی ہر بے تکلیف بات و بے جا اعتراض کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت رکھتی تھی مگر ان کی عزت دل سے کرتی تھی۔ اسی لئے خاموش بیٹھ گئی تھی۔

”آپ ملول نہ ہوں امی حضور! کوئی ہی ہو گئی مجھ سے..... معاف کر دیجئے۔“ اس نے انہیں راضی کرنے کے لئے کچھ بھانپا تھا جوڑ دینے تو ان کا موڈ بہتر ہوا۔

”میں نے جو کچھ کہا تمہیں برا ضرور لگا ہوگا۔“

”نہیں نہیں امی حضور! آپ میری بڑی ہیں..... میری بزرگ ہیں..... بھلا میں آپ کی بات کا برا کیسے مانوں گی؟“ اس کے شفاف لہجے میں کچھ چمک رہا تھا۔

”میں تمہارا برا نہیں چاہتی اور چاہتی ہوں کہ اس گھر میں اچھی طرح اپنے قدم جما لو بہتر ہے۔ کیونکہ تمہاری حیثیت سوتیلی ماں ہونے کی وجہ سے بڑی نازک ہے۔ اگر تم خرم کی پہلی بیوی بن کر آئیں تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ تمہارا ہم عمر ہوتا اور بچے بھی سگے ہوتے تو تمہیں اس گھر سے کوئی بے دخل کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ خرم نے اس عمر میں شادی کی ہے۔ کب اس کا مزاج بدل جائے پھر دوسرے نہیں ہے۔ پھر اولاد کا دباؤ اس پر مسلسل ہے کہ وہ تمہیں طلاق دے گا تو وہ باپ سے ملیں گے ورنہ نہیں۔ اب وہ تمہارے اور اولاد کے درمیان میں رسد کٹی کا شکار ہو گیا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس عمر میں وہ تمہاری خاطر اولاد کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ طلاق کا نام حرا کے ہوش و حواس درہم برہم کر گیا۔

”جو کچھ ہے تم نے دیکھا نہیں۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے خرم نہ عرفان سے ملنے آیا اور نہ ہی عرفان باپ کے پاس گیا۔ کچھ تو چل رہا ہے نا ان کے درمیان۔ ابھی خرم تم کو اہمیت دے رہا ہے مگر اس عمر کی محبت ڈھلچ ڈھوپ کی مانند ہوتی ہے

قبل اس کے کہ سب کچھ ختم ہو جائے، تمہیں سمجھ داری سے کام لینا ہوگا۔“ وہ گاؤں کیوں سے ٹپک لگائے دھیمے دھیمے لہجے میں اُسے سمجھا رہی تھیں۔ حرا نے ایسی دل دہلا نے والی باتیں سن کر رونا شروع کر دیا تھا۔

”ان بچوں سے راہ و رسم بڑھاؤ، انہیں اپنا سمجھو، ایسی آؤ بھگت کرو کہ وہ تمہارے عادی ہو جائیں۔ ایک طریقہ تھے تحائف کے ذریعے محبت پیدا کرنا ہے، دوسرا خدمت، ملنساری۔ خیال رکھنا، آگے بڑھ کر ملنا سب کو ہی گرویدہ بنا ڈالتا ہے تم بھی یہی گرا پنا لو۔ ایک دفعہ بچوں کے دل میں جگہ بن گئی تو پھر کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔“

”خرم ناراض ہوں گے۔“ وہ خود کو بھنور میں پھنسا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ امی حضور کی باتیں غلط نہیں تھیں۔ خرم اور عرفان کی اجنبیت و بیگانگی نے اسے بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی دیوار ہے اور اب معلوم ہوا وہ دیوار خود اس کی ذات ہے۔ اسے اپنا وجود اس طرح لگنے لگا جیسے ممنوع جگہ کا پارک کر دی جائے۔ نو انٹری میں انٹری دے دی جائے یا کسی فٹ پاتھ پر نا جائز جگہ تعمیر کر دی گئی ہو اور اب جس کے گرائے جانے کا خطرہ ہر دم بڑھتا جا رہا ہو۔

وہ سمجھ نہیں رہی تھی خرم کی بات کا احترام کرنے سے منع کر گئے تھے یا امی حضور کی ہدایتوں پر عمل پیرا ہو جن کی باتیں بھی غلط ہرگز نہ تھیں۔

”خرم کی ناراضگی کا خیال کرو یا اپنے گھر کا، فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہے۔“ وہ کہہ کر اطمینان سے لیٹ گئیں۔ حرا نے پریشان نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

□●□

”خالہ جان! السلام علیکم۔ اتنے عرصے بعد آئی ہیں۔“ سارہ بے جی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر خوشی سے دوڑ کر ان سے پٹ کر کویا ہوئی۔

”بکھیروں نے ہی کچھ اس طریقے سے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ وقت ہی نہیں ملتا۔ ایک دوسرے کے پیچھے دن گزرتے چلے جاتے ہیں اور میں یہی سوچتی ہوں کہ کل چلی جاؤں گی۔ لیکن آج تو میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ ہر حال میں یہاں آؤں گی اور دیکھ لو تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ دراصل ہم سوچتے ہیں وقت ہمارے اختیار میں نہیں رہا اور یہ صرف غلط فہمی ہے۔ ارادے کی مضبوطی، فیصلے کی طاقت ہم کو کبھی بھی شکست سے دوچار نہیں کر سکتی۔“ وہ اس کے ساتھ ہی پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

”ارے یہ سورج آج کس سمت سے نکل آیا؟ ہم پر مہربانی کا خیال کیونکر ہوا؟ ہم غریب تمہیں کس طرح حیا د آگئے..... تم تو ایسی بدل گئیں آپا کہ ہم تو تمہیں یاد ہی نہیں۔ کویا ہمیں صبر کر کے بیٹھ گئی ہو۔“ زرینہ ہاتھ روم سے غسل سے فارغ ہو کر نکلی تھیں اور بہن سے شکوے شروع کر دیئے تھے۔

”اللہ کی پناہ زرینہ! تمہاری زبان کی رفتار نے تو درزی کی قینچی کو بھی مات کر دیا ہے۔ بلا سوچے سمجھے جومنہ میں آتا ہے کہے چلی جاتی ہو۔ سوچتی سمجھتی کچھ نہیں ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں درازی عمر دے، ایمان کے ساتھ۔“ بے جی نے خفگی سے انہیں ڈانٹا تھا۔

”آپا! جب دل جلتا ہے تو سمجھو عقل گھاس جہ نے چلی جاتی ہے اور خیال اپنوں کا ہی آتا ہے۔ شکوہ غیروں سے نہیں کیا جاتا، سگوں سے ہی شکایت کی جاتی ہے۔“ تو لیے سے بال خشک کرتی ہوئی وہ ناراض لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”شکوہ، شکایت کرو، برا بھلا کہو، مجھے اعتراض نہیں ہے۔ مگر اپنے لئے تو ایسے الفاظ استعمال نہ کرو جو مجھے تکلیف پہنچائیں۔“

”ارے آپا! تمہیں کون بد بخت برا بھلا کہہ سکتا ہے بلکہ برا کہے بھی تو تم ہی زیادہ باہمت اور صبر والی ہو، نہ معلوم اللہ نے مجھے تمہارے جیسی کیوں نہیں بنایا۔ تم بے اولاد تھیں سب سے زیادہ دکھ مجھے ہی تھا کہ میری بہن کی کود سونی ہے، اس کی کوئی اولاد نہیں، کوئی ماں کہنے والا نہیں۔ تم صابر تھیں، کبھی کوئی شکوہ تمہارے لبوں پر نہیں آیا۔ اور دیکھو اللہ نے تمہارے بند لبوں کی کیسی سنی، جیتا جاگتا ہونہا رفرمانبر دار بیٹا تمہاری جھولی میں ڈال دیا۔ بے شک تم نے اسے اپنی کوکھ سے جنم نہیں دیا لیکن تمہارا اور شاہ ویز کا رشتہ کس قدر مضبوط ہے، کتنا احترام کرتا ہے تمہارا، کس قدر محبت کرتا ہے، کتنا خیال رکھتا ہے۔ اور ایک ماں کو ایسی محبتوں کے علاوہ کیا چاہئے۔ ایسے جاں نثار رویوں کی توقعات تو ہوتی ہیں۔ اب میں اتنی ہی خوش ہوں تمہارے بے اولاد ہونے پر، دوسروں کا خون تمہیں اپنے بچے سے بڑھ کر محبت دے رہا ہے، بہت خوشی کی بات ہے۔ ورنہ اولاد والی آج کل کے دور میں اولاد کی بے اعتنائی و بے رخی کی دردناک مار سہہ رہی ہے۔ مجھے ہی دیکھ لو، بیٹیاں ہیں، ان کی طرف سے بھی کبھی کوئی ناکوئی فکر پریشانی گھیرے رکھتی ہے۔ کبھی بڑی کے ساتھ کوئی مسئلہ، چھوٹی کے ساتھ کوئی الجھن، منجھلی کے لئے کوئی تردد۔ ان جھمیلوں سے فارغ بھی نہیں ہوتی ہوں کہ اکلوتے بیٹے کی طرف سے چلن لگی رہتی ہے۔ وہ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی نہ رہنے کے برابر ہے۔“

وہ بال سلجھا کر چوٹی باندھ کر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں جبکہ سارہ باورچی خانے میں چلی گئی تھی دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنے۔

”تم دل چھوٹا نہیں کرو زرینہ! سب صحیح ہو جائے گا۔“

”میرا تو بہت ہی دل دکھی ہے آپا! بہو کی حرکتوں کی تمہیں سب خبر ہے اور اصغر کے کروت بھی میں نے تم سے چھپا کر نہیں رکھے کہ کس طرح بیوی اور سسرال والوں کو ماں کے مقابلے میں اہمیت دیتا ہے انہیں۔ اٹنے سیدھے پکروں میں پڑ کر بیٹا کھو دیا ہے۔ عقل ابھی بھی نہیں آئی۔ اللہ لاٹھی لے کر تھوڑی مارتا ہے۔ اس کی مارتو ایسی ہی ہوتی ہے۔ انہوں نے میرا دل دکھایا ہے، اللہ نے میرا دل لیا مگر ابھی بھی اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہیں۔ اصغر چپکے چپکے سارہ سے کہتا ہے ماں کو راضی کرو کہ وہ جا کر فرح کو لے آئیں۔ وہ ضد باندھے بیٹھی ہے کہ جب تک ماں مجھے لینے نہیں آئیں گی میں نہیں جاؤں گی۔ میں بھی چپکے چپکے منتی ہوں اور یہ سمجھتے ہیں میں انجان ہوں۔ سارہ تو ہے ہی بدھو، فوراً اس کی باتوں میں آکر میرے پیچھے لگی رہتی ہے کہ ماں، بھابھی کو لے آؤ، بھائی پریشان ہیں۔ گھرا بیا لگ رہا ہے، گھرو بیا لگ رہا ہے۔ اس کی جگہ کوئی تیز و طرار لڑکی ہوتی تو فوراً ہی بھائی کا گریبان پکڑ کر پوچھتی کہ بھابھی کیا ماں کی اجازت سے گئی تھیں یا ماں نے اس کو گھر سے نکالا ہے جو ماں کے ساتھ واپس آئیں گی؟“

”خوب.....! اب تم بہن سے بھائی کا گریبان پکڑو او گئی؟ کچھ عقل کو ہاتھ لگاؤ۔“ بے جی نے سخت لہجے میں سرزنش کی۔

”ہائے آپا! زبان ہے، پھسل جاتی ہے۔“ انہیں خود اپنے جملے کا احساس ہوا تو غصہ ہو گئیں۔ ”میرا منصوبہ ہے کہ اگر وہ مجھے کہے کہ ماں چلو فرح کو لے کر آئیں تو کیا میں اسے انکار کر دوں گی؟ کیا مجھے احساس نہیں ہے بیٹے کی زندگی کی بے رونقی کا؟“

”تم ماں ہو، جتنا اچھا و بہتر تم اپنے بچوں کے لئے سوچ سکتی ہو ایسا کوئی بھی نہیں سوچ سکتا۔ ماں کے قدموں تلے جنت ایسے ہی تو نہیں رکھی گئی۔ بات ساری ہمارے گھریلو بنائے گئے ماحول کی ہوتی ہے، ذہنی قربت و اعتماد کی ہوتی ہے۔ بچوں سے ہمیں دوستی بھی رکھنی چاہئے، انہیں کہنے اور سننے کا موقع بھی دینا چاہئے تاکہ وہ اپنی چھوٹی بڑی ہر بات بلا جھجک ماں باپ سے کر سکیں، اپنی خوشی اور پریشانی بتا سکیں۔ ماں صرف ماں نہیں ہوتی، بہت سارے رشتے اس کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں۔

وقت پڑنے پر اسے یہ سارے رشتے نبھانے پڑتے ہیں اور ہر سکون زندگی کا راز یہی ہے۔ اور تم نے اصغر کو بہت محبت دی، بے حد خیال رکھا لیکن ایک سخت مزاج ماں کی طرح۔ اگر تم کچھ دو قی کارنگ بھی بھرتیں تو اسے تم سے چسپ کرتہارے ہی لئے سارہ سے سفارش نہیں کرنی پڑتی اور نہ ہی فرح کی ہمت ہوتی اس کے کان بھرنے کی۔ فی الحال جو کچھ ہو اس سے سبق حاصل کرو، اپنے اندر تبدیلی لاؤ، عاجزی و انکساری، اچھے لہجے کی مٹھاس اور زبان کی شیرینی دشمنوں کو بھی دوست بنا ڈالتی ہے۔ پھر یہ تو تمہاری اولاد ہے۔ ان کا سلوک و رویہ بہت جلد بدلے گا۔“

”سوچوں گی ابھی میں۔ تم تو آپا ایسی ہی باتیں کرتی ہو ہمیشہ سے۔“

”بس اب اٹھ جاؤ، اب سوچنے کا وقت گزر گیا، عمل پیرا ہونے کا وقت ہے اور نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ چلو، ہم بڑے ہیں اور بزرگی کا تقاضا یہ ہے کہ چھوٹوں کی غلطیوں کو معاف کر کے اپنے بڑے پن کا ثبوت دیا جائے۔ فرح کو لینے چلو میرے ساتھ۔“

انہوں نے کوپا دھماکا کیا تھا۔ زرینہ اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔

”میں اور اس کلہوئی کو لینے جاؤں! کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

”ہاں..... اور میں اب کوئی بکواس نہیں سنوں گی تمہاری۔ نہ معلوم کیسا دماغ لے کر آئی ہو، کتنا سمجھا لو مگر سمجھ میں نہیں آتا تمہارے۔ بد عقل لوگوں کی طرح اپنی ضد پر اڑی رہتی ہو۔ ایسے لوگوں کو دشمن بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود اپنے دشمن ہوتے ہیں۔“ بے جی کبھی کبھار ہی غصہ ہوتی تھیں اور ایسے میں کسی کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ان کی بات سے روگردانی کر جائے۔ اس وقت بھی زرینہ جو بہت کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھیں، خاموش ہو گئیں۔

”خالہ جان! بالکل صحیح کہہ رہی ہیں آپ..... بھائی اور بھابھی کے بغیر اماں کون سی خوش رہتی ہیں۔ اکثر کسی نہ کسی بات میں اماں بھابھی کا ذکر ضرور کرتی ہیں۔ بھائی سے خواہ زیادہ بات نہیں کرتی مگر ان کی ہر ضرورت کا، کھانے میں ان کی پسند کا، ان کے آرام کا خیال انہیں رہتا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہوا کہ یہ انہیں بہت چاہتی ہیں۔ بظاہر ناہنگی کی خشکی ہے مگر دل میں محبت کے چشمے اہل رہے ہیں۔“ سارہ نے روٹی پکاتے پکاتے پکن کی کھڑکی سے جھانک کر ہنستے ہوئے کہا تو بے جی مسکرا کر بولیں۔

”میں جانتی ہوں، یہ دل کی بہت نرم اور اچھی ہے۔ بس تھوڑا زبان پر اختیار نہیں ہے ورنہ لاکھوں میں ایک ہے میری بہن۔“

”آپا! اب مجھے مکھن مت لگاؤ۔ ڈاکٹر نے چکنی چیزوں سے منع کیا ہے بلڈ پریشر کی وجہ سے۔ چل رہی ہوں فرح کو لینے آپ کے ساتھ۔“ وہ روٹھی روٹھی مسکرائیں۔

”تم نہیں سدھنا زرینہ!“ بے جی بے ساختہ نفس پڑی تھیں۔

”اب آخری وقت میں سدھر کر کروں گی بھی کیا۔ چل اوسارہ! جلدی سے میرا کوئی ڈھنگ کا سوٹ نکال کر امتری کر دے۔ ہم کھانا کھاتے ہی نکلیں گے۔“

”اماں! میری نظروں میں تمہارا کوئی ڈھنگ کا سوٹ نہیں ہے۔ ایسا کرو بھابھی کے ولیمے کا شرارہ سوٹ یا شادی والے دن کا غرارہ سوٹ پہن جاؤ۔“ ماں کو اپنی ضد توڑتے دیکھ کر سارہ خوش ہو گئی تھی، سوشرارت سے کوپا ہوئی۔

”مت ماری گئی ہے کیا تیری۔ تیری بھابھی کو لینے جا رہی ہوں کوئی تیرے لئے نیا باپ لانے نہیں جا رہی جو ایسی جج جج کر جاؤں گی۔ سفید چکن کا سوٹ نکال دے۔“ انہوں نے تپ کر جواب دیا تھا اور سارہ قہقہے لگانے لگی تھی۔

”زرینہ! تمہیں کبھی سوچ سمجھ کر بولنا نہیں آئے گا۔“ بے جی نے سر پکڑ کر کہا۔



سفر طویل ترین ثابت ہوا تھا اور جب رات کے ڈیڑھ بجے وہ مظلومہ جگہ پر پہنچے تو ملازم ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کی کار دیکھتے ہی لوہے کا بڑا گیٹ کھولا گیا تھا اور کئی ملازم اور ملازمائیں ان کے سواگت کو آگے بڑھی تھیں۔

مشعل کا طویل سفر کی تھکان سے برا حال تھا۔ نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ایسے میں وہ جبراً بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے میں اس کی پہلی اور آخری خواہش نرم گرم بستر کی تھی۔

زندگی میں پہلی بار اس نے اتنا طویل سفر بذریعہ کار کیا تھا اور اس کے بدن کا جوڑ جوڑ شدید تکلیف کا شکار تھا۔ ایسے میں اس کا موڈ بہتر ہونے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ شاہ ویز بہت اخلاق سے ان سے مل رہا تھا۔ وہ منہ بنائے کھڑی تھی۔

”ان سے بیڈروم معلوم کرو..... مجھے شدید نیند آرہی ہے۔ کھڑا نہیں ہوا جا رہا مجھ سے۔“

اسے حسب عادت باتوں میں مگن دیکھ کر مشعل کو کہنا پڑا تھا۔

”پہلے آپ کھانا کھالیں۔ آپ کا بیڈروم میں نے صاف کر دیا ہے۔“ ان میں سے ایک عورت نہایت ادب سے کوپا ہوئی تھی۔

اگر اس وقت اس کے ہمراہ شاہ ویز نہ ہوتا تو وہ اس کو خود سے براہ راست مخاطب ہونے پر مزہ چکھا دیتی۔ وہ ملازموں کو منہ لگانے کے قابل ہی نہ سمجھتی تھی۔ اس وقت وہ کسی بد مزگی کے خیال سے برداشت کر گئی اور ملازمہ کو انگور کر کے شاہ ویز سے بولی

”میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ سینڈوچ جو راستے میں کھائے تھے، وہ ابھی تک ہضم نہیں ہوئے مجھے۔ صرف سونا چاہتی ہوں۔“

”اوکے، ایز یوش۔ میں تو ابھی نہاؤں گا، کھانا کھاؤں گا پھر سوؤں گا۔“ اس نے اطمینان سے کہا اور ملازمہ سے کہا کہ وہ اسے بیڈروم میں لے جائے۔

وہ اس بری طرح تھکی ہوئی تھی کہ اس نے کمرے کا جائزہ لینا بھی کو ارنہ کیا۔ کمرے کے وسط میں ڈبل بیڈ پر پلک پلک بے ٹھکن چادر بچھی تھی اور دونوں سائڈ ٹیبلر پر ترو تازہ گلاب کے پھول کرٹل کے چمکتے گلدانوں میں مہک رہے تھے جس سے کمرے میں مسحور کن بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے ایک جھٹکے سے سینڈل سے پاؤں آزاد کئے تھے، پرس بیڈ پر اچھالا تھا اور ایک انگڑائی لے کر بیڈ پر لیٹی تھی اور سر سے منہ تک رضائی اوڑھنے کے بعد چند لمحوں میں ہی دنیا و مافیہا سے غافل ہو گئی تھی۔

ملازمہ اس کے کمرے میں ان کا سامان لے کر آئی تو وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے بغیر کوئی آواز نکالے سامان رکھا تھا، دائیں بائیں پڑے سینڈل اٹھا کر بیڈ کے نیچے رکھے اور باہر نکل گئی۔

خوب نیند بھرنے کے بعد اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی تھی۔

کسی خیال کے تحت اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر شاہ ویز بے خبر سو رہا تھا۔ وہ فوراً اٹھ گئی اور بیڈ سے نیچے اتر گئی۔

باتھ روم میں اس کے سوٹ کے ساتھ ہر شے ٹھکانے پر موجود تھی۔

ناشتے کی ٹیبل پر اس کی پسند کی تمام اشیاء تھیں جنہیں دیکھ کر اسے حیرت آمیز حسرت ہوئی تھی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا میری پسندیدہ ڈشز کا؟“ ڈونگے میں سے دلیہ بیا لے میں نکالتی ہوئی وہ قریب کھڑی ملازمہ سے مخاطب ہوئی تھی۔

”نیگم صاحب جی، ہمیں صاحب نے سب سمجھا دیا ہے آپ کی پسند اور نا پسند کے بارے میں۔ رات میں آپ نے کچھ کھایا نہیں تھا اس لئے میں نے دوسری چیزوں کے ساتھ دلیہ بھی بنا لیا تھا اور انڈے بھی دو تین طرح بنا لئے تھے کہ جو آپ کو پسند آئے وہ کھالیں۔“ نو عمر لڑکی خاصی پُر اعتماد تھی مگر اس سے باتیں کرتے وقت اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور انداز بھی خاصا مؤدب تھا۔

مشعل کو کم رہنے والے لوگوں کی ایسی ہی تابعداری و فرمانبرداری بھاتی تھی جو اس کے مغرور ذہن کو تقویت پہنچاتی تھی کہ وہ ان سے اعلیٰ و ارفع ہستی ہے۔

”شاہ ویز نے ناشتہ کر لیا ہے؟“ دلیہ میں دودھ شامل کرتے کھاتے ہوئے کوپا ہوئی۔

”جی..... وہ تو خاصی صبح بیدار ہو گئے تھے، بابا کے ساتھ چہل قدمی کو بھی گئے تھے۔ وہاں سے آکر انہوں نے ورزش کرنے کے بعد ناشتہ کیا تھا اور آپ کے ناشتے کا حکم دے کر سونے چلے گئے تھے۔“

”اچھا، تم جاؤ..... مجھے ضرورت پڑے گی تو پکاروں گی۔ نام کیا ہے تمہارا؟“

”جی فریدہ نام ہے میرا..... میں کمرے کے باہر کھڑی ہوں۔“ وہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

وہ ناشتہ کرتے ہوئے سوچ رہی تھی، شاہ ویز کو اس کا اتنا خیال کس طرح آگیا کہ اس نے ملازموں کو اس کے بارے میں، اس کی پسند نا پسند کا خیال رکھنے کی ہدایت دی ہے۔ آخر اس کے پیچھے اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ یہ کون سی نئی سازش ہے اس کی؟ ”وہ سوچ رہی تھی اور بے حد سوچنے کے باوجود بھی جب وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تو شانے جھٹک کر پوری تو جہناشتے کی طرف لگا دی۔

وہ جن ہر بانیوں کو شاہ ویز کی کرم نوازی سمجھ رہی تھی، درحقیقت یہ تمام احکامات شاہ ویز نے نہیں بلکہ حسن بیگ صاحب کے تھے، جنہوں نے چونکیدار رب نواز اور اس کی بیوی بتول کو دیئے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی حسن بیگ کے پرانے نمک خوار تھے۔ پہلے شہر کی کوٹھی میں کام کرتے تھے مگر جب حسن بیگ صاحب نے یہاں زمین خریدی تو انہیں یہاں بھیج دیا تھا۔ وہ پچھلے تیس سال سے یہیں مقیم تھے۔ شادی کے کچھ دنوں بعد وہ دونوں میاں بیوی یہاں آگئے تھے اور اب ان کے بچے بھی جوان ہو گئے تھے اور ان کی وفادار بیاں بھی مضبوط و قابل بھروسہ تھیں۔

ان میاں بیوی کو صورت حال معلوم تھی ماسوائے ان کی تینوں بیٹیوں کے جو ماں باپ کے صاحب کہنے پر شاہ ویز کو ہی بڑے صاحب سمجھتی تھیں۔

وہ ناشتہ کر کے کھڑی ہوئی تھی کہ فریدہ کسی جن کی طرح حاضر ہوئی تھی۔

”نیگم صاحبہ! دوپہر کو آپ کھانے میں کیا کھائیں گی؟“

”جودل چاہے بنا لینا تم نے ناشتہ اتنا اچھا بنایا ہے تو یقیناً کھانا بھی مزیدار بناؤ گی۔ بہت دنوں بعد مجھے ناشتہ کرنے میں مزہ آیا ہے۔ مریجیں کم ڈالتا۔“ وہ جس طرح کسی کی بے عزتی کرنے میں کوئی تامل نہ کرتی تھی، اسی طرح جو عمل قابل تعریف ہوتا اس کی تعریف کرنے میں قطعی سنجوسی نہ کرتی تھی۔



فریدہ اپنی مغرور و بد مزاج نظر آنے والی نئی مالکن کے منہ سے اپنی تعریف سن کر سرت سے جھوم اٹھی تھی۔

وہ بھر پور نیند لے کر اٹھی تھی، اس لئے طبیعت بھی بہت تروتازہ تھی یا پھر کئی ہفتے قید جیسی زندگی گزرنے کے بعد یہ آزادی، کھلی فضا اور کسی قسم کے بلا روک ٹوک کے لمحوں میں وہ بہت اطمینان و سکون محسوس کر رہی تھی۔

وہ کسی آزاد پنچھی کی طرح پورا بنگلہ دیکھتی پھر رہی تھی۔ کشادہ کمروں، کھلے دالانوں، وسیع برآمدوں، سرخ اینٹوں والا بنگلہ بڑے میں گھر، بہت خوب صورت تھا۔

وہ لان میں چلی آئی جہاں گہری سبز گھاس پر بے شمار پھل دار درخت پھلوں سے لدے کھڑے تھے۔ پھولوں کے پودوں کی بہتات بھی چاروں سمت بہار دکھا رہی تھی۔ طویل و عریض لان کے مشرقی حصے میں مصنوعی آبشار بہتا ہوا تھا جس کا پانی جھاگ اڑاتا ہوا پتھروں سے نیچے گر رہا تھا اور یہ منظر اس قدر خوب صورت تھا کہ وہ کئی لمحے مبہوت لگا ہوں سے اس منظر کو دیکھتی رہی تھی۔

”واجہ بین! اس آبشار کے لئے واٹر پلانٹ کی ازبخت کرتی پڑی ہوگی۔“ قریب سے گزرتے چوکیدار سے وہ مخاطب ہوئی تو وہ رک کر مؤدب لہجے میں بتانے لگا۔

”نہیں بی بی جی! ہا ہر پیچھے ہی جھیل بہہ رہی ہے۔ وہاں سے کچھ انجینئروں نے کام کر کے جھیل کے پانی کو اس طرح ایک حصے سے کاٹا کہ وہاں سے پانی کٹاؤ کی صورت میں اس آبشار میں داخل ہو کر دوسرے راستے سے نکل کر واپس جھیل میں گرتا ہے۔“

”اوہ، کتنا سہیل اور زبردست آئیڈیا ہے..... جھیل کہاں ہے، میں دیکھوں گی۔“

”جھیل بنگلے کے پیچھے ہے۔ میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔“

”نہیں..... میں چلی جاؤں گی۔ تم اپنا کام کرو۔“ وہ قطعی انداز میں بولی۔

”بی بی جی! آپ کا وہاں تنہا جانا مناسب نہیں ہوگا اور موسم بھی ٹھیک نہیں لگ رہا۔“ چوکیدار ڈرتا ڈرتا کوہا ہوا تھا۔ وہ غصے سے بولی۔

”آئندہ مجھے ایڈوائز کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ بہت براحشر کروں گی، سمجھے۔“ وہ غصے سے بولتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ چوکیدار ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

موسم بد آلود تھا، فضا میں خوشگوار خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ ایک پرسرار خاموشی و سکوت ہر سمت پھیلا ہوا تھا۔ ادھر ادھر گاؤں دلکش سینری کی طرح پھیلا ہوا تھا۔

اسے کبھی بھی ایسے نگاروں سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ تو روشنیوں، ہنگاموں، پارٹیز کی دلدادہ رہی تھی۔ اپنے حُسن کا اسے اتنا زعم تھا کہ کبھی اس نے فطرت کے روپ، قدرت کے حُسن کی پرواہ ہی نہ کی تھی۔

اور آج جبکہ وہ اس ماحول کا حصہ نہ رہی تھی، اپنے حُسن کی ضوفنائیوں سے لاپرواہ ہوئی تو قدرت کے حُسن سے متعارف ہوئی اور اسے بے اختیار دنیا کے رنگ دلکش و حسین لگنے لگے۔

وہ بنگلے کے دوسری طرف آگئی جہاں جھیل کا پانی ایک چھوٹی ندی کی صورت میں دور تک بہتا ہوا جا رہا تھا۔ ہر سو پھیلے ہوئے جنگلی پیڑ پودوں نے ایک گھنے جنگل کی صورت اختیار کر لی تھی۔ فضا پرندوں کی چکاروں سے گونج رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے رنگ برنگے پھولوں کو تو ذکر ملتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

معا خاموش فضا فارکی زوردار آواز سے لرز اٹھی۔ وہ ٹھٹھک کر اپنی جگہ رک گئی۔

”آج تو بہت ہی بیک لک ہے یا ر! صبح سے دوپہر ہونے کو آئی ہے مگر تیر تو ایک طرف ہم کو ایک چڑیا تک شکار کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے پرندوں سے ہماری بھری کر دی ہے اور وہ ہماری آمد سے قبل ہی چھپ کر بیٹھ گئے ہیں۔“ ایک، دوسرے سے بولا تو دوسرے نے بھی گردن ہلا کر تائید کی۔ وہ دونوں جن کے ہاتھ میں لمبی لمبی شکاری بندوقیں تھیں، لباس بہت چست تھے، سر پر ہیٹ جمائے ایک پتھر پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی اٹھی ہوئی گردنیں درختوں میں چھپے پرندوں کو ڈھونڈ رہی تھیں جن کی آوازیں تو مسلسل آ رہی تھیں مگر وہ نظروں سے اوجھل تھے۔

”کیا کھائیں گے یا راب۔ جو کچھ راستے سے خریدتا تھا، وہ وقفے وقفے سے چٹ کر چکے ہیں۔ اب کھانے کے لئے گھاس اور پتے ہیں اور پینے کے لئے یہ جھیل کا پانی۔“ پہلے والے نے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر پانی اس کی طرف اچھا لاتو دوسرا بھنا کر رہ گیا۔

”مذاق نہیں کرو، جو کچھ کھایا ہے تم نے تنہا ہی ہڑپ کیا ہے۔ اب تو مجھے بہت ہی بھوک لگی ہے۔ تیر اور مرغابی کا روٹ کھانے کے خیال سے میں نے ناشتہ بھی پیٹ بھر کر نہیں کیا تھا اور یہاں روٹ تو کیا ہوتا پرندے دیکھنے کو بھی نہ ملے۔“ دوسرا کپڑے جھاڑتا ہوا بڑا رہا تھا۔ پہلا ہنستا ہوا اسے دیکھ رہا تھا کہ ان کی نگاہ سامنے سے آتی مشعل پر پڑی۔ وہ چونک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بڑے غور سے اس سمت دیکھ رہے تھے۔

”یا ربینڈ لک نہیں، گڈ لک۔ ہم شکار کے لئے مارے مارے گھوم رہے ہیں، شکار خود ہمارے پاس چل کر آ رہا ہے۔“ دوسرا مشعل کو اپنی جانب آتے دیکھ کر ہر جوش لہجے میں گویا ہوا۔

مشعل ان کے قریب پہنچ گئی۔ وہ چونکا جس اٹھائے اسے گھور رہے تھے فوراً ہی مؤدب سے بن گئے۔

”مس! آپ یہاں تنہا..... کیا راستہ بھٹک گئی ہیں؟“

”نہیں..... فائر تم نے کیا تھا ابھی؟“ ان کے ہاتھوں میں پکڑی رائفل دیکھتی ہوئی ہر اشتیاق لہجے میں مخاطب ہوئی تھی۔

”ہاں..... ہم یہاں شکار کرنے آئے ہیں۔“ وہ گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

”کیا شکار کیا ہے..... مجھے دکھاؤ۔“ اس کی دوتی بچپن سے لڑکوں سے رہی تھی، عام لڑکیوں کی طرح لڑکوں کی موجودگی اسے کسی قسم کی گھبراہٹ و شرم سے دوچار نہ کرتی تھی۔ وہ لڑکوں سے اسی طرح سکون و اطمینان سے بات کرتی تھی جس طرح لڑکیاں لڑکیوں سے کرتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ بہت آرام سے دواجنی لڑکوں سے اس ویرانے میں کھڑی گفتگو کر رہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو کب کی اجنبیوں کو دیکھ کر بھاگ چکی ہوتی۔ لیکن وہ بے فکری سے کھڑی تھی۔

وہ دونوں لڑکے بھی برگرفیل کے بگڑے ہوئے اوباش نوجوان تھے۔ مشعل کو تنہا دیکھ کر پہلے ہی ان کی نیت خراب ہو چکی تھی۔ اس پر اس کی بے تکلفی سے گفتگو سے وہ اپنے مطلب کی لڑکی لگی تھی۔ ان کے لبوں پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”میں اپنے پاپا کے ساتھ بہت دفعہ شکار پر گئی ہوں۔ مجھے رائفل چلانا آتی ہے۔ ایک کولی سے میں کئی پرندوں کا شکار کر سکتی ہوں۔“

”تمہیں کولی مارنے کی کیا ضرورت ہے ڈیئر! صرف آنکھ مار دیا کرو۔ دیکھنا جنگل کے سارے جہند پرند، نازن سمیت تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو جائیں گے۔“ پہلے نے خاصے بے ہنگم انداز میں کہتے ہوئے تہقہہ لگایا تو دوسرے نے بھی ساتھ دیا تھا۔

”وہاٹ یو مین مسٹر؟“ وہ جھٹکا کھا کر دور ہو کر پھنکار رہی تھی۔

”ارے اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو؟ تم ہم سے کہنی لینے آئی تھیں، ہم دینے کو تیار ہیں۔ خوب بنے گی جوں بیجھیں گے دیوانے تین۔“

”شٹ اپ..... مجھے کیا سمجھ رہے ہو تم۔ ذرا آگے بڑھ کر بات کیا کر لی تم اپنی اوقات دکھانے لگے۔ ہٹو میرے راستے سے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ ان کے بدلتے تیور اسے احساس دلانے لگے کہ وہ غلط لوگوں کی طرف بڑھ آئی ہے اور ان سے جلد دور ہونا ہی بہتر ہے۔“

”سنو میڈم! نازخ سے ہم دیکھنے کے عادی نہیں ہیں۔“

”یکو اس مت کرو..... دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ ان دونوں کو آگے بڑھتے دیکھ کر وہ چیختی تھی۔

”میر نام میر ہے..... ہاتھ لگا مال کھی جانے نہیں دیتا۔“

”اور میر نام امین ہے۔ مگر یا ر لوگ بیار سے کہیں کہتے ہیں۔ میں ہاتھ آئی دولت چھوڑ سکتا ہوں مگر لڑکی نہیں اور لڑکی بھی تم جیسی جو کسی کپے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں خود ہی آن گری ہو۔“ انسان پر جب شیطان سوار ہو جائے تو وہ مکمل اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ وہ دونوں بھی اس وقت شیطان بن گئے تھے۔

وہ جو خود کو ناقابل تغیر سمجھتی تھی..... اسے خود پر زعم تھا کہ کوئی مرد اسے اس کی مرضی کے بنا چھو بھی نہیں سکتا، سب خیال ریت کے گھر ہندے ثابت ہوئے تھے۔

وہ کافی دیر تک ان کی گرفت سے بچنے کے لئے پارے کی طرح ادھر ادھر دوڑتی رہی تھی لیکن وہ دونوں بھی گھاگ شکاری تھے، جان بوجھ کر اسے اتنا دوڑا رہے تھے کہ وہ تھک کر خود ان کے قابو میں آئے گی۔ اور وہی بات ہوئی۔ بھاگ بھاگ کر اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں، دل بند ہونے لگا تو وہ گر پڑی۔

”خبردار..... آگے ایک قدم بھی نہ بڑھانا۔“ شاہ ویز نے قریبی جھاڑیوں سے نکلے ہوئے ان دونوں کو لکارا تو وہ ٹھٹھک کر رہ گئے جبکہ مشعل کی جان میں جان آئی۔ وہ ہانپتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کون ہوتا ہے تُو ہمیں روکنے والا؟“ میر نامی لڑکا سینہ تان کر گویا ہوا۔

شاہ ویز نے گویا اس کی بات سنی ہی نہ تھی، اس کی آنکھوں میں خون اتر ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر مشعل کی ابتر حالت پر ڈالی تھی اور قہر بن کر ان پر پلٹا تھا۔ وہ دونوں صحت میں اس سے کافی تندرست و توانا تھے مگر غصہ، جنون اور رکوں میں مارے غیرت کے لاوے کی طرح کھولتے خون نے اسے فولا دینا ڈالا تھا۔ وہ ان دونوں سے بری طرح گتھم گتھا تھا۔

مشعل کھڑی ہو چکی تھی۔ خوف و دہشت سے وہ کانپنے لگی تھی۔

مردوں سے تعلقات پہلے بھی تھے لیکن کسی نے ایک نگاہ غلط نہ ڈالی تھی۔ ان کے درمیان گہری فرینڈ شپ تھی۔ وہ ساتھ بیٹھتے تھے، رہتے تھے، مستی مذاق، چھیڑ چھاڑ، سب کچھ ہوتا تھا مگر اس طرح کسی نے وحشی پن کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ سب سے بڑھ کر شاہ ویز جسے تمام حقوق حاصل تھے، اس نے کبھی اپنے حق کا معمولی سا بھی اظہار نہ کیا تھا۔ کئی پردے تھے جو ایک کے بعد ایک اس کی نگاہوں سے اٹھ رہے تھے۔

آگہی کا احساس

شعور کی دستک

فہم و ادراک کی آمد

ذہن کے متقل در پیچے کھل رہے تھے۔

وہ لڑ رہا تھا اُس کی خاطر۔ اس کا جنون، اس کی وحشت، اس کی دیوانگی سب اس کے لئے تھی جس نے کبھی اسے درخور اعتنا نہ جانا تھا۔

جو ہمیشہ اس کی تذلیل و توہین کا شکار رہا تھا، جس نے کسی لمحے اسے اپنائیت کا احساس نہ بخشا تھا، وہ اس کی خاطر لڑ رہا تھا۔

ان دونوں میں سے ایک تو بری طرح گھائل ہو گیا۔ اس کے سر اور ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ شاہ ویز کے ٹکوں اور ٹکروں نے اس کے اوسان خطا کر ڈالے تھے۔ دوسرے کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ شاہ ویز کے تار و تار و حلوں نے اس کی قوت مدافعت تو ذکر رکھ دی تھی جبکہ زخمی وہ بھی ہوا تھا مگر اس کی وحشت ہر جذبے پر حاوی تھی۔ نیکی و بدی کی جنگ میں ہمیشہ جیت نیکی کی ہوتی ہے، وہ بھی جیت گیا تھا۔ وہ دونوں گرتے پڑتے وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ شاہ ویز نے ان کے پیچھے جانا چاہا تو مشعل نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔

”تم زخمی ہو، بھاگنے دو انہیں۔ اتنی مار لگائی ہے ان کی کہ کبھی اس علاقے میں ہی قدم رکھنے کی کوشش نہ کریں گے۔“ اس نے شاہ ویز کا بازو مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

”اس احتقانہ حرکت کی کیا ضرورت تھی؟ جب تمہیں چوکیدار نے تنہا ہر نکلنے سے منع کیا تھا تو کیوں ادھر آئی تھیں؟ یہ علاقہ شکاریوں کا پسندیدہ علاقہ ہے اور وہ پرندوں کے علاوہ تم جیسی بے وقوف لڑکیوں کا بھی شکار کر لیتے ہیں۔ اگر چوکیدار مجھے اسی وقت آکر اطلاع نہ دیتا اس طرح تمہارے یہاں تنہا آنے کی تو سوچو کیا ہوتا؟ میں آرام سے سکون کی نیند سو رہا ہوتا اور تمہاری ہستی کا یہاں نام و نشان مٹ چکا ہوتا۔“ وہ مگڑے تیوروں سے اسے ڈانٹ رہا تھا۔

مشعل خود اس صورت حال سے بری طرح سہم چکی تھی۔ اس وقت شاہ ویز کی ڈانٹ میں اپنائیت و اضطراب محسوس کر کے وہ خود پرتا بوندہ پانسی تھی اور اس کے شانے پر سر رکھ کر رو پڑی تھی اور خاصی دیر تک روتی رہی تھی۔

شاہ ویز نے اسے رونے دیا۔ وہ اس کی اندرونی کیفیت سمجھ رہا تھا کہ وہ اس وقت کس خلفشار میں مبتلا ہے۔ ایسے میں اس کے دل کا غبار نکلتا بہتر تھا۔

”مائی ایم سوری، میں نہیں سمجھتی تھی کہ وہ لوگ حیوان صفت ہوں گے۔“ وہ تھیلیوں سے آنسو صاف کرتی ہوئی ندامت سے کوپا ہوئی۔

”تمہاری نگاہ میں سب اچھے ہوتے ہیں سوائے میرے۔ خیر، آج ایسی بے وقوفی کر چکی ہو مگر آئندہ خیال رکھنا، قسمت بار بار ساتھ نہیں دیتی۔“ اس کے چہرے پر وہی سکون و اطمینان چھا گیا جو اس کی ذات کی پہچان تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اس شخص کے چہرے سے شعلے نکلتے دکھائی دے رہے تھے، جو جنون و وحشت کی مجسم تصویر دکھائی دے رہا تھا۔

”اب کس کی آمد کا انتظار ہے جو آگے نہیں بڑھ رہی ہو؟“ اسے اسی جگہ براجمان دیکھ کر وہ غصے سے مخاطب ہوا تو وہ ہٹپٹا کر اس کے ساتھ چلے گئی۔

”ما معلوم تم کس مٹی کی بنی ہو جو ذرا بھی عقل و شعور نہیں رکھتیں۔ اُن اٹو کے پٹھوں سے زیادہ مجھے تمہاری بیوقوفی پر غصہ آ رہا ہے۔ بھلا کس نے کہا تھا کہ.....“

”پلیز، میں نے کہا تو جو ہوا ہوا اور بری باتوں کو دہرانے سے دکھ بھی ملتے ہیں۔ میں آئندہ کبھی اس طرح نہیں نکلوں گی۔ بعض لوگ دنیا میں دوسرے کو گرتے دیکھ کر سنبھل جاتے ہیں مگر مجھ جیسے ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتے ہیں۔“

شاہ ویز سخت حیرانی کی لپیٹ میں تھا۔

مشعل کا طرز گفتگو، سوچنے کا انداز، پشیمانیوں و ندامتوں میں ڈوبا لہجہ حیران کن بات تھی۔ وہ لڑکی جس نے جھکنا اور کسی سے مرعوب ہونا سیکھا ہی نہ تھا۔

ان لمحوں میں کتنی کمزور، بے بس و بے اختیار لگ رہی تھی۔

پہلی ٹھوکر ہی اُس کے لئے آخری ثابت ہوئی؟

لگتا تو نہیں کہ وہ سنبھل گئی ہوگی۔ اس نے سوچا۔

راستہ خوب صورت تھا۔

ماحول پر سکون۔

ہوائیں خوشبوئیں لاتا ہوتی لگ رہی تھیں۔

موسم خوشگوار تھا، صبح سے اب رنے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔

اب ابڑھٹ گیا تھا۔ نیلے و سفید شفاف بادلوں سے آسمان دلکش لگ رہا تھا۔

سورج کی چمکتی روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی اور جھیل کے بہتے ہوئے پانی میں جب سورج کی کرنیں چمکتیں تو نگاہوں کو ان کا حسن خیرہ کرنے لگتا تھا۔

وہ ساتھ ساتھ جارہے تھے مگر سوچیں الگ الگ تھیں۔

مشعل پر اس حادثے نے گہرا اثر ڈالا تھا، جہاں وہ اپنی عزت بچ جانے پر شکر ادا کرتی وہیں شاہ ویز کے سامنے خود کو نگاہ اٹھانے کے قابل نہ پاتی تھی۔ وہ اس کے سامنے کس قدر اکڑتی تھی، بہادری و خود سری کے مظاہرے کرتی مگر وہ درحقیقت کیا تھی؟

معمولی و کمزور لڑکی۔

جو وقت پڑنے پر اپنا دفاع بھی نہ کر سکتی تھی۔

وہ کتنا عظیم تھا۔

بلند حوصلہ، جرأت مند، بہادر ہونے کے ساتھ غیرت مند بھی بلا کا تھا۔

ایسا مرد ہر لڑکی کی چوائس و آئینڈیل ہوتا ہے۔

دھیرے دھیرے اس کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو رہی تھی۔ دل کی دنیا میں حشر برپا تھا اور کانوں میں کوئی سرکوشیاں کر رہا تھا۔

خوشبو کی پوشاک پہن کر کون لگی میں آیا ہے

کیسا یہ پیغام رساں ہے

کیا کیا خبریں لایا ہے

کھڑکی کھول کر باہر دیکھو

موسم میرے دل کی باتیں تم سے کہنے آیا ہے

□●□

فرح کے گھر میں زرینہ اور بے جی کا استقبال از حد سردہری و بیگانگی سے کیا گیا تھا۔ فرح ان کے سامنے نہیں آئی تھی۔ اس کی ماں اور بہنیں کمرے میں موجود رہی تھیں۔ فرح کی والدہ بے جی کی عمر کی تھیں مگر بالکل جوانوں کی طرح فیشن پہل تھیں۔ بے جی نے سلام کیا تو منہ میڑھا کر کے انہوں نے جواب دیا تھا۔ خود بیٹھی تھیں مگر اخلاقا بھی انہیں بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔

دونوں اُن کی بنیاں بھی اسی بے جی سے بیٹھی رہی تھیں۔

”تمیز طریقہ تو تمہارا پہلے ہی نیست و نابود ہو گیا تھا۔ اب کیا میزبانی بھی بھول گئیں؟ گھر میں آنے والے غیروں کو بھی بیٹھنے کو کہا جاتا ہے پھر ہم تو تمہارے جان پہچان والے ہیں۔ ایسی بھی کیا بے مروتی کہ بیٹھنے کو بھی نہ بول رہی ہو۔“

زرینہ کو ان کی بے اتفاقی ذرا نہ بھائی۔ وہ دھک کر بولیں۔

”آؤ بیٹھ جاؤ۔ اب بیٹھنے کے لئے بھی تمہیں کیا دعوتی کارڈ دینا ہوگا؟“ فرح کی ماں تیوریاں چڑھا کر بولیں اور قبل اس کے کہ زرینہ بھی بڑھ کر جوابی حملہ کرتیں، بے جی نے ان کا ہاتھ پکڑا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔

”نہیں..... کارڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا اپنا گھر ہے، خود ہی بیٹھ جائیں گے۔“

بے جی اور زرینہ کو بیٹھنے کا کافی دیر گزر گئی مگر ان کے درمیان بالکل خاموشی تھی۔ پہل کر کے کوہ تیار نظر نہ آ رہی تھیں تو زرینہ بھی خاموش تھیں۔

اس الجھن زدہ صورت حال سے بے جی کو بے چینی ہونے لگی تھی۔ وہ یہاں کام سنوارنے آئی تھیں۔ وہ زرینہ کی نگاہوں کو نظر انداز کر کے فرح کی ماں سے استفسار کرنے لگیں۔

”زہیدہ! فرح کو بلاؤ۔ ہم اسے لینے آئے ہیں۔“

”اب کیسے یاد آگئی فرح کی؟ میری بچی موت کے منہ سے واپس آئی ہے۔ میں اسے نہیں سمجھتی۔ تکلیف کی حالت میں کسی نے آکر جھانکا نہیں۔ اب وہ تندرست ہوئی ہے تو خدمت کروانے کے لئے لینے چلی آئیں۔“ زہیدہ بھری بیٹھی تھیں۔ ذرا سی بات سے ہی وہ پھٹ پڑی تھیں۔

”موت کے منہ میں بھی تو تم ہی لے کر گئی تھیں اسے۔ ماں اور ساس دونوں خود ہی بن بیٹھی تھیں۔ مجھے تو ایسے دور کیا تھا جیسے دودھ میں گری مکھی کو نکال کر پھینکتے ہیں۔ اور خدمت کی بھی تم نے خوب کہی۔ بی بی! کسی خوش گمانی میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے بیٹی کی تربیت خدمت کرنے کے لئے نہیں، لینے کی، کی ہے۔ وہ کیا خدمت کرے گی، خدمت کروانے والی ہے۔“ زرینہ غصہ سے بلند لہجے میں بولیں۔

”اگر ہماری آپی خدمت کروانے والی ہوتیں تو ان کا ایسا حال نہ ہوتا۔ جو تکلیف انہوں نے اٹھائی ہے ہم جانتے ہیں۔ وہ تو اپنے بچے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔“ فرح کی چھوٹی بہن منہ بنا کر کہنے لگی۔

”اے بی! تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ جب بڑے بات کر رہے ہوں تو چھوٹوں کو نہیں بولنا چاہئے۔ تم ابھی کنواری ہو، ایسی باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔“

”گئے وہ وقت جب بچیاں منہ میں کھنگھنیاں ڈالنے بیٹھی رہتی تھیں۔ لیکن اب وہ وقت نہیں رہا۔ بچیاں جو دیکھیں گی وہ کہیں گی۔“

”تب ہی تو ان کی صورتوں پر پھنکار بھی برس رہی ہے۔ کنواری ہیں مگر کئی کئی بچوں کی مائیں لگ رہی ہیں۔“ زریہ نے اس انداز میں کہا کہ ان ماں بیٹیوں کے پٹنگے لگ گئے اور وہ تینوں تیز تیز بولنے لگیں۔

زریہ بھی شروع ہو گئیں اور لڑائی کا ماحول بن گیا۔ وہ تینوں ماں بیٹیاں شروع تھیں۔ غضب کے طعنے تشنہ میز اہل کی طرح ایک دوسرے پر دانے جارہے تھے۔

زبانی کولہ باری کرنے میں زریہ کا بھی کوئی ٹانی نہ تھا۔

خوب ایک دوسرے پر زبانی حملے بڑھ بڑھ کر کئے جارہے تھے۔ بے جی نے پہلے تو انہیں منع کرنے، روکنے کی بہت کوشش کی مگر دونوں طرف سے ہی کوئی ماننے کو آمادہ نہ ہوا تو وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گئیں کہ اچھا ہے دونوں کے دلوں میں بھری غلط فہمیاں رفع ہو جائیں تو ٹھیک بات ہوگی۔“

بالآخر ایک دوسرے کو خوب کہنے سننے کے بعد دل کی بھڑاس نکل گئی تو وہ خاموش ہو گئیں۔ زریہ ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

”آپا! کیسے اطمینان سے بیٹھی ہواتی بے عزتی ہونے کے باوجود۔ چلو۔“

”بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔ کوئی بے عزتی نہیں ہوئی۔ تم نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔“

”آپا! یہ تم کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔ ارے تم میری بہن ہو یا ان کی؟“

”تمہاری بہن ہوں تو غیر زبیدہ کے لئے بھی نہیں ہوں، سگی خالہ کی بیٹی ہے۔ اور اصغر کا رشتہ بھی اسی وجہ سے کیا گیا تھا کہ مضبوط ہوگا رشتہ مزید۔ لیکن لگتا ہے تم دونوں عقل فروخت کر کے بیٹھی ہو۔ ابھی جو تمہارے درمیان باتیں ہوئی ہیں بالکل بے بنیاد اور فضول ہیں۔ نہ زریہ تمہاری بیٹی کی دشمن ہے اور نہ زبیدہ۔ تم اصغر کو سکھا پڑھا کر زریہ کے خلاف کر رہی ہو۔“

”بہن! میں بھی یہی کہتی ہوں۔ مگر نہ جانے کیوں زریہ کو سمجھ نہیں آتی۔ نہ معلوم کیوں یہ ایسی باتیں کرتی ہے۔ کون سکھاتا ہے اس کو میرے خلاف۔“ زبیدہ کے دل کی بھڑاس نکل چکی تھی۔ پھر بے جی کے بات کرنے کا انداز، لہجے کی شیرینی اور سچے خلوص کے مظاہرے کچھ ایسے ہی ہوتے تھے کہ بڑے سے بڑے مزاج والوں کے دل بدل جایا کرتے تھے۔ پھر یہ تو رشتہ ایسا تھا کہ وہ موم بن گئی تھیں۔

”لو یہ بھی خوب کہی، مجھے کون سکھائے گا، میں نا سمجھ ہوں کیا؟“

”ہاں، مجھے معلوم ہے۔ تم بہت سمجھدار ہو۔ لیکن اب خاموش بیٹھی رہو، میں فرح کو لینے آئی ہوں۔ تم کیا کہتی ہو زبیدہ! اگر ابھی بھی کوئی گلہ شکوہ باقی رہ گیا ہو تو کر لو مگر فرح کو میں ہر حال میں لے کر جاؤں گی۔“ زریہ کو ڈپٹ کر وہ زبیدہ سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”اے بہن! بیٹی کو کون اپنی چھاتی پر بٹھانا پسند کرتا ہے۔ اگر مجھے اپنے گھر ہی بٹھانا ہوتا تو شادی ہی کیوں کرتی۔ اگر زریہ پہلے آجاتی تو میں بھیج دیتی۔“

”آج سے سارے گلے شکوے ختم ہو گئے ہیں۔ آئندہ چھوٹی چھوٹی باتیں ایک دوسرے سے کہہ کر غلط فہمی دور کر لیا کرنا۔ بات کچھ نہیں ہوتی اور جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“ بے جی نے اٹھ کر انہیں ایک دوسرے سے گلے ملوایا تھا۔

□●□

مشعل نے مردکی ہوس ناک نظریں پہلی مرتبہ دیکھی تھیں اور اس کی دنیابدل گئی تھی۔ وہ جوشاہو پر کی پرچھائیں سے بھی دور ہنا چاہتی تھی اب ہمہ وقت اس کا سایہ بینی رہنا چاہتی تھی۔

بے پناہ خوف و وہم اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔

”کہاں جارہے ہو؟“ اسے تیار ہوتے دیکھ کر وہ بولی تھی۔

”کیوں۔۔۔۔۔ اب تمہیں بتا کر جانا ہوگا؟“ اس نے بال بتاتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے مرمر میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی ساتھ چلوں گی۔“

”ہمارے درمیان معاہدہ نہیں ہوا تھا۔“

”کیسا؟“

”کہ تم ہر جگہ میرے ساتھ جاؤ گی۔“ وہ میز برش رکھ کر اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

”معاہدے کی بات نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گی۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ عجیب بے نام سی گھبراہٹ و ہلچل سی چمٹنے لگی تھی۔

وہ جو بے خوفی سے اس کا مقابلہ کرتی تھی، اب نگاہ ملا کر بات کرنا تو درکنار اس کے قریب بھی کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔

”میرے ساتھ؟ یہ میرا ساتھ تمہیں کب سے بھانے لگا؟ میں تو وہی بے مایہ، لئیرا شخص ہوں جو تمہارے پاپا کی دولت پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا ہوں۔“ اس کا رویہ خواہ مخواہ ہی تلخ ہوا جا رہا تھا۔

”ضروری نہیں پرانی باتیں دہرائی جاتی رہیں۔“

”ہاں ضروری نہیں ہے مگر میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر نہیں جاسکتا۔“

”لیکن کیوں؟۔۔۔۔۔ کیا میں تمہارے ساتھ چلنے کے قابل نہیں؟ بد صورت ہوں، اپانچ ہوں، آخر کیا برائی ہے مجھ میں؟“ وہ اس کی مسلسل انکار کی تکرار سے زچ آ کر بولی۔

”بد صورت؟ تمہیں ابھی تک اپنے حسن پر ناز ہے؟“ وہ اس کے دلکش چہرے کو بغور دیکھتا ہوا استہزائیہ لہجے میں کوپا ہوا۔

وہ ہونٹ بھیجنے کر خاموش ہی رہی کہ کیا کہتی۔ اس کو درد و جواب دینے کا مطلب تھا اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی مارنا، جو وہ چاہتی نہ تھی۔

”حالانکہ ہمارے ہاں خوب صورت اسی کو کہتے ہیں جو بیامں بھا جائے۔“ اس کی زبان رواں ہو گئی تھی۔

اسی دم رشیدہ صفائی کے لئے کمرے میں آئی تو وہ اس سے مخاطب ہوا۔

”رشیدہ! تمہاری مالکن بہت خوب صورت ہے؟“

”ہاں صاحب جی! بہت خوب صورت ہیں۔ بالکل پری کی طرح۔“ وہ مشعل کو دیکھ کر شائستہ لہجے میں کوپا ہوئی تھی۔

”پری کی طرح۔ تم نے کبھی پری دیکھی ہے؟“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنس کر بولا تو مشعل کا ملازمہ کے ساتھ خود کو ڈسکس کرنا مسترد و مضحکہ اڑانا وہ بل کھا کر رہ گئی مگر خاموش رہی۔

”دیکھا تو نہیں ہے مگر بے بے بتاتی ہے پری بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ تو نیگم صاحبہ بھی اتنی ہی خوب صورت ہیں تو پری کی طرح ہی ہوں۔“ رشیدہ نے پوری طرح وضاحت کر دی تھی۔

”اگر پری کو معلوم ہو گیا تو وہ ہر امان جائے گی اپنی انسلٹ پر۔“ وہ تہقید لگا کر بولا اور رشیدہ سمجھ نہ سکی۔

”صفائی تھوڑی دیر میں کرنا۔“ مشعل کوپا ہوئی۔

”نہیں ابھی ہی کرنے دو۔ تم میرے ساتھ چل رہی ہونا؟“

”کہاں؟“

”نش پونڈز ہیں یہاں پر۔ وہیں چلنا ہے۔“

”مگر مجھے پھیلوں کی رُو سے چڑ ہے۔“

”لیکن میری مرغوب غذا مچھلیاں ہی ہیں اور میں نے آج ڈش بھی نش فرائی بنوائی ہے۔“ اس نے معلومات فراہم کی تھیں۔

”میں کچھ اور کھا لوں گی۔“

”ہر چیز بندے کو کھانے کی عادت ہونی چاہئے سب اللہ کی بنائی ہوئی ہیں۔“

”میں نے ہتھراض تو نہیں کیا، صرف اپنی پسند بتائی ہے۔“

”اوکے، چلو وہاں میں تمہیں خالص گاؤں کی ڈش ملے گی روٹی اور سرسوں کا ساگ کھلاتا ہوں، بڑی مزے دار ڈش ہوتی ہے۔“ اس کا موڈ بھی بہتر ہو گیا تھا۔

مشعل نے نیٹ کا ٹیبلٹ سوٹ پہنا تھا۔

وہ تیار ہو کر باہر آئی تو کار کے پاس اس کے انتظار میں کھڑا شاہو پر اسے دیکھتا رہ گیا۔

مشعل بڑے مطمئن انداز میں گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

بلیک نیٹ کی شرٹ، بلیک ویلوٹ کے ٹراؤزر میں تک سب سے تیار ہوئی۔ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ سنہرے سرفی مائل بال ریشم کے پھوں کی طرح پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ بلیک اسٹون کی جیولری اس کے متیکھے نقوش کو مزید اجاگر کر رہی تھی۔ چہرہ بالکل سادہ ہر زیبائش سے پاک ہونے کے باوجود ایک ملکوتی حسن، ایک پُرکشش جاذبیت لئے ہوئے تھا۔ وہ خراماں خراماں بہار کے سبک جھونکے کی مانند معطر معطر چلی آرہی تھی۔ معاس کی نگاہ کار کے قریب ایستادہ شاہو پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ بنا پلکیں جھپکائے یک نکل، مسلسل۔ اس نے بھی اس کی جانب دیکھا اور دل پوری شدت سے دھڑک اٹھا۔

سانس جیسے تھمنے لگی تھیں۔

قدم وہیں منجھد سے ہو گئے۔

شاہ ویز کی نگاہوں میں والہانہ پن یا پسندیدگی کے خوب صورت رنگ نہ تھے بلکہ اس کی نگاہوں میں ناپسندیدگی و ناگواری کی سرخی چھا رہی تھی۔

کشادہ پیشانی پر شکنوں کا جال بن چکا تھا۔

چہرے پر کدورت و بے زاری پھیلنے لگی تھی۔

ہونٹ غصے سے بھیج کر رہ گئے تھے۔

”کیا ہوا..... ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

وہ اسے وہیں ہر اس اٹھڑی دیکھ کر قریب چلا آیا تھا اور بڑے ناگوار انداز میں اسے گھورنے لگا تو مشعل خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے استفسار کر بیٹھی۔

”میں سمجھا تھا اتنے دن میری معیت میں گزارنے کے بعد تم میری پسند، ناپسند سے واقف ہو چکی ہو گی۔ مجھے، میرے مزاج کو سمجھنے لگی ہو گی۔ مگر تم نے میری تمام خوش فہمی، خوش گمانی کو ملیا میٹ کر ڈالا۔“ اس کی نگاہوں کے ساتھ ساتھ زبان بھی اٹکارے برسانے لگی تھی اور وہ بری طرح بوکھلا اٹھی تھی۔

”لیکن میں نے کیا کیا ہے؟“

”تم نے کیا کیا ہے؟ آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اسے بری طرح گھینٹتا ہوا اندر بیڈروم میں لے گیا اور ڈریسنگ کے قد آور آئینے کے سامنے لے جا کر کھڑا کیا تو ان دونوں کا عکس ساتھ ساتھ تھا۔

لائٹ بلیو کلف شدہ شلوار سوٹ میں کھڑا کھرا وہ از حد جاذب نگاہ رہا تھا۔ اس لمحے وہ اسے اپنے برابر میں کھڑا بہت مکمل لگا۔ اس کی دھڑکنوں میں نا مانوس ہلچل مچی تھی اور ایک نامعلوم احساس کے تحت نگاہ از خود جھک گئی تھی۔ اپنے ان احساسات کو، دل کی دھڑکنوں کو کوئی عنوان نہ دے پائی تھی اور یہ بھی نہ جان پائی تھی کہ وہ اسے اس وحشی پن سے گھبیٹ کر اندر کیوں لایا تھا اور آئینے میں عکس دکھانے کا کیا مقصد ہے کہ وہ بول اٹھا۔

”عورت کا لباس محض اس کی شخصیت کی چارم رنگ کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کی ناموس کا محافظ اور حیا و اعتبار کی پاسداری کا ضامن بھی ہوتا ہے۔ عورت جس قدر مکمل پردے میں نظر آتی ہے اتنی ہی نامکمل بے پردگی میں دکھائی دیتی ہے۔“ وہ اس سے دور ہو گیا تھا۔ ”پردہ عورت کو حسن و جمال بخشتا ہے، اس کی عزت و وقار بڑھاتا ہے اور گندی نگاہوں کی غلاظتوں، بری نیت کی ہوس سے بچاتا ہے۔ عورت جس قدر حسین و پرکشش پردے کے حصار یعنی پاکیزگی کے حصار میں دکھائی دیتی ہے اتنی اس بے حیائی و بے ہودگی کے لباس میں نہیں۔“

شاہ ویز لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بے اختیار اپنے لباس پر گئی تھیں۔ سیاہ نیٹ کی شرٹ کی سیلیویس فل تھیں مگر نیچے اسٹرن نہ ہونے کے باعث ان کے سفید سڈول بازو اس طرح چمک رہے تھے کہ گویا سیاہ دلوں میں چاند پوری آب و تاب سے اپنی چاندنی لٹا رہا ہو۔ پیٹ کا پچھلا حصہ بھی اسی طرح جھلک رہا تھا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات یا تعجب خیز امر نہیں تھا۔ وہ ایسے ملبوسات زیب تن کرنے کی عادی تھی۔

جس سوسائٹی سے اس کا تعلق تھا، جس ماحول میں اس نے پرورش پائی تھی وہاں ایسی باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتیں بلکہ دقیانوسی اور چہالت کہہ کر مذاق اڑایا جاتا تھا۔ وہاں حسن کا معیار ہی بے پردگی و بے حیائی سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ایک امریکن کورنس نے سمجھایا تھا۔

”بے بی! اگر خود کو سدا جوان رکھنا چاہتی ہو تو خود کو ایسی شمع بنا لو جس کی خاطر پروانے اپنی جان گواتے رہیں۔ اپنے حسن میں ایسی آگ پیدا کرو جو صرف راکھ بنانا جانتی ہو۔“ اور وہ اس جیسی بے شمار کورسز کی زیر تر بیت پروان چڑھتی رہی تھی۔

پھر اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اپنے حسن کی دوا حاصل کرنا اس کا حق ہے اور لباس ایسا ہی پہننا چاہئے جو اس کے حسن کی رعنائیوں کو اجاگر کر کے دیکھنے والی آنکھوں کو خیرہ کر ڈالے۔ زندگی ان چیزوں، ایسے رہن بہن کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ عجب نہیں لگتا تھا مگر اس لمحے شاہ ویز کی باتیں، اس کا غصہ، شعلے برساتی نگاہیں، کاٹ دار لہجہ اس کے ہوش و حواس سلب کئے دے رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر لفظ کو باری سے محروم ہو چکے تھے۔ اسی شش و پنج میں وہ گردن جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

”ایسا لباس پہننے کا فائدہ ہی کیا جو انسان کو بے لباس ظاہر کرے۔ اور ہمارے نبی ﷺ نے بھی ایسے باریک لباس پہننے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔“ اسے گھبرائے، بوکھلائے دیکھ کر اس کا لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔

”سوری، مجھے دھیان نہیں رہا۔“ اس کا دھیمالہجہ مخالفت آمیز تھا۔

”موسٹ ویکم۔ اس گاؤں کی آب و ہوا واقعی خاصی تازہ و زود اثر ہے۔ انسان پر کافی تیزی سے اثر انداز ہوتی ہے۔ مجھے از حد خوشی ہے کہ یہاں کے دو دن کے قیام نے تمہیں نہ صرف اپنی غلطی کا احساس بخشتا ہے بلکہ معذرت کرنا بھی سکھا دیا۔“

”پاپا کہتے تھے بہادری وہ نہیں جو آپ شیر کا شکار کر کے اس کے مردہ سر پر پاؤں رکھ کر ظاہر کریں بلکہ اصل بہادری یہ ہے کہ آپ اگر غلطی کریں تو احساس ہو جانے پر اپنی غلطی کا اعتراف کرنا اصل بہادری ہوتا ہے۔“

”گنڈ..... ویری گنڈ..... بیگ صاحب کی بہادری و عظمت کا میں پہلے سے قائل ہوں۔ بہر حال اس لباس کو تبدیل کرو اور ڈھنگ کا لباس زیب تن کرو۔ میں جا رہا ہوں۔“ وہ بال بنا کر کمرے سے نکل گیا۔ اس نے مشعل کو اب ساتھ چلنے کو کہا نہ مشعل نے ساتھ جانے کو کہا۔ وہ لباس و بے لباسی کے فلسفے میں مستغرق تھی۔

وہی دن ابھی تھے

جب ہم بچے تھے

مٹی کے گھر بناتے تھے

جو ہوتے بہت ہی کچے تھے

باتوں باتوں میں لڑتے تھے

پھر بھی جذبے سچے تھے

اب تو وہ دور ہے کہ

سو جیتی ہوں بیگانے ابھی تھے



فریجہ ان کے ساتھ گھر آ چکی تھی۔

بے جی ایک دن رک کر گھر روانہ ہو گئی تھیں۔ زرینہ بیگم کا رویہ گھر آتے ہی فریجہ کے ساتھ راضی ناراض، اپنائیت سے خالی رہا تھا۔ وہ بات کرتی تو مختصر سا جواب دیتیں، خود غلط نہ کرتی تھیں اور اسی طرح کے کئی رویے انہوں نے غیریت عیاں کرنے والے اپنائے تھے۔

فریجہ نے سائرہ سے مشورہ کیا کہ وہ کس طرح ان کو منائے۔ اس وقت زرینہ پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں کھانے سے فارغ ہو کر دوپہر کے وقت لیٹی تھیں۔

”اماں چند دنوں میں خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔ ان کا غصہ قوی ہوتا ہے۔“ ایک نکیہ اس کی طرف بڑھانے کے بعد دوسرا نکیہ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے سائرہ اطمینان سے گویا ہوئی تھی۔

”یہ مجھے معلوم ہے مگر میں چاہتی ہوں میں خود ان سے معافی مانگوں۔ نادانگی میں، میں نے انہیں بہت تکلیف پہنچائی ہے، بے حد زیادتی کی ہے۔ جب بیٹی تھی، بہو تھی، ان احساسات کا ادراک نہیں رکھتی تھی، اب ماں بننے کے بعد ان جذباتوں سے روشناس ہوئی ہوں تو مجھے اپنی ہر اس غلطی کا احساس ہو رہا ہے جو میں نے اصغر کے حوالے سے ان کے ساتھ کی۔ نامعلوم کیا ہو گیا تھا مجھے جو میں از حد خود غرض و خود پسند ہو گئی تھی جو اصغر کو صرف اپنا دیکھنا چاہتی تھی، اپنے علاوہ کسی اور کا نام بھی مجھے ان کے منہ سے سننا کوارہ نہیں تھا حتیٰ کہ اماں تک کو برداشت کرنا کوارانہ تھا۔ عورت کی دشمن عورت ہوتی ہے، خواہ وہ کسی بھی روپ میں ہو وہ اپنی ہی جنس کو ڈستی ہے۔ خود کو ہی جہ کے لگاتی ہے اور نمک چھڑک کر تما شہ دکھاتی ہے۔ مردوں کی ذات میں یہ کینہ پوری نہیں ہوتی۔ ایک مرد کبھی بھی دوسرے مرد کا گھر نہیں اجڑواتا، کبھی اپنے بیٹے کی غلط سمت میں رہنمائی نہیں کرتا اور شاید اسی وجہ سے وہ کامیاب و معتبر کہلاتا ہے، اسی وجہ سے خصوصی پروٹوکول ملتا ہے، خواہ وہ باپ کے رتبے پر فائز ہو، بھائی، بیٹا، داماد ہر رشتے میں مردوں کے لئے ریلیف ہوتا ہے۔“

”اللہ تعالیٰ نے مردوں کو حاکم کا رتبہ دے کر پیدا کیا ہے۔ یہ ان کی سرشت میں شمار ہوتا ہے کسی میں کم کسی میں زیادہ، کوئی بھی ان حاکمانہ رویوں سے خالی نہیں ہوتا اور جہاں بات عورتوں کی حوصلہ افزائی کی آجائے تو وہاں تو سونے پر سہاگہ والی مثال پوری ہو جاتی ہے۔ تم فکر مت کرو، اماں زبان کی عینی تیز چیریں دل کی اتنی نرم و شیریں ہیں۔“

”میں معافی مانگ لوں گی ان سے، کہہ دوں گی گزشتہ باتیں سب بھول جائیں، یوں سمجھیں ہم ابھی ملے ہیں۔ کل ہمارے درمیان میں آیا ہی نہیں۔ ہم آج ملے ہیں، ہماری خوشگوار زندگی کی ابتداء آج سے ہوئی ہے۔“ فریجہ اندامت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”ایسی باتیں ہر گھر میں ہو جاتی ہیں۔ اگر ہم اپنے ذہنوں میں لگے خود غرضی و نا عاقبت اندیشی کے جالوں سے پاک صاف ہو جائیں تو ہمارے دل و دماغ ہی نہیں گھر اور چہرے بھی خوب صورت اجالوں سے جھنگلے لگیں گے۔ مال و دولت وہ سرتیں، وہ الہوی خوشیاں فراہم نہیں کرتی جو سچی محبت اور بے لوث چاہتیں ہمیں بخش دیتی ہیں۔ جن سے ہمارے دل ہی نہیں روحیں بھی سرشار و مسرور ہو جاتی ہیں۔ انسان کے وجود کی تخلیق کا پہلا مطلب عبادت ہے اور دوسرا محبت۔ عبادت، محبت انسان کی اصل شناخت ہے۔ انسان کی تکمیل ہیں اور جو فی روح اپنی شناخت، اپنی بنیاد کو بھول جائے گا وہ خود کو قائم کس طرح رکھ سکتا ہے؟ اللہ کی عبادت اور اللہ کی محبت کی خاطر اللہ کے بندوں سے محبت کرنا، آج ہم ان احکامات سے غافل، بے پرواہ، بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح تو اتر سے مسائل درمساں، پریشانیاں درپریشانیاں ہمارا



مقدور فنی جا رہی ہیں۔ ہمارے اعمال میں نمود و نمائش آگئی ہے۔ ہم کسی تنگ دست کی مدد کرتے ہیں تو اللہ کی خوشی مد نظر نہیں ہوتی بلکہ خود نمائی ملحوظ خاطر رکھی جاتی ہے۔

جب تک ہم سچے دل سے، پوری نیک نیتی سے اللہ سے معافی نہیں مانگیں گے، اس کے حضور خود کو بند لئے، نیک بننے بلکہ اس کے لئے پسندیدہ بندے بنانے کی دعائیں کریں گے تو وہ مالک و مولیٰ ہماری گناہ آلود زندگیوں کو بدل سکتا ہے۔ ہماری دعاؤں میں یہ دعا بھی لازمی ہونی چاہئے کہ یا اللہ! آپ ہمیں ایسا ہی بننے کی توفیق عطا فرمائیے جیسا آپ ہمیں دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”سارہ، بیوہ ہے۔ دعائیں بھی ہمارے دل کی خواہشوں کا حصہ ہوتی ہیں اور دل کا تعلق سیدھا رب العالمین سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ غرضی ہماری دعاؤں میں تاثیر ہوگی اتنی ہی شدت سے دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ میں پچھلے دنوں سے دعا مانگ رہی تھی کہ بے جی اور اماں مجھے لینے آئیں اور دیکھو وہ دونوں ہی مجھے لینے آگئی تھیں۔“ فریجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔



عورت جب قربانی دینے پر تیار ہو جائے تو بڑی سے بڑی، عزیز سے عزیز تر چیز قربان کر ڈالتی ہے اور معمولی سے دکھ و اندر دگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہی حال حرا کا تھا۔ اسی حضور نے کچھ اس انداز میں اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا کہ وہ جو فرم کی از حد محبت اور بھرپور توجہ پا کر خود کو ان کے بغیر ادھورا و نامکمل سمجھنے لگی تھی، ان کی بے لوث چاہتوں کی ایسی اسیر ہوئی تھی کہ تصور میں بھی ان سے جدائی برداشت نہ تھی۔ ان کی محبت، چاہت، رفاقت اسے ہر قیمتی سے قیمتی شے سے عزیز تھی۔ وہ صرف ان کی قربت کی خواہش مند تھی۔ اسے فقط ان کی الفت کی کرم نوازیوں مطلوب تھیں۔ وہ ان سے منسوب تھی اور انہیں تا حیات خود سے وابستہ رکھنا چاہتی تھی۔ ان جذبات سے سرشار اس نے وہی کیا جو امی حضور نے اسے مشورے دیئے تھے۔

فرم اس کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ ترین ملبوسات خریدتے تھے۔ مہنگی جیولری اس کے پاس موجود تھی۔ اپورٹ میک اپ پر فیومز اس کے پاس بے حساب موجود تھا جو ایسے ہی پیک شدہ رکھا تھا۔ میک اپ کی وہ عادی نہ تھی سو فرم کے از حد اصرار پر چند لپ اسٹکس، ہاؤڈرز اور پرفیومز کے علاوہ کسی اور سامان کی اس نے پیکیجنگ تک نہ چھوئی تھی۔ وہ اسی طرح محفوظ رکھا ہوا تھا۔

اس کے لباس میں جار جٹ، سلک اور بنارسی ساڑیوں کے علاوہ جاپانی کپڑے کے شلوار سوٹ و پانچاھے کے علاوہ بے شمار سوٹ موجود تھے جن پر نقیص اور فیشن کے لحاظ سے کڑھائی کے علاوہ جدید فینسی ورک جھلملا رہا تھا۔ وہ سادگی پسند تھی، پھر بچپن سے بہت معمولی و سادہ ملبوسات زیب تن کرنے کی عادی تھی اور کچھ فطرتاً ہی چمک دمک و شوٹا پسند نہیں کرتی تھی۔ فرم کے اصرار کے باوجود وہ ایسے بھاری ملبوسات کو استعمال نہ کر سکتی تھی جو ایسے ہی رکھے تھے اور یہی حال زیورات کا تھا۔ فرم نے سونے، چاندی، ہیروں کے علاوہ نایاب و قیمتی پتھر و موتیوں سے آراستہ زیورات کے ڈھیر لگا رکھے تھے جن میں سے وہ ہلکے سے کام والا سونے کا سیٹ پہنے رہتی تھی جو لاکٹ اور نازک سی بالیوں پر مشتمل تھا۔ البتہ دونوں ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں کڑوں کے ہمراہ بڑے شوق سے پہنتی تھی۔ ان کے علاوہ اسے کسی اور چیز سے لگاؤ نہ تھا۔ لیکن فرم اپنی لائی چیزوں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً سمجھاتے رہتے تھے کہ وہ ان کی لائی ہوئی چیزوں کو حفاظت سے رکھے اور ان کا ذکر امی حضور سے بھی کرنے سے منع کر چکے تھے۔

اسے ان کی اسی بات سے اختلاف تھا کہ وہ ماں کی بالکل بھی عزت نہیں کرتے بلکہ چیزوں کو حفاظت سے رکھنے کی تاکید کر کے انہیں بے اعتبار بھی ظاہر کر دیا تھا۔ اس نے اسی وقت غلطی سے کہا تھا۔

”مجھے آپ کی یہی بات سخت ناپسند ہے کہ آپ امی حضور کو وہ عزت، وہ رتبہ نہیں دیتے جس کی وہ حقدار ہیں۔ اب بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ان سے میں یہ سامان چھپا کر رکھوں۔“

”مائی ڈیئر! تم نہیں سمجھ سکتیں ابھی ہماری سوسائٹی کی مدرز کو، وقت کے ساتھ ساتھ سب جان جاؤ گی۔ میری بات بھی، میرے جذبات بھی۔ فی الحال اس وقت سمجھنا تمہیں ایسا ہی ہے جیسے تپتی ہوئی دھوپ میں تم سے کہوں کہ چھتری کھول کر کھڑی ہو جاؤ تیز بارش ہونے والی ہے تو تم مجھے دیوانہ ہی سمجھو گی۔“

اپنی نگرانی میں سب سامان انہوں نے حفاظت سے رکھ لیا تھا۔ نامعلوم وہ کیا چاہتے تھے، کیا سمجھ رہے تھے۔ وہ اس وقت ان کی ہر سوچ ہر سمجھ سے لاپرواہ تیزی سے کچھ سوٹ، زیورے کراچی کے پاس آگئی تھی۔ وہ دیکھتے ہی کوپا ہوئیں۔

”یہ دو کوڑی کے کپڑے اور زیورہ میرے بچے استعمال نہیں کرتے۔ کسی کے دل جیتنے کے لئے اپنا دل دینا پڑتا ہے۔ ایسے سستے سستے سوٹ دو گی تو کون تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائے گا؟“ ان کا لہجہ دھوپ چھاؤں کی طرح طرز و چاشنی کی متضاد کیفیت میں ڈوبا حرا کو ہنسنے لگا تھا۔

وہ اپنی ذات کی نفی کی اس حد تک عادی ہو گئی تھی کہ خواہشات و آرزوئیں اپنا وجود بھی کھوپکی تھیں لیکن دوسروں کے لئے اس کا دل از حد وسیع تھا۔ بہت فراخ دلی سے اپنی چیزیں دوسروں میں بانٹ دینے میں خوشی محسوس کرتی تھی۔ اور یہاں تو معاملہ بھی از حد خاص تھا اور جذبات بھی خصوصی تھے۔ ان سب کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ اعلیٰ ترین چیزوں کا ہی انتخاب کر کے لائی تھی مگر امی حضور کے لہجے نے سب جوش و خروش ماند کر ڈالا تھا۔

”یہ سونے کے سیٹ فرم بتا رہے تھے، بہت قیمتی ہیں اور یہ کپڑے بھی تمام غیر ملکی بازاروں سے خرید کر لائے تھے، دیکھیں اس ساڑی پر سچے موتیوں کے ہمراہ اصلی سونے کے تار سے کام بنایا گیا ہے۔“ اس نے ڈارک بلیو ساڑھی ان کی جانب بڑھائی جو کوئلڈن فینسی کام سے جھلملا رہی تھی۔ ”یہ چیپٹی کا غراہ سوٹ، اس پر مقیش کا کام کسی بہار دکھا رہا ہے اور یہ تنگ پانچماہ گرنہ، سلمہ ستارے سے چمکتا ہوا ایسے لگ رہا ہے جیسے چمکتا و مکتا آسمان ہمارے ہاتھوں میں اتر آیا ہو۔ اور یہ جار جٹ کی.....“

”ہاں ہاں، میں دیکھ رہی ہوں۔ مگر مجھے وہ بھی تو دکھاؤ جو فرم میاں لاتے رہے ہیں، سب دیکھ کر ہی فیصلہ ہوگا کہ کون سے دیئے جائیں اور کون سے نہیں۔ مجھے غلطو سمجھنا مت، یہ سب میں تمہاری بھلائی و بہتری کی خاطر کہہ رہی ہوں کہ تمہاری سرخروئی چاہتی ہوں ورنہ مجھے ان چیزوں سے اس عمر میں کیا سروکار۔ اپنی چیزیں ہی برتنے کی رغبت نہ رہی۔“

”میں سمجھ رہی ہوں امی حضور! بخدا مجھے آپ کی نیت، آپ کے خلوص پر بھروسہ ہے۔ میں جانتی ہوں آپ میری خیر خواہ ہیں۔ چلیں آئیں، آپ خود اپنے ہاتھوں سے جو مناسب سمجھیں منتخب کریں۔ میں آپ کو ٹرنک کی چابی دے دیتی ہوں۔“

فرم کی ہر ہدایت کو فراموش کر کے وہ ٹرنک اور وارڈروب میں رکھی تمام اشیاء ان کے حوالے کر چکی تھی۔

امی حضور کی رشک سے آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ ایسا نادرو قیمتی سامان دیکھ کر ان کے اندر کی حاسد و تیز مزاج کی روایتی ساس انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی۔ انہوں نے بہت سرعت سے کافی سارا مہنگا سامان اپنے تصرف میں لے لیا تھا۔ دل میں بے حد خوش ہونے کے باوجود بظاہر بے نیازی و لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے کوپا ہوئیں۔ ”بس یہی سامان لے رہی ہوں، تمہارے نام سے بھیجوں گی تو بچے کچھ تو تمہاری طرف سے دل صاف کریں گے۔ پھر تمہارے ختے نہیں ملتے رہیں گے تو ایک دن ان کے دل بالکل صاف ہو جائیں گے اور وہ تمہیں ماں سمجھنے لگیں گے۔ اور اس دن سمجھنا تم نے اس گھر میں اپنے قدم جما لئے ہیں۔“ وہ سامان ایک گھنٹہ کی گھنٹی میں باندھتے ہوئے بے تاثر لہجے میں کوپا ہوئیں۔



رات سرد تھی۔

ہر طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی اداسی پھیلا رہی تھی۔ نامعلوم کس وقت لائٹ چلی گئی تھی اور اسی بے چینی نے اسے گہری نیند سے بیدار کیا تھا۔ موسم سرد ہونے کے باعث کمرے میں گرمی و گھٹن کی وہ فضا نہ تھی جو عموماً لائٹ فیل ہو جانے کے بعد محسوس ہوتی ہے مگر پھر بھی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ پہلے تو خاصی دیر آنکھیں پھاڑے وہ اندھیرے سے مانوس ہونے کی کوشش کرتی رہی اور چند ثانیے بعد وہ کامیاب بھی ہو گئی۔ کمرے کی اشیاء اندھیرے میں غیر واضح تھیں بلکہ کچھ عجیب عجیب ڈراؤنی سی لگ رہی تھیں۔

نیاعلاقہ۔

نیاماحول۔

نئی جگہ۔

ایک خوف کی لہر اس کے وجود میں سرایت کر گئی۔ اسی لمحے باہر سے گیدڑوں کی آوازیں ماحول کو مزید وحشت ناک بنانے لگیں۔ ساتھ چھیٹگیروں اور مینڈکوں کی آوازیں پہلے ہی ہر سمت سے کونخ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر کچھ فاصلے پر سوتے ہوئے شاہ ویز کی طرف دیکھا جو دنیا و ما فیہا سے بے خبر بیٹھی وُپر سکون نیند میں گم تھا۔ اندھیرے کے باعث اس کے چہرے کے خدو خال واضح نہیں تھے مگر کبھی کبھی اس کے سانسوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی جو اس کی گہری نیند کا تاثر تھی۔ وہ چند لمحے یہ سوچ کر بیٹھی رہی کہ اس کی طرح بجلی کی غیر موجودگی اور باہر سے آنا شور سن کر وہ جاگ جائے گا اور اس کے جاگنے سے اسے بھی ڈھارس مل جائے گی لیکن اس کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔

کافی دیر گزرنے کے بعد بھی اس کی پرسکون نیند میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا۔ موسم بلاشبہ سرد تھا مگر اس کی عادت تھی، گرمی سردی وہ فین چلا کر سونے کی عادی تھی۔ اسے سی کی کوئٹنگ کے باوجود فین کی ہوا اسے ضرور چاہئے ہوتی تھی۔ اب بھی بجلی بند ہو جانے کے باعث فین بند ہو گیا اور ہوارکنے کی گھٹن سے اس کی آنکھ حسب عادت کھل گئی تھی۔ جب کہ شاہ ویز اسی اطمینان سے بخواب تھا۔ کوپا بجلی کا ہونا نہ ہونا اس کے لئے کوئی وقعت و اہمیت نہ رکھتا تھا۔

اس کے اندر شاہ ویز کے لئے رشک و ستائش کی لہر سی اٹھی تھی۔ ”کتنے مضبوط و لاپرواہ انسان ہو تم۔ جس قدر انتہا پسند ظالم نظر آتے ہو اتنی ہی مظلومیت و عاجزی تمہاری ذات میں ہے۔ خواہشات و آرزوئیں تمہاری ذات کا حصہ نہیں ہیں۔ کتنی عجب بات ہے یہ۔ جب پہلی دفعہ تمہاری اس بے نیازی، بے رخی و فطرت اندازی نے میرے اندر توجہن و تضرع کا غبار بھر ڈالا تھا، میں جو بڑے سے بڑے اسمارٹ، ڈشنگ، پیڈسم نو جوان کو نظر بھر کر دیکھنا کوارہ نہ کرتی تھی، انہیں تڑپا کر، سسکا کر، رُلا کر قہقہے لگاتی تھی

نامعلوم کس طرح تمہاری یہ بے پرواہی و بے نیازی مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج لگنے لگی اور میں جو وجہہ سے وجہ پرتر چہرے کی جانب ایک نظر ڈالنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی، بے اختیار میری نگاہیں تمہارے وجود کا احاطہ کرنے لگیں۔ میری تمام سوچیں، تمام خیالات، تمام منصوبے، تمام احساسات صرف اور صرف تمہارے گرد گھومنے لگے۔

میں تمہیں اپنے حُسن کے آگے سرنگوں دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنے تمام ہوائے فریڈ زکی طرح تمہیں بھی اپنے سامنے اپنے عشق میں آہیں بھرتا دیکھنا چاہتی تھی اور اسی تمنا میں، میں ہر فیصلے، ہر خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہی کرتی گئی جو میرے دل نے مجھے کہا۔ جو میرے انتقام نے مجھے راہ دکھائی۔ سو دونیاں کا تو میں نے کبھی حساب لگایا ہی نہ تھا۔ شکست سے میں واقف ہی نہ تھی۔ فتح یاب ہونا میں اپنا مقدر سمجھتی تھی۔

اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے نہ آئے تب تک خود کو سب سے بلند و برتر سمجھتا ہے۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ جب تک تم سے غیر وابستہ رہی، تمہاری سنجیدگی، بے اعتنائی و گریز کو ڈرامہ سمجھتی رہی۔ لیکن جب سے تم کو قریب از حد قریب سے سمجھنا، پرکھنا پڑا تب ہی سے اپنی ہر سوچ، ہر ضد پر شرمندگی و ندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ تم میری سوچوں سے بالکل متضاد ہو۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا مرد ہو جو تمام اختیارات رکھتا ہو، تمام حقوق کا مالک ہو کر کبھی اپنے نفس و کردار پر اتنا زبردست قابو رکھتا ہو۔“ وہ سنجیدگی سے سوچ رہی تھی وہ محض اس کی خوشی کی خاطر اپنی خواہشات و اختیارات سے دستبردار تھا۔ روز و شب کے دوران تمہائی کے بے شمار مواقع ان کے درمیان آئے تھے لیکن اس نے کبھی نادانستگی میں بھی اس پر ایک نگاہ استحقاق نہ ڈالی تھی۔

رات کے اس درمیانے پہر میں وہ مدہوش سوتے ہوئے شاہ ویز کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے اپنے آج کل کے گزرے ہوئے جذباتی و غیر جذباتی لمحات کا تجزیہ کر رہی تھی۔ شاہ ویز نے سوتے ہوئے کروٹ بدلی تھی۔ رخ اس کی جانب ہو گیا تھا اور اسی لمحے لائٹ آگئی۔ لائٹ بلب کی نیلگوں روشنی کمرے میں پھیل گئی اور فین پوری رفتار سے ہوا دینے لگا۔ پچھلے کی آواز میں باہر سے آتی آوازیں خاصی دب گئی تھیں۔ کچھ لمحے قبل جس گھٹن و بے چینی نے اسے بیدار کر ڈالا تھا وہ اب رفع ہو گئی تھی۔

وہ لیٹ گئی۔ اس نے وال کلاک کی جانب دیکھا جہاں سوئیاں دوکا ہندسہ عبور کرنے والی تھیں۔ دل میں ابھرنے والی سوچوں کو وہ راہ نہ دینا چاہتی تھی کیونکہ چند دن سے اپنے اندر ہوتی بغاوت سے فکر مند و ہراساں تھی۔ نامعلوم کسی تبدیلی رونما ہوئی تھی جس کو وہ جانتے ہوئے بھی انجان بنی ہوئی تھی۔ ایک آنچ تھی جو آہستہ آہستہ اس کے تن من میں سلگنے لگی تھی، عجب سرور آمیز بے کلی و بے چینی تھی جو اس کے دل میں بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

جذبوں کی بدلتی شوریدہ سری، دھڑکنوں کا تبدیل انداز اسے کسی انجان و غیر مانوس وادیوں کی سیر کروا رہا تھا۔ اس نے نگاہیں شاہ ویز کے چہرے پر مرکوز کر دیں، دل میں خوشگوار احساس جاگزیں ہوا تھا۔ رات کے اس پہر وہ اسے از حد دل کے قریب محسوس ہوا۔ وہ اپنے اس جذبے کو کوئی نام تو نہ دے پائی ماسوائے اس احساس کے کہ دل چاہا اسے دیکھے جائے، بنا کسی جنبش کے بغیر پلکیں جھپکائے۔

اس کے چہرے کے نقوش بہت جاذب تھے۔ گندی رنگت میں سرخیاں سی سٹھلی ہوئی تھیں۔

کشادہ پیشانی، اونچی ناک (جس کا اسے ہر لمحہ زعم رہتا تھا) سیاہ گھنی مونچھیں، گلابی بھرے ہونٹ، اس میں انوکھی کشش و جاذبیت تھی کہ ایک نگاہ دیکھنے والا دوسری نگاہ از خود ڈالتا تھا۔ وہ اسے دیکھے جا رہی تھی اور اندر بیدار ہوتی نئی انگلیوں، نئی خواہشوں اور انہونی سرکوشیوں نے اسے بے قرار کر ڈالا تھا۔

وہ بے کل، بے کل گھبرا کر اٹھ گئی۔ بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ جس شخص سے پوری شدت سے نفرت کرتی آئی تھی وہی شخص اب حاصل حیات کیوں لگنے لگا تھا؟ شدید نفرت کا دوسرا رخ شدید ترین محبت ہوتا ہے؟

”یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ شاہ ویز مجھے اتنا عزیز کیوں محسوس ہو رہا ہے؟ دل اس کے قرب کا تمنائی کیوں ہے؟ آنکھیں اسے دیکھنے، مسلسل دیکھنے کی تمنائی کیوں ہیں؟ اوہ گاڈ! یہ کیا ہو رہا ہے؟..... مجھے کیا ہو رہا ہے؟“ وہ متوحش سی کمرے میں پکرانے لگی تھی۔

□●□

عرفان سے اس کی ملاقات کھانے کے دوران ہوئی تھی۔

وہ اور امی حضور کھانا کھا رہی تھیں جب وہ داخل ہوا تھا اور سیدھا وہیں آگیا تھا۔

”بہت بھوک لگی ہے گرینڈ مرد! ہمارا انتظار بھی نہ ہوا آپ سے؟“ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتا ہوا کویا ہوا۔

حرا غیر متوقع اس کی آمد پر گھبرا سی گئی تھی۔ چادلوں کی ڈش میں سے چمچے اٹھا ہاتھ وہیں تھم گیا تھا جب کہ عرفان کی اس کی جانب اٹھی نگاہ اٹھی رہ گئی تھی۔ استعجاب، اشتیاق، تجسس و ستائش کیا کچھ نہ تھا ان نگاہوں میں۔ حرا اس کی ان نگاہوں سے ہی گھبرائی تھی۔ اس نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تھا اور امی حضور کو گرینڈر کہنے سے سمجھ گئی تھی کہ وہ عرفان ہے۔ مگر اسے مسلسل پُرشوق نگاہوں سے اپنی جانب بے باکی سے دیکھنا اسے پسند نہ آیا۔ وہ نگاہیں جھکا کر بیٹھ گئی۔

”تم نے خود ہی تو فون پر منع کیا تھا کہ کھانا باہر ہی کھاؤ گے۔“ امی حضور قہقہے کی ڈش اس کی جانب بڑھاتے ہوئے وضاحت کر رہی تھیں اور ایسے پسندیدہ موقع پر وہ ارد گرد سے بیگانہ ہو کر اپنی نگاہوں کو ٹیبل پر بھی ڈشز تک ہی مرکوز رکھتی تھیں۔ اس وقت بھی یہی صورت حال تھی۔ انہوں نے مرونا بھی حرا کا تعارف کرنا کوارہ نہ کیا تھا لیکن عرفان سے صبر نہ ہوسکا۔ وہ حرا کو دیکھتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا تھا۔

”گرینڈ مرد! یہ اسپر اسیدھی آکاش سے اتر کر کہیں براجمان ہوئی ہیں یا ان سے آپ کی ملاقات پہلے ہو چکی ہے؟“

”ہیں..... کون اسپر؟“ انہوں نے قریب رکھی عینک آنکھوں پر لگاتے ہوئے استعجابیہ انداز میں استفسار کیا اور پھر اس کا چہرہ حرا کی جانب دیکھ کر مسکرا کر کویا ہوئیں۔

”یہ حرا ہے، تمہاری اسٹیپ مدر۔“ وہ سرسری تعارف کر کر دو بارہ بہاری کباب کی ڈش کی جانب متوجہ ہو چکی تھیں۔ جب کہ عرفان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ جن نگاہوں میں بے باکی و شوخی کے رنگ بھرے ہوئے تھے وہاں اب بے یقینی و منظر اب کی سی کیفیت موجزن تھی۔

اس کی نگاہوں کا انداز، چہرے کے تاثرات بدلے تو حرا کو بھی حوصلہ ہوا اپنے رشتے کے حوالے سے حق ادا کرنے کا۔ کوسوتیلی ماں ہی سہی مگر ماں تھی اس کی۔

”کھانا کھائیں آپ۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ اس کے پُراعتماد لہجے میں خرم کے لہجے جیسی پُراعتمادی و وقار ٹمکتی تھی۔

”جی میں کھا رہا ہوں۔ آپ بھی کھائیں۔“ وہ آہستگی سے کہتا ہوا اپنی پلیٹ پر جھک گیا تھا۔

شروع شروع میں چند دنوں تک وہ اس سے خاصے جھجکے ہوئے انداز میں ملتا رہا تھا پھر آہستہ آہستہ وہ اجنبیت و جھجک ختم ہوتی گئی۔

”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ اس وقت رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ امی حضور کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جب امی حضور سونے کے لئے دراز ہو گئیں تو وہ بھی سونے کے لئے اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی تھی عرفان نے رک کر سوال کیا تھا۔

”میرے خیال میں ہمارے درمیان میں کوئی غیریت والا رشتہ نہیں ہے کہ آپ کو کوئی بات پوچھنے سے قبل اجازت درکار ہو۔“ وہ مشفقانہ انداز میں کویا ہوئی تھی۔

”ایک منٹ..... میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان میں کوئی غیریت نہیں ہونی چاہئے۔ یہ زندگی بہت مختصر ہے، جتنا ہو سکے اسے ہلکی خوشی گزارنا چاہئے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں آپ یہاں اس طرح رہتی ہیں جیسے کوئی قیدی نظر بندی کی زندگی گزار رہا ہو۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا خرم صاحب نے پابندیاں لگائی ہیں آپ پر؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں..... خرم نے کوئی پابندی نہیں لگائی بلکہ میں بہت آزاد و خوشحال زندگی گزار رہی ہوں، باہر میں اس لئے نہیں نکلتی کہ عزیز کوئی ہے نہیں۔ ماموں اور ممانی تھے وہ بھی کچھ عرصہ قبل وفات پا چکے ہیں۔ ایک بڑی بہن ہیں وہ اپنے شوہر کے ساتھ دہلی میں رہائش پذیر ہیں۔ اب باہر میں کس سے ملنے جاؤں؟ ضروریات زندگی کی ہر شے مجھے گھر بیٹھے ہی مل جاتی ہے۔ بلا جواز گھر سے نکلتا میں معیوب سمجھتی ہوں ورنہ ایسی کوئی بات نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اور ایک بات یہ کہ مجھے آپ کا خرم کو نام سے پکارنا قطعاً پسند نہیں آیا۔ انسان کتنا ہی تہذیب یافتہ کہلائے، کتنا ہی ماڈرن بن جائے مگر باپ کو ان کے نام سے پکارنا کسی مہذب شخص کو زیب نہیں دیتا۔“ اس کے وضاحتی لہجے میں ناکواری بھی تھی۔ خرم کو نام سے پکارنا اسے نہ بھایا تھا۔

”ارے..... آپ ماسٹر کر گئیں؟ سوری..... اکیچو نیلی میرا ہرگز ارادہ آپ کی دل آزاری نہ تھا۔“ اس کے لہجے میں حقیقی خجالت تھی۔

”اوکے، کوئی بات نہیں۔ بچوں سے غلطی ہو جاتی ہے مگر ماں برا نہیں مانتی۔“

”ماں..... اور وہ بھی آپ؟“ عرفان بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسا تھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ میں آپ کی سگی ممانیں ہوں لیکن ضروری نہیں عمروں کی خلیج جذبوں کو تقویت نہ بخشنے، شفقت کا تعلق جذبوں کا مہون منت ہوتا ہے عمروں کا محتاج نہیں۔ آپ مجھے کچھ بھی کہیں مگر خرم کے حوالے سے آپ مجھے سکے بیٹے کی طرح عزیز ہیں۔“ اس لمحے اس نوخیز خُسن رکھے والی لڑکی کی زبان میں پختہ اور متا سے چور عورت کی تاثیر تھی۔ اس کے لہجے، چہرے، آنکھوں سے ایک مکمل ماں کا تقدس عیاں تھا۔

عرفان نے حیرانی اور نا پسندیدہ نگاہوں سے اس دھان پان سی شفاف رنگت والی لڑکی کو دیکھا تھا جس کا حُسن پھولوں کو شرماتا تھا۔ جس کی سیاہ بھنورا آنکھوں کی چمک کے سامنے ستارے بھی ماند نظر آتے تھے۔ جس کے حُسن کی چمک دل پر برق بن کر گر گئی تھی۔ جو عمر میں اس کی چھوٹی بہن سے بھی چھوٹی تھی، وہ اسے متنا کا درس دے رہی تھی جو اس کا ذہن کبھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔

وہ بتا کچھ کہ وہاں سے تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

□●□

محبت ایک ایسے احساس کا نام ہے جو کسی کے ہونے سے تو نہیں ہوتا مگر کسی کے نہ ہونے سے ہوتا ہے اور انسان کو سرتا پاتبدیل کر ڈالتا ہے۔

محبت نہ ہونو صدیاں گزر جاتی ہیں اور ہو جائے تو پہل بھر میں ہو جاتی ہے۔ یہی وہ آگ ہے جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔ از حد پر اسرار ہوتی ہے یہ آتش عشق جو تن

من جلا کر خاکستر کر ڈالتی ہے مگر ناپیدہ رشتی ہے اور ستم یہ ہے اسے بھی دکھائی نہیں دیتی جس کو جلا رہی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

اس پر دل کی انہونی خواہش کا انکشاف کیا ہوا کو یہ دنیا ہی بدل کر رہ گئی اور وہ اپنی تمام تیزی، طراری، طغیہ، غرور، اعتماد و افتخار بھول کر ایک عام سی خاموش، سادہ و سنجیدہ مزاج لڑکی بن کر رہ گئی۔

”اُف کتنی عجیب بات ہے مشی..... تم جو بہت بلندی پر پرواز کرنے کی عادی تھیں، نیچے دیکھنا تمہیں تو جین محسوس ہوتا تھا۔ تم جو پیر کا جوتا تک ہائی کوالٹی کا چوٹس کرتی تھیں، آج اپنے لائف پائرنٹر کے طور پر ایک ٹف اینڈ روڈ شخص کو سلیکٹ کر رہی ہو جو کسی بھی حوالے سے تمہاری چوٹس، تمہارے اسٹینڈرڈ، تمہاری سوسائٹی سے میچ نہیں ہوتا۔“ اس کے اندر کوئی فریاد کر رہا تھا۔ اسے اس راہ سے واپس لوٹ جانے کو کہہ رہا تھا جس پر وہ پاؤں رکھ چکی تھی۔

”میں نہیں جانتی میرا یہ فیصلہ درست ہے یا غلط، یہاں میں کامیاب ہوں گی یا نا کام؟ مگر میں یہ جانتی ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے، اس کے سنگ چلنے میں فخر محسوس ہوتا ہے۔ جب میں اس کے ساتھ ہوتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی آہنی قلعے کے حصار میں ہوں۔ از حد محفوظ کہ گرم و سرد ہوائیں بھی اس کی اجازت کے بغیر مجھے چھو نہیں سکتیں۔

اس کی رفاقت مجھے خوشی بخشتی ہے، من کو شانتی۔ اسے پا کر مجھے محسوس ہوا دراصل مرد ہوتا کیا ہے۔ غیرت، عزم، حوصلہ، حمیت و شرافت کا دوسرا نام مرد ہے۔ مکمل چھاؤں، ساہنہاں اور محافظ۔“

خود سے لڑتے ہوئے سمجھاتے ہوئے اسے تین دن ہو گئے تھے۔ نہ جانے انا کی شکست تسلیم نہ ہو پا رہی تھی یا خود داری کا زعم۔ چکنا چور ہو جانے کے بعد وہ اس حقیقت سے نگا ہیں چہ اری تھی کہ شاہویر اپنی تمام اکھڑ مزاجی، بے اعتنائی، لاپرواہی و بے رخی کے باوجود دل کے کسی خانے میں براہمان ہو گیا تھا۔ وہ متضاد کیفیت کا شکار تھی۔

کبھی دل کی چاہت کو سراہتی، سرور ہوتی اور کبھی پڑمردگی و امتیاز سے بے چین و مضطرب ہونے لگتی تھی۔

یہ تین دن تین صدیاں بن کر اس پر گزرے تھے۔ ان دنوں وہ خود سے ہی نہیں شاہویر سمیت سب سے بیگانہ رہی تھی۔ سوچوں کے عمیق سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبتی ابھرتی ناؤ کی طرح تھی۔

شاہویر اس کی دلی حالت سے بے خبر بہت خاموشی سے اسے الجھے الجھے، گم صدمہ دیکھ رہا تھا اور اس کی عادت سے واقف ہونے کی وجہ سے اس کے حال پر ہی چھوڑ رکھا تھا۔ لیکن تین دن گزرنے کے باوجود بھی اسے اسی انداز میں دیکھا تو اب نظر انداز نہ کر سکا۔ قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے گویا ہوا۔

”اینی پر اہلم؟ تین دن سے کمرہ نشین کیوں ہو گئی ہو؟“ جذبات بدلے تو احساسات خود ہی تبدیل ہو گئے۔ وہ قریب بیٹھا تو دل از خود ہی نئے انداز میں دھڑکا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں کچھ سمٹ گئی۔

وہ قریب پہلی بار نہیں بیٹھا تھا۔ اکثر ایسے مواقع آتے رہتے تھے۔ لیکن اب سے قبل ایسی فحری گھنٹیاں پہلے کبھی نہ بچتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

”ماراض ہو؟“ جواب نہ ارد۔

”ہوں، ماریاض ہو۔ اس دن تمہیں جنگل میں ڈالنا تھا اس لئے۔“ اس کی خاموشی کو ناراضگی پر محمول کرنا وہ کہہ رہا تھا۔

”اس معاملے میں تمہاری ناراضگی، خفگی یا خاموشی میں قطعی برداشت نہیں کروں گا کیونکہ غلط بات مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ اور اس دن تم نے بہت غلط حرکت کی تھی بلکہ..... بلکہ اگر میں تمہاری نیچر سے واقف نہ ہوتا تو ایک سیکنڈ بھی تمہیں ساتھ رکھنا کو ارا نہ کرتا۔ کیونکہ مجھ جیسا آدمی کبھی بھی اخلاق سے بے بہرہ عورت کو برداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ حمیت کے معاملے انسان کو از حد تنگ ذہن بنا ڈالتے ہیں۔“

”میں فحنا نہیں ہوں، بلکہ بہت گھٹی فیل کر رہی ہوں۔ اس دن جو کچھ ہوا وہ اچھا نہیں ہوا۔ ایک یوٹیلیری کیئرنگ میری ممانے نہیں کی اس لئے شاید ایسی ہوں۔ ورنہ ایسے مومنٹس لائف میں کبھی نہیں آتے۔“ شاہویر کے گمبیر لہجے میں نا کواری اس نے شدت سے محسوس کی تو اپنی صفائی میں بول اٹھی۔

”دیکھو، چھلی کے بچے کو کوئی تیرنا نہیں سکھاتا اور نہ ہی چٹیا کے بچے کو اڑاتا۔ تیرنا اور پرواز کرنا ان کی فطرت میں شامل ہوتا ہے اور وہ بغیر گائیڈنس کے سوئنگ بھی کرتے ہیں اور فرائی بھی۔ پھر ہم تو اشرف المخلوقات ہیں۔ ہمیں سوچنے، سمجھنے کے لئے عقل استعمال کرنے کی صلاحیت دی گئی ہے۔ ابھیے اور برے کی تمیز دی گئی ہے اور جو اپنے بڑوں سے تمیز نہیں سیکھتے انہیں وقت از خود سکھا دیتا ہے۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں جس طرح میں سیکھ گئی ہوں۔ ورنہ لوگوں کو اپنی کسوٹی پر پرکھنے کی عادی تھی۔ کبھی کوئی لمحہ ہماری زندگی میں ایسا بھی آتا ہے ہم جو کتنی سالوں میں نہیں سلجھا پاتے وہ لمحے میں سلجھا لیتے ہیں اور میری زندگی میں بھی ایک ساتھ کئی لمحے ایسے آ کر مجھے آگئی در آگئی سے ہمکنار کر گئے۔“

کھوئی کھوئی سی دھیمے لہجے میں بولی گویا وہ اس سے نہیں کسی اور سے مخاطب تھی۔ شاہویر نے پریشان کن انداز میں اس کی جانب دیکھا تھا۔ جامنی کاشن کا سوٹ شکن آلود تھا، بال الجھے الجھے، ہائٹ چہرے پر عجیب اداسی و بے چارگی پھیلی ہوئی تھی۔ سیاہ دراز پٹلیں عارضوں پر جھکی ہوئی بخروٹی انگلیوں کو ایک دوسرے میں بار بار پوسٹ کرتی وہ کوئی معصوم سی لڑکی لگ رہی تھی۔ شعلہ صفت و بے رحم مشعل، بجھ چکی تھی۔

”یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے..... طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ اس نے فکر مندی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دریافت کیا تھا۔

نا معلوم کیا ہوا تھا اسے، اس کی مضبوطی و وحدت انگلیوں کے لمس کا کرشمہ تھا یا کم ہمت و حوصلہ ہو گئی تھی کہ بے اختیار اس کے سینے سے لگ کر شدتوں سے رو پڑی تھی۔

شاہویر بھونچکا رہ گیا۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس رد عمل کا اظہار کرے گی۔ وہ حیران پریشان سوچ رہا تھا کہ ایسا کیا ہو گیا؟

”مشعل! کیا ہوا ہے؟ پلیز بتاؤ، تمہیں میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہے؟ تکلیف ہوئی ہے؟“

”نہیں، دکھ تو میں نے آپ کو دیے ہیں، تکلیف میں نے آپ کو پہنچائی ہے اپنے ہر عمل سے، ہر طریقے سے، بہت بری ہوں میں..... بہت بری..... مجھے معاف کر دیں۔ پلیز مجھے معاف کر دیں ورنہ میں مری جاؤں گی۔“ وہ اس کے سینے سے لگی بچوں کے انداز میں روتے روتے کہہ رہی تھی۔

شاہویر پاگلوں کی طرح اپنے بازوؤں پر اس کے کھمرے کو لڈن بالوں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی سماعت پر دھوکے کا گمان ہو رہا تھا۔ ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے، اسے یہ سب خواب لگ رہا تھا۔

”ارے مر تو میں جاؤں گا اس ناگہانی پر..... پہلے تو مجھے شک تھا مگر اب یقین ہو چلا ہے کہ تم بیمار ہو۔ جسمانی ہی نہیں ذہنی بھی۔“ وہ مشعل کو خود سے علیحدہ کرتے ہوئے خاصے کنفیوژ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”میں پاگل نہیں ہوئی ہوں، بلکہ آج سے قبل پاگل تھی۔“

”آج سے میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”میں جانتی تھی آپ کو میری باتوں کا یقین نہیں آئے گا لیکن میں سمجھتی ہوں اگر میری نیت میں کھوٹ نہیں ہے میری شرمندگی وقتی یا کسی جذبے کی مرہون منت ہے تو وہ وقت بھی ضرور آئے گا کہ جذبوں کی سچائی اپنا آپ خود عیاں کر دے گی۔“ اس کی حد درجہ اعتمادی عود کر آئی تھی۔ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے پُر عزم لہجے میں کہہ رہی تھی۔

اس سے بدتمیزی کرتے وقت کبھی بھی اس کی زبان نہیں لٹو کھڑائی تھی تو اس لمحے اقرار وفا کرتے وقت بھی اس کا لہجہ پُر اعتماد و بے جھجک تھا۔ شاہویر کو اس کا یہ وفاداری، جاں نثاری و تابعداری کا انداز بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اس کے خیال میں عورت اپنے منہ سے اظہار جذبات کرتی اپنی پاکیزگی، نسوانیت و حیا کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔ اپنا ستر ام کھودیتی ہے۔

ایسے نازک و خوب صورت جذبوں کا اظہار تو صرف مردوں پر چلتا ہے۔ عورت شرم و حیا کی چادر میں ملفوف ہی شاندار عہد و قار لگتی ہے۔

اس کی پہل نے اسے سرور و شاداں کرنے کی بجائے مزید بدن و نالاں کر دیا تھا۔ وہ کچھ کہنے کو آدہ نہیں تھا۔

مشعل نے ذرا کی ذرا اس کی جانب نگاہیں اٹھائی تھیں اور اس کے چہرے پر رقم ناپسندیدگی و نا کواری کی ٹھکنوں نے اس کے کوئل کوئل جذبوں کو پتی پتی کر ڈالنا تھا۔ اس کی یہ اجنبیت و بیگانگی اسے متوحش کر گئی۔

شاہویر بیڈ پر بیٹھا تھا۔ وہ کارپٹ پر اس کے قدموں کے قریب گھنٹوں کے بل بیٹھ گئی اور رقت آمیز لہجے میں گویا ہوئی۔

”مجھے اب اس وقت تک سکون نہیں ملے گا جب تک آپ مجھے معاف نہیں کر دیں گے۔ میں کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح بے چین و بے قرار رہوں گی۔“

”اٹھو..... یہ کیا پاگل پن ہے؟“ اس نے جھک کر ہاتھ پکڑ کر اسے کارپٹ سے اٹھایا تھا، پھر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے گویا ہوا۔

”میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں، تمہاری فراخ دلی و بہادری کا بھی اعتراف ہے مجھے لیکن میں وہ نہیں ہوں جو تم مجھے سمجھ رہی ہو۔ نہ تو میں حاتم طائی ہوں اور نہ سند باد و دوسروں کی زندگیوں کی خاطر اپنی زندگی کی سنگلوں و خواہشوں کو کھل دے۔ میں ایک بے حد عام سا، کمزور و بے بس بندہ ہوں جو اپنی زندگی اپنے طور پر جینے کا آرزو مند ہے۔ جس میں تھوڑی سی انگلیں، بڑی محدود خواہشیں، کچھ چاہنے اور چاہے جانے کے جذبات، ایک چھوٹا سا گھر جہاں پیار و محبت کے پھول سدا کھلتے ہوں، جن سے محبت و وفا کی خوشبوئیں ہر دم ممکتی ہوں۔ بس اس سے زیادہ کی خواہش نہیں ہے مجھے اور یقین ہے کبھی نہ کبھی میری یہ آرزو ضرور پوری ہوگی۔“ پہلی بار اس نے اپنے دل کی باتیں اس کے کوش گزاری کی تھیں۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

اس لمحے اس کے چہرے پر پھیلی الیملی چمک عجب تھی۔

اس کے بھاری لہجے کی گمبیرتا، آنکھوں میں آنے والے لمحوں کا عکس کرنوں کی طرح جھلملارہا تھا۔ بظاہر سخت مزاج، سنگدل نظر آنے والا بندہ اعلیٰ ذوق کا حامل تھا جو باہر سے سخت تو تھا اندر سے اتنا ہی گداز۔

وہ بولتا بولتا بالکل خاموش ہو گیا اور سکت و جامد بیٹھی مشعل پر ایک نظر ڈالی پھر بتا کچھ کہے باہر نکلتا چلا گیا۔

اس کی نگاہوں میں اپنا عکس نہ دیکھ کر وہ سُن بیٹھی رہ گئی۔



”ارے اللہ کی مار ان موئی چڑیوں پر۔ گرمیاں آئیں اور ان کم بختوں نے گھر میں کچرا کرنا شروع کیا۔ محسوس کو کوئی دوسرا گھر نظر نہیں آتا۔“ زرینہ دالان کی چھت کے ایک گوشے میں چڑیوں کے گھونسلے سے گرنے والے ٹکڑوں اور پروں کو سمیٹتے ہوئے غصے سے ہڑبڑا رہی تھیں۔

یہ ہر سال کا تماشہ تھا۔ گرمیوں کی آمد کے ساتھ ہی چڑیاں چونچ میں دبائے تنکے لے کر آتیں جو گھونسلے کے علاوہ ہمہ وقت فرش پر پڑے اڑتے رہتے۔ ہر بار زرینہ کی کوشش ہوتی کہ وہ اس بار چڑیوں کو کامیاب نہیں ہونے دیں گی۔ وہ ہاتھ میں جھاڑن پکڑے کبھی ہش ہش کر کے، کبھی لپک کر گالیوں، کوسنوں سے نوازتی، اڑاتی رہتیں مگر چڑیوں کو بھی کوپا ان کوستانے میں خوب مزا آتا۔ وہ پھر سے ادھر ادھر اڑ کر انہیں خوب دوڑاتیں، پھر وہ ہانپتی ہوئی تھک کر بیٹھ جاتیں تو وہ دوبارہ اپنی تعمیری مصروفیات میں لگ جاتیں۔ آج صبح سے پھر انہیں چڑیوں کے گند پھیلانے پر طیش آیا ہوا تھا۔

”اماں چھوڑیں نا۔ کیوں ان بے چاریوں کے پیچھے لگی ہو، بے زبان پرندے ہیں۔“ سارہ سلامتی مشین پر کپڑے سی رہی تھی۔ ماں کو بلا وجہ ہلکان ہوتے دیکھ کر بولی۔

”میں پیچھے لگی ہوں یا یہ میرے گھر کے پیچھے لگی ہیں؟ اور بے زبانی کی بھی خوب کہی تم نے، چڑیا سے زیادہ زبان دراز کوئی اور پرندہ میں نے نہیں دیکھا۔ کیسے چیں چیں کر کے دماغ کھا جاتی ہیں کج بخت ماریاں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کی زبان نہیں سمجھتے لیکن یہ بے زبان تو نہیں ہیں۔“ ان کے صبر کا پیمانہ جلد ہی لبریز ہو جاتا تھا۔ قوت برداشت کی استطاعت بالکل نہ تھی۔ جو کام ان کی مرضی و منشا کے خلاف کیا جاتا اس کی وہ اسی طرح دشمن بن جایا کرتی تھیں، خواہ وہ انسان ہو یا کوئی چمند پرند۔

”قسم سے اماں! مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم ان چڑیوں کی بھی ساس ہو۔“ سارہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی تھی۔ زرینہ کے پٹنگے لگ گئے۔

”جو تمہارا بس چلے نا تو ان کپڑوں کی طرح میری زبان بھی سی ڈالو۔“

”ارے اللہ نہ کرے..... تمہاری زبان سے ہی تو گھر میں رونق لگتی ہے اماں۔“

”بیٹھی ہر وقت میرے بولنے پر ٹوکتی رہتی ہو۔“

”ایسی بات نہیں ہے اماں! جب آپ کسی کے ساتھ زیادتی کرتی ہیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے میں آپ کو صرف سمجھاتی ہوں۔ جہاں ہم بے اختیار ہیں وہاں حجت کرنا بے مصرف ہے، ہر دفعہ چڑیوں کو گھونسلایانے سے روکنا چاہتی ہو مگر نا کام ہوتی ہو۔ گھر تو ہر ذی روح کی ضرورت ہے پھر مجھے تو ان چڑیوں پر بہت رشک آتا ہے۔ کتنی مشقت سے تنکا تنکا کر کے اپنا گھونسلایا جاتی ہیں۔“

”تمہارا کام یہی ہے ہر کسی پر رشک کرنا، ترس کھانا اور گھر کا بیڑہ غرق کروانا۔ کل بلی کی حمایت لے رہی تھیں آج چڑیوں پر فدا ہو، کل گلی کے کتے پر غار ہو جانا اور میری جگہ گھر میں اسے لاکر بٹھا دینا، مجھے تو لگتا ہے سب مجھ کو ہی جلانے کے لئے کوشاں ہیں۔“

زرینہ کی بات پر سارہ نے مشکل سے ہنسی پر قابو پایا تھا۔ فرح کوشت میں آلو ڈالنے کے لئے وہیں کائنے کے لئے لے آئی تھی۔

”کیا بلی نے بھی اماں کے تخت کے نیچے بچے دے دیئے؟“ فرح بھی مسکراہٹ ضبط کرتی نیچے آلو کی ٹوکری، چھری اور برتن رکھتی ہوئی استفسار کرنے لگی۔

”ارے اس بار تو اس کا باپ بھی نہیں دے سکتا۔ میں نے تخت کے چاروں طرف چادریں باندھ دی ہیں اور اس بار تو میں اسے گھر میں بھی نہیں گھسنے دے رہی۔ ہر دفعہ میرے تخت کے نیچے گند پھیل کر چلی جاتی ہے۔ اس بار میں اسے کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ کانوں میں ہندے پہنتی ہوئی کوپا ہوئیں۔

”دیکھتے ہیں، بلی کو شکست ہوتی ہے یا تم کو۔ ویسے بلی نے میٹرنٹی ہو م خوب چنا ہے۔“ سارہ قمیض کی سلامتی مکمل کرنے کے بعد مشین اس کی جگہ پر کھسکاتے ہوئے بولی۔

”تم بھی کیا فضول باپک لے کر بیٹھ گئی ہو۔ تیار ہو جاؤ۔ پھر واپس بھی آنا ہے۔“ فرح نے ساس کے تیور بگڑتے دیکھے تو موضوع بدلتے ہوئے سارہ سے بولی تھی اور وہ بھی ہاتھ میں پکڑی ہوئی قمیض لے کر تیزی سے آئرن اسٹینڈ کی جانب بڑھی تھی۔ میچنگ کا دوپٹہ اور شلوار سرمئی و سیاہ پرنٹ کے رکھے تھے۔

”تم نہانے جاؤ میں اتنی دیر میں کپڑے پر بس کر دوں گی بے جی انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ اس کے ہاتھ سے قمیض لے کر اسٹری کرنے چلی گئی۔

”دیکھا؟ چند ہیمنوں میں ہی تمام کس بل نکل گئے نا میکے میں رہ کر۔ اب کس طرح بھاگ بھاگ کر خود بخود کام کرتی ہے۔“ وہ فرح کے دور جاتے ہی اس سے سرکشی میں کوپا ہوئی تھیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔ سارہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔



میں نے کہا

ابھی مجھے اپنے پاگل سے گلے ملنا ہے

ابھی سینے میں وحشت سرزد نہیں ہوئی

میں نے کہا

ابھی مجھے اپنی دیوانگی کو لگام نہیں ڈالنی

ابھی مجھے بہت سی بے سمجھتیاں تلاش کرنی ہے

ابھی مجھے اپنے آپ سے دور نہیں رہنا

ابھی میری بہت سی مسافت باقی ہے

ابھی مجھے تم سے وصال مار ڈالنا ہے

ابھی مجھے خود کو زندہ رکھنا ہے

میں نے کہا

اور بس میں نے کہا، باقی سب خاموش رہے

”یہاں پر کمرے میں بند ہونے کے لئے آئی ہو؟ رشیدہ، فریدہ کی ماں بھی کئی بار پوچھ چکی ہیں کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیوں کمرے سے باہر نہیں نکلتیں؟ کیوں اس قدر خاموش و اداس رہنے لگی ہو؟“ شاہد پر ہنجیدگی سے اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”کیا ہوں؟ کس کو بتاؤں؟ آگئی سے جب تک نا واقفیت تھی تب تک زندگی جنت تھی۔ اب آگئی کا ادراک کوپا عذاب کا آغاز ہوا ہے۔ ہر لمحہ، ہر ساعت ایک جہنم دکھاتا ہے، کچھ تباہوں کا، شرمندگی وند استوں کا اور ہر اس بھول و نادانی کا جو کبھی سرزد ہوئی تھیں۔“ اس کے اندر دھواں پھیلتا چلا گیا۔

”میں تم سے مخاطب ہوں..... کوئی دیواروں سے نہیں۔“ وہ اس کی جانب کچھ جھک کر کوپا ہوا تھا۔ وہ اس کے انداز پر دھیرے سے مسکرا اٹھی تھی۔

”وقت کبھی ایک سانہیں رہتا اور نہ ہی خواہشیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ شوق و آرزوئیں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔ پہلے مجھے روشنیوں سے عشق تھا، ہنگاموں کا کریر تھا۔ اب مجھے تمہارا ہنسا پسند ہے۔“

”جوگ لینے کا ارادہ ہے کیا؟“ اس کے شوخ لہجے میں استہزا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم یہ جوگ ووگ کیا ہوتا ہے۔“ حسب عادت اس کا طعنے لہجہ اسے چڑا گیا تھا۔ وہ تنک کر بولی۔

”جوگ وہی ہوتا ہے جو عشق میں عاشق لیتے ہیں اور پھر بھی نا مراد رہتے ہیں۔“

”میں اپنے جذبوں میں ٹیئر ہوں، اس لئے مجھے ٹینس کرنے کی ضرورت نہیں مسٹر۔“ وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

شاہد پر کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ اس کے بھاری لہجے کی دکشی، وجہ بہرہ چہرے کی طمانیت صاف مضحکہ اڑاتی لگ رہی تھی۔

اس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

وہ حسب معمول خوش باش، مطمئن و لا پر واہ تھا۔ اس کے کسی خطر اب، لگن، جذبے اور بے سکونی کا اس پر کوئی اثر نہ تھا۔

اس کی محبت

اس کا اقرار

اس کے لئے کوپا کوئی وقعت نہیں رکھتے تھے۔ اسے اس کی دل آزاری و مضحکہ خیزی کا وسیع موقع مل گیا۔ یہ احساس دل پر چوٹ بن کر لگا تھا اور اس شدید چوٹ کا درد آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا تھا۔

وہ رخ پھیر کر بچتے آنسو صاف کرنے لگی۔

”تم نے کبھی نماز پڑھی؟ نماز پڑھنے سے دل کو سکون ملتا ہے۔ روح سرشار ہو جاتی ہے۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی زیادہ خالص و طاقت ور ہوتا ہے۔ گناہوں کا اعتراف اور سچے دل سے توبہ بندوں کو منوں بوجھ سے آزاد کر کے راحت و سکون بخشتی ہے۔ تم بھی رب سے پوری دیانت داری کے ساتھ، مکمل سچائی سے اپنے صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے توبہ کرو، معافی مانگو، عاجزی و انکساری کے ہمراہ۔ دیکھنا وہ کتنا شفیق و رحیم ہے۔ اس کی رحمت ایک ایسے سمندر کی مانند ہے جس کی وسعت و گہرائی کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ اس کی رحمت سے ہر کوئی فیض یاب ہوا ہے خواہ وہ نافرمان ہو یا فرمانبردار، کفر و شرک کی اندھیری وادیوں کا باسی ہو یا شمع نور سے جھللاتا ہوا صاحب ایمان، وہ منصف سب سے انصاف کرتا ہے۔“

وہ بول رہا تھا۔



ازحد دھیمے اور نرم لہجے میں۔ اس کی آواز مخصوص ملٹر و طعنوں سے پاک سادہ و پُر اثر تھی۔

وہ اسے دیکھ رہی تھی سشدرسی۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟ میری باتیں بڑی لگ رہی ہیں یا سمجھ میں نہیں آرہیں؟“ اسے بالکل گم صم و خاموش دیکھ کر وہ آہستگی سے مسکرا کر استفسار کر بیٹھا۔ مشعل کو اس کی مسکراہٹ پسند تھی۔

مسکراہٹ شاہوین کو اسی طرح منور کر ڈالتی تھی جیسے چاندنی کو چاند۔ مشعل نے نگاہیں جھکا لی تھیں اور ایک گہری سانس اس کے لبوں سے بے آواز خارج ہوئی تھی۔

اس کی روشن مسکراہٹ۔

اس کے ملبوس کی مہک۔

پرفیوم کی خوشبو یا

اس کے بے ربط و سادہ لہجے میں کوئی ایسا سحر تھا جو اس کے ذہن میں لگے بے حسی کے منا لوں کو آن و احد میں توڑ بیٹھا تھا اور وہ سمجھی، مانجھی کی کیفیت میں چکرا گئی۔

□●□

ایک نہ معلوم سا احساس تھا جو اسے گہری نیند میں بھی بے کل کر بیٹھا تھا۔ اس نے غنودگی میں محسوس کیا کوئی اس کے بے حد قریب ہے۔

نا کواریو گرم سانس کے ساتھ اس کے چہرے سے لگرائی تھی۔ اس کے خوابیدہ احساسات پوری طرح سے بیدار ہو گئے اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا مگر اس کے ہونٹوں پر بھی عجیب مسکراہٹ و آنکھوں سے جھانکتے نا قابل فہم رنگ دیکھ کر اسے اپنی بصارت پر یقین ہو گیا تھا۔

”آ..... آ..... آپ یہاں..... اس وقت؟“ بیڈ کے قریب کھڑے عرفان کو دیکھ کر وہ ہر اسماں سی اٹھ بیٹھی تھی۔

”خیر میت تو ہے نا؟“ سر ہانے رکھے دوپٹے کو پھیلا کر اوڑھتے ہوئے وہ پریشان کن لہجے میں کو یا ہوئی تھی۔

”خیر، خیر میت ہی تو نہیں ہے۔“ وہ ہلکے ہلکے انداز میں کہتا ہوا بیڈ پر بیٹھ گیا۔

حرا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے تحاشہ سرخ ہو رہی تھیں، ایسی ہی سرخی چہرے پر بھی چھائی ہوئی تھی۔ شرٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے، ایک نا کواریو اس کے منہ سے خارج ہو رہی تھی۔ اس کا غیر متوازن لہجہ، غیر متوازن چال ظاہر کر رہی تھی کہ وہ نشے میں ہے۔ عقل و شعور سے بے نیاز۔

حرا کو تکلیف دہ جھٹکا لگا تھا۔ اس نے سر اسی نگاہ نظر دروازے کی طرف ڈالی۔ وہ اسی طرح لاک تھا جس طرح وہ کر کے سوئی تھی۔ البتہ وہاں سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔ وال کلاک نصف رات ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

”کیا ہوا..... تمہاری سٹی کیوں گم ہو گئی ہے؟“ وہ حرا کی جانب دیکھتا ہوا مگر وہ مسکراہٹ سے کو یا ہوا۔

”تم کمرے میں کس طرح آئے؟ میں لاک کر کے سوئی تھی۔“ حرا نے اس کے تم کو نظر انداز کر کے سخت لہجے میں پوچھا جسے سن کر چند منٹ وہ بے ہنگم انداز میں ہستار ہا پھر بولا۔

”یہ گھر میرا ہے اور اس کے چپے چپے سے مجھے اتنی واقفیت ہے کہ میں آنکھیں بند کر کے بھی ہر کوشے میں اس طرح پہنچ جاؤں جس طرح آنکھیں کھول کر جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں نصب شدہ ہر دروازے کی ایکسٹرا کنجیاں میرے پاس ہوتی ہیں کہ جب جہاں جانا چاہوں یا آسانی جاسکتا ہوں۔“ وہ کسی شعبہ ہا ز کی طرح فخر یہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”لیکن تمہیں کیا کام تھا جو تم اس طرح بلا اجازت میرے بیڈ روم میں بے وقت آئے ہو..... یہ کون سی تہذیب ہے؟“ نہ چاہنے کے باوجود اس کا لہجہ نا کواریو تھا۔

”صبح سے آپ کو دیکھا نہیں تھا، ناشتہ، دوپہر کا کھانا، رات کا کھانا بلکہ شام کی چائے، کسی نام بھی آپ موجود نہیں تھیں۔ گریڈ مندر سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آپ کے سر میں درد ہے اسی وجہ سے آپ کمرے سے باہر نہیں آئیں۔ میں نے سوچا چلو چل کر آپ کا سر دبا دیتے ہیں۔ گریڈ مندر کو صرف اپنی خاطر میں کروانی آتی ہیں۔ وہ خود کسی کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ اور اگر بیماری میں کوئی تیمارداری کرنے والا نہ ہو تو مزہ نہیں آتا۔“

”نہیں، بہر بانی۔ مجھے بیماری میں تیمارداری کروانے کی عادت ہرگز نہیں ہے۔ آپ اپنے کمرے میں جائیں۔“ وہ عجیب شش و پنج میں مبتلا تھی۔

”بر امت مانیں۔ پاپا ہوتے تو آپ کو اس طرح چھوڑ دیتے؟ اب وہ نہیں، میں ہی سہی۔ باپ بیٹے میں آپ فرق نہ سمجھیں، باپ نہیں ہے تو میٹا حاضر ہے آپ کی خدمت کے لئے۔ آئیں لیٹ جائیں، میں سر دبا تا ہوں آپ کا۔“ اس کی مد ہوش نگاہوں نے حرا کے خوب صورت چہرے کو فوکس کئے ہوئے تھا۔

عورت اپنی جانب اٹھنے والی ہر نظر کی شناخت رکھتی ہے، نگاہوں کی زبان کا اور اک لاشعوری طور پر ہوتا ہے اور آج اسی لمحے عرفان کی بد خصلت و بد نگاہی پہلے روز ہی بھانپ لی تھی مگر پھر اس احساس کو اپنی غلط فہمی پر محمول کر کے عرفان کو ہر بار باتوں باتوں میں از خود ہی احساس دلاتی رہی تھی، جتنا ہی رہی تھی کہ وہ اس کی ماں ہے، ان کے درمیان بڑا مقدس و پاکیزہ رشتہ ہے۔ وہ اس سے عمر میں خواہ بہت کم ہی سہی مگر ان کا رتبہ از حد معتبر و بڑا ہے۔ لیکن جب نیت میں فتور آ جائے، جذبے ہوس سے پلید ہو جائیں اور رشتے اپنا اترا م و تقدس کھو بیٹھیں تو پھر بربادیوں کے طوفان اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو ایسی تباہیاں مچاتے ہیں کہ ہستیاں نیست و نابود ہو جاتی ہیں اور نسلیں تباہ۔ عرفان مجسم شیطان بنا ہوا تھا۔

وہ پہلے بہت نرمی و بیار سے حرا کو اپنی منشا پر لانے کی سعی کرتا رہا مگر جب حرا اس کی پچھنی چڑی باتوں میں نہ آئی تو وہ بہ زور بازو اسے زیر کرنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ حرا بھر پور مزاحمت کر رہی تھی۔ اسی دوران عرفان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا چاہتا اور حرا نے پوری طاقت سے اس کی گرفت سے ہاتھ چھڑا لیا تھا۔ ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ عرفان کے ہاتھ سے چھوٹا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی تھی اور بے اختیار گر تے ہوئے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔ پوری شدت سے، پوری تکلیف سے اس کی آنکھوں میں اندھیرا اچھا گیا تھا۔ طبیعت تو پہلے ہی نا ساز تھی اور اس شدید چوٹ نے اسے بے ہوش ہونے میں لحد لگا لیا تھا۔ دوسرے لمحے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر قائلین پر پڑی تھی۔

عرفان نے جو اسے اس طرح بے ہوش دیکھا اور اس کے سر سے خون بہتا دیکھا تو اس کا نشہ تمام، حیوانیت ہو ا ہو گئی۔ اس کے شاطر ذہن نے وہاں سے بھاگنے میں ذرا دیر نہ کی تھی۔ وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی آہستگی سے نکل گیا تھا۔ اسے نہ اپنی حرکت پر ندامت تھی نہ اس بات کا خوف یا فکر کہ جس تیزی سے حرا کے سر سے خون بہہ رہا تھا اس طرح اس کی جان کو خطرہ لاحق تھا۔ مگر وہ بے حسی و بے ضمیری کی سب سے بلند سیڑھی پر کھڑا تھا اور ویسے حرا کی جان کی اسے کوئی پروا نہ تھی کہ اگر وہ مر جاتی تو ان کی راہ صاف ہو جاتی۔ بلکہ اس کی زندگی سے زیادہ خیال اسے اپنے شیطانی ارادے کی ناکامی کا تھا۔ وہ غصے سے بل کھانا اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ باہر اس نے کار کی آواز سن کر کھڑکی کھول کر حیرانگی سے باہر جھانکا تو خرم صاحب کو کار سے اترتے دیکھ کر اس کی پیشانی پر لاقعد اوٹھ گئیں پڑ گئی تھیں۔

□●□

”ممی..... ممی..... ممما!“ جو انے اندر داخل ہوتے ہی رانچہ بیگم کو پکارنا شروع کیا تھا۔ اس کے لہجے میں از حد بے قراری و بے تابانی مترشح تھی۔

”ممما! آپ کہاں ہیں؟“ وہ ان کے بیڈ روم میں آکر چیخا تھا اور انہیں ڈرینگ ٹیبل کے سامنے چیز پر ایزی اسٹائل میں نیم دراز دیکھ کر وہ جھنجھلا گیا تھا۔

رانچہ بیگم جو چہرے پر ماسک لگائے اور آنکھوں پر کھیرے کے ککڑے رکھ کر ماسک ڈرائی ہوئے کا انتظار کر رہی تھیں، جو اد کی آوازیں وہ بتدریج سن رہی تھیں مگر اس سے زیادہ انہیں اپنی اسکن کی فکر تھی سو خاموشی سے اس کی پکار سنتی رہی تھیں۔ اس کے کمرے میں آنے پر بھی انہوں نے زبان پاچہرے کو جنبش دینے کی بجائے صرف آنکھوں سے کھیرے کے ککڑے ہٹا کر اس کی طرف ایسے دیکھا تھا جیسے پوچھ رہی ہوں کیا بات ہے؟

”ممی! آپ یہ سب پر اہلعر میں نام گزارنے کے باوجود کچھ حاصل نہیں کر پاتیں۔ صرف نام و ویٹ کرتی ہیں ورنہ کچھ پہنچ نہیں آتا۔“ وہ ان کی جانب دیکھ کر ہنس کر بولا تو رانچہ جو اس خوف سے جواب نہیں دے رہی تھیں کہ ماسک ہٹائے بغیر بات کرنے سے جھریاں پڑنے کا احتمال رہتا ہے لیکن جو انے ان کی بڑھتی عمر کے اثرات سے متاثر ہوتے چہرے پر ملٹر کر کے تمام احتیاط و خیال بھلا دیا۔

”واہٹ یو مین ایڈیٹ؟ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ بہت کم عمری میں شادی کر دی گئی تھی میری۔ اور شادی کے سال سے پہلے تم وارد ہو گئے تھے۔ آج کل کے دستور کی طرح ہڑھاپے میں شادی نہیں ہوئی تھی میری، ہاں ابھی بھی لوگ مجھے تمہاری ماں نہیں کہتے ہیں۔“ وہ آئینے میں دیکھتے ہوئے خشک شدہ ماسک اتارتے ہوئے غصے سے کہہ رہی تھیں۔ وہ بدستو مسکرا رہا تھا۔

”تھینکس گاڈ۔ لوگ پاپا کو بہنڈ ہی سمجھتے ہیں، فادر نہیں۔“

”کیا بات ہے..... آج کچھ زیادہ ہی آپ سے باہر نظر آرہے ہو؟“

”فکسٹک گڈ نیوز ہے۔“

”خوب جانتی ہوں تمہاری گڈ نیوز۔ پھر روپوں کا مطالبہ ہوگا۔ مگر میرے پاس اب تمہیں دینے کے لئے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ چھ ماہ سے اس کوٹھی کا بل چڑھ رہا ہے۔ کوٹھی کے مالک کو جس طرح میں نے روک رکھا ہے وہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ پارٹیز میں جانے کے لئے کوئی ڈھنگ کا ڈریس ہے اور نہ جیولری۔ بینک اکاؤنٹ منہ چڑا رہے ہیں، دوسرے تمام بلز دو ماہ سے نہیں بھرے جا رہے۔ احمد کا بزنس تو بھائی جان کے بزنس کے سہارے ہی چلتا تھا۔ ان کی وجہ سے ہی ہماری لائف ہائی اسٹینڈرڈ کی تھی۔ اور سب سے زیادہ سہارا ہمیں اس مشعل کی بے وقوفی نے دے رکھا تھا۔ وہ ہمارے لئے لڑکی نہیں سونے کے انڈے دینے والی چڑیا تھیں۔ وہ کیا آڑی ہمارا وقت بد سے بدتر ہی ہو رہا ہے۔“ ماسک اتارنے کے بعد وہ اپنے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اندر دگی سے کہہ رہی تھیں۔

”آپ نے میری بات سنی نہیں اور پوری تقریر کر ڈالی۔ مائی سویٹ مدرا ہمارے برے دن سمجھو ختم ہونے والے ہیں۔ ہماری زندگی پھر سے بد لئے والی ہے۔“ اس نے

ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پُر جوش انداز میں کہا تو وہ چونک کر گویا ہوئی تھیں۔

”پھر ڈرنک کر کے آگئے؟“

”اونٹنی! میرا یقین کریں، چٹپا اُڑگئی تو کیا ہوا آج ہمیں اس کا گھونسلال گیا ہے، جو چٹپا سے زیادہ قیمتی ہے۔“ اس کا انداز تجسس زدہ تھا۔

”کیا..... کیا مطلب؟“ وہ ایک جھٹکے سے اس کی طرف گھومی تھیں۔

”آج میں نے خود ماموں جان کو سڑک پر کار میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”سچ بول رہے ہو؟“ سرت کے بے پایاں احساس سے وہ جھوم کر گویا ہوئیں۔

”بالکل سچ۔ پہلے تو مجھے بھی آپ کی طرح یقین نہیں آیا تھا اور اسی یقین کی تصدیق کرنے کے لئے میں آفس گیا۔ وہاں پون سے معلوم ہوا کہ ماموں جان وہاں آچکے ہیں اور وہ حرام خور، مشعل کو لے کر ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔“

”اوہ..... کتنے عرصے بعد خوشی محسوس ہوئی ہے۔ چل ابھی بھائی جان کے پاس چلتے ہیں۔“ ان کے انداز میں غلت و بے تاب تھی۔

”ابھی نام ختم ہو گیا ہے۔ کل چلیں گے۔“

”آفس کا نام ختم ہوا ہے، ان کے گھر کا نہیں۔“

”میں نے سب معلوم کر لیا ہے۔ وہ کہیں اور رہ رہے ہیں، کل آفس میں ہی ملاقات ہوگی۔“

”اچھا، اچھا..... ٹھیک ہے۔ جہاں اتنے دن صبر کیا ہے وہاں ایک دن مزید کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ خوش حالی نے پھر ہمارے در پر دستک دینا شروع کر دی ہے۔ میں اس خوشی میں ایسی زیر دست پارٹی دوں گی کہ سب یاد رکھیں گے مدتوں۔“ سرت و آسودگی، سکون و بے فکری انسان پر خوشگوار اثر ڈالتے ہیں۔

رافعہ جو کچھ دیر قبل بھی سمجھی و بے رونق نظر آ رہی تھیں اتنی بڑی خوشی سن کر ان کا چہرہ پھولوں کی طرح شکفتہ و تر و تازہ ہو گیا تھا۔ مہنگے سے مہنگے پالرز نے انہیں ایسی رعنائی و شکفتگی بخشی تھی۔

”مما! جو ہم نے ان کے ساتھ کیا تھا اور جس کے باعث انہوں نے فوراً مشعل کی شادی اپنے ملازم سے کر دی تھی ایسی باتوں کے باوجود انکل سے ہم ملیں گے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارا نام سنتے ہی ملازموں سے دھکے دلوادیں۔“ معاً جواد کو وہ سب یاد آیا تو وہ تر دوسے گویا ہوا۔

”ارے نہیں..... میں بھائی جان کو اچھی طرح جانتی ہوں، وہ نامعلوم کس مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ وہ عاجزی و انکساری کا پیکر ہیں، بر لمانا یا کسی کو برا بھلا کہنا وہ جانتے ہی نہیں ہیں۔ تب ہی تو مشعل نے انہیں اپنے اشاروں پر اس طرح نچایا ہوا تھا جیسے کوئی مداری بندر کو ڈگڈی پر تماشے کروانا ہے۔ تم دیکھتے جاؤ اب میں کیا کرتی ہوں۔“ ان کے لہجے میں عجیب پر اسراریت سی تھی۔ آنکھوں سے مکاری جھلکنے لگی تھی۔

”میں نے آپ کو اتنی بڑی خوش خبری سنائی ہے اب تو آپ کو بغیر مانگے ہی مجھے خوش کر دینا چاہئے۔ مجھے فرینڈز کے ساتھ کلب جانا ہے۔“

”جو جو! میں نے کہا تھا میرے پاس بالکل بھی پیسے نہیں ہیں۔ کل تمہیں دس ہزار دیئے تھے، اب بالکل بھی نہیں ہیں۔“ وہ اسے ڈانٹتی ہوئی وارڈ روب کی جانب بڑھ گئی تھیں۔ ان کے لہجے میں قطعیت محسوس کر کے وہ گھڑاٹھا مگر جانتا تھا اب ان سے بحث کرنا بے کار ہے۔ وہ اب ایک روپیہ بھی نہیں دیں گی۔ وہ ماں کو لباس سلیکٹ کرنے میں مگن دیکھ کر نیچے کارپٹ پر پڑی سونے کی چین اٹھانے میں کامیاب ہو گیا جو نامعلوم کس لمحے ان کے گلے سے گر پڑی تھی اور اس نے کمرے میں آتے ہی دیکھ لیا تھا اور بہانے سے ان کے قریب کھڑا ہوا تو پہلا قدم چین پر ہی رکھ کر اسے چھپایا تھا۔

”اوکے، امینو و ش ممما!“ بہت تیزی سے چین سائیز پاکٹ میں منتقل کرنا ہوا ممسی سی صورت بنا کر بولا۔

”اب تمہارے ساتھ یہی ایٹی ٹیوڈ کرنا پڑے گا ورنہ تم خراب ہو جاؤ گے۔“ وہ شیفون کی ملٹی کلر ساڑھی والا ڈیگر اٹھاتی ہوئی سخت لہجے میں بولیں۔ جواد عرف جو چوٹی کامیابی و چالاکی پر دل ہی دل میں قہقہے لگاتا کمرے سے نکل گیا۔



دروازہ آہستگی سے کھلا تھا۔ فریدہ اندر داخل ہوئی تھی۔

”جی بیگم صا حب! آپ نے بلایا ہے مجھے؟“ وہ ٹکا ہیں جھکا کر مؤدبانہ لہجے میں بولی۔

”کھانا تیار ہو گیا ہے؟“ وہ بیڈ پر نیم دراز رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

”جی۔“

”صاحب کہاں ہیں؟“

”وہ جی باہر بابا سے کوڑی کرنا سیکھ رہے ہیں۔“

”کوڑی کرنا؟ واٹ از دس؟“ وہ رسالہ ایک طرف رکھ کر حیرانگی سے بڑبڑاتی ہوئی کھڑکی کی جانب بڑھی تھی۔ پردہ ہٹا کر کھڑکی کھولی تو سامنے خاصے فاصلے پر وہ مالی کے ہمراہ کھڑکی ہاتھ میں لئے کیاری پر جھکا ہوا تھا۔ مالی قریب ہی گھاس پر بیٹھا ہوا شاید اسے گائیڈ کر رہا تھا۔ بہت مستعدی سے اس کے ہاتھ زمین پر چل رہے تھے اور مٹی پھدک پھدک کر ادھر ادھر گر رہی تھی۔

”نان سینس، اسٹوڈین..... نامعلوم کب اپنے کمپلیکس سے باہر آئے گا۔“ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی شاہوین کو کوڑی کرتے دیکھ کر۔

”بیگم صا حب! کھانا لگا دوں؟“ فریدہ اس کے گھڑتے تیز دیکھ کر حواس باختہ ہو گئی تھی۔ ویسے بھی وہ اس کے گھڑے تیروں اور سخت رویوں کے سبب اس سے بہت خوفزدہ رہتی تھی اور اس کے احکامات کی بجا آوری کے لئے ہر لمحہ چونکاؤ مستعد رہتی تھی۔

”نہیں، لگاؤ گی کیا؟ تمہیں نام کا نہیں معلوم؟“ پوری شدت سے وہ اس پر برس پڑی تھی۔ پہلے ہی شاہوین کی حرکت نے اسے مشتعل کر ڈالا تھا، مستزاد فریدہ کے معصوم سے سوال نے وہاں کا غصہ یہاں انڈیلنے کا موقع دے دیا تھا۔

”وہ..... وہ..... صاحب نے کہا تھا دیر سے کھانا لگانے کو۔“ وہ خود پریشانی سے کانپ اٹھی تھی سو بے ربط گویا ہوئی۔

”شٹ اپ، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ آئندہ مجھے جواب دینے کی کوشش مت کرنا ورنہ زبان کھینچ لوں گی۔ تم جیسے لوگوں کو تمہاری اوقات میں رکھنا خوب جانتی ہوں۔“ وہ اس پر گرج برس رہی تھی۔ اسی دم فریدہ سے چھوٹی رشیدہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ ڈانگ روم میں آئی تو شاہوین کرسی پر آرام سے براجمان اس کا منتظر تھا۔ ٹیبل پر برتن اور ڈشز سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ فریدہ نے آگے بڑھ کر اس کے لئے کرسی کھینچ دی تھی۔

”کیا بات ہے..... آج موسم خاصا گرم اور گرد آلود لگ رہا ہے۔“ شاہوین اس کی پُر شکم پیشانی، گہڑے مزاج و سرخ چہرہ دیکھ کر شوخی سے ذومعنی لہجے میں بولا۔ اس نے جواباً کچھ نہیں کہا، خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ دل و دماغ میں جنگ ہو رہی تھی۔ وہ اسے خوب برا بھلا کہنا چاہ رہی تھی مگر جانتی تھی اس نے اس وقت ایک بھی لفظ منہ سے نکال دیا تو وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ جائے گا اور ملازماؤں کے سامنے بھی لڑنے بیٹھ جائے گا۔ بے عزتی سے بہتر تھا کہ ابھی خاموشی سے کھانا کھایا جائے۔

”کھانا کس نے بنایا ہے؟“ کھانے سے فارغ ہو کر وہ باہر نکل رہے تھے۔ باہر موجود فریدہ اور رشیدہ سے مخاطب ہوا۔

”مم..... مم..... میں نے۔“ فریدہ جو کچھ دیر قبل مشعل کی ڈانٹ سے سہمی ہوئی تھی شاہوین کے سنجیدگی سے پوچھنے پر وہ ہٹلا کر گویا ہوئی تھی۔

”صاحب جی! کھانا اچھا نہیں بنا کیا؟“ رشیدہ نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا تھا۔

”اچھا..... اتنا اچھا کہ پیٹ بھر گیا مگر نیت نہیں بھری۔ شامی کباب اور بریانی تو بہت ہی لذیذ تھی اور فروٹ ٹرانکل کا تو جواب ہی نہیں، بہت اچھا کھانا بناتی ہو۔ کس سے سیکھا؟“

شاہوین کی تعریف نے اس کے فقی چہرہ پھولوں کی طرح کھلا دیا تھا۔ وہ دونوں بہنیں از حد خوش نظر آ رہی تھیں۔

مشعل اس کے ساتھ کھڑی دل ہی دل میں اسے گالیوں سے نواز رہی تھی۔ وہ جانتی تھی بلکہ اب اسے اچھی طرح سمجھنے لگی تھی کہ غریب اور بے حیثیت لوگوں میں بے حد گمن، خوش و خرم رہتا ہے اور صاحب حیثیت و دولت مند لوگوں کو رتی بھر بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ جل بھن کر حسب عادت یہاں سے چلی جاتی مگر آن واحد میں ایک بالکل انجانا و نا آشنا جذبہ ابھر اٹھا۔ اس کے اندر ایک نادیدہ پر اسرار سی آگ تھی جو اس کے وجود کو جھلسانے لگی تھی اور اس کے قدم آگے بڑھنے کی بجائے وہیں منجمد ہو گئے تھے۔

دل کے احساسات میں تغیر آیا تھا تو نگاہوں کے زاویے بھی بدل کر رہ گئے تھے۔ فریدہ کے لئے ستائشی ڈھیمی جھلے، شیریں لہجے کی ملامت اس کے اندر کسی زہر یلہناگ کی طرح لہرانے لگا اور بالکل نیا اور انوکھا جذبہ، حاسدانہ جذبہ اس کی رگ و پے میں سرایت کرنا چلا گیا۔

اپنی ملکیت کا احساس شدت سے بیدار ہوا تھا۔ بے ساختہ اس کی کھوجتی نگاہیں ان کی جانب اٹھ گئی تھیں اور خاموشی سے ان کو کھوجنے لگی تھیں۔

”باقاعدہ کسی سے نہیں سیکھا، ہاں اماں کو پکاتے ہوئے دیکھ کر سیکھتی رہی۔ خود مجھے بھی کھانا پکانے کا بے حد شوق ہے۔ جب پڑھ رہی تھی تو سہیلیوں سے بھی انت نئے کھانوں کی ترکیبیں سیکھتی رہتی تھی۔ بس اس طرح کھانا پکانا آ گیا ہے۔“

فریدہ ملازمہ تھی۔ ایسے لوگ جو خود کو دوسروں کے زرخیز ید سمجھتے ہیں تو اپنے مالکوں کو خوش کرنے کی خاطر ہر ظلم و زیادتی برداشت کرتے ہیں، ہر کچھ ضبط کر لیتے ہیں پھر یہاں تو ان کے مالک نے ان کی تعریف کر کے حوصلہ افزائی کی تھی اور بیگم صا حب کے مقابل ان کا لہجہ غرور و تکبر، اہانت و تذلیل سے پاک بہت شفیق و ملامت تھا جیسے کوئی انہوں کو سراہتا ہے۔

وہ بے حد خوش خوش جواب دے رہی تھی۔ مشعل باریک بینی سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

گندی رنگت، بھر بھر اپہرہ، براؤن شفاف آنکھیں، کچھ فریبہ جسم، کاسنی وسیاہ پر عذسٹ میں بڑی سی چادر سے پیر تک لپیٹ کر وہ بالکل عام سی شکل و صورت کی لڑکی تھی۔

لمحے بھر کو اس کے دل میں اطمینان لہریں لینے لگا کہ کہاں وہ گلاب جیسا سُسن، فوئیز پھولوں کی ملکہ، کہاں وہ ہر جھائے پھول جیسی بے رونق و بے کشش فریدہ۔

بھلا کہاں وہ اس کے مقابل آسکتی تھی؟ وہ مطمئن ہوئی تھی کہ پھر کہیں سے سرکوشی ابھری، دل آجائے گدھی پر تو پری کیا چیز ہے۔ وہ پھر ایک شش و پنج میں مبتلا ہوگئی۔

”یہ تمہارا انعام ہے۔ تمہیں بہترین کھانا پکانے پر مل رہا ہے۔ اور تم اس کی ہیلپ کرتی ہو تمہیں اس پر دے رہا ہوں۔“ اس نے والٹ سے دوسرخ نوٹ نکال کر ایک ایک دونوں کی جانب بڑھایا تھا جو تھوڑی سی پس و پیش کے بعد انہوں نے تھام لئے تھے اور خوشی خوشی ڈانٹنگ ہال کی طرف بڑھ گئیں برتن سیٹھے۔

”آخر نو کروں کو اس قدر سر پر چڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ جو کام کرتی ہیں کوئی احسان نہیں کرتیں، اپنی محنت کا دگنا معاوضہ وصول کرتی ہیں اور آج کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا جس کے لئے انہیں انعامات دیئے گئے ہیں۔ ہر ماہ ہزاروں روپے بٹورتی ہیں معمولی سے معمولی کام کے۔ اس طرح کی فیا ضیاں ان لوگوں کے دماغ اور نیت خراب کر کے رکھ دیتی ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ان کا دماغ خراب کرنے کی۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بڑبڑانے لگی تھی۔

”سورو پے میں ان کی زندگی نہیں گزر جائے گی۔“ وہ بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے کوپا ہوا۔

”ضرورت کیا ہے ان کا دماغ خراب کرنے کی؟ سورو پے کوئی معمولی رقم بھی نہیں ہوتی جو اس طرح ضائع کی جائے۔“ وہ اپنے موقف پر قائم تھی۔

”اوہ، تم شاید یہ سوچ رہی ہو کہ تمہارے ڈیڈی کی دولت میں اس طرح ضائع کر رہا ہوں۔“ اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا تھا۔ ”نو..... نیور، میری سرشت میں یہ نہیں ہے کہ میں نیکیاں چوری چوری کر کے نیکیاں ہی ضائع کر دوں۔ اطمینان رکھو، یہ سو فیصد میری نیک کمانی کی رقم تھی۔ کسی کے چہرے پر چچی خوشی کے انمول رنگ بکھرے ہوئے دیکھ کر انسان کو کس قدر روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے اس کا احساس تم شاید ہی کبھی کر سکو۔ دراصل بے حس و کٹھور لوگوں کو ایسی سعادتیں و راحتیں نصیب نہیں ہوتی ہیں۔ جو لوگ کسی کا دکھ درد محسوس نہیں کرتے وہ اسی طرح حقیقی و بے ضرر محبتوں سے محروم رہتے ہیں۔ تمہیں آج محض دو سورو پے ضائع ہونے کا دکھ ہو رہا ہے لیکن میں بہت خوش ہوں اور اس بات کا دکھ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تم میں اتنی بری عادتیں ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی برائی ہے کہ تم کجوس بھی ہو۔ کسی غریب کی مدد کرنا تمہارے لئے پیسہ ضائع کرنا ہے اور تم جو جیولری، ڈریسز، شاہنگمر، پارلز اور پارٹیز میں لاکھوں روپیہ اڑاتی ہو وہ ضائع کرنا نہیں ہوتا؟ تمہاری ایک لپ اسٹک کی قیمت بھی ان روپوں سے زیادہ ہوتی ہے۔“ اس کا موڈ بری طرح سے بگڑنے لگا تھا۔

”افوہ..... میرا مقصد یہ نہیں تھا۔“ وہ فوراً ہی مصالحتی لہجے میں بولی۔

”تمہارا مقصد کچھ بھی ہو مگر آئندہ تم میرے پرسنل انئیرز میں انٹرفیر نہیں کروگی۔“

”اوکے، مجھے اس وقت کا شدت سے انتظار رہے گا جب تمہارے اور میرے پرسنل علیحدہ نہیں ایک ہوں گے اور تم اس طرح مجھ سے بات نہ کر سکو گے۔“ اس نے سوچتے سوچتے اپنے تمللاتے ذہن کو تھکی دی تھی۔



خرم بڑے اطمینان سے اپنے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

ان کے ہونٹوں پر بڑی دلاؤیز مسکراہٹ تھی یہ سوچ کر کہ حرا انہیں بالکل اچانک بغیر اطلاع کے موجود کچھ کرکس قدر خوش ہوگی، حیران ہوگی اور وہ اس کی حیرت آمیز خوشی سے گل رنگ چہرے کا تصور لئے اندر داخل ہوئے تھے

کمرے میں داخل ہوتے ہی حیرت انگیز جھٹکا انہیں لگا تھا۔

وہ جو اسے سر پر از دینا چاہتے تھے انہیں ایسا سر پر از ملا کہ متوحش سے حرا کی جانب بڑھے جو قالین پر بے سدھ پڑی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر تیزی سے اسے سیدھا کیا جو اونڈھی پڑی تھی۔ اس کا چہرہ خون میں بھیگا ہوا تھا۔ خون تازہ تھا اور ابھی تک ماتھے سے رس رہا تھا جس کا مطلب تھا اس کے یہ چوٹ ابھی لگی ہے۔ آف وہارٹ قالین پر بھی کئی دھبے سرخ سرخ لگے ہوئے تھے۔ خون اور اس کی بے ہوشی نے انہیں حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر سیدھے پورٹیکو میں آئے تھے جہاں ڈرائیور ابھی ان کا لایا ہوا سامان اتار کر فارغ ہی ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا تھا۔

اسی وقت عرفان جو اپنی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا تیزی سے بھاگ کر وہاں پہنچا تھا اور ڈرائیور کو منع کر کے خود کار ڈرائیو کر کے نزدیک ترین ہسپتال کی طرف کار دوڑانے لگا تھا۔

”ڈیڈی! یہ کیا ہوا؟“ وہ انجان بن کر مصنوعی پریشانی سے کوپا ہوا۔

”مجھے خود نہیں معلوم۔ میں ابھی ٹورنٹو سے واپس آیا ہوں۔ کمرے میں آتے ہی میری نگاہ ان پر پڑی تو یہ بے ہوش تھیں اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔“

”اوہ، کہیں ماما کو سوتے میں چلنے کی بیماری تو نہیں ہے؟“ وہ بہت شاطر ذہنیت کا مالک تھا۔ خلاف توقع خرم صاحب کی آمد اور پھر اپنی گھٹیا حرکت کا ادراک اسے اب ہو رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کے مزاج و غصے سے پوری طرح آشنا تھا۔ اگر اس کے وہم و گمان میں ان کی اس طرح آمد کا احساس ہوتا تو وہ کبھی بھی اس ارادے سے آگے نہ بڑھتا۔ اب جو کچھ ہوا تھا وہ بھولانہیں جاسکتا تھا۔ وہ اس بات سے خوفزدہ تھا کہ اگر ہوش میں آنے کے بعد حرا نے اس کی حرکت بتا دی تو پھر کچھ بعید نہیں کہ وہ اسے شوٹ ہی کر ڈالیں۔ خود کو متوقع سزا سے بچانے کی تدبیر بھی تھی کہ وہ لہجہ اختیار کیا جائے، وہ انداز اختیار کئے جائیں کہ وہ اس پر مکمل اعتماد کرنے لگیں۔

”نہیں، حرا ایسی کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہیں۔“ سوتیلے رشتے سے منحرف بیٹے کے منہ سے حرا کو ماما کہنا خاصا سورو شاداں کر گیا تھا۔ وہ تمام ناراضگی و خفگی بھلا کر کوپا ہوئے تھے۔

”پھر کس طرح انہیں یہ چوٹ آئی؟“ وہ طرح طرح سے اپنا اطمینان چاہتا تھا۔

”اب اس سوال کا جواب حرا ہی دے سکتی ہیں۔“

ہسپتال میں حرا کی فوری ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ اس کی از حد کمزوری و وفاہمت کے پیش نظر صبح تک کے لئے اسے ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ خرم صاحب نے پرائیویٹ روم حاصل کر لیا تھا۔ اس کا رروائی کے دوران عرفان ان کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ اس کے دل میں خوف تھا۔ وہ کوئی لمحہ ان سے دور نہیں ہونا چاہتا تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہوا تھا اس کی اصل وجہ، مین کردار وہی تھا۔

حرا ابھی بھی بیڈ پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے دائیں بازو میں ڈرپ انجیکٹ تھی جس میں ڈاکٹر کے حکم پر نرس کئی انجکشنز انجیکٹ کر رہی تھی۔

”فکر کی تو کوئی بات نہیں ہے ڈاکٹر؟“ عرفان کوپا ہوا۔

”نہیں۔“ لیڈی ڈاکٹر کوپا ہوئی تھی۔

”تھینکس گاڈ۔ ورنہ خون دیکھ کر میں تو بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔“

”ڈیڈی! آپ گھر جا کر آرام کریں، میں ماما کے پاس ہوں، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ سفر سے آئے ہیں، تھک گئے ہوں گے۔“ وہ بڑی محبت سے خرم سے مخاطب ہوا تھا۔

”یور آر ویری کئی مسٹر خرم! جو آپ کے بیٹے آپ کی اور اپنی اسٹیپ مدر کی اتنی کیئر کرتے ہیں، عزت کرتے ہیں۔ ورنہ ہم نے بچوں کو بدلتے دیکھا ہے۔“ لیڈی ڈاکٹر، عرفان کی چالوسی و عیاری سے خاصی متاثر نظر آ رہی تھی۔ یہی حال خرم صاحب کا بھی تھا۔

”میں شکر گزار ہوں اپنے پروردگار کا جس نے مجھے ایسی اولاد دی ہے۔ بیٹے آپ گھر چلے جاؤ، میں حرا کو ڈسچارج کروا کر لے آؤں گا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، کوئی ٹھکن نہیں ہے۔“ وہ دھیرے سے مسکرا کر کوپا ہوئے تھے۔

”سپیلے آپ میرے ساتھ ڈاکٹر روم چلیں، وہاں میں آپ کو کچھ سلیپس دوں گی۔ سوچتے کے چند منیٹ کروانے ہیں۔“ ڈاکٹر کے ہمراہ خرم صاحب باہر نکل گئے تو عرفان کی جان میں جان آئی۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ خرم صاحب کی غیر موجودگی میں حرا کو ہوش آئے تاکہ وہ اپنا منصوبہ مکمل کر سکے۔ اب اس کی راہ میں حائل وہاں نرس موجود تھی۔ ”مسٹر پلیز ایک کام کریں گی آپ؟ ایک کولڈ ڈرنک لادیں بلکہ آپ اپنے لئے بھی کولڈ ڈرنک اور برگر بھی لے لینا۔“ اس نے ایک بڑا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بھرپور آفر دی اور نرس مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ نرس کے باہر نکلتے ہی وہ مستعدی سے اٹھا تھا۔

دروازہ کھول کر باہر گیلری میں جھانکا جو دور تک سنسان پڑی تھی۔ اس نے دروازہ اندر سے لاک کیا اور حرا کے بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔ اسی اثناء میں حرا کی پلکوں میں جنبش ہونا شروع ہوئی تھی۔ وہ قریب گیا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”نیت..... تم.....؟“ وہ جس کے زیر اثر ہوش و حواس سے بیگانہ ہوئی تھی اسی مکروہ چہرے کو قریب دیکھ کر وہ خوف سے گھٹائیاتی تھی۔

”خاموش.....“ وہ اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر غرایا۔ ”اگر کوئی بات ڈیڈی کو بتانے کی کوشش کی تو یا درکنہ وہ اس بڑھے کا آخری دن ہوگا۔ وہ تو اس دنیا سے جائے گا ہی ساتھ تمہیں بھی برباد کر جائے گا، جب میں اس بتاؤں گا کہ تم بد چلن ہو، بد کردار ہو، تمہارے آشنا کے ساتھ میں نے تمہیں خود رنگ رلیاں مناتے دیکھا اور جب میں اسے پکڑنے گیا تو تم راستے میں آکر مجھ سے ٹکرا گئیں اور تمہارا عاشق بھاگ گیا۔“

”اتنا بڑا بہتان..... ایسا بھیا نک جھوٹ..... میری زندگی میں خرم کے علاوہ کوئی مرد نہیں آیا۔ میں خرم کو تمہاری گھناؤنی و مکروہ شکل ضرور دکھاؤں گی۔ تم انسان نہیں شیطان ہو۔ پکے شیطان۔“ وہ غصے سے کانپتے ہوئے بولی۔

”دیکھ لو، سوچ لو، تمہارے پاس صرف ایک لائف لائن ہے جس سے تم اپنی زندگی بنا بھی سکتی ہو اور سنوار بھی سکتی ہو۔ مرد کی وفاؤں پر اعتبار کبھی نہیں کرنا چاہئے۔ یہ وقت کی طرح پل پل بدلتی رہتی ہیں اور خصوصاً نوجوان بیوی کو ادھیڑ عمر شوہر کی محبت پر تو بھروسہ کرنا ہی نہیں چاہئے۔ کیونکہ ایسے بڑھے شوہر سب کچھ کر سکتے ہیں مگر اپنی جوان بیوی پر کبھی بھی اعتماد و بھروسہ نہیں کرتے۔ دراصل یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ بڑھا شخص ہر شے پر بد اعتمادی و شک رکھتا ہے خواہ وہ عمر ہو، زندگی ہو یا نوجوان بیوی

اسے ہر ایک سے دھوکے کی توقع ہوتی ہے کہ عمر نہ معلوم کس لمحے دغا دے جائے۔ زندگی نہ معلوم کس لمحے موت کی آغوش میں دم توڑ دے؟ بیوی، ہابا..... نہ معلوم کس لمحے سب دولت و جائیداد سمیٹ کر کسی کے ساتھ فرار ہو جائے۔“ وہ ہنستے ہوئے ازحد بے رحمانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ سفاکی و حیوانیت کا دوسرا رخ دکھارہا تھا۔ وہ لرز کر رہ گئی۔

”نہیں بتاؤں گی خرم کو کچھ بھی۔ مگر تم آئندہ ایسی حرکت کے بارے میں سوچنا بھی مت۔“ وہ کمزور عورت تھی، اس کی اسی کمزوری نے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی عرفان بلا کا جب زبان و مکار فطرت ہے۔ اس کی زبان میں ایسی تاثیر ہے کہ وہ جھوٹ بھی کہے تو بچ لگتا ہے۔

”ہوں..... تم حسین ہی نہیں ذہین بھی ہو ورنہ تمہارے اس بڑھے کو دو ٹائیک ہو چکے ہیں تیسرا تو سیدھا اوپر ہی لے جاتا۔“ اس نے ہنستے ہوئے اوپر کی طرف اشارہ کیا اور آہستگی سے لاک ہٹا دیا تھا۔

”بتا دینا اپنے شوہر نامدار کو کہ میں نیند میں باتھ روم جانے کے لئے اٹھی تھی اور پاؤں کسی چیز سے الجھنے پر گر گئی۔“ وہ اطمینان سے بتا رہا تھا۔



بے جی حسب عادت فجر کی نماز سے فارغ ہو کر ناشتہ کر کے سو گئی تھیں۔ پھر اپنے وقت پر بیدار ہوئیں تو دیکھا پورا گھر جگر جگر چمک رہا ہے۔ ہر شے اپنی جگہ فریے سے رکھی چمک رہی ہے۔ کمرے، باتھ رومز، لاؤنج، گیلری سب صاف و شفاف پڑے ہیں۔ ان کی صفائی پسند طبیعت جھوم اٹھی۔ بے اختیار کئی دعائیں سارہ کے لئے دل سے نکلتی تھیں۔ وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

”اٹھ گئیں بے جی؟“ سارہ دیکھنی میں کچھ چلاتے ہوئے کویا ہوئی۔

”تم تو آتے ہی لگ گئیں بیٹی۔ ایک دن تو مہمان بن کر آرام کر لیتیں۔“

”اپنوں کے ہاں بھی کوئی مہمان بن کر رہ سکتا ہے؟ پھر آپ کے ہاں کا کام ہی کتنا ہوتا ہے بے جی۔“ وہ برسرِ سلو کرتی ہوئی بولی۔

”ہاں، جنہیں کام کی عادت ہوتی ہے وہ بے کار کہاں بیٹھ سکتے ہیں۔ تو رومہ پکار رہی ہو؟“ پورے کچن میں شور سے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

”کل آپ کہہ رہی تھیں ناکہ آپ کا دل چاہ رہا ہے تو رومہ کھانے کو تو میں نے فریج سے چکن نکال کر پکالیا اور بیٹھے میں شاہی کٹڑے بنانے کے لئے دودھ چولہے پر رکھ دیا تاکہ وہ پک کر ہلکا دامی رنگ کا ہو جائے تو اس میں فرانی کسے ہوئے سلاؤں ڈالوں۔“ وہ چائے کے مگڑے میں رکھتی ہوئی کویا ہوئی اورڑے اٹھائے لاؤنج میں چلی آئی۔ بے جی کا رپٹ پر رکھے کٹشن کے سہارے بیٹھ گئیں اور ساتھ ہی باتھ بڑھا کر اس کے ارد گرد بھی کشن لگا دیئے تھے۔

”جیتتی رہو..... سدا خوش رہو۔“ چائے کا مگ باتھ میں چڑتے ہوئے حسب عادت دعاوی تو غیر محسوس انداز میں سارہ کے لیوں پر محروح مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”اس لئے میں نے تمہیں روکا تھا۔ دیکھ رہی ہونا گھر کی تنہائی و خاموشی۔“ بے جی نے چائے پیتے ہوئے شفقت سے کہا۔

”یہ آپ کی محبت ہے..... ورنہ کچ تو یہ ہے کہ اگر آپ مجھ کو نہ روکتیں تو بھی میں نہ جاتی۔“ وہ کپ کی سطح پر اٹھتے دھوئیں کو دیکھ کر سنجیدگی سے بولی۔

”ہاں، ہاں..... ضرور بیٹی..... یہ گھر تمہارا ہی ہے۔“

”نہیں بے جی۔ درحقیقت عورت کا تو کوئی گھر ہی نہیں ہوتا۔ شادی سے پہلے وہ جس گھر کو اپنا گھر سمجھتی ہے وہ گھر اس کے باپ کا ہوتا ہے، پھر بھائیوں کا، اس کے بعد شوہر کا اور پھر بیٹوں کا۔ عورت مالک نہیں، مزدور ہے۔ وہ نہ حیات اپنے ہاتھوں سے ایک ایک اینٹ جوڑ کر گھر بناتی ہے۔ اپنی آرزوئیں، تمنائیں، خواہشیں سب تنج و اتنی ہے، اپنا آپ مٹا دیتی ہے اور جب کڑی ریاضت کا ثمر ملنے کا وقت آتا ہے تو اسے انعام میں اسی گھر کے ایک تارک کو نے میں بے کار برتن کی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ صلہ ہے عورت کی قربانی و وفاؤں کا جو ہر دور میں اسے ملتا رہا ہے۔“

”کیوں اس قدر سوچتی ہو بیٹی۔ عورت سب سے لڑ سکتی ہے مگر اپنے نصیب سے نہیں لڑ سکتی، جو ہمارے حصے کی کٹھنایاں ہیں، پریشانیاں و دکھ ہیں ان سے مقابلہ کر کے ہی ہم سرتوں و سکون کے ساگر میں تیر سکتے ہیں۔ جس طرح سونا بھٹی میں پک کر کنڈن بن جاتا ہے اسی طرح دکھوں و مصیبتوں کی آگ انسان کو نکھار دیتی ہے۔ حوصلہ و قوت بخشتی ہے۔ انسانوں کو جلد یا بدیر ان مراحل سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ اب کون ان سے ہنستے مسکراتے گزرتا ہے یا روتے، سکتے، بلکتے۔ ان مقامات پر ہمارے ایمان کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہمارے تعلقات کی آگہی ملتی ہے اور اس رب کائنات کی ذات پر ہمارا اکتنا یقین و بھروسہ ہے اس کا ادراک بھی ہمیں ہوتا ہے اور ہم جتنا اس کی ذات پر یقین کامل و صداقت رکھتے ہیں اسی حساب سے ہماری پریشانی و دکھ مٹتے چلے جاتے ہیں۔“ بے جی اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مشفقانہ انداز میں سمجھانے لگیں تو بے اختیار ہی وہ رونے لگی تھی۔

بے جی نے خاموشی سے اس کے دل کا غبار نکلنے دیا۔

”میں تنگ آ گئی ہوں ان حالات سے جو سیارہ رات کی طرح میرے نصیب پر محیط ہو گئے ہیں۔ میں تنہا ہوتی بے جی، تو کسی نہ کسی طرح سب برداشت کر لیتی مگر اب اماں کی جو حالت دیکھتی ہوں تو میں خود کو مجرم محسوس کرتی ہوں۔“ دل کی گھٹن آنسوؤں کے ذریعے باہر نکلی تو وہ قدرے سُر سکون انداز میں کویا ہوئی تھی۔

”وہ کبھی ظاہر نہیں کرتیں مگر میں سمجھتی ہوں وہ اندر ہی اندر میرے غم میں گھل رہی ہیں۔ میرا دکھ، میرا وجود کسی آسیب کی مانند انہیں لگ گیا ہے جس سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ سب کچھ ہی کر رہی ہیں، کبھی عاملوں و نجومیوں کے چکر لگاتی ہیں، کبھی درگا ہوں و مزارات پر حاضریاں دیتی ہیں مگر خلاصی کسی طرح نصیب نہیں جگا رہی، خالی ہاتھ بدستور خالی ہیں۔“

”اس رب کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ ہمیں کبھی بھی ہمارے حوصلوں سے بڑھ کر نہیں آزمایا جاتا۔ حوصلہ رکھو، سب درست ہو جائے گا۔“ بے جی چائے سے فارغ ہو کر وہیں کشن کے سہارے نیم دراز ہو کر کویا ہوئیں۔

”پہلی بات میں اماں کو سمجھاتی ہوں مگر وہ روگ لگا بیٹھی ہیں اور اس قدر چڑچڑی و کم حوصلہ ہو گئی ہیں کہ انسان تو انسان پرندوں تک کو کوسنوں و گالیوں سے نوازنے لگی ہیں۔“ سارہ ماں کے لئے از حد فکر مند تھی۔

”ارے زرینہ کی حرکتیں تو تم رہنے ہی دو، مت سوچو اتنا، کوئی تمہاری وجہ سے وہ ایسی، بھکی، بھکی حرکتیں نہیں کر رہی ہے، بچپن سے عادت ہے اس کی۔“ بے جی مسکرا کر کویا ہوئیں اور اسے زرینہ کے بچپن کے قصے سنانے لگیں جو لڑائی، جھگڑوں سے بھرپور تھے۔



محبت سے اگر مانگو تو ہے یہ جان بھی حاضر  
مگر نفرت سے میرا سر کبھی بھی خم نہیں ہوتا  
نہ جانے کس گلی کے موڑ پر ہم تم پہنچ جائیں  
وصال ہجر کا یارو کوئی موسم نہیں ہوتا

شاہ ویز حسب عادت ناشتے سے فارغ ہو کر سیر کو نکل چکا تھا۔ پہلے دن کے بعد اس نے مروتا بھی اسے ساتھ چلنے کی آفر نہ کی تھی۔ اس نے بھی کوئی ایسی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ وہ قید سے آزاد ہوئی تھی اور تنہا اپنی آزادی کا جشن منانا چاہتی تھی اور منایا بھی تھا مگر عادت کے مطابق وہ اس روٹین سے بھی ایک ہفتے میں اکتا گئی تھی۔ اپنی اس بوریت کا اظہار اس نے شاہ ویز سے کیا تو اس نے مشورہ دیا کہ وہ فریڈہ کی ماں کے ہمراہ گاؤں کی عورتوں سے ملے۔ ان کے طور طریقے دیکھے اور محسوس کرے کہ گاؤں کی عورت اور شہر کی عورت میں کیا فرق ہے۔ ان کی زندگی کے کیا اصول و ضوابط ہیں۔ پہلے تو اس نے منہ بنا کر منع کر دیا کہ وہ سوشل ورک کو پسند نہیں کرتی اور نہ ہی وہ شہر اور گاؤں کی عورت میں کوئی تضاد دیکھنے کی خواہش مند ہے۔ عورت، عورت ہوتی ہے۔ خواہ وہ کہیں سے بھی تعلق رکھتی ہو۔ جو اب لاہور وائی کے انداز میں کاندھے اچکا تے ہوئے شاہ ویز نے اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔

جہاں بات اس کے اختیار یا ذات سے ہٹ کر ہوتی تھی، وہاں وہ کبھی بھی اپنی نہیں منواتا تھا مگر ہونٹوں پر ایسی طنز یہ مسکراہٹ ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ سامنے والا بندہ طیش میں آکر وہ کرگڑتا تھا جو وہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اطمینان سے شانے اچکا کر مسکرا کر چلا گیا تھا اور وہ غصے میں چوکیدار کی بیوی کے ہمراہ نکل گئی تھی۔

ان کے جھگڑے سے کافی دور وہ کچے کا علاقہ تھا جہاں ٹوٹی پھوٹی جھوپڑیاں بنی ہوئی تھیں جن کے اطراف میں ہرے بھرے کھیت تھے۔ کھیتوں کے درمیان سے ٹیڑھی میڑھی چمڈغیاں نکل رہی تھیں، دھنیریں بہہ رہی تھیں جن میں میا لے رنگ کا پانی تھا۔ ان نہروں کے کنارے ہی گاؤں کی کچھ لڑکیاں اور عورتیں کپڑے دھونے میں مصروف تھیں جن کے قریب ہی کپڑوں سے بے نیاز بچے مٹی میں کھیلنے میں مگن تھے۔ وہ نخوت بھرے انداز میں سب دیکھتے ہوئے چل رہی تھی۔

اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

نہ کھیتوں کی ہریالی۔

نہ صاف و شفاف ہوا کی فرحت بخش تازگی۔

نہ اسے تنگ دھڑنگ مٹی سے لت پت بچوں سے ہمدردی تھی۔

نہ رنگ برنگ پھولدار سوٹ پہنے، بڑی بڑی اوڑھنیاں اوڑھے عورتوں سے دلچسپی۔

یہ ماحول اور یہ لوگ کسی طور پر بھی اس کے مزاج کے خانے میں فٹ نہیں ہوتے تھے۔ وہ بے زار ہو گئی تھی چند لمحوں میں۔ اس کی دل کی کیفیت چہرے سے عیاں تھی جو چوکیدار کی بیوی بہ خوبی محسوس کر رہی تھی لیکن وہ اس کے مزاج کو سمجھتی تھی کہ اگر وہ کچھ کہے گی تو مشعل کے حاکمانہ ذہن پر یہ بات ناکوار گزرے گی کہ نوکرانی ہو کر منہ کھول رہی ہے۔



”یہاں کی عورتیں اسی طرح کام کرتے کرتے ہی زندگی گزار دیتی ہیں؟ کوئی مشاغل نہیں ہیں ان کے؟“ خوب سارا جاڑہ لینے کے بعد وہ تھک کر واپس کار میں آکر بیٹھ گئی تھی اور منرل واٹر پیتے ہوئے بولی تھی۔

”غریبوں کے کیا مشاغل، جی۔ صبح سے رات تک عورت کام کرتی ہے، گھر کا بھی اور کھیتوں کا بھی، پھر دو وقت ڈھنگ سے پیٹ بھرنے کو روٹی ملتی ہے ورنہ کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔“

”عورت کو اپنے حق کے لئے آواز بلند کرنی چاہئے۔ وہ کیوں ان گائے بھینسوں میں رہ کر ان کی طرح ہی بے زبانی کی زندگی گزار رہی ہیں؟“

”بی بی جی! کون مانگے گا اور کون دے گا؟ عورت کا حق عورت ہی مارتی ہے۔ اصل ظلم کرنے والی عورت پر، عورت ہی ہوتی ہے۔ مرد کے تو صرف کان بھرے جاتے ہیں۔“

”جب لوگوں کو علم سے دور رکھا جائے گا تو جہالت پھیلے گی۔ اور جہالت سے بری چیز کوئی نہیں ہے۔ تعلیم نہیں ہوگی تو شعور نہیں آئے گا، بہتر اور بدتر کی تمیز نہیں آئے گی۔“ وہ سوچ رہی تھی۔ پھر سارا دن وہ گاؤں کے مختلف گھروں میں جا کر ان سے ملتی رہی اور ان مظلوم عورتوں کی کہانیاں اس کے اندر تعمیرات پیدا کرنے لگیں۔

وہ شام کو واپس لوٹی تو جھولی میں بہت سی داستانیں بھری تھیں کہ جن کے کردار دل پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔

وہ جن عورتوں کو از حد اجڈ، جاہل و گنوار سمجھ کر اگنور کر رہی تھی، ان کے ہمت و حوصلوں، صبر و استقلال نے اسے تحیر کر ڈالا تھا۔ وہ اپنی سوچ پر شرمندہ ہو کر رہ گئی تھی۔

”میں نے کہا تھا نا لوگوں سے مل کر ہم ان کے متعلق جان کر ہی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ دنیا کے چال چلن کا اندازہ بھی ہمیں ہو جاتا ہے۔“ رات کھانے کے بعد چہل قدمی کے دوران مشعل نے سارے دن کی روئیدار سنائی تو وہ کوہا ہوا تھا۔

”ہم کب چلیں گے یہاں سے؟“

”کیوں..... ابھی ہمیں یہاں کتنا عرصہ ہوا ہے؟“ اس نے الٹا سوال کر دیا۔

”کیا ہم یہاں ساری زندگی گزارنے کے لئے آئے ہیں؟“

”ساری زندگی.....“ وہ مسخرانہ انداز میں مسکرایا تھا۔

”میں نے جو کہ نہیں سنایا، سوال کیا ہے۔“ ہمیشہ کی طرح اس کی مسکراہٹ مشعل کو تپا گئی تھی مگر پھر بھی اس نے لہجے کو نارمل رکھا تھا۔

”میں نے قہقہہ تو لگا یا نہیں ہے۔“

”لیکن مسکراہٹ قہقہے سے زیادہ بھاری ہے۔“

”ارے یار! تم تو مسکراہٹ پکڑ لیتی ہو۔“ راستے میں آئے پتھر کو ٹھوکر مارتے ہوئے وہ بے تکلف لہجے میں بولا۔

”ساری زندگی..... آخر مقصد کیا ہوا اس طنزیہ مخاطب کا؟“ شاہ ویز کے جملے نے اس کی طنزیہ مسکراہٹ کی کاٹ اسے بہت کچھ سمجھا گئی تھی۔

”کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں۔ ان بلاؤں کی باتوں میں کیوں دماغ کھپاتی ہو؟“ شاہ ویز نے کہہ کر بات ختم کر دی تھی مگر مشعل کے دل میں عجیب و ہم چھانے لگے تھے۔

وہ یہ اچھی طرح جانتی تھی، شاہ ویز سے اس کی مرضی کے بنا کوئی بات معلوم نہیں کی جاسکتی، اسی طرح وہ قبل از وقت کچھ کہنے سے بھی گریز اس رہتا تھا۔

وہ تفکرات کے سننے پسندوں میں الجھنے لگی تھی۔

شاہ ویز کی ادھوری بات بہت سے معنی رکھتی تھی جن کو وہ بہ خوبی سمجھنے، جاننے، محسوس کرنے کا ادراک رکھنے لگی تھی۔ پہلے وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیریں کرتی تھی، وجوہات ڈھونڈتی تھی جن کے بہانے سے ان سے جان چھڑائی جاسکے۔ اپنی انہی خواہشات و توقعات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے بہت موثر و جامع پلاننگ کی تھی جس کے تحت نہ صرف شاہ ویز کو زوج و پریشان کیا تھا بلکہ اس کی ماں یعنی بے جی کی تو اس قدر توہین و تذلیل کی تھی کہ اگر کوئی عام عورت ہوتی تو کب کی اسے گھر سے نکال چکی ہوتی بلکہ گھر سے ہی نہیں اپنے بیٹے کی زندگی سے بھی علیحدہ کر چکی ہوتی۔ اسے اب اپنی زیادتیوں و بے حسی کا احساس ہو رہا تھا تو بے جی کی فراخ دلی و خلوص کا اندازہ بھی ہو رہا تھا۔

جب سے وہ محبوب ہوا تھا اسی وقت سے اس سے وابستہ ہر شے عزیز تر ہوتی چلی گئی تھی۔

رسوائیوں کا خوف ہے ورنہ یہ خواہش ہے  
تم میرے ہو ہر جگہ یہ خبر ٹھہرے  
تیرا وجود ہے اتنا عزیز کہ تجھے  
رہوں کہیں بھی نظر تیری منتظر ٹھہرے

□●□

حسن بیگ کے سامنے آفس ٹیبل پر مختلف فائلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک نیلے رنگ کی فائل پر از حد انہماک سے جھکے اپنے کولڈن قلم سے کچھ تحریر کرنے میں مصروف تھے جب ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا تھا۔

”میڈم..... میڈم میری بات سنیں پلیز۔“ حسن صاحب نے سر اٹھا کر دیکھا اور بے اختیار کھڑے ہو گئے۔

”سر! یہ میڈم منع کرنے کے باوجود اندر آ گئی ہیں۔ میں نے کہا بھی کہ آپ بے حد بڑی ہیں، بنا اپنا نمٹ کے نہیں مل سکتے مگر یہ یہاں آ گئیں۔“ سیکرٹری پریشان لہجے میں ان سے مخاطب ہوا تھا۔

”تم تو کیا..... دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے بھائی سے ملنے سے نہیں روک سکتی۔“ رانعدہ کی تیز و کاری آواز حسن صاحب کو حواسوں میں کھینچ لائی، وہ انہیں بالکل غیر متوقع طور پر وہاں دیکھ کر کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئے تھے۔

”اوکے، نوٹیشن، یو کو پلیمز۔“ فوراً ہی شائستگی سے بولے تو سیکرٹری چلا گیا۔

”بھائی جان!“ وہ ان کے شانے سے پسٹ کر جذباتی لہجے میں کویا ہوئی تھیں۔ ”کس بات کی سزا دی آپ نے مجھ کو؟ بنا کچھ کہے، بنا کچھ بتائے ایسے غائب ہوئے کہ ڈھونڈنے سے بھی آپ کا پیو نہ مل سکا۔“ رانعدہ نے ان کے شانے سے لگے لگے ہی دھواں دھار روتے ہوئے شکوے شکایات شروع کر دی تھیں۔

”آپ کے سوا کون ہے میرا..... ماں باپ، بہن بھائی سب رشتے آپ کی ذات سے ہی وابستہ ہیں میرے۔ آپ کی غیر موجودگی بلکہ کمشدگی نے مجھے فکر و پریشانیوں میں ڈال دیا تھا۔ میں کتنی فکر مند تھی یہ آپ محسوس ہی نہیں کر سکتے۔“

ان کے لہجے میں اپنائیت و رُخس، چہم چہم برستے آنسو، بے قراری و غطرار حسن بیگ جیسے نرم دل و بلند ظرف شخص کا دل موم کی طرح پگھلا گئے۔

وہ تمام باتیں، تکلیف دہ اذیت ناک مراحل جو دل و جان کے ساتھ ساتھ رشتے و قرابت داریوں کو بھی مخ کر گئے تھے اس وقت جیسے دلوں سے بالکل محو ہو گئے تھے۔ اپنی ازلی شفقت و محبت سے انہوں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

”میں جانتا ہوں تمہاری محبت کو۔ احساس ہے مجھے کہ مجھے نہ پا کر تمہیں کیسا محسوس ہوا ہوگا۔ مگر انسان پر کبھی کبھی ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ وہ اپنی پرچھائیں سے بھی پوشیدہ رہنا چاہتا ہے۔ پھر بھی ایسی ہی آفت ٹوٹ پڑی تھی۔“ وہ انہیں لے کر صوفے پر بیٹھ گئے اور ان کی انسردگی دور کرنے کے لئے وضاحتی لہجے میں کویا ہوئے۔

”کہاں رہ رہے ہیں آپ؟ کلنگٹن والی کوٹھی پر تالا پڑا ہے۔“ وہ کیوں منہ چھپا کر روپوش ہوئے تھے یہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں اس لئے سرعت سے ان کی بات نظر انداز کر کے وہ عام سے لہجے میں استفسار کرنے لگیں۔

”میں آفس کے ایریا میں کچھ گیسٹ رومز ہیں، ان میں سے ایک میں رہ رہا ہوں۔“

”ہائے، کیوں بھائی جان! اتنا کچھ ہونے کے باوجود آپ مہمانوں کے کمرے میں مہمانوں کی طرح کیوں رہ رہے ہیں؟“

”بس وقت کے تقاضے ہیں۔ فی الحال بتاؤ کولڈڈ رنک لوگی یا چائے کافی؟“

”میں نے تو کھانا ہی نہیں کھایا، دراصل آپ سے ملنے کی خوشی میں بھوک ہی اڑ گئی تھی۔ اب آپ کو اپنے سامنے دیکھ کر بھوک کا احساس جاگ اٹھا ہے۔“

”اچھا آفس باؤم آف ہو رہا ہے۔ ہم ڈنبا ہر کریں گے۔“ حسن بیگ اٹھتے ہوئے کویا ہوئے تو وہ بھی فوراً اٹھتے ہوئے بولیں۔

”ہوں..... یہ ٹھیک ہے۔ چائیز فوڈ کھائے کتنا عرصہ ہو گیا ہے، میں ابھی جو جو کوفون کر کے کہتی ہوں وہ چائیز میں آجائے۔ بہت عرصے بعد ہم ساتھ کھانا کھائیں گے اور مجھے آپ کو، آپ کے اس مکارور کر کے کارنا سے بھی سنانے ہیں کہ کس کس طرح وہ ہماری نازک پھولوں سی مشعل پر ظلم کرتا ہے۔“ وہ فون کی طرف بڑھتے ہوئے شاطرائے لہجے میں کہہ رہی تھیں اور فائل پر سائن کرتے کرتے حسن بیگ کی انگلیوں میں پکڑا سہری قلم یکفخت رک گیا تھا۔

□●□

اس نے غطرابی طور پر انگلیاں آپس میں چوست کرتے ہوئے ادھر ادھر چکر لگاتے ہوئے بے سدھ سوئے ہوئے شاہ ویز پر نظر ڈالی۔

کتنی گہری و مٹھی نیند سو رہا تھا وہ، اس کی نیند اڑا کر۔ چوکیدار دومرتبہ آچکا تھا کہ وہ اسے بیدار کر دے۔ کسی ضروری کام کے لئے انہیں کہیں جانا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح جگائے اور اسی غطراب میں چکر کاٹ رہی تھی کہ اسی اثناء میں چوکیدار تیسری مرتبہ پیغام دے گیا تو جھجکتی ہوئی اس کی جانب بڑھی تھی۔ غلٹ میں پاؤں کا رپٹ پر سلسپ ہوا تھا اور وہ جو اسے جگانے کے ارادے سے کچھ جھک کر آگے بڑھ رہی تھی، سلسپ ہونے کے باعث سیدھی اس پر جا گری تھی۔ شاہ ویز کے چہرے سے اس کا چہرہ لکرایا تھا۔ بے اختیار منہ پھلنے کے لئے اس نے شاہ ویز کا بازو پکڑ لیا تھا۔

شاہ ویز جاگ گیا تھا۔

مشعل نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ بھی سرخ سرخ خمار آلودہ گاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ نامعلوم اس لمحے اس کی آنکھوں میں کون سے رنگ تھے۔ وہ مخصوص تسخرانہ ظالمانہ چمک نہ تھی جو اس کا ویلہ خاص تھی۔

وہ شرمندہ ہو کر اٹھنے لگی۔

”میں..... میں آپ کو جگانے آئی تھی۔“ وہ بوکھلائی، گھبرائی سی ہکلا کر بولی۔

”میں جاگ گیا ہوں۔“ شاہویر نے دکشی سے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا۔

”میں جاگ گیا ہوں۔ فرمائیں کیا خدمت کروں؟ کیا حکم ہے میرے لئے؟“

”واجب میں کئی بار بلانے آچکا ہے۔“ وہ اس کی جانب سے رخ موڑ کر کھڑی تھی۔

”اوہ، یہ بات ہے..... ورنہ میں سمجھا میری پر سنائی نے آج آپ کو بھٹکنے پر مجبور کر ہی ڈالا۔“ وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں کوپا ہوا تھا۔

مشعل کچھ نہ بولی۔ وہ ابھی اپنے دھڑکتے دل و کانپنے وجود پر قابو نہ پا سکی تھی۔ عجیب سی کیفیت تھی جو اس پر طاری تھی۔

”جگانے کا یہ انداز مجھے بے حد پسند آیا ہے۔ نیند میں ایسا محسوس ہو رہا تھا کوپا، بہت سارے مہکتے گلاب میرے سینے پر آگرے ہوں۔“ وہ اس کے مقابل چلا آیا تھا۔

”سنو.....“ وہ اس کے سرخ چہرے پر نگاہیں جما کر بولا۔ ”اتنا فحاشک اسٹائل کہاں سے سیکھا ہے؟“ وہ اسے زنج کر رہا تھا۔

”میں نے از خود بیہوش کیا ہے۔ میں جگانے آ رہی تھی میرا پاؤں سلپ ہوا اور میں آپ پر گر گئی۔“ مشعل آہستگی سے کوپا ہوئی تھی۔

”ارے میں نے کوئی ہتھ اڑا نہیں کیا، نہ ہی ماسٹڈ کیا، بلکہ گز ارش کر رہا ہوں کبھی کبھی جگا دیا کیجئے شاید اسی طرح آپ کی بات بن جائے۔“

”کمینہ، ذلیل انسان، کس قدر خود پسند ہے۔“ اس کے کمرے سے جانے کے بعد وہ ہڑبڑائی تھی۔

وہ سر جھٹک کر کمرے سے نکل آئی تھی۔

شہر کی نسبت گاؤں کی صبحیں خوب صورت و خوش کوار ہوتی ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی کثافت سے پاک ہوا، دھوئیں، شور اور ہنگاموں سے ہر آنکھری، ستھری تر ہوا، نضا۔ وہ لان کی تم گھاس پر شہلٹی ہوئی شریفہ، امرود اور جامن کے درختوں کی ٹہنیوں پر لٹکیلیاں کرتی چڑیوں کو دیکھ رہی تھی جن کا مدھم شورا حول میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔

”بی بی صا حب! چائے لیجئے۔“ رشیدہ کپ و ساسر لئے بڑے مؤدبانہ انداز میں مخاطب ہوئی تھی۔ اس نے ساسر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

لائٹ گرین بڑے دوپٹے کو نماز کے اسٹائل میں لپیٹے لگا ہیں جھکائے، گردن کو معمولی خم کئے وہ اس لمحے اسے بہت منفرد اور پُرکشش محسوس ہوئی تھی۔ ہر آرائش وزینائش سے بے نیاز۔ اس کے چہرے پر انوکھی جاذبیت اور نکھار تھا۔ ایسی جاذبیت اور نکھار اس نے ان سب ماں بیٹیوں کے چہرے پر محسوس کیا تھا حالانکہ وہ عام سے نقوش اور گندی رنگت والی لڑکیاں تھیں جن کو میک اپ کے نام پر فیس پاؤڈر بھی استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی جو تھریڈنگ، پلچنگ، فیشل وغیرہ کے عمل سے بھی ناواقف تھیں۔

جن کی زندگی گھر اور گھر کی چہار دیواری تک ہی محدود و محدود تھی۔

پھر نامعلوم کس طرح وہ اتنی معمولی ہونے کے باوجود غیر معمولی و پُرکشش تھیں۔

”آپ ناشتے میں کیا لیں گی؟“ اسے مسلسل اپنی طرف گھورتے دیکھ کر رشیدہ کی جان ہوا ہو رہی تھی۔ اسے مسلسل خاموش دیکھ کر وہ سہمے ہوئے انداز میں کوپا ہوئی تھی۔

”تم کیا کھاتی ہو؟“ بے اختیار ہی لب و اہوائے تھے۔

”جی..... میں؟..... کبھی انڈر پرائیڈ، کبھی رات کا باسی روٹی سالن، کبھی پرائیڈ اپار۔“ بہت سعادت مندی سے اس نے تفصیل بتا دی تھی۔

”ہوں.....“ اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور چہرے پر کیا لگاتی ہو؟“

”چہرے پر کچھ بھی نہیں جی..... اماں ناراض ہوتی ہیں پاؤڈر کریم لگانے سے۔“

بلا کی مرعوبیت تھی۔

”صاحب کو بیڈٹی دی؟“

یکدم اس کو احساس ہوا کہ وہ ایسے سوالات کر کے انہیں خوش فہمی کا موقع دے رہی ہے جو درست فعل نہیں ہے۔ اپنی حماقت کا احساس ہوتے ہی وہ اسے آج کے ناشتے کا مینو بتا کر بیڈروم میں چلی آئی جہاں شاہویر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔



آنسو کتنا پُرسوں احساس ہے۔

وہ جو آنکھ کی سیلپ سے گرتے ہیں، موتیوں سے بھی زیادہ حسین و دلکش لگتے ہیں اور ان خوب صورت موتیوں کی قدر کوئی قدر دان ہی کر سکتا ہے۔ وہی ان کی اہمیت و افادیت کو سمجھ سکتا ہے ورنہ دوسروں کے لئے یہ ارزاں و بے وقعت سی چیز ہیں۔

آنسو یونہی حاصل نہیں ہو جاتے۔ انہیں حاصل کرنے کے لئے دل پر بڑی گہری چوٹ کھانی پڑتی ہے، احساسات کو گھائل کرنا پڑتا ہے۔ جب درد کا دھواں آنسوؤں کی صورت میں نکلتا ہے جو تمام خزانوں سے زیادہ قیمتی ہیں، ان موتیوں کو وہی چتا ہے جو ان کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوتا ہے اور خرم نے اس کی آنکھ سے گرنے والے ہر موتی کو بڑی چاہ، اپنائیت سے جین لیا تھا کہ وہ ایک بہترین شریک سفر ہی نہیں بلکہ کامیاب جوہری بھی تھی۔

”میں کتنا خوش ہوں..... اس کا اندازہ شاید تمہیں نہیں ہوگا۔ اس عمر میں جب کہ میں اپنی زندگی سے قطعی مایوس ہو گیا تھا، تم نے مجھے ایک نئی زندگی سے ہم کنار کیا ہے۔“ رپورٹس ان کے ہاتھ میں تھیں۔ سرت و شادمانی سے ان کا انگ انگ چمک رہا تھا۔

”تھینکس..... تھینکس اے لوٹ مائی ڈارلنگ۔“ انہوں نے جھک کر اس کا خرطوی ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا کر بوسہ دیا تو وہ ہری طرح جا کر رہ گئی۔

”تم بھی کچھ کہو جب سے یہ خوش خبری سنی ہے میں بولے ہی جا رہا ہوں۔ تم بھی کچھ کہو۔ کیا تمہیں ماں بننے کی خوشی نہیں ہے؟“ وہ قریب بیٹھتے ہوئے لمحے بھر کو فکر مند ہوئے۔

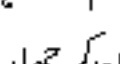
”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ یہ رشتہ لازوال ہے۔ ایک عورت کی تکمیل ماں بن کر ہی ہوتی ہے۔ میں نے اس خیال کو، اس آرزو کو دل میں تھپک تھپک کر سلا دیا تھا کہ شاید آپ مجھے اس سعادت سے محروم رکھیں گے کیونکہ آپ باپ پہلے بن چکے ہیں اور شاید..... شاید آپ سے وابستہ دوسرے رشتے بھی اس رشتے کو قبول نہ کریں۔“ اس نے آہستگی سے اپنے خدشات و احساسات ان سے شیئر کئے تھے جنہیں سن کر وہ کھل کر مسکراتے ہوئے کوپا ہوئے۔

”تمہاری سوچ اور تفکرات بے بنیاد نہیں ہیں ڈارلنگ۔ دراصل حقیقی مشاہدے میں پہلی بار آیا ہے کہ جو لوگ میری عمر میں سیکنڈ میرج کرتے ہیں وہ مسند کارول تو بہ خوش قبول کر لیتے ہیں مگر وفادار بننا کوارہ نہیں کرتے اور شاید میں بھی نہیں کرنا اگر مجھے تم جیسی با وفا، با کردار بیوی نہ ملی ہوتی، تمہاری بیار بھری رفاقت نہ ملی ہوتی تو میں بھی عام مردوں کی طرح صرف نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے یہ رشتہ استعمال کرنا مگر اب میری دلی خواہش ہے کہ باپ بنوں اور اس رشتے کے حقیقی تعلق کو محسوس کروں اور رہا سوال مجھ سے وابستہ لوگوں کا تو نہ میں نے کسی کی پرواہ آج تک کی ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔ جب زندگی ہماری ہے، اس پر ہمارا حق ہے تو بلا کسی خوف و خطر کے ہمیں اپنے طریقے سے جینا چاہئے۔ کیوں بلا وجہ کے ڈرو خوف میں پھنس کر خود کو پابند کریں۔“

”آپ آرام کریں..... رات ہسپتال میں بھی نہیں سوئے ہیں اور اب بھی بے آرام ہو رہے ہیں۔“ حرا ان کی جانب بیار بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی کوپا ہوئی۔

گرے پیٹ، اسکاٹی لائٹ کٹر کی شرٹ میں ان کے وجہ چہرے پر تھکان سرخی بن کر چھا رہی تھی۔ آنکھوں میں حقیقی سرت کی روشنی چمک رہی تھی۔

”بیگم صاحب! آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ ہمیں تو آپ کی خدمت کرنے کی سعادت نصیب ہو گئی اب۔“ بے پایاں خوشی کے احساس نے اس بنجیدہ و پروتار شخص کو خاصا شوخ بنا ڈالا تھا۔



شام کا جاوہ تھا یا شدت تمہاری یاد کی

وقت کیا مجھ کو تو دریا بھی ٹھہرا لگا

حسن بیگ صاحب بنجیدگی سے رانچہ کی گفتگو سن رہے تھے اور رانچہ بغیر کسی فل اسٹاپ یا کوسے کے بول رہی تھیں، کسی سیلاب زدہ چڑھائی کی مانند ان کی زبان رواں دواں تھی۔ حسن بیگ سے ان کی یہ چوتھی ملاقات تھی۔

چار دنوں کی اسی چوتھی ملاقات میں ان کی زبان پر موضوع گفتگو شاہویر کی شریپرندی، حیوانیت، ظلم و ستم اور جواب میں مشعل کی مظلومیت، معصومیت، صبر و استقلال کی من گھڑت داستانیں تھیں کہ جن کو سننا کر ان کے آنسو خشک نہ ہوتے تھے۔ جہب زبانی و دوغلی فطرت تو ان کی اصل تھی۔ مکار و سازشی ذہن اس قدر کہ لمحے بھر میں ملے ہوؤں کو لٹروا دیں یا لٹرے ہوؤں کو لوٹوا دیں۔ ہر طریقے سے وہ اپنی غرض پوری کرنا جانتی تھیں۔

ان کا ہر قدم اپنے بہتر سے بہتر مفاد کی جانب بڑھتا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا بھائی جان! میں آپ کو ایک ایک بات، ایک ایک حرکت اس فراڈی کی بتا رہی ہوں اور آپ بجائے مشعل کو اس وحشی کے بچوں سے آزاد کروانے کے میری باتیں سن کر مسکرانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہی آپ کی پالیسی۔ مجھے تو لگتا ہے ان حرام خور ماں بیٹے نے آپ پر کوئی بحر وغیرہ کروا دیا ہے۔ جس لڑکی کو آپ نے سگی اولاد سے بڑھ کر چاہا، کبھی ڈانٹ مار تو درکنار پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا ہو، اسے وہ غیر و اجنبی شخص ایسے دھنسا ہے جیسے دھوبی کپڑے کو فٹا ہے یا لوہار لوہے پر ہتھوڑے کی ضربیں لگا کر حسب فضا اشکال ترتیب دیتا ہے اور ایسا ہی حال اس وحشی جلاوٹ نے ہماری لاڈوں پل مشعل کا کیا ہے۔ آہ!

مشعل جو، جو جو کے سنگ مشعل کی طرح چمکدار روشن دکھائی دیتی تھی اب کسی سمجھے جہراغ کی طرح بے رونق و بیران نظر آتی ہے۔“

چندر لمحے تو قف کے بعد وہ پھر رواں ہوئیں۔

”مجھے تو محسوس ہو رہا ہے بھائی جان، آپ کے دل سے مشعل کی محبت نکل گئی ہے اور ایسا تو ہونا ہی تھا۔ آخر کسی اور کی نا جائز اولاد کو آپ کب تک.....“

”رائہ! وہ صوفے سے کھڑے ہو گئے۔ آواز غیر معمولی طور پر بلند ہو گئی تھی۔ شدید ترغصے کی سرخی ان کے چہرے پر نمایاں تھی۔ قدرے تیز تنہس سے ان کا جسم جھنجھٹا اٹھا تھا۔

”میں نے غلط تو نہیں کہا بھائی جان۔“ وہ بھی ان کے انداز سے سراسیمہ ہو کر بولیں۔

”غلط..... تم نے ایسی بات کہی ہے کہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو دوبارہ ایسی بات کہنے کی جرأت نہ کرتا۔“ اس وقت سخت اشتعال انگیزی ان کے چہرے، ان کی آنکھوں و لہجے سے مترشح تھی۔

”لیکن بھائی جان، میں نے کیا غلط کہہ دیا؟“

”ایک بار نہیں، بار بار تم نے میرے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ مشعل سے تمہیں محبت نہ سہی مگر میرے احساسات کا تو خیال رکھا کرو۔ وہ میری بیٹی ہی نہیں میری زندگی، میری روح ہے۔ اس کو گالی دینا مجھے گالی دینے کے مترادف ہے۔ اس کی تو جین میری تو جین ہے۔ اس کی رسوائی میری رسوائی ہے۔“

”ہائے ہائے بھائی جان! خون کے رشتے اتنے بودے اور نا پسندوار ہو گئے کہ سگی بہن کی کوئی حیثیت و وقعت ہی نہ رہی۔ وہ کچھ نہ رہی جو سب کچھ تھی اور وہ سب کچھ ہو گئی جو کچھ نہ تھی۔“ حسب معمول وہ آنسو بہانے کو تیار تھیں۔

”اس دور میں خون کے رشتے اتنے ہی نازک و نا پسندوار ہیں جتنے کانچ کے برتن ہوتے ہیں کہ ذرا معمولی سی لغزش ہوئی نہیں اور وہ چکنا چور ہوئے۔ اور اگر انہیں کسی تدبیر سے جوڑ بھی دیا جائے تو وہ پہلے جیسے نہیں رہتے، ان میں پڑنے والی بد صورت لکیریں ہر ایک کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیتی ہیں کہ ٹوٹنے کے بعد انہیں دوبارہ جوڑا گیا ہے اور رشتوں کا بھی حال ایسا ہی ہوتا ہے۔“ حسن بیگ صاحب کے لہجے میں ایک ایسی کاٹ و آج تھی کہ رائہ چند لمحوں کو گنگ سی رہ گئی تھیں۔ انہوں نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا تھا وہ سب انہیں بخوبی ازبر تھا مگر وہ خود غرض اور خود پرست لوگوں کی اس برادری سے تعلق رکھتی تھیں جو دوسروں پر ظلم و ستم روا رکھ کر بھی خود کو مظلوم و معصوم تصور کرتے ہیں۔

اس وقت بھی بھائی کے منہ سے نکلی چائی انہیں عرقِ ندامت میں شراپور کرنے کی بجائے احساسِ شغری سے ساگائی تھی۔ وہ اندر ہی اندر کسی گیلی لکڑی کی مانند دھواں دھواں سلگتی گئی تھیں۔ اگر انہیں ان سے مطلب نہ ہوتا تو وہ ایک ٹھوکر مار کر انہیں وہاں سے نکل گئی ہوتیں، مگر مجبوری یہی تھی کہ انہیں ان سے رقم لینی تھی کہ بد حقیقت ان کے تمام عیش و آرام حسن بیگ کے ہی مرہون منت تھے۔

”یہ آپ نے کس طرح سوچ لیا کہ میں مشعل کو اپنا نہیں سمجھتی؟ اس سے محبت نہیں کرتی؟ نہیں نہیں بھائی جان یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ اگر وہ مجھے عزیز نہ ہوتی یا میں اس سے محبت نہ کرتی تو کیوں اسے جو جو کے لئے آگے کرتی؟“ بازی تیزی سے پلٹتی دیکھ کر انہوں نے پینٹر بدلا تھا۔

”اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ نصیب تو اوپر والا لکھتا ہے، جوڑے بھی آسمان پر ہی بنائے جاتے ہیں۔ مشعل کا نصیب جواد سے وابستہ نہیں کیا گیا تھا، اس کا نصیب شاہ ویز کے ساتھ لکھا گیا تھا جو اسے مل گیا۔ شاہ ویز میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک ہونا ہوتا قابلِ فخر داماد میں موجود ہونی چاہئیں۔ مجھے از حد فخر ہے اس پر۔“ حسن بیگ کے انداز میں شاہ ویز کے لئے بے حد ستائش و توصیف تھی۔ رائہ کی حسد و غصے کے مارے بری حالت تھی مگر مجبوراً مسکرا رہی تھیں۔



شاہ ویز کا پچھلے دو، ہفتوں سے یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ صبح ہی نکل جایا کرتا تھا اور شام ڈھلے واپس آتا۔ پھر غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد یا تو چوکیدار کے ساتھ گاؤں کے بزرگوں کی بیٹھک میں جا بیٹھتا یا کمرے میں تاریخی یا ادبی موٹی موٹی کتابیں لے کر بیٹھ جاتا اور پھر اسے ارد گرد کی کوئی خبر نہ رہتی تھی۔

اس کے ان معمولات نے مشعل کو بوریت کی انتہاؤں تک پہنچا ڈالا تھا۔ یہاں قیام پذیر ہوئے انہیں ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ اب وہ یہاں رہنے کو قطعی تیار نہیں تھی اس وقت بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔

وہ ایک کتاب لے کر بیڈ پر نیم دراز ہو کر مطالعہ کرنے لگا۔

”میری سزا کب ختم ہوگی؟“ وہ جو اس کی طرف سے خوب جلی جھنی بیٹھی تھی، اسے مطالعے میں محو ہوتے دیکھ کر پاؤں پیچتی ہوئی وہاں جا کر کویا ہوئی۔

”کون سی سزا؟ اگر میرا ساتھ تمہیں سزا لگتا ہے تو یہ سزا میں بھی برداشت کر رہا ہوں۔“ اس نے کتاب سے نگاہیں اٹھائے بغیر اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔

”تم سے تو سیدھے منہ بات کرنے کی کوشش ہی فضول ہے۔“

”سیدھے لوگوں سے سیدھی بات، اگلے لوگوں سے الٹی بات۔ لوگوں کو میں ان کی اوقات کے مطابق ہی ڈیل کرتا ہوں۔“ اس کا انداز ہنوز تلخ تھا۔

”میں یہاں مزید رہنا نہیں چاہتی۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ اس کے لہجے میں بے چارگی تھی۔ شاہ ویز نے اس کی جانب دیکھا تھا۔

کاشن کے سادہ پنک سوٹ پر پنک اینڈ بلیک پرنٹڈ دوپٹہ لئے وہ براؤن بالوں کا سادہ سا جوڑا بنائے خاصی پُرکشش و معصوم لگ رہی تھی۔

چہرے پر اداسی و بے کلی نے عجیب سا نکھار پیدا کر دیا تھا۔ اس کی بے ارادہ اٹھائی گئی نگاہ کو یا آٹھی ہی رہ گئی تھی۔ بے ساختہ دیکھے گیا تھا۔

”دل..... اس دل کے کہنے پر چل کر بڑے بڑے دانش مند لوگوں نے اپنی حیات تباہ کر ڈالی، دل کی باتوں پر دھیان مت دیا کرو، دل مس گائیڈ کرتا ہے، ہمیشہ غلط سمت دکھا کر بھٹکا دیتا ہے۔ دماغ پرتو جد دیا کرو، اس کی سنا کرو۔“

”میں اب یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔“

”کہاں؟“

”جہاں سے ہم آئے تھے۔“

”وہ جگہ تمہارے لئے قید خانہ تھی۔“

”میری زندگی میں قید لکھ دی گئی ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں ماسوائے صبر کے؟“

دھیما لہجے، شائستہ انداز۔

جھکی نگاہیں، بنجیدہ چہرہ۔

یہ وہ لڑکی تو نہ تھی جس کی ہر جنبش سے حقیر جھلکتی تھی، جس کے لبوں سے لفظ انگارے بن کر نکلتے تھے۔

جو خود سری، خود پسندی و خود پرستی کا وجود تھی، حد درجہ مغرور و منہ پھٹ، کسی کو خاطر میں نہ لانے والی سرکش اور ضدی۔

بلکہ یہ لڑکی تو اس لڑکی کا عکس بھی نہ تھی۔ از حد معصوم و دلربا، بلیوں کی مانند نگلختہ و پھولوں کی طرح شاداب، اس کے حکم کی تابع۔

”تمہارا میرا معاہدہ ہوا تھا کہ تم وہی کرو گی جو میں چاہوں گا۔“ اس نے کتاب سینے پر اوندھی کر لی تھی اور نکیہ سیدھا کر کے لیٹ گیا تھا۔ وہ پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ تھا۔ اس کی نگاہیں محو بیت سے اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہوں؟“ اس کے اشارے پر وہ بیڈ کے کنارے پرکھ گئی تھی۔

”ہوں..... بہت کم بلکہ چیونٹی سے بھی کم رفتار ہے، ذرا تیز تیز حرکت کرو تو یہاں سے جانے کا موقع میسر ہو۔“

”جب تک ہم خود کو تہذیب کرنا نہیں چاہیں گے تو دنیا کی کوئی طاقت یہ امر انجام نہ دے پائے گی اور جب ہم خود کو بد لئے کا تہیہ کر لیں، ہمیں یقین ہو جائے کہ ہم میں کچھ باتیں غلط ہیں، ہمارے قدم درست سمت نہیں اٹھ رہے ہیں تو قدم واپس پلٹنے میں، راستہ بد لئے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ البتہ کچھ وقت ضرور لگتا ہے خود کو صیقل کرنے میں۔“ اور یہ کچھ وقت کتنے سالوں پر محیط ہوتا ہے..... ذرا وضاحت کریں گی؟“

”یہ انسان کی ول پاور اور اینٹیش فیئلنگز پر ڈپنڈ کرتا ہے۔“ اس کی شوخی کا جواب بھی اس نے بڑی بنجیدگی سے دیا تھا۔

”میں بھی یہاں بے جی سے دور رہنے میں کوئی سرت محسوس نہیں کر رہا۔ بے جی سے دور رہنا میرے لئے ایک کڑا امتحان ہے جس میں، میں کامیابی سے سرفرو ہونا چاہتا ہوں کہ میری یہاں تک آمدان کے حکم کی بجا آوری ہے۔ اپنی ذات کی نفی کے لئے میں سب کچھ کر سکتا ہوں مگر بے جی کی کوئی خواہش رد کرنے کا حوصلہ نہیں۔“

”ہاں محبتیں ہی انسان کو بہت سی حقیقتوں سے آشنا کرتی ہیں اور ہم کو بے حد خوب صورت و روشن منزل کا ادراک دیتی ہیں جن کا تصور بھی ہمیں نہیں ہوتا۔“

”آہ..... آہ! یہ کیا ہوا؟..... یہ کیا ہوا؟“ شاہ ویز اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر بری طرح کراہ رہا تھا۔

”کک..... کک..... کیا ہوا؟“ یکدم گھبرا کر وہ اس کی جانب بڑھی تھی اور فطرتی انداز میں اس کا سراپے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

”یہ تم ہی ہونا؟“ اپنے سر پر رکھے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ از حد بنجیدگی سے کویا ہوا تھا، بالکل نارمل انداز میں۔

”ہاں..... میں ہی ہوں۔ لیکن تمہیں ہوا کیا ہے؟“ اچانک اس کا کراہنا، پھر یکدم نارمل ہو جانا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ ہونق بینی سوال کر رہی تھی۔

”اتنی سمجھداری کی باتیں تم کر سکتی ہو..... مجھے یقین نہیں آ رہا۔ میں سمجھا شاید میرا دماغ چل گیا ہے۔“ وہ شوخ لہجے میں مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مشعل کے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اس وضاحت پر وہ مسکرا آٹھی خفیف انداز میں۔

”حسن بیگ صاحب کی زمینوں اور نش پاؤنڈز کے کچھ مسائل ہیں جن کو حل کرنے میں دو ہفتے لگیں گے، تب تک تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔“ اس کے مضبوط اور حدت سے پُر ہاتھوں میں اپنے ہاتھوں کو وہ ابھی ڈھنگ سے محسوس بھی نہ کر پائی تھی کہ اس نے بہت آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا تھا۔

وہ جو لمحے کے ہزارویں حصے میں خوش گمانیوں کے عروج پر مائل پرواز تھی، دھڑام سے پڑنے پرندے کی مانند زمین بوس ہوئی تھی۔

”کیا ہوا.....؟ ایک دم گم سم کیوں ہو گئی ہو..... طبیعت ٹھیک ہے؟“ شاہ ویز نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ لمحہ قبل مسکراتی مشعل یکدم مت بن گئی تھی۔

”کیا ہوا؟..... کیا ہو سکتا ہے مجھے؟..... یہ سوال تو انسانوں سے پوچھے جاتے ہیں جو احساس رکھتے ہیں، جذبات رکھتے ہیں یا ان سے پوچھا جاتا ہے جن کا کوئی اپنا ہوتا ہے، جن کا کسی کو خیال ہوتا ہے، جن کو کوئی بیار کرتا ہے، چاہتا ہے، اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اس کو اہمیت دیتا ہے۔ میرے لئے یہ سوال بے معنی و فضول ہے، کسی کو پروا ہے میری؟ کون چاہتا ہے مجھے؟ میری ضرورت کسی کو بھی نہیں ہے۔ میں صرف ایک موم کا وجود ہوں جس کو سب اپنی اپنی مرضی کے مطابق انشجو بنانا چاہتے ہیں بس۔“

ایک عرصے سے اندر رکھتی اداسی، مایوسی و بے بسی نے ایک لخت ہی صبر و ضبط کا دامن چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے رونے لگی تھی۔

شاہ ویز بالکل خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”پاپا نے مجھے مَر دوں سے بدتر سمجھ لیا، ایسا اپنی بیوہ تو مرنے والوں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ ان کی قبر پر بھی فاتحہ خوانی کے لئے کبھی کبھار اپنے چلتی ہی جاتے ہیں مگر مجھ زندہ کے ساتھ تو یہ بھی نہیں ہوا کہ ان گزرے سات آٹھ ماہ کے دوران پاپا نے غلطی سے ہی کال کر لی ہو۔ کبھی مجھ سے میرے متعلق پوچھا ہے کہ میں جوان سے ایک دن دور رہنا برداشت نہیں کرتی تھی، اب اتنا عرصہ ان کے بغیر کیسے رہ رہی ہوں یا جس کو انہوں نے اتنی امپورٹنس دی، جوان کی بیٹی سے بھی زیادہ ان کے لئے ویلیوڈ ہے، جس شخص سے وہ بہت زیادہ انسپازڈ ہیں وہ ان کی بیٹی کو وہ احترام، عزت، محبت و اہمیت دے رہا ہے جو ایک مسند اپنی وائف کو دیتا ہے۔“ وہ بولتے بولتے رورہی تھی۔

روتے روتے بول رہی تھی۔ شاہ ویز بہت خاموشی سے اس کی ہر بات بہ غور سن رہا تھا۔ اس دوران اس نے اسے خاموش کرنے یا جواباً کچھ کہنے کی کوشش قطعی نہیں کی اور مشعل تمام غبارِ دل آج نکال دینے کے درپے تھی۔

”میں نے اپنی تمام گزشتہ غلطیاں مان لیں، اقرار کر لیا کہ میں غلط تھی۔ حالانکہ اس کی میں ذمے دار نہیں تھی۔ انسان جس ماحول میں موو کرتا ہے اور جس انداز میں اس کی کیئرنگ ہوتی ہے، وہ وہی اپنا تا ہے جو اسے سکھایا جاتا ہے۔ میں جیسی تھی اس میں میری خطا نہیں تھی کیونکہ میری پرورش اسی انداز میں کی گئی تھی۔ اگر میری طرح تمہیں بھی یہی ماحول ملتا تو تم بھی میری طرح ہی ہوتے یا تمہاری طرح مجھے ماحول ملا ہوتا، پرورش کی گئی ہوتی تو آج میں بھی تمہاری طرح فخر و غرور سے اُڑی ہوئی ہوتی، ناز کرتی، اتراتی۔ مگر کسی کی زندگی خراب پھر بھی نہیں کرتی۔“ وہ دل کی بھڑاس نکال کر چپ چاپ آنسو بہانے لگی۔

”شکوے، شکایتیں، گلے اور اب یہ آنسوؤں کی برسات..... کیوں مجھ غریب کو ڈبو کر مارنا چاہتی ہو؟“ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا تھا۔ اس کا لہجہ ہی نہیں آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ لیکن دل میں وہ بھی یہ اعتراف کر رہا تھا کہ مشعل کی گستاخیاں، بدتمیزیاں، جاسوسی مگر حسن بیگ صاحب کا اسے بالکل نظر انداز کر دینا صریحاً غلط فیصلہ ہے۔ ہر انسان چاہت ہے کہ رگلوں سے زندگی کی رنگینی کشید کرتا ہے اگر زندگی میں محبت و الفت نہ ہو تو زندگی پھینک اور بے رنگ ہو جاتی ہے۔

جس طرح غذا، ہوا، پانی زندگی کی اشد ضرورت ہے اسی طرح محبت کے بغیر زندگی بھی نامکمل ہے۔ خواہ محبت کا تعلق خونی رشتوں سے ہو یا ازدواجی۔

”میں تنہائی چاہتی ہوں۔“ اس کی بے ریا مسکراہٹ اسے خود پر مٹھ محسوس ہوئی۔

”اوکے، پہلے اپنے آنسو صاف کرلو۔ کہیں ان سے گاؤں میں سیلاب آگیا تو پھر تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا بے چارے گاؤں والوں کی شامت آجائے گی۔“

”گاؤں والے کیوں..... میں خود ڈوب کر مرنا چاہتی ہوں۔“

”اگر ڈوبنے کو اتنا ہی دل چاہے تو میری آنکھوں میں ڈوب جاؤ۔“ وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بٹس کر بولا۔

جیلے رومانک تھے مگر انداز وہی مضحکہ اڑاتا ہوا۔ مشعل نے زخمی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا اور اپنے شانوں سے اس کے ہاتھ ہٹا کر ہاتھ روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔



دل کا دیا جلا کر ہواؤں میں رکھ دیا  
سورج دھک رہا تھا سو چھاؤں میں رکھ دیا  
دل جیتنا کسی کا بڑے فن کی بات ہے  
یہ فن خدا نے اس کی اداؤں میں رکھ دیا

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ خرم کی محبتوں میں شدتیں بڑھ رہی تھیں۔ وہ اس کا ایسے ہی خیال رکھ رہے تھے جیسے وہ گوشت پوست کی بنی لڑکی نہ ہو کوئی کالج کی بنی گڑیا ہو جس کو ایک معمولی سی شخص بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔

حرانے اتنی ناز و داریاں و چاہنیں کہاں دیکھی تھیں۔

احساسِ تشکر سے اس کی آنکھیں اکثر نم ہو جاتی تھیں جنہیں وہ خرم سے چھپ کر صاف کیا کرتی تھی۔ زندگی از حد پر سکون و حسین ہو گئی تھی۔

عرفان واپس چلا گیا تھا اور جاتے وقت ان سے مل کر نہیں گیا تھا اور اس نے قصدِ آخرم سے عرفان کی اس ناز و حرکت کا ذکر نہیں کیا تھا۔

خرم اسے آرام کی تلقین کر کے فتر گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ گزشتہ رات سے اسے درد کی شکایت تھی جس کو بہت ضبط سے برداشت کرتی رہی تھی کہ خرم کو ذرا بھی محسوس ہوا تو وہ فتر نہیں جائیں گے اور ڈاکٹروں کی فوج یہیں جمع کر لیں گے۔ ڈیوری میں ابھی اس کے کئی ماہ باقی تھے۔ ہر ماہ چیک اپ وہ باقاعدگی سے کروا رہی تھی۔ میڈیسنز بھی لے رہی تھی۔

ایسی تکلیفیں تو پریگنسی میں ہوا ہی کرتی ہیں۔ از حد صعوبتیں اٹھا کر عورت ماں کے مقدس و معتبر رشتے پر فائز ہوتی ہے۔ اس بات سے وہ آگاہ تھی اسی لئے نہیں چاہتی تھی کہ خرم پریشان ہوں۔

وہ میڈیسن لے کر لیٹی ہی تھی کہ امی حضور کمرے میں آئی تھیں جنہیں دیکھ کر وہ احترام مانا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ارے میں کہتی ہوں خرم کی عمر تو ہے ہی ٹھیکانے کی مگر تم کیا کرنے چلی ہو..... کچھ خیال ہے تمہیں یا بالکل ہی بد عقل ہو گئی ہو۔ جو خرم کی اپنے بچوں کے بچے کھلانے کی ہے، اس عمر میں تم اسے باپ بتا رہی ہو؟“

خرم کی موجودگی میں تو ان کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کمرے میں بھی قدم رکھ لیں، ایسی باتیں کہنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ خرم کی غیر موجودگی ان کو موقع فراہم کر گئی تھی اور وہ موقع سے مستفید ہونے کو وہاں فوراً پہنچ گئی تھیں۔

”امی حضور! اس میں میرا کیا دوش ہے۔ اولاد اللہ کی منشا سے ملتی ہے، اس کی بھی مرضی ہے تو ہم مجبور ہیں۔“ حرانے آہستگی سے کہا۔

”ارے واہ..... میں خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں تمہاری مجبوری کو۔ بچہ پیدا کرنا یا نہیں کرنا یہ عورت کی مرضی ہوتی ہے۔ اس میں مرد کا کیا دخل۔ ابھی بھی وقت ہے، زیادہ دن نہیں گزرے ہیں۔ اس مصیبت سے چھٹکارا پا سکتی ہو۔ دوا میں نے منگوائی ہے۔ چند کولیاں ہیں، ابھی کھالو۔ جان چھوٹ جائے گی۔“

وہ ہاتھ میں پکڑی کولیاں لے کر اس کی جانب بڑھی تھیں جس کا چہرہ ان کے عزائم جان کر سفید پڑ گیا تھا۔

”اللہ کے قدر و غضب سے خوفزدہ ہوں امی حضور! میں کس طرح اس بچے کا قتل اپنے سر لے سکتی ہوں جس کے وجود کی تکمیل بھی ابھی پوری نہیں ہوئی، جو دنیا میں آیا بھی نہیں۔ یہ قتل ہے، صریحاً قتل۔ جو اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

وہاں نہیں بنی تھی۔ ابھی صرف اس کی کوکھ آباد ہوئی تھی۔

کوئی ابھی سونی تھی۔

پھر بھی اس ان دیکھے گوشت کے لوتھڑے نے اس کے اندر مٹا و شفقت کی گرمی وڑپ پیدا کر دی تھی۔ ان کی بات اسے بری طرح تڑپا گئی تھی۔

وہ جو امی حضور کی ہمیشہ ہاں میں ہاں ملاتی آئی تھی، اس وقت اپنے بچے کے دفاع کی خاطر وہ ان کے روبرو تھی۔

”خوفزدہ مجھے نہیں تمہیں ہونے کی ضرورت ہے۔ جس بچے کی خاطر تم آج میرے منہ لگ رہی ہو وہ بچہ اگر دنیا میں آ بھی گیا تو بہت تباہی و بربادی لے کر آئے گا۔ کہیں آنے سے قبل ہی تمہارے آشیانے کو نہ اجاڑ دے۔“ ان کے انداز میں اتنی سفاکی اور نفرت تھی کہ جراثیم زہر کر رہ گئی۔

”خدا را امی حضور! آپ اگر دعا نہیں دے سکتیں تو بد دعا تو نہ دیں۔ میرا نہیں تو خرم کا خیال تو کریں۔ وہ آپ کے بیٹے ہیں۔“ وہ روہانے لہجے میں کویا ہوئی تھی۔ جواباً وہ منہ بنا کر کویا ہوئیں۔

”بیٹے کی محبت میں، اس کی عزت کے خیال سے ہی تمہیں مشورہ دے رہی ہوں ورنہ مجھے اس سے کیا سروکار۔ تم ایک یا ایک درجن بچوں کو جنم دو میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے اس سے بھلا۔ خرم نے اس عمر میں جگ ہنسانی کروائی تھی جواب باپ بنے چلا ہے۔“ وہ شاید یہ کہہ کر آئی تھیں کہ اسے زبان سے جہ کے لگا لگا کر تھال کر دیں گی۔

”خرم اس عمر میں باپ بن رہے ہیں تو یہ کوئی انوکھی و مضحکہ خیز بات نہیں ہے۔ کیا اس عمر میں لوگوں کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی؟ کیا آپ کے خاندان میں اس سے قبل ایسا نہیں ہوا؟ دور کیوں جاتی ہیں امی حضور! پچھلے ماہ ہی تو آپ کے بھائی کی سیکرٹری نے آپ کے بھائی کے ناجائز جڑواں بچوں کو جنم دیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے گھر میں جنگ کا ماحول ہے۔ وہ تو خرم سے بھی عمر میں بڑے ہیں اور ان کے بچوں کے بچے بھی جوان ہیں۔ خرم کے ساتھ یہ مسئلہ نہیں ہے۔ آپ بھائی کی ناجائز اولاد برداشت کر سکتی ہیں مگر بیٹے کی ناجائز اولاد نہیں۔ یہ کیسا تضاد اور منافقت ہے؟“

”ابھی ماں نہیں بنی، جب تیری یہ ڈھٹائی وہم و گہری ہے بعد میں تو ہمیں گھر سے بے دخل کر دے گی۔ تمام دولت و جائیداد ہزپ کر جائے گی۔“ امی حضور جو اپنے خاندان کے بارے میں ان کے منہ سے سن کر ششدر رہ گئی تھیں، شدید غصے سے کویا ہوئی تھیں۔

”نہیں چاہئے مجھے ایسی دولت و جائیداد جو خون کے رشتوں پر حاوی ہو جائے۔ یہ سب آپ ہی کو مبارک ہو۔ آپ ہمیں سکون سے جینے دیں۔“ وہ التجائیہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر بولی تو وہ چند منٹ اسے کینہ تو زنگہ ہوں سے گھورتی رہیں پھر کویا ہوئیں۔

”بہتر یہی ہے یہ کولیاں کھا کر قصہ پاک کر دو۔ ورنہ بچے کو جنم تو دو گی مگر کبھی دیکھ نہ سکو گی۔ یا درکھنا تم نے میرے بھائی، میرے خاندان کے لئے ناجائز لفظ استعمال کئے



ہیں، ایک بار شاید ناگن بدلہ لینا بھول جائے مگر میں نہیں بھولتی۔ ایسا ڈنکی ہوں کہ مرنے سے قبل تڑپے کا موقع بھی نہیں دیتی۔‘ خوفناک تیز، خطرناک انداز..... وہ اسے گھورتی ہوئی چلی گئیں اور وہ خوف سے پسینہ پسینہ ہو گئی۔ ایک عجیب سی گھبراہٹ اسے لاحق ہو گئی تھی۔



اس طرح	کا	جیون	میں	حادثہ	نہیں	ماتا
تم	تلک	پہنچنے	کا	واسطہ	نہیں	ماتا
آرزو	تو	ملتی	ہے	جستجو	نہیں	ملتی
منزلیں	تو	ملتی	ہیں	راستہ	نہیں	ماتا
روح	کی	زمینوں	پر	عجیب	عالم	ہے
درد	اور	تمنا	میں	فاصلہ	نہیں	ماتا
سوکار	لوگوں	کی،	بے	قرار	لوگوں	کی
زندگی	میں	کوئی	بھی	ضابطہ	نہیں	ماتا
اس طرح	بھی	ہو	جاتا	ہے	خراب	موسم
دور	کے	مسافر	سے	رابطہ	نہیں	ماتا

اس دن موسم خوش کوار ہو رہا تھا۔ ہوائیں پھولوں کی مہک ہر سو پھیلاتی گھوم رہی تھیں۔ وہ لان میں چلی آئی۔ شام دھیرے دھیرے ماحول کو جکڑ رہی تھی ہر طرف خواب ناک سا سناٹا بکھر رہا تھا۔ وہ وہاں رکھی چیز پر بیٹھ گئی اور اس نظروں سے اڑتے پرندوں کو دیکھنے لگی۔ تب ہی گیٹ سے شاہ ویز داخل ہوا۔ لائٹ گرین پینٹ پر بلیک شرٹ میں ملبوس تروتازہ اور از حد سرور سا۔

”ہیلو، کیا ہو رہا ہے؟“ وہ اس پر قدرے جھک کر بولا تو وہ بوکھلا کر اسے دیکھنے لگی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو..... کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟“

”بہت ناز ہے خود پر؟“ وہ سنجیدہ تھی۔

”ہونا بھی چاہئے..... آخر آل ایک حسین ترین لڑکی کا شریک سفر ہوں۔“ اس کا لہجہ شوخ تھا۔ وہ اٹھ کھڑی گئی۔

”مجھے ایسے بے ہودہ مذاق قطعی ناپسند ہیں۔“

”ارے میں کب مذاق کر رہا ہوں..... یہ حقیقت ہے۔ خواہاں پسندیدہ ہی سہی۔“

”آخر مجھے کب تک سزا ملتی رہے گی؟ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟ کیوں ہر وقت مجھے ٹیز کرتے رہتے ہو۔ میں تنگ آ گئی ہوں خود سے، اپنی زندگی سے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

”سوری..... آئی ایم ریلی سوری۔ تم اتنی نیرو مینڈ ڈ ہو جاؤ گی، مذاق بھی برداشت نہ کر سکو گی میں نے سوچا نہیں تھا۔“ وہ سخت پشیمانی کا شکار ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ جان بوجھ کر اس سے بیگانہ ولا تعلق رہتا تھا لیکن اب دیکھ رہا تھا وہ بتدریج خود کو بدل رہی تھی۔ وہ خود سری و خود پسندی، بد تمیزی و ہٹ دھرمی جو اس کی ذات کی شناخت تھی رفتہ رفتہ منہدم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ تیزی سے بہتری کی طرف بڑھ رہی تھی اور گزشتہ ایک ہفتے سے وہ محسوس کر رہا تھا بلکہ بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ بہت اُداس و دل گرفتہ رہنے لگی ہے۔ اکثر تنہائی میں اسے روتے دیکھا تھا۔ پہلے اس کے آنسو اسے ذرا بھی شرمندہ و متاسف نہ کرتے تھے مگر اب اسے ندامت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا ضمیر اسے تنگ کرنے لگا تھا۔

اس وقت بھی اس کی اداسی و آنسو اس کو مضطرب سے کر گئے تھے۔

”نہیں..... معافی تو مجھے مانگنی چاہئے۔ نا معلوم کیا ہو گیا ہے مجھے..... شاید میں پاگل ہو گئی ہوں، بلا وجہ بات بے بات آنسو آ جاتے ہیں۔“ دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو رگڑتی ہوئی وہ نام لہجے میں بولتی کچھ ایسی ہی دلکش لگی تھی کہ وہ اسے یک ٹک دیکھ گیا پھر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”تیار کرلو۔“

”کہاں چل رہے ہیں؟“ وہ بے حد اکیسا پینڈ تھی۔

”پاگل خانے۔“

”وہاٹ! یو آر جو کنگ؟“ وہ ایک دم مضطرب ہوئی تھی۔

”لیس..... مذاق ہی کر رہا ہوں۔ یہ تو میری ہمت ہے جو تمہیں برداشت کر رہا ہوں ورنہ پاگل خانے والے اتنے با حوصلہ و مستقل مزاج کہاں ہوں گے۔“ بظاہر سنجیدہ انداز میں اس کے شوخی جھلک رہی تھی۔

وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی تھی۔ ہر تصنع و بناوٹ سے پاک مسکراہٹ جو اس کے چہرے کو اس طرح ہی روشن کر گئی تھی جس طرح چاند کو چاندنی۔

ان کا مختصر سا سامان سیٹھنے میں رشیدہ و فریدہ نے بھر پور مدد کی۔ وہ خاندان ان کے جانے سے بہت اندر وہ تھا۔ وہ بھی ان کی محبت و خلوص سے متاثر ہوئی تھی اور اپنے کئی سوٹ، جیولری اور سینڈلز ان کو دی تھیں۔ بہت محبتوں کی چھاؤں میں وہ لوگ نکلے تھے۔ ڈرائیور انہیں کار میں ایئر پورٹ تک چھوڑنے آیا تھا۔



حسن بیگ کا بے جی سے کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا مگر ان کی ملنسار طبیعت و بے غرض مروت و ہنرمندی ان کا گرویدہ بنا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گاہے بگاہے ان کی طرف آ جایا کرتے تھے اور ان سے باتیں کر کے، مسئلے مسائل ڈسکس کر کے خاصے پرسکون ہو جاتے تھے۔

”بہن! آپ برا تو محسوس نہیں کرتیں کہ جب دل چاہتا ہے میں یہاں آ جاتا ہوں خواہ مخواہ آپ کا نام بردا کرنے۔“ اس ہفتے میں یہ ان کا ساتواں چکر تھا۔ یعنی پورے ہفتے ہی وہ یہاں آتے رہے تھے۔ وجہ ایک تو ان کے پاس رائفہ کی برآمد تھی جن کا ہر بار یہی مقصد ہوتا کہ وہ کسی طرح بھی انہیں شاہ ویز سے اس حد تک بدگمان و بدظن کر ڈالیں کہ وہ فوراً ہی مشعل کو اس سے طلاق دلا کر دوبارہ ان کے بچوں میں دے دیں۔

حسن صاحب، بہن کا اصل کردار نہ دیکھ چکے ہوتے تو یقیناً وہ ان کی لگائی گئی جھوٹ و فریب باتوں کی آگ میں کود پڑتے اور اپنے ساتھ مشعل کو بھی خاک کر ڈالتے مگر ان کے لگائے گئے زخموں سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ وہ تکلیف، وہ درد کس طرح وہ بھول سکتے تھے کہ محض ان کی خود غرضی، لالچ، مطلب پرستی، بد لحاظی و بے مروتی کے باعث انہوں نے اپنی لاڈلی، اکلوتی بیٹی کو ایسے چوروں کے انداز میں فقیروں کی طرح خالی ہاتھ رخصت کیا تھا اور پھر اس کی پُر خلوص طبیعت اور تباہ کن مالی حالت کو چھپانے کی خاطر اس سے بالکل ہی لالچ و اغوا کر رکھی تھی۔ اس بیٹی سے جس کی لمحے بھر کی جدائی انہیں کوارا نہ تھی۔ یہ کسی کی دعاؤں کا صلہ تھا یا ان کی قسمت کی خوبی کہ انہیں شاہ ویز جیسا ہونہار و محنتی داماد ملا تھا، جس نے دن رات کی محنت و لگن سے ان کے بزنس کی گرتی ہوئی ساکھ کو از سر نو بحال کیا تھا اور انہیں سر اٹھانے کا موقع فراہم کیا تھا۔ وہ اسے کس طرح چھوڑ سکتے تھے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ انہیں عزیز تر ہوتا جا رہا تھا۔

یہ علیحدہ بات تھی کہ مشعل کی محبت کو چاہت کو جس طرح انہوں نے دل میں دبا کر رکھا ہوا تھا، اس کی یاد میں موم کی طرح اندر ہی اندر پگھل رہے تھے اور رائفہ کی مشعل، مشعل کی گردان نے دوبارہ سے ان کے اندر بیٹی کی محبت کو بیدار کر دیا تھا۔ اب انہیں محسوس ہو رہا تھا ضبط کی طنائیں چھوٹ جائیں گی اور وہ مزید مشعل کی جدائی برداشت نہ کر پائیں گے۔ یہی احساسات وہ بے جی سے شہر کرنے آ جاتے تھے۔

”یہ کیسی بات کر ڈالی آپ نے بھائی صاحب! بھلا، بہنوں کو بھائی کی آمد بھی کبھی گراں گزرتی ہے۔ آپ کی آمد میرا مان بڑھا دیتی ہے۔“ بے جی اپنے مخصوص نرم و شفیق انداز میں ٹوگٹنگو تھیں۔ ان کا یہی انداز تو لوگوں کو بھی گرویدہ بنا دیتا تھا۔

”مہربانی..... میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوں کہ مشعل سے میں اب زیادہ دن دستبردار نہیں رہ سکتا، اس کی یاد ہر لمحہ مجھے آنے لگی ہے۔ خوابوں میں بھی وہ مجھے اداس، غمگین اور روتی ہوئی نظر آتی ہے، مجھ سے شکوہ کرتی ہوئی۔ میں بے حد ڈسٹرب ہو گیا ہوں۔“ ان کے لہجے میں دکھ اور تڑپ محسوس کر کے بے جی بھی اندر وہ ہو گئیں۔

”میں آپ کی محبت، آپ کی تکلیف سمجھ سکتی ہوں اور میرے خیال میں اب اللہ کی مہربانی سے آپ امتحان کے بھنور سے نکل آئے ہیں۔ مشعل کو آپ بلوائیں۔ وہ بہت بہتر ہو گئی ہے۔ ہر بات کو سمجھنے کی اہلیت رکھنے لگی ہے۔ شاہ ویز کا فون آیا تھا تو بتا رہا تھا کہ وہ وہاں سے مری جا رہا ہے اور آپ کہیں گے تو وہ مشعل بیٹی کو لے کر یہاں آ جائے گا۔“

”ہاں کل رات میری بات ہوئی تھی اس سے۔ وہ دونوں مری پہنچ گئے ہیں اور انہیں یہاں بلانے کا فیصلہ میں آپ کی مرضی کے مطابق کروں گا۔“

بہت بھاری ذمے داری انہوں نے ان کے شانوں پر ڈال دی تھی مگر جن کے دل اللہ کے خوف سے دھڑکتے ہوں اور وہ کسی سے کوئی کدورت و ذاتی پر خاش نہ رکھتے ہوں ان کے لئے کوئی فیصلہ مشکل نہیں ہوتا۔ انہوں نے بے خوشی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔



”اماں! پھر تم نے ان فریبی و مکار لوگوں کے ہاں چکر لگانے شروع کر دیے؟“ ساڑھ نے انہیں پانی کی بوتل اور کچھ دوسری چیزیں شاہ سے نکالتے دیکھ کر اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اری ٹو نہیں سدھریو کبھی بھی۔ یہ سب میں تیرے بھلے کو ہی کر رہی ہوں۔ آخر کب تک ایسا ہوتا رہے گا..... ہر بات کی کوئی حد بھی ہوتی ہے کہ نہیں۔ باقر کا یہ وطیرہ بن گیا ہے کہ یا تو اس کی مانو ورنہ یوں ہی در بدر پھرو۔“ وہ سامان اسے تنہا ہی چار پائی پر لیٹتے ہوئے خشکی سے گویا ہوئی تھیں۔

”یہ سب میرے نصیب میں لکھا ہے تو ہو رہا ہے۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبائی ہوئی گویا ہوئی۔

”ہر بات نصیب سے مت جوڑا کرو۔ کچھ تدبیریں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ تقدیر کو بدل کر رکھ دیتی ہیں۔ زندگی میں کچھ بھی بغیر جدوجہد کے نہیں ملتا، مثلاً کھانا ہمارے نصیب میں ہے مگر جب تک ہم اس کو تیار نہیں کریں گے نہیں کھا سکتے، جب تک کوشش نہیں کریں گے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکے گا“ انہوں نے مفصل جواب دیا تھا اسے مطمئن کرنے کے لئے۔

”میں تقدیر کو بھی مانتی ہوں اور تدبیر کو بھی اور یہ بھی کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب اوپر سے اشارہ ملتا ہے تو پھر کوئی دیر نہیں لگتی۔ ہر کام کو انجام دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ اس رب کے حکم کے بغیر تو کسی معمولی پتے کو بھی جنبش کرنے کی ہمت نہیں ہے۔“

”تو میں کب کچھ کہہ رہی ہوں۔“

”پھر یہ عالموں، باباؤں کے پاس چکر لگانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”تو بہ بھئی، کس قدر کوڑھ مغز لڑکی سے پالا پڑا ہے۔ ہیر پھیر کر پھر اسی بات پر آ جاتی ہے۔“ وہ غصے سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ”جن کے پاس میں جا رہی ہوں یہ کوئی چھوٹے موٹے بابا نہیں ہیں، بہت پختی ہوئی، ہستی ہیں۔ عام انسان نہیں ہیں وہ۔“ ان کے لہجے میں از حد ستائش و مرعوبیت تھی۔ سارہ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی جسے چھپانے کے لئے اسے رخ پھیرنا پڑا تھا۔ اپنے کمرے سے نکل کر اصغر بھی ان کے درمیان آ بیٹھا۔

”میں بھی تو سنوں اس خاص انسان میں ایسی کیا خوبیاں ہیں جنہوں نے ہماری اماں جیسی ذہین نطین عورت کو گرویدہ بنا ڈالا ہے؟“ وہ پُرشوق لہجے میں بولا۔

”ارے انہوں نے دوسری دنیا کی مخلوق کو تباہ میں کر رکھا ہے۔ جن، پری، جڑیل، ہمز اور نامعلوم کون کون سے مؤکلات ان کے تابع ہیں۔“

”ہا ہا..... اماں! ایسے عالموں اور باباؤں کے اشتہارات سے سنڈے میگزینز بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اعتقاد مت رکھا کریں، جو ایسی لمبی لمبی بڑی بڑی باتوں سے محض لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔“ اصغر سنجیدگی سے گویا ہو تو زرینہ کے ماتھے پر بنا کواری کی شکنیں پڑ گئیں۔

”ارے چپ رہو..... ایک، بہن کیا تم تھی جو بھائی بھی چلا ہے باتیں بنانے کو۔ اگر یہ چھوٹے ہوں تو لوگ کیوں جائیں، لوگوں کو کچھ ملتا ہے تو وہاں جاتے ہیں ورنہ کون کسی کو پوچھتا ہے اس دور میں۔“

”سب کچھ گنوا کر لوگوں کو عقل آتی ہے اور جب ان کی آنکھیں کھلتی ہیں تو سب کچھ لوٹ کر ایسے لوگ جنوں کی طرح ہی غائب ہو جاتے ہیں۔“ اصغر سنجیدگی سے ماں کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

”مجھ سے بحث ہی کرتے جاؤ گے یا بہن کو بسانے کی کوشش بھی کرو گے؟ کچھ احساس ہے تمہیں، سارہ کتنے عرصے سے گھر آ کر بیٹھی ہوئی ہے۔ اسے گھر بھیجنا ہے کہ نہیں؟ یہ سب میں اس کی خاطر ہی کر رہی ہوں۔ تمہیں اس کی فکر نہ سہی مجھے بڑی فکر ہے۔“

اب ان کے لہجے میں تفکر و اندر دگی تھی۔

”اماں! سارہ مجھ پر کوئی بار نہیں ہے، نہ ہی آپ اس کو بوجھ سمجھیں۔ شادی سے پہلے بھی وہ اس گھر کی بیٹی تھی، میری، بہن تھی اور اب شادی کے بعد بھی اس کا مجھ سے اور اس گھر سے رشتہ نہ ٹوٹا ہے اور نہ ٹوٹے گا۔ باقر نے اسے خود بھیجا تھا یہ اپنی مرضی سے نہیں آئی ہے اور اب یہ بھی جائے گی جب باقر خود یہاں اسے لینے آئیں گے۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنایا۔

سارہ بھی اصغر کے فیصلے سے مطمئن تھی۔

”ہاں اماں! بھیا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے بھائی کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

سارہ کی بات پر انہوں نے دونوں کو گھور کر دیکھا اور بولیں۔

”اس کی بیوی آج میکے گئی ہوئی ہے تو اس کو، بہن اور ماں کی یاد آئی ہے۔ کل اس کے آتے ہی سب بھول جائے گا۔ تمہاری خیر خواہ صرف ماں ہی ہو سکتی ہے۔“

□●□

”ارے..... آپ!..... آپ یہاں.....؟“ بالکل غیر متوقع طور پر فرح کو سامنے موجود دیکھ کر حرا حیرت و سرت سے گنگ رہ گئی تھی۔

”ہاں میں، میری جان!“ انہوں نے لپک کر اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ بے حد خوشی سے ان کا چہرہ بھی گل رنگ ہو رہا تھا۔

کافی دیر تک وہ ایک دوسرے سے لپٹی بے تحاشہ مسرت کے احساس سے سرشار آنسو بہاتی رہیں۔ مسکراہٹوں اور آنسوؤں کی عجب مگر خوب صورت برسات تھی۔

”یہاں بیٹھو آرام سے..... کیسا لگا سر پر آ؟“ فرح حرا کو بیڈ پر بٹھاتے ہوئے مسکرا کر گویا ہوئیں اور خود بھی اس کے نزدیک بیٹھ گئیں۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا ابھی تک، یہ سب خواب یا آنکھوں کا دھوکا محسوس ہو رہا ہے۔ لیکن یہ خواب ہے تو خدا کرے میری آنکھ کبھی نہ کھلے۔“

”آجائے گا یقیناً بھی۔ جب رات دن تمہارے سر پر سوار رہوں گی تو خود دعا مانگو گی کہ یہ خواب ہوتا کہ جلد از جلد آنکھیں کھول سکو۔“

”مرتے دم تک میں آپ! آپ سے بیزار نہیں ہو سکتی۔“

”لگی، ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے..... میں مذاق کر رہی تھی۔“ فرح جذبات سے انہوں نے بہن کو گلے سے لگالیا۔ اسی لمحے خرم اندر داخل ہو کر بولے۔

”میں نے کھانا لگوادیا ہے۔ پہلے طعام کر لیجئے پھر سارا وقت آپ کے لئے ہی وقف ہے۔ خوب باتیں کیجئے گا۔“ خرم خوش مزاجی سے گویا ہوئے۔

”آپ گھبراہٹ میں خرم صاحب! صرف آج کی رات میں حراسے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں، پھر کل سے دن ہی میرے لئے وقف ہوا کرے گا۔“ فرح کی پُرشور وضاحت پر خرم بے ساختہ مسکرائے تھے۔ حرا جھینپ گئی تھی۔

”آپ! آپ! آپ! کیلی ہی آئی ہیں..... دولہا بھائی کہاں ہیں؟“

”میں تنہا ہی آئی ہوں۔ منصور پاکستان گئے ہیں وہ دہائی سے بزنس وائنڈ اپ کر رہے ہیں تو بہت مصروفیات ہیں۔ تمہاری خوش خبری کا سنا تو مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے چند ہفتوں کا پروگرام ترتیب دے ڈالا۔“

”آپ نے مجھے بالکل لاعلم رکھا، ہر بات سے با علم ہونے کے باوجود۔“

کھانے کے کمرے میں فرح، امی حضور سے ملنے لگی تو وہ موقع پاتے ہی مخاطب ہوئی۔

”اگر بتا دیتا تو تمہارے چہرے پر ایسی خوشیوں کی چمکتی روشنی کس طرح دیکھتا۔ میری خواہش ہے تمام عالم کی سرتیں تمہارے وجود میں مادیوں۔“

جاں نثار اور بھرپور چاہت دینے والے شوہر کی رفاقت حرا کو مغرور کر گئی۔

”امی حضور! یہ فرح ہیں، حرا کی بڑی بہن۔ دہائی سے آئی ہیں۔ ان کے ماموں ممانی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب یہ ہمیں ٹھہریں گی۔“ خرم نے سپاٹ لہجے میں تعارف کروایا تھا۔

”ہاں، ہاں..... کیوں نہیں..... شوق سے رہیں..... یہ ان کا اپنا گھر ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ بہو کی ایسی حالت میں ان کا بھی کوئی عزیز قریب ہوگا۔ پہلی زچگی ہے، بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب مجھ بڑھیا سے اپنا دھیان نہیں رکھا جاتا تو اس معصوم کا کیسے رکھوں گی۔ صرف دعا ہی کر سکتی ہوں۔“ بیٹے کو سامنے دیکھ کر امی حضور بھی ہنسی جاری تھیں۔

ان کے انداز سے چالپوسی و خوشامد جھلک رہی تھی۔ ان کے چہرے سے ذرا بھی تو محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کل ہی اسے کس بری طرح اپنی کوکھ اجاڑنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اس سے ان کے چہرے پر کس قدر سفاکی، درشنی و خنثی تھی جیسے وہ چہرہ کسی جلا دکا ہو۔

حرا کے اندر ایک تنفر سا اٹھایا سوچ کر کہ یقیناً ان میں کچھ ایسی ہی ناپسندیدہ صفات ہوں گی جن کی بناء پر ان کا رگامیٹا انہیں ایک حد میں رکھتا ہے۔ اس سے قبل اس نے کتنی سعی کی تھی کہ ان ماں بیٹے کو قریب لے آئے۔ ان کے درمیان بیگانگی و لاتعلقی کی دیوار کو منہدم کر ڈالے۔ مگر خرم نے ذرا بھی تعاون نہ کیا تھا اور بہت سرعت سے خود ان کا رویہ بھی ایسا بدلایا تھا کہ وہ آج ان کا روپ دیکھ کر سخت متنفرد و برگشتہ ہو گئی تھی۔

□●□

مری کے خوب صورت مرغزاروں اور گرتے آبشاروں کے دلاویز ماحول میں بھی اس کی بے چینی و کسمندی کم نہ ہوئی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی سی بے مقصد کسی بھٹکی ہوئی روح کی مانند ٹول کے کمرے یا بیئرس پر گھومتی رہتی تھی۔

اس دن بھی وہ بلا مقصد کھڑکی سے باہر خلاؤں کو گھور رہی تھی کہ شاہ ویز نے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑی تھی۔

”آج دوسرا دن ہے ہمیں یہاں آئے ہوئے اور تم ابھی تک کمرے میں بند ہو کر بیٹھی ہوئی ہو۔ گاؤں میں شور کر رہی تھیں کہ وہاں سے چلو، جگہ چھینج کرو اور یہاں آ کر بھی تمہاری وہی روٹین ہے۔“ وہ چیخ کر بیٹھتا ہوا گویا تھا۔

”مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“ اس نے ایک لمحہ جگہ اس پر ڈال کر جھکاتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بوریت دور کرنے کے لئے۔“

”کیا تمہیں میری اتنی پرواہ ہے؟ احساس ہے میری بوریت و تنہائی کا کیا مجھ پر ترس کھا رہے ہو؟“ اس کا لہجہ اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ و خلفشار کا غماز تھا۔

”پرواہ ہے، تب ہی تو تمہیں سب کام چھوڑ کر یہاں لے کر آیا ہوں۔“

مشعل کے لبوں پر مجروح مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ شاہ ویز کے لفظ ایسے ہی تھے جیسے کانغذی پھول مہک و تازگی سے محروم ہوتے ہیں۔

”کہاں چلیں؟“ وہ سرد آہ بھر کر مخاطب ہوئی تھی۔

”پہلے کسی بوتیک سے ڈریسز خریدیں گے۔ کیونکہ تم اپنے تمام ملبوسات خاصی فیاضی سے رشیدہ، فریدہ کوڈے کرا گئی ہو۔ آج سارا دن ہم شاپنگ کریں گے، رات چائیز ڈنر ہوگا پھر کل کا پروگرام ترتیب دیں گے۔“

وہ اس سے اسی طرح مخاطب تھا جیسے کسی بچے کو بہلا رہا ہو۔

دوسرے دن وہ دونوں گھومنے کے لئے نکل گئے تھے۔

ویلوٹ کی ڈارک بلیو قمیض، سلک کے کولڈزن تنگ پا جاسے وکولڈزن سلک کے بڑے سے دوپٹے میں بلیو اسٹون کی نازک سی جیولری پہنے وہ خاصی پُرکشش لگ رہی تھی۔ ہونٹوں پر ڈارک پنک لپ اسٹک نے چہرے کو آؤپز ی بنی تھی۔ بال اس نے برش کر کے ایسے ہی چھوڑ دیئے تھے۔

بلیک کوٹ سوٹ میں شاہوہ بھی آج عام دنوں سے زیادہ نکھر نکھر خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کافی دور نکل آئے تھے۔ آسمان پر سفید و سرمئی بادل محو گردش تھے۔ زمین پر برف بھی ہوئی تھی۔ ماحول میں تازگی و ٹھنڈک تھی۔

”آگے راستہ بلاک ہے..... کافی پیدل چلنا پڑے گا۔ رات برف باری خاصی ہوئی ہے۔“ شاہوہ نے واپس آنے والے لوگوں سے معلومات لے کر اسے بتایا۔

”واپس ہوٹل چلتے ہیں۔ ہمیں کسی خاص جگہ ٹو نہیں جانا۔“

”میں تمہاری بوریت دور کرنے لایا ہوں، ہوٹل کے کمرے میں بند کرنے نہیں۔“ اس نے پہلی استحقاق بھری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

برف باری کے شوقین لوگ شوخ رنگ ملبوسات میں سفید برف پر ادھر ادھر نکھرنے لگے تھے۔ ان لوگوں میں زیادہ تر نو بیاہتا جوڑے تھے۔

مشعل اس کی نگاہوں سے بے خبر قریب سے گزرتے ہوئے ایک کپل کود کھ رہی تھی۔ لڑکی کا فیروزی بھڑکیلا لباس جھلملا رہا تھا۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز اپنے ساتھی کی بانہوں میں چلتی ہوئی از حد سرور و مفرور دکھائی دے رہی تھی۔ مرد کے چہرے پر بھی سرشاری و والہانہ محبت کے رنگ تھے۔ دونوں آسودہ تھے۔

”کیا سوچ رہی ہو..... یہ ہنسی مون پوائنٹ ہے، یہاں پر اس سے بڑھ کر بھارے ملیں گے۔“ وہ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں شوخی سے بولا۔

”میرے خیال میں ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ موسم بدل رہا ہے۔ ہوٹل بھی یہاں سے کافی فاصلے پر ہے اور بالوں کود کھ کر لگ رہا ہے کہ برف باری کبھی بھی شروع ہو سکتی ہے۔“ وہ خفیف انداز میں بالوں کی طرف دیکھ کر کوہا ہوئی جہاں تیزی سے گہرے سرمئی بادل جمع ہو رہے تھے۔ سفید بالوں کا نام و نشان نہ تھا۔

”تو کیا ہوا؟ ہم یہاں انجوائے کرنے آئے ہیں۔ اور پھر برف باری کا موسم بار بار دیکھنے کی سعادت کہاں نصیب ہوتی ہے۔“

اونچے اونچے درخت، پھول، پتے، مکانوں کی چھتیں سب برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ہر سو مقدس چاندنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ برف سے ڈھکی میزھیوں پر احتیاط سے پاؤں جما جھا کر ریٹنگ کے سہارے اوپر چڑھ رہی تھی تاکہ پیل کے اس پار بننے کا کافی ہاؤس میں پہنچ سکیں۔

ان کے ساتھ اور بھی کپلوں تھے، ہنستے مسکراتے، ایک دوسرے کی بانہوں کا سہارا لئے، ارد گرد سے بے گناہ اپنے آپ میں مگن چل رہے تھے۔

محبت ایک نشہ ہے..... جو اس کے جام نوش کرتے ہیں وہ اسی طرح ارد گرد سے بے گناہ، محبوب کی چاہت میں مگم رہتے ہیں۔ وہ سب بھی تو محبت کے نشے میں مگم تھے۔ ان کے ہر سو محبوب کی چاہتیں تھیں، وہ تھے اور باقی کچھ نہ تھا۔

ہمارے درمیان بھی تو یہی رشتہ ہے..... ہم ایک دوسرے کے لائف پارٹنر ہیں..... ہمارے درمیان بھی تو ایسا مضبوط و قوی رشتہ بندھا ہے مگر تعلق نہ بندھ سکا۔

تعلقات کی نوعیت بھی تو رشتوں سے مربوط جذبات و احساسات سے اٹچھڑ ہوتی ہے۔ ہمارے درمیان صرف بندھن ہے۔ نہ نازک جذبوں کی مہکار ہے نہ کوئل کوئل احساسات کی دلربائی ہے جو محبت و چاہت کے پھول کھلا دے۔

اس نے دزدیدہ نگاہوں سے ساتھ چلتے ہوئے بے نیاز انداز میں کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، شاہوہ کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

بہ ظاہر یہ فاصلہ چند قدموں کا تھا مگر وہ جانتی تھی اس کو عبور کرنے میں شاید صدیوں کا سفر درکار ہو۔

عجیب تضاد ہے وقت کا بھی۔ جس منصب پر آج ہم فائز ہوتے ہیں کل اس منصب پر ہمارا مقابلہ براجمان ہو جاتا ہے اور جانے انجانے میں ہم سے ہونے والی گستاخیاں، زیادتیاں و کج ادائیگوں کا سود سمیت بدلہ لیتا ہے اور اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں۔

کل تک میں جن جذبوں سے بے خبر اپنی انا و ضد کی قید میں تھی، اس کا شکار آج شاہوہ ہے۔ وہ کسی طرح مجھے معاف کرنے کو تیار نہیں اور میں اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

بڑی انمول زندگی تھی

ٹوٹنے بے مول بنا ڈالی

اس چاہت کے دھوکے میں

ہم نے جند جان گواڈالی

”کتنی دور اور چلنا ہے؟“ جیسے جیسے وہ اوپر بڑھ رہے تھے سردی بڑھنے لگی تھی۔ ہوائیں خشک ہوتی جا رہی تھیں۔

”اوہ..... اتنی اوپر جانے کی کیا ضرورت ہے..... ہم ہوٹل واپس چلتے ہیں۔“

”ذرا سا ہی تو فاصلہ رہ گیا ہے۔ وہاں کی کافی سنا ہے بہت مزے دار ہوتی ہے اور وہاں سے مری کا بھار بڑا خوب صورت و دلکش نظر آتا ہے۔“ وہ اس کے قریب آ کر چلتے ہوئے بولا۔

”خوب صورتی و دلکشی!..... تمہیں بھی کوئی خوب صورتی و دلکشی اٹریکٹ کر سکتی ہے؟“ اس نے چلتی ہوئی نگاہیں اٹھا کر پوچھا تھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں..... قدرت کی بنائی ہوئی ہر خوب صورت شے سے مجھے عشق ہے۔“ اس نے کوٹ اتار کر اس کے شانے پر ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟“ اس کی اس اپنائیت نے اس کے اندر خوش گمانیوں کے غنچے کھلا دیئے تھے۔

”تمہاری طرح کانچ سے نہیں بنا ہوا، فولاد سے بنا ہوا ہوں۔“

”شاہوہ! کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے کبھی؟“

”محبت ایک بے اختیاری جذبہ ہے اور مجھ پر بھی یہ حاوی ہو چکا ہے۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں کوہا ہوا تھا۔

”اوہ ریلی؟“ مشعل نے بے یقینی سے استفسار کیا تو شاہوہ مسکرا اٹھا۔

”تمہارے علاوہ کسی اور سے محبت ہو سکتی ہے؟“ اس نے آگے بڑھ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

مشعل نے مسکراتی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا اور ایک آسودہ مسکراہٹ اس کے اندر تنک اتر گئی۔ وہ تھا مانا چاہتی تھی ان غیر متوقع لمحوں کو جو شاید قدرت نے اس کے دامن میں ڈال دیئے تھے۔ ایک مدہوش کر دینے والی خوشبو تھی جو اس کی رگ و پے میں سا گئی تھی۔

ایک سرشاری

ایک خوش کن سحر انگیز کیفیت سے وہ دوچار تھی۔

وہ ہوٹل کے کافی ٹیبل میں پہنچے تو زیادہ تر ٹیبلوریز رو تھیں۔ وہ ویٹر کی رہنمائی میں اس ٹیبل کی طرف بڑھے تھے جو کھڑکی کے قریب تھی۔ اندر مہکے مہکے ہنگامے اور معطر فضا میں احساس کو بالیدگی بخشنے والا نرم گرم ماحول بڑا اظریب لگ رہا تھا۔

وہ چیئر پر بیٹھ چکے تھے۔ مشعل نے شاہوہ کو کاکوٹ جو بڑی چاہ سے اس نے اس کے شانوں پر ڈالا تھا، اتار کر چیئر کی بیک پر ڈال دیا تھا۔ پھر اس نے جھک کر سینڈل پاؤں سے اتارے ہٹو بکس سے نشوونکال کر بھیگے پاؤں صاف کرنے لگی۔

شاہوہ شیشوں کے پار دیکھ رہا تھا جہاں ہر سو روئی کی مانند برف کے گالے مستی میں رقص کرتے ہوئے زمین بوس ہو رہے تھے۔

فضا پر ایک خواب ناک اندھیرا سما محیط تھا جس سے ماحول دھندلا دھندلا سا لگ رہا تھا۔ اس کے اندر عجیب سا مہر اب ہلکنے لگا۔

حیات کی بے ثباتی و بے مقصد گزرنے والے دن و رات کا تسلسل اس کے اندر کے سونے ہوئے مرد کو بیدار کرنے لگا کہ اس کی زندگی کا، اس بھاگ دوڑ کا حاصل کیا ہے؟ وہ بے جی سے دور ہے اور ان کے حکم کی بجا آوری کی خاطر ہی وہ کھ پتلی کی مانند کام کر رہا ہے۔ پہلے ان کی صلاح پر اسے لے کر گاؤں گیا کہ وہ چاہتی تھیں مشعل کو کھلی فضا اور آزادی نصیب ہو، حسن بیگ کے زرعی مسائل تھے وہ نمٹانے میں اسے وہاں چند ہفتے لگے تھے اور جب کام مکمل ہو گیا تو حسن بیگ کی طرف سے پیغام ملا کہ شمالی علاقہ

جات کی طرف نکل جاؤ۔ کچھ دن وہاں گزار کر رچی لوٹ آنا۔

ان کی بات وہ نال دیتا اگر اس کا خود کادل چند دن آرام و سکون کی طلب نہ کرتا۔ وہ اسی ارادے سے یہاں آیا تھا کہ کچھ دن اس طرف گزارے۔ وہ اپنی زندگی کا تجدیدگی سے لائحہ عمل طے کرے گا کہ اس طرح زندگی کیونکر گزر سکتی ہے۔ گھر اور گھریلو زندگی کی آرزو اسے محسوس ہونے لگی تھی۔

بظاہر وہ ایک شادی شدہ شخص تھا۔

ایک از حد حسین و طہر دار لڑکی اس کی شریک سفر بن چکی تھی لیکن ان دونوں نے ہی اس بندھن کو اول روز سے قبول نہ کیا تھا۔

وہ اپنے حسن، امارات و اسٹیٹس کے زعم میں مبتلا تھی۔

وہ اپنی خودداری، حمیت و شرافت کے خول میں مقید تھا۔

جہاں رشتوں میں محبت، خلوص، ایک دوسرے کا احترام و اہمیت شامل نہ ہو وہاں ایسے رشتے اسی طرح ٹوٹتے ہیں جیسے ریت کے گھر وندوں کو صرف ایک لہر منہدم کر کے

ان کا وجود منڈا ڈالتی ہے اور ان کے درمیان بھی یہ نام نہاد رشتہ کب کا ٹوٹ چکا ہوتا اگر اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ، قوت برداشت میں ٹھوس پن، اخلاق و درگزر کی عادت بچتہ نہ ہوتی یا بے جی جی فرشتہ صفت ماں کی تربیت و رہنمائی حاصل نہ ہوتی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں جو ذلت و خواری مشعل کے رویوں نے اسے بخشی تھی، وہ لاکھ بھلانے کی سعی کر چکا تھا مگر جیسے کوئی پھانس سی اس کے اندر جھپتی رہتی تھی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے انسان بڑی سے بڑی تکلیف بھول جاتا ہے اور بے رحم معمولی سازشم اکثر و بیشتر درد جگائے رکھتا ہے۔

اسی طرح وہ اپنی ذات پر توڑے گئے اس کے تمام ظلم و ستم بھول گیا تھا مگر بے جی کے ساتھ اس کا روارکھا جانے والا، اس کا نہایت گھٹیا و حقیر اندوہانت و فخرت سے لبریز رویہ نہ بھولتا تھا۔

چند مناظر اس کی گستاخی و بدتمیزی کے وہ ملاحظہ کر چکا تھا اور باقی گھر میں کام کرنے والی چوکیدار کی بیوی نے اس کے گوش گزار کئے تھے۔ بے جی کی تذلیل اسے اپنی ذاتی اہانت سے زیادہ گراں ثابت ہوئی اور وہ اس کے دل سے اس طرح علیحدہ ہوئی کہ کوئی ورق کتاب ہستی سے جدا ہو کر بے وقعت و ناقابل اعتناء ہو جاتا ہے۔ وقت کبھی یکساں نہیں رہتا، تعمیرات ہر شے کو بدل ڈالتے ہیں۔

کبھی راتیں طویل، دن مختصر ہو جاتے ہیں۔

کبھی صبحیں سہانی اور شامیں آداس دکھائی دیتی ہیں۔

کبھی سورج کی شعاعیں جسم و جاں کو جھلسا ڈالتی ہیں۔

کبھی نیلے آفتاب پر چاند کی چاندنی کی فسون خیزی تن من کو سر و محسوس ہونے لگتی ہے۔ صبح و شام، رات دن، چاند سورج، ہوا، بادل گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اپنا آپ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ پھر انسان جو بالکل بے اختیار ہو بے بس نہیں ہے اس پر بھی ان تبدیلیوں کا بھرپور اثر ہوتا ہے۔ بدلتا وقت، تبدیل ہوتی حیات انسان کو بدل دیتی ہے۔ ناپسندیدہ لوگ پسندیدہ بن جاتے ہیں، ناپسندیدہ رشتے پائیدار رشتے بن گتے ہیں۔ اس طرح مشعل میں بھی نمایاں تبدیلی آئی تھی۔

وہ از حد بدل گئی تھی۔

اسے چاہئے لگی تھی، اس سے وابستہ رشتے کی نزاکت کو سمجھنے لگی تھی اور اس سے بھی اسی رد عمل کی تقاضی تھی۔

وہ مجبور تھا۔

اس کی چاہت کا جواب چاہت سے نہیں، مروت سے دے سکتا تھا۔ وہ فراخ دل تھا مگر اس کے معاملے میں از حد تنگ نظر و تنگ دل بن گیا تھا۔ اسے یہ سب وقتی جذباتیت محسوس ہوتی تھی۔ شاید ذہن کے کسی مخفی زاویے میں یہ خیال، یہ حقیقت کسی سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا کہ وہ اس کی سیکنڈ چوائس ہے یا وقتی، بھلاؤ اور جذباتیت ہے جو اتنے عرصے ساتھ رہنے سے محسوس ہوئی ہے جو وہ اپنے ماحول میں جا کر بھول جائے گی جس کو وہ محبت کا نام دے رہی ہے۔

اس کی پہلی محبت، پہلی چوائس جو جو عرف جو اد احمد ہے اور یہ دنیا کول ہے۔ انسان جس مقام سے قدم آگے بڑھتا ہے، واپس اسی پر آ کر کرتا ہے۔ اور وہ بھی آج نہیں تو کل جو جو کی طرف لوٹ جائے گی۔

خیالات کا لامتناہی سلسلہ تھا جو اسے سمندر جیسی عمیق گہرائیوں میں غرق کئے ہوئے تھا اور وہ موجود ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہ تھا۔

”کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ مشعل نے چیخ بجا کر اسے خیالوں کی دنیا سے کھینچ نکالا۔ وہ خفیف انداز میں ٹیبل کی جانب متوجہ ہوا جہاں ویٹر کافی کے برتن، کافی اور سینڈویچز کی پلیٹس لگا کر جا چکا تھا۔



ایسی حضور نے دے دے قدموں سے چلتے ہوئے بیرونی برآمدہ عبور کیا تھا اور ہر طرف سے اطمینان کرنے کے بعد لابی میں رکھے فون کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ پھر فون کو ہاتھ لگانے سے قبل ان کے ذہن میں وسوسہ جاگ اٹھا تو وہ دوبارہ دے دے قدموں سے حرا کے بیڈروم کی طرف بڑھی تھیں اور نہایت احتیاط سے کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو حرا کو بدستور محو خواب دیکھ کر پھر لابی میں آئی تھیں۔ اندر سے دروازہ بند کر کے فون کی جانب بڑھی تھیں۔

”میلو عرفان! میں تمہاری گریڈ مڈر بول رہی ہوں۔“ کال ٹل جانے پر ریسپورمنس سے لگائے مخاطب ہوئی تھیں۔

”خیر یہ ہی تو نہیں ہے..... تم جلد سے جلد نڈا کو لے کر یہاں پہنچو۔ تمہاری سوتیلی ماں نے تمہاری دولت و جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے ایک وارث کو پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس منصوبے میں تمہارا باپ براہم کا شریک ہے۔“ ان کے لہجے کی نفرت و صداوت سے بڑھ کر دوسری جانب سے اظہار ہوا تھا۔

”وہاں بیٹھے بیٹھے غصہ دکھانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر کچھ لینا ہے تو فوراً پہنچ جاؤ۔ حرا کی بڑی بہن فرح دہی سے آئی ہوئی ہے اور وہ بہت تیز اور چالاک عورت ہے۔ خرم نے پورے گھر کا انتظام اس کے سپرد کر رکھا ہے اور نہ جانے اندر ہی اندر ان لوگوں میں کیا کچھڑی پک رہی ہے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہیں جانے کی تیاری کر رہے ہیں یہ لوگ..... نہیں، نہیں، دولت و جائیداد لے کر کیسے فرار ہو سکتے ہیں۔ اپنی آنکھیں اور کان ہر وقت کھلے رکھتی ہوں۔“ دوسری طرف سے تشویش بھرے لہجے پر وہ اعتماد سے گویا ہوئی تھیں۔

”بہت کوشش کرتی ہوں کان لگا کر ان کی باتیں سننے کی مگر سماعت کی کم زوری کے باعث صاف سن نہیں پاتی۔ بس تم دونوں بہن بھائی جلد از جلد یہاں پہنچو۔ میں روز روز فون نہیں کر سکتی۔ آج بھی وہ ”چالاکو“ کہیں گئی ہے خرم کے ساتھ اور وہ ”مکارن“ اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔ ملازمائیں بھی کوارٹرز میں ہیں تو موقع دیکھ کر میں بات کر رہی ہوں۔ تم لوگ فوراً پہنچو۔“

پورچ میں کاررکنے کی آوازیں کرانہوں نے گھبرا کر عرفان کو تاکید کی اور فون بند کر کے دروازہ کھول کر باہر نکلتا ہی چاہتی تھیں کہ قریب آتی جوتوں کی آوازیں انہیں دروازے کے پیچھے رکنے پر مجبور کر گئیں۔

وہ لابی سے ملحقہ بیڈروم میں رکھے صوفے پر براجمان ہو گئے تھے جب کہ سینڈل کی ٹک ٹک آگے جا کر معدوم ہو گئی۔ پھر چند لمحے بعد دوبارہ ٹک ٹک کی آواز ابھری تھی اور قریب آ کر رک گئی تھی۔

”حرا ابھی سو رہی ہے۔“ یہ فرح کی آواز تھی۔

”اچھا ہے..... میں بھی یہی چاہتا ہوں وہ زیادہ سے زیادہ آرام کرے۔“

”آج حرا کی پاکستان جانے کی تمام کارروائی مکمل ہو گئی ہے، چند دن میں ویزا مل جائے گا تو ٹکٹ ریز روکروالیں گے۔ مگر میں چاہتی ہوں اگر آپ ایک مرتبہ پھر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں تو بہتر ہوگا۔“ فرح کا لہجہ تنجید کی فکر مندی سے لبریز تھا جب کہ دروازے کے پیچھے کھڑی امی حضور اس انکشاف پر دنگ رہ گئی تھیں۔

”میں نے بے حد سوچ کر فیصلہ کیا ہے اور رزلٹ یہی آیا ہے کہ حرا اور اپنے آنے والے بچے کو اس ماحول، اس جگہ اور ان لوگوں سے دور ہی رکھنا چاہئے اور اس فیصلے کا یہ مقصد نہیں کہ میں کسی سے خوف زدہ ہوں یا کسی کے پریشر اڈز کئے جانے کے خوف سے یہ سب کر رہا ہوں، نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ڈرنے اور ڈرانے والا بندہ ہرگز نہیں ہوں۔ دراصل.....“ وہ چند لمحے توقف سے گویا ہوئے۔ ”ایک عجیب سی کیفیت ہے میرے اندر جس کو میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ میرا ادراک، میری سمجھ سائنس کہتی ہے آنے والا وقت سازگار نہیں ہے۔ نہ معلوم کیا ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں حرا اور بچہ آزاد فضا، آزاد ماحول میں رہیں۔ ڈیوری میں ابھی کئی ماہ باقی ہیں۔ تب تک میں بھی بزنس و انڈیاپ کر کے وہیں آ جاؤں گا۔“ خرم کے لہجے میں خوشی و مضطرب کے ملے جلے رنگ تھے۔

فرح بہن کے بخت پرنازاں و سرور تھیں کہ انہیں اس قدر چاہئے و سرائئے والا شوہر ملا تھا جو اس کی خاطر سب کچھ وارنے کو تیار تھا۔

ان کی سوچ سے قطع نظر امی حضور کی سماعتوں میں خطرے کی گھنٹیاں ہی بجنے لگی تھیں اور ان کے دیدے حلقوں میں سرچ لائنس کی طرح گردش کرنے لگے تھے۔



میرے حاصل، یہ محرومی عجب محسوس ہوتی ہے  
تجھے پا کر بھی کیوں تیری طلب محسوس ہوتی ہے  
تمہارے ساتھ دیکھی تھی وگرنہ زندگی ہم کو  
نہ تب محسوس ہوتی تھی، نہ اب محسوس ہوتی ہے

”مشی..... مشی.....!“

وہ گھبرا کر پلٹی تھی اور اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی لڑکی کو دیکھ کر حیرت آمیز مسرت محسوس ہوئی تھی۔

”سونیا! وہ آنے والی لڑکی سے بڑی محبت سے گلے ملی تھی اور کئی لمحوں تک ایک دوسرے کے گلے سے لگی رہی تھیں۔

”مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہی ہو..... کافی دیر سے میں تمہیں دیکھ رہی ہوں اور خود کو یقین دلارہی ہوں کہ یہ تم ہی ہو، میری لاڈلی، چیمپی، از حد عزیز فرینڈ۔“ سونیا اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے گرم جوش سے کہہ رہی تھی۔ مشعل بھی بہت خوش و ہرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

”مگر میں تمہیں پہلی نظر میں ہی پہچان گئی۔“

”تم شروع سے ہی جینس ہو..... انکل کہاں ہیں؟“ معاوہ چونک کر گویا ہوئی تھی۔

”میں پاپا کے سنگ نہیں آئی ہوں۔ آؤ کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ وہ میسر سے کمرے میں آ گئیں۔ وہاں سے اس نے انٹرکام پر روم سروس کو کافی لانے کا آرڈر دیا پھر اس کے قریب بیٹھ گئی، جو بہت تعجب سے سوئٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی حیران کن نگاہیں ڈبل بیڈ پر رکھی مردانہ جینٹ پرمکوز ہو گئیں۔

”پھر کس کے ساتھ آئی ہو..... یہ جینٹ کس کا ہے؟ کیا جو جو کے ساتھ آئی ہو؟ مگر تم ابھی ان میرڈ ہو، پھر اس حد تک ایڈوانس بھی نہیں کہ ان میرڈ ہونے کے باوجود جو جو



کے ساتھ اس طرح.....“

”میں اب میرڈ ہوں اور یہ میرے ہسبنڈ کا جیکٹ ہے۔“ مشعل اس کی بات قطع کر کے ڈرامائی انداز میں گویا ہوئی۔

”وہاٹ..... آریو سیریس؟“ سونیا از حد متحیر تھی۔

”آف کورس۔“

ویٹر کافی دے گیا تھا۔ وہ کپوں میں انڈیلٹی ہوئی گویا ہوئی۔ اس کے انداز میں پھر پوراسرارو سسپنس تھا۔

”کس سے..... کیا اسی اہمق اُلوجو جو ہے؟“

”ارے ایسٹو نہ کہو اس غریب کو۔“ وہ کافی سرو کرتی ہوئی مسکرا کر بولی۔

”اوہ..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسے تم لائف پارٹنر کے لئے چوز کر سکتی ہو۔“ سونیا کے لہجے میں برا ملا گہرا رخ دنا سف تھا۔ ”تم نے اسی لئے مجھے شادی میں انوائٹ نہیں کیا اور مزے سے اس گھامڑ کے سنگ رشتہ استوار کر بیٹھی ہو جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔“ سونیا سخت کبیدہ تھی۔ ہنستے مسکراتے چہرے پر ملال کے رنگ اُڑ آئے تھے۔ مشعل اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”مجھے اس طرح دانت مت دکھاؤ، ایک گدھے سے شادی کر کے تم نے کوئی نئی دنیا دریافت نہیں کر ڈالی ہے۔“ وہ کافی سپ کرتی ہوئی بولی۔

”خواجہ اہیرے ہینڈسم ہسبنڈ کو برے برے ناموں سے پکار رہی ہو۔“

”برے نہیں، پرفیکٹ نیم ہیں اس کے لئے۔ بہر حال اچھا ہی ہوا جو تم نے مجھے انوائٹ نہیں کیا ورنہ میں یہ شادی ہونے ہی نہ دیتی۔ اب میں چلتی ہوں، تم یہ کارڈ رکھ لو بلکہ شام کو میں ڈرائیو کو بھیج دوں گی، تم سامان لے کر آ جانا، جب تک یہاں رہو گی، میرے ساتھ ہی رہو گی۔“ وہ وزیٹنگ کارڈ پرس سے نکال کر اس کی طرف بڑھاتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

”اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ بیٹھو ابھی۔ بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ اور یہ تو بتاؤ تم آسٹریلیا سے کب آئی ہو اور یہاں کیسے رہے۔ بے لگس؟ سرد بھائی کیسے ہیں اور تم بہت بدلی ہوئی لگ رہی ہو۔“

”مجھے آسٹریلیا سے یہاں آئے ہوئے ایک ماہ ہوا ہے۔ ہماری ساس کی ساس یعنی سرد کی دادی کی رہائش گاہ کہیں پر ہے۔ ان کی خواہش پر ہم یہاں رہ رہے ہیں۔ سرد سے معلوم کرنا وہ کیسے ہیں اور بدلی بدلی تو تم مجھے لگ رہی ہو۔ تم تو شعلہ جوالا تھیں، کہاں شبنم کی طرح نرم نرم ٹھنڈک تمہارے رگ و پے، لہجے میں در آئی ہے۔ بالکل مختلف لگ رہی ہو اپنی فطرت سے۔“

سونیا کے ٹھیک ٹھاک تجزیے پر وہ مسکرا کر رہ گئی۔

”میرے ہسبنڈ سے مل کر جاؤ۔ وہ ابھی آرہے ہیں۔“

”شام میں ملاقات ہوگی۔ اب کیا کروں تمہاری وجہ سے اسے اہمیت تو دینی پڑے گی۔“ وہ اسے جلد آنے کی تاکید کر کے چلی گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد وہ یہ سوچ سوچ کر مسکراتی رہی کہ جب شام کو وہ شاہ ویز کے ساتھ وہاں جائے گی تو سونیا کا رد عمل دیکھنے کے لائق ہوگا جب وہ جو جو کی بجائے ایک اجنبی شخص کو اس کے ہمراہ دیکھے گی۔

وہ اسی تصور میں گم مسکرا رہی تھی جب شاہ ویز اندر داخل ہوا تھا۔

”خیریت ہے نا؟ یہ تنہا کس خوشی میں مسکرا لیا جا رہا ہے؟“ وہ صوفے پر بیٹھ کر شوز اتارتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

”آج اتھا تا میری کلوز فرینڈ سونیا سے ملاقات ہوئی ہے۔ وہ یہاں کسی کام سے آئی تھی، میں میسر پر کھڑی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ شادی کے بعد دو سال قبل آسٹریلیا چلی گئی تھی، ایک ماہ قبل یہاں آ کر سیٹل ہوئی ہے۔ وہ رات ڈنر پر انوائٹ کر کے گئی ہے بلکہ کہہ رہی ہے ہم جب تک یہاں پر ہیں اس کے ساتھ رہیں گے۔“ مسرت کے خوش رنگ گلاب اس کے چہرے پر کھلے ہوئے تھے۔ شاہ ویز صوفے پر نیم دراز دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔

”چلیں گے نا؟“ معا اس کو احساس ہوا وہ خاموش ہے۔

”ہوں..... چلیں گے لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

”ہم رات کو واپس آجائیں گے۔ بلا وجہ کہیں قیام کرنا فضول ہے۔“

شاہ ویز کی بات پر اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

سونیا کے ہاں اس کا پرتپاک استقبال ہوا تھا۔ سرد بہت گرم جوشی سے ملے تھے۔ شاہ ویز کا موڈ بھی بہت خوشگوار تھا۔

”مشی! یہ کیا معاملہ ہے؟ یہ حضرت کون ہیں؟ تم تو کہہ رہی تھیں جو جو، جبکہ.....“

”یہ سر پر اترے تمہارے لئے..... یہ شاہ ویز ہیں، میرے ہسبنڈ..... تم نے مجھے بتانے کا موقع ہی نہیں دیا اور خود ہی جو جو، جو جو پکارتی رہیں تو میں نے سوچا شام کو تمہیں تمام باتیں بتاؤں گی۔“ وہ آرام سے صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ ”کیسا لگا؟“

”کون..... شاہ ویز؟“

”نہیں سر پر اتر۔“

”سر پر اتر اور دولہا بھائی دونوں شان دار بلکہ لا جواب۔“ وہ بھی بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر مسرت والہ لہجہ کے ملے جلے رنگ تھے۔ وہ سب کچھ جان لینے کو بے تاب تھی۔

مشعل کو بھی کوئی ہمدرد مہربان وجود ایک عرصے بعد میسر آیا تھا، وہ بھی دل میں کافی غبار والہ لہجہیں رکھتی تھیں۔ اپنی پریشانیاں و احساسات کسی کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بھی شاہ ویز سے پہلی ملاقات سے لے کر آج تک پیش آنے والے تمام واقعات و باتیں بچ بچ بتا ڈالی تھیں۔

”یہ تمہاری خوش قسمتی ہے مشی جان کہ تمہیں اتنا مضبوط کردار کا پُر خلوص مرد ملا ہے ورنہ مردوں کے ضبط، برداشت و نفس اتنے طاقتور نہیں ہوتے کہ اپنی ذات و خواہشات کو یکسر نظر انداز کر کے محض دوسرے فریق کی خاطر، اس کی مرضی پر جیون گزاریں۔ بہت گریٹ ہیں شاہ ویز۔ ان کی پروتار پر سنائی سے میں پہلی نظر میں متاثر ہو گئی تھی مگر اب ان کے بارے میں تفصیل جان کر ان کی گرویدہ ہو گئی ہوں۔“ سونیا کے لہجے میں از حد ستائش تھی شاہ ویز کے لئے۔

”لو کون کو متاثر کرنا اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے..... اس کام میں وہ بے حد ماہر ہے۔ پاپا کو بھی اس نے ایک ملاقات میں ہی متاثر کر لیا تھا۔“

”اور پاپا کی بیٹی کو کون سی ملاقات میں متاثر کر سکا تھا؟“ سونیا شوخی سے ہنس کر گویا ہوئی تو وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

”ریلی، میں اکل کے انتخاب پر بہت خوش ہوں اور بچ پوچھو تو تمہاری آئی اور جو جو مجھے شروع سے ہی ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔“

وہ باتوں میں مصروف تھیں جب کہ دروازہ ناک کر کے سرد اندر آیا تھا۔

”محترم خواتین! آپ کی باتوں کے لئے ساری رات پڑی ہے، پہلے کھانا لگالیں، ڈنر کے بعد گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑیے گا جہاں سے منقطع ہو رہا ہے۔“ وہ شرارتی لہجے میں بولا تو وہ دونوں مسکرا کر اٹھ گئیں۔

”تم ہو بہت لگی۔“ کھانے سے فارغ ہو کر وہ واش مین پر ہاتھ دھو رہی تھی، تب سونیا ناول اسٹینڈ سے ناول اس کی طرف بڑھاتی ہوئی کہہ اٹھی۔

”کس طرح؟“

”اس طرح کہ تمہاری طرح تمہارے ہسبنڈ بھی بے حد گریس فل اور اسماٹ ہیں۔ ان کی گفتگو کا انداز کتنا دل کو اکیل کرتا ہے۔ اونچا مضبوط اور شان دار۔ ٹوٹ کر محبت کرنے والے لگتے ہیں۔“

”وہ ٹوٹا نہیں توڑنا جانتا ہے۔“ وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

”کیا مطلب؟“

”ارے کوئی مطلب نہیں..... ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔“ وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ باوجود خواہش کے وہ سونیا کو یہ نہیں بتا سکی کہ ان کے درمیان آج تک بیگانگی و سرد مہری کی دیوار حائل ہے۔ ساتھ ساتھ رہتے، اٹھتے بیٹھتے نظر آنے کے باوجود وہ اب بھی ایک دوسرے کی خواہشوں، جذبات، احساسات سے اتنے ہی لاعلم، انجان ہیں جتنے شادی سے قبل تھے۔ معلوم اس میں اس کی انا کی سرخروئی کا دخل تھا یا خودداری و وقار کا تقاضا کہ وہ ہر بات شیئر کرنے کے باوجود یہ شیئر نہ کر سکتی تھی۔

”لگتا ہے بہت چاہتا ہے تمہیں..... ہے نا..... جو ٹوٹ کر چاہتے ہیں ان کے پیار کرنے کے انداز میں ایسی شدتیں اور وحشتیں ہوتی ہیں۔“ سونیا کے مسکراتے چہرے اور معنی خیز لہجے میں ازدواجی سرتوں کی شوخیاں تھیں۔

مشعل محض مسکرا کر رہ گئی۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس نے اس کے محض غیظ و غضب، وحشت و بربریت کے وحشیانہ روپ دیکھے ہیں، پیار محبت، عشق و چاہت کے رنگ اور محبت کی شدتوں، چاہت کی برکھا سے وہ کہاں بھیگی تھی۔

اس بیاس سے ابھی پوری طرح آشنائی نہیں ہوئی تھی۔

”کن رنگین یادوں میں کھو گئیں؟“ سونیا نے اسے خاموش دیکھ کر شرارت سے کہا۔

”آں..... کچھ نہیں۔ چلو، وہ کہیں گے اندر جا کر بیٹھ گئیں۔“ وہ ہاتھ پونچھ کر تولیہ اسٹینڈ پر لٹکا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئی۔ سونیا کی معنی خیز باتیں، گہری مسکراہٹ

اسے بوکھلا رہی تھی۔ اسے اپنا بھرم ٹوٹنا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سنگٹ روم میں پہنچی تو ملازمہ کافی بتا رہی تھی۔ پھر انہیں سروکر کے چلی گئی۔

”کچھ کہا ہے کسی نے جب دو خواتین ملتی ہیں تو گپ شپ میں سب کو فراموش کر دیتی ہیں۔“ سرد کا فی پتے ہوئے کوہا ہوا۔

”سوری سرد! ہم اتنے عرصے بعد ملے ہیں تو ظاہر ہے باتیں بے حد جمع ہو گئی ہیں۔“

”پھر ختم ہوئیں باتیں یا ابھی باقی ہیں؟“ شاہ ویز نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”ابھی کہاں..... ابھی شروع بھی نہیں ہوئیں۔“

”جب عورتیں ملتی ہیں تو کیا باتیں کرتی ہیں..... آئی مین کس طرح کی باتیں ہوتی ہیں؟“

”آپ کو کیوں بتائیں؟“ سونیا ان کی طرف دیکھ کر شرارت سے بولی۔

”دو عورتیں دوسری عورتوں کی برائیاں ہی کر سکتی ہیں۔“ سرد نے چھیڑا تھا۔

”شکر کریں آپ کی برائیاں نہیں کرتے ہیں۔“ سونیا نے دوبارہ جواب دیا۔

”سرد صاحب! کیوں شعلوں کو ہوا دے رہے ہیں، اتنے نزدیک بیٹھ کر؟“ شاہ ویز مسکرا کر کوہا ہوا تھا۔ سونیا صوفے پر سرد کے قریب ہی بیٹھی تھی جب کہ مشعل سنگل صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کے جیلے پر سرد نے بے اختیار قبضہ لگایا تھا، وہ دونوں بھی مسکرائیں۔

”میری فکر مت کرو یا ر، ہم تو جل کر خاستران کی پہلی نگاہ سے ہی ہو گئے تھے۔ اب تو وجود کی راکھ لئے گھومتے ہیں۔“ سرد نے مخمور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر فدویا نہ لہجے میں کہا۔ سونیا کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی تھی۔ شاہ ویز اس سے عجیب سے احساسات سے دوچار ہوا۔ بے ساختہ نگاہیں مشعل کی جانب اٹھی تھیں، جس کے سرخ عارضوں پر سیاہ دراز پلکیں لرزاں تھیں۔

مختلف باتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ سرد اور شاہ ویز بہت جلد بے تکلف ہو گئے تھے۔ کوہا مدتوں کی شناسائی و دوستی ہو۔

”یہاں کے موسم کا بھی کوئی اعتبار نہیں، پل پل بدلتا رہتا ہے۔“ سونیا نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو باہر خشک ہواؤں کے ساتھ ساتھ موٹی بوندیں بھی گر رہی تھیں۔

”آپ موسم کی بات کر رہی ہیں، ہم نے انسانوں کو پل پل بدلتا دیکھا ہے۔“ شاہ ویز ہنکھکیوں سے مشعل کو دیکھ کر کوہا ہوا۔

”تجربہ ہے آپ کو انسانوں کو پرکھنے کا؟“ سرد کوہا ہوا۔

”جی ہاں..... میری تو ساری لائف ایسے ہی تجربوں میں گزری ہے۔“ وہ دونوں ہنس دیے، سوائے مشعل، جو ان کے درمیان خود کو کس فٹ محسوس کر رہی تھی۔ سونیا اور سرد ایک دوسرے کے قریب بیٹھے مکمل لگ رہے تھے۔ ان دونوں کی موجودگی کے باوجود سرد کی نارہوتی، چاہت چھلکاتی نگاہیں سونیا کے چہرے پر وقفے وقفے سے ٹھہر رہی تھیں۔ ہر بات میں وہ سونیا کی تائید لازمی حاصل کرتا تھا۔

جب کہ شاہ ویز بات کرنا تو درکنار، ایک نگاہ غلط اس پر ڈالنے کا روادار نہ تھا۔ نہ ہی وہ اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا حالانکہ وہ قریب ہی بیٹھی تھی۔

وہ تنہا ہی اپنی ذات میں انجمن تھا مگر اس کی ویلیو ڈاؤن کر رہا تھا۔

”شاہ ویز بھائی! ان تجربات کے دوران کوئی ہستی ایسی ملی جس نے آپ کو متاثر کیا ہو؟“ سونیا نے پوچھا تھا۔ ”یا آپ سے کوئی اسپاڑ ہوا ہو؟“

”ہاں..... ساری زندگی مجھے ایک ہستی نے متاثر کیا۔ وہ میری ماں، میری بے جی ہیں۔ دوست، ماں، ہمدرد، از حد جاں نثار کرنے والی ہستی۔ ان کی تنہا ذات نے مجھے ہر قریبی و معزز رشتوں کا احساس بخشتا ہے۔“ اس کے مدھم گنبھیر لہجے میں بے جی کے لئے جو عقیدت و احترام تھا اس سے وہ بھی متاثر ہوئے تھے۔

”دوسرے سوال کا جواب کول کر رہے ہیں۔“

”بے حد عام سا بندہ ہوں..... بھلا کس کو متاثر کر سکتا ہوں۔“

”میری اتنی کیوٹ اینڈ بیوٹی فل دوست کے سہینڈ بننے کے بعد بھی آپ کو اتنی اسمارٹنس، چارمنگ، انٹرکشن پر سنائی کا احساس نہیں ہوا، حیرت ہے۔ مشعل جیسی لڑکی آپ کے قریب ہے اور آپ ایسی بات کر رہے ہیں۔ ایسی کوئی بات تو ضرور ہے آپ کی پر سنائی میں جو شوخ و خشک ہر لمحے پارے کی مانند بے قرار رہنے والی میری دوستی کتنی سوہٹ اور سوہر ہو گئی ہے۔ جس کو بلا سوچے سمجھے، بے تکان بولنے کی عادت تھی، وہ اب سوچ سوچ کر بلکہ تول تول کر بولنے لگی ہے۔“

سونیا کی زبان رواں ہو گئی تو وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”چلیں اب؟“ وہ ہٹنا کر شاہ ویز سے مخاطب ہوئی۔

”کہاں چلیں؟ تمہیں یہیں رہنا ہے۔ میں نے کہا تھا تم سے۔“ سونیا کھڑی ہوئی تو سرد کو بھی کھڑا ہونا پڑا جب کہ شاہ ویز پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”سوری بھائی! ہم ہوٹل واپس جائیں گے، کل آپ لوگ آئیے گا ہماری طرف۔ ملاقات ہوتی رہے گی اب تو۔“

”کیسی غیروں جیسی بات کر رہے ہو یا تم۔ موسم خراب ہے پھر ہم نے آپ لوگوں کے لئے بیڈروم سیٹ کروا دیا ہے۔ یقین مانیں، ہم دونوں میں سے کوئی بھی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔“ سرد کا شوخ انداز بے باکی سے لبریز تھا۔ بے حد بولڈ ہونے کے باوجود شاہ ویز کچھ تو جیہہ پیش نہ کر سکا۔ مشعل جھکا چہرہ مزید جھکا گئی۔

ازدواجی تعلقات میں بندھے لوگوں کے درمیان ایسے چھوٹے موٹے معنی خیز مذاق اور شوخیاں چلتی رہتی ہیں۔ سونیا کو امید تھی شاہ ویز حاضر جواب ہے لہذا کوئی پھڑکتا ہو جواب ملے گا مگر شاہ ویز کا کترانا، مشعل کا گھبرانا اسے عجیب سے احساس سے دوچار کر گیا۔

”ڈرائیور آپ کا سامان ہوٹل سے ابھی لے آئے گا مگر آپ لوگ اب ہماری میز بانی قبول کریں گے۔“

”پلیز پھر.....“

”کوئی ہیکسلوڈ نہیں چلے گا۔ قسم سے آپ بالکل بھی فکر مت کریں، ہم آپ کی تنہائیوں میں بالکل نخل نہ ہوں گے اور آپ کے لئے بیڈروم بھی ہم نے بالکل الگ تھلگ سیٹ کروا دیا ہے۔ خاصی پرسکون و رومانٹک جگہ ہے وہ۔ شادی کے ابتدائی ایام ہم نے وہیں گزارے تھے اور کتنا.....“

”ایسی بات نہیں ہے..... دراصل ہم نہیں چاہتے کہ آپ کو میز بانی کی تکلیف میں مبتلا کریں، پھر مہمان کو وبال جان بننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔“

”ارے چھوڑو یا ر یہ تکلف۔ سب چلتا ہے۔ پھر وہ لوگ پہلی ہی ملاقات میں دل سے قریب ہو جائیں تو وہ مہمان نہیں عزیز از جان لگتے ہیں۔ ورنہ جب مجھے سونی نے بتایا کہ اس کی فرینڈ کے سہینڈ سے ملنا ہے تو کچھ مانو میں تو یہ سوچ کر ہی کوفت میں مبتلا ہو گیا تھا کہ.....“

”اوہو بھئی اب انہیں آرام بھی کرنے دیں گے یا پھر اور ایک اسٹوری شروع کرنے کا ارادہ ہے؟“ سونیا کو مدخلت کرنی پڑی۔

”اوکے..... اوکے..... جو حکم سرکار۔“ سرد نے سعادت مندی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دیا۔ وہ تینوں ہی مسکرائے تھے۔



”یہ تم میرے وارڈروب میں کیا کر رہے ہو؟ کتنی دفعہ تمہیں سمجھایا ہے میری چیزوں کو کونج مت کیا کرو، لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔“ رافعہ نے ایک جھٹکے سے وارڈروب کا دروازہ بند کیا تھا اور جو جس نے ابھی خاصی جدوجہد کے بعد کی ہول میں چابی گھما کر دروازہ کھولا تھا، ان کی غیر متوقع آمد اور جارحانہ انداز نے موڈ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

”مما! آپ کا ایٹی نیوڈ کیسا ہوتا جا رہا ہے میرے ساتھ، جیسے میں کوئی چور ہوں۔ کیا آپ کے کمرے میں گھسنے سے قبل مجھے آپ کی پر مشن لینی ہے؟ کیا ایک گھر میں رہنے والے آپس میں ایسے ٹرمز رکھتے ہیں؟“

”اوہو..... مت پریشان کرو مجھے۔ میں ویسے ہی پریشان ہوں۔ بھائی جان پہلے جیسے نہیں رہے۔ جاؤ تو بڑی خوش اخلاقی سے ملتے ہیں، بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں کوہا مجھ سے بڑھ کر ان کو کوئی عزیز نہیں ہے اور اگر نہ جاؤں کئی دن تو پلٹ کر خبر بھی نہیں لیتے کہ زندہ ہوں یا نہیں۔ اور مزید ستم یہ کہ مٹی کیبنی اس چالاک شاہ ویز کو لے کر نہ معلوم کہاں چھپی ہوئی ہے جو آنے کا نام ہی نہیں لے رہی اور یہاں تیزی سے ایک کے بعد ایک اکاؤنٹ خالی ہو رہا ہے۔ اکلم کوئی نہیں، مہنگائی پوچھو نہیں۔“ رافعہ سرخی مائل بالوں پر برش چلاتے ہوئے اکتائے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”مہنگائی، اس ٹاپک کو میرے سامنے مت چھیڑا کریں۔ مجھے دینے کا وقت آتا ہے تو آپ کو مہنگائی اور خالی اکاؤنٹ کا رونا یاد آتا ہے۔ آپ روز جو پارٹیز انیڈ کرنے کے لئے مہنگے گفٹس، ساڈھیاں، جیولری یوز کرتی ہیں، ہر ہفتے جو پارلز کے چکر لگتے ہیں وہ کیا کسی صدقے خیرات سے کرتی ہیں؟ کل بھی آپ نے دس ہزار کی ساڈھی خریدی ہے اور چیئڈ پرس.....“

”شٹ یور ماؤتھ جو! اولاد دہو، اولاد دین کر رہو، باپ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے معاملے میں مت بولا کرو۔“ حسب عادت وہ سچی بات پر طیش میں آ کر چنگھاڑی تھیں۔

”آپ تو مجھے ماں ہی نہیں لگتی ہیں۔ کبھی بھی آپ کو میری اور میری ضروریات کی پروا نہیں رہی ہے۔ پہلے مٹی تھی تو وہ میری تمام ضروریات پوری کرتی تھی۔ انکل بھی بے حساب پاکٹ منی دیا کرتے تھے۔ آپ نے کچھ نہیں کیا میرے لئے..... کچھ نہیں کیا۔“ وہ غصے میں دھاڑے دروازہ بند کرنا ہوواہاں سے چلا گیا۔

رافعہ بے فکری سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال سنوارتی رہیں۔ ان کے کسی بھی انداز سے پریشانی یا پشیمانی کا احساس نہ ہو رہا تھا۔



سارا دن آگنن جلتی دھوپ میں دکھتا رہا تھا۔

سورج اپنی آگ برساتی شعاعوں سمیت چند لمبے قبل ہی رخصت ہوا تھا لیکن سرخی فرش سے نادیہ شعلے ابھی بھی گرم گرم لپیٹے مارتے دکھائی دے رہے تھے۔ درو دیوار جھلے دکھائی دے رہے تھے۔

سارہ نے آگنن کے ایک طرف لگنے ل میں پائپ لگایا، جھاڑواٹھائی اور پہلے پھرتی سے پورا آگنن دھویا، پھر سائینڈوں میں رکھے گلوں میں پانی ڈالنے کے بعد دوبارہ

فرش کی دھلائی شروع کر دی۔

”میرے ہاں پیدا ہونے سے بہتر تھا کسی جمع دار کے ہاں پیدا ہو جاتی تو چوبیس گھنٹے جھاڑو ہاتھ میں پکڑے رہنے کا خوب موقع مل جاتا۔“ زرینہ گھر میں داخل ہوئیں تو اسے تیزی سے واپس چلا تے دیکھ کر گویا ہوئیں۔

”کتی ٹھنڈک ہو گئی ہے اماں! کچھ دیر پہلے تو یہاں چپل پہن کر بھی قدم نہیں رکھا جا رہا تھا۔“

”ہاں..... بیو ہے۔ ٹھنڈک ہو گئی ہے۔“ وہ برقع ایک طرف رکھ کر پلنگ پر نیم دراز ہو گئیں۔ گلوں میں کھلے بے شمار مویسے کے پھولوں سے نکلتی مہک کرنے آگن کی ٹھنڈی فضا کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

عصر کی اذان کے بعد سارہ نے فوراً وضو کر لیا تھا اندر نماز ادا کرنے جاتے ہوئے اس نے پائنتی سے برقع اٹھاتے ہوئے نکلیوں سے ماں کی طرف دیکھا جو خلاف معمول خاموش و فکر مند نظر آ رہی تھیں۔

اس نے بے آواز، خاموش گہری سانس اندر کھینچی تھی اور اندر نگہ پر برقع لٹکانے کے بعد جہ نماز کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ماں کی اندر دگی و پریشانی کا سبب خود اس کی ذات تھی کہ باقر نے گزشتہ دو ماہ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے اس کو بھول گیا تھا یا اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا تھا۔

ادھر گھر والے تو اس کی موجودگی سے کوئی پریشان نہیں تھے اور ویسے یہ تو دستور دنیا ہے کہ جو شخص بڑھ چڑھ کر گھریلو سرگرمیوں اور کاموں میں از خود حصہ لے، بلا کسی ہمتراض و شکایت کے تو ایسے لوگوں کو ہر کوئی عزیز رکھتا ہے۔ پھر وہ تو اس کے اپنے تھے۔

پھر بھی لوگوں کی جھپتی، کانتی، کچو کے لگاتی نظریں اس کو گھائل کر ڈالتی تھیں۔ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم سمجھتی تھی۔

”سارہ بیٹی! ایک پیالی چائے دو بنا کر۔ آج تو سر میں درد ہو رہا ہے۔“ سارہ کے بعد وہ بھی نماز ادا کر کے دوبارہ پلنگ پر ہی دراز ہوتے ہوئے گویا ہوئیں۔ اسی لمحے کچن میں سے سارہ برآمد ہوئی تھی۔ ہاتھ میں چھوٹی پلاسٹک کی ٹرے میں دو کپ چائے سے پُر بھاپ اُڈ رہے تھے۔

”چائے تو میں نے نماز پڑھتے ہی تیار کر لی تھی، تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ ایک کپ انہیں پکڑا کر دوسرا خود لے کر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

”یہ گلوڑ ماری لت بڑی بری پڑ گئی ہے۔ تمہارے ابا کی زندگی میں تو کبھی چائے کی شل گھر میں دیکھنے کو بھی نہ ملتی تھی۔ کہتے تھے چار کی جگہ دو کپ دودھ کے بندہ پی لے تو جان میں جان تو آئے۔ یہ چائے تو زری خون جلاتی ہے، دماغ الگ خشک کرتی ہے۔“ وہ گھونٹ پر گھونٹ بھرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”اماں! ابا کو تمہارا دماغ اور خون بہت عزیز ہو گا نا۔“

”اچھا..... اب تو مجھ سے ٹھنڈک کرے گی؟“

”اماں! صحیح تو کہہ رہی ہوں۔ اب نہ ابا رہے اور نہ تمہارا دماغ اور خون و بیارہا، تبھی تو دن میں چار چار کپ چائے پی جاتی ہو۔“ وہ ان کی اندر دگی دور کرنے کی سعی میں لگی ہوئی تھی۔

”وقت بدل جاتا ہے، انسان بھی بدل جاتا ہے، عمر ڈھل جاتی ہے، عادتیں بھی اپنا آپ بدل ڈالتی ہیں کہاں رہی ہوں پہلے جیسی..... سب کچھ بدل گیا ہے۔“

”یہ ہماری فطرت ہے۔ اس سے ہم کہاں بچ سکتے ہیں؟“

”آپا حاجرہ کی بیٹی شرمین جو سال بھر سے میکے روٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی، جانتی ہو اس کے ساتھ کیا ہوا؟“ وہ جس بات کو اس سے چھپانے کی سعی کافی دیر سے کر رہی تھیں بالآخر وہ خود کو بتانے سے باز نہ رکھ سکی تھیں اور اس سے کہہ رہی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ وہ جو چائے کے آخری گھونٹ بھر رہی تھی، چونک کر بولی۔

”اس کے میاں نے دوسری شادی کر لی اور شرمین سے اجازت بھی نہیں لی۔ بلکہ بد بخت اجازت کیا خاک لیتا، اس نے بتانا بھی کو اہ نہ کیا۔ وہ تو اتفاقاً کوئی عورت ادھر سے آئی تو اس نے بتایا کہ اسے شادی کئے بھی چھ ماہ ہو چکے ہیں اور اسی بات نے تو آپا حاجرہ کے دل میں آگ سی لگا دی۔ ان کے میاں نے کسی جاننے والے سے مشورہ کیا تو وہ ایک وکیل کے پاس لے گئے۔ وکیل نے خاصی تسلی دی۔ نہ معلوم کون کون سی درخواستیں لکھوائیں اور کہہ دیا کہ جلد ہی وہاں سے اس کے میاں کے گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے جائیں گے۔ وکیل نے لمبی چوڑی تقریر کر کے اتنی لمبی رقم بھی فیس کے نام پر ہتھیلی۔ یہ باتیں ابھی چل رہی تھیں کہ آج صبح شرمین کا میاں آیا اور اس کا بھتیجا جو گھر سے باہر کھیل رہا تھا اسے کہا کہ شرمین آنٹی کو بلا کر لاؤ۔ بچے نے جا کر شرمین سے کہا۔ اس لڑکی کے نہ معلوم کیا دل میں آئی یا وہ کیا سمجھی جو سیدھی دروازے پر چلی آئی۔ اور جیسے ہی اس نے چہرہ نکال کر دروازے سے جھانکا ہے، بے رحم شیطان نے ہاتھ میں چھپائی ہوئی تیزاب کی بوتل اس کے چہرے پر انڈیلی اور بھاگ گیا۔“

”ہائے..... شرمین تو بہت اچھی اور صابر لڑکی ہے۔ اس کا کیا ہوا، کیسی طبیعت ہے اس کی؟“ سادہ سی کم کو شرمین کا سراپا اس کی نگاہوں میں لہر اگیا۔ وہ ایسے ہی تڑپ اٹھی جیسے یہ تکلیف اسے ہوئی ہو۔

”اللہ خیر کرے، انتہائی نگہداشت میں رکھا ہوا ہے اسے۔ کسی کو منہ دیکھنے بھی نہیں دے رہے۔ ان کے گھر میں کھرام مچا ہوا ہے۔ اس کے بھائی، باپ سب غم و غصے سے بدحواس ہوئے ہیں۔“

”اس کے شوہر کو نہیں پکڑا جس نے ایسا سنگین جرم کیا ہے؟“

”وہ پورا گھر غائب ہے۔ ایک ہفتہ قبل وہ گھر پہنچ کر نا معلوم کہاں چلے گئے ہیں۔ آج کچھ رقم جو بھٹایا تھی وہ لے کر اپنا مقصد پورا کر کے وہ بھی چلا گیا۔ بندوں سے چھپ سکتا ہے انسان لیکن اللہ سے نہیں۔ وہ جب تک خاموش ہے تب تک بچتا ہے۔ جب اس کی لاشیں چلتی ہے تو بے آواز ہوتی ہے اور کسی کو بھی راہزن نہیں مل سکتی۔“ زرینہ اندر دگی سے کہہ رہی تھیں اور سارہ گم صدمہ بیٹھی خلاؤں میں تنہا رہی تھی۔



”آپ مجھے خود سے جدا کرنا کیوں چاہتے ہیں..... میں آپ کے بغیر تنہا نہیں رہ پاؤں گی۔“ فرح نے اسے بتا دیا تھا کہ فرم کی خواہش پر وہ اس کے ہمراہ پاکستان جا رہی ہے۔ مکمل تفصیل وہ بتا چکی تھی اور جب سے وہ بے قرار، مضطرب ہو گئی تھی کہ موقع ملے ہی پریشان کن لہجے میں گویا ہوئی۔

”آپ تنہا کہاں ہیں، ہماری امانت آپ کے ساتھ ہے۔ پھر یہ سب آپ کے لئے ہی کر رہے ہیں۔ کچھ عرصے کی تو بات ہے، میں بھی بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ پھر فرح آپ کے ساتھ ہیں وہ از حد بہادر و فہم اعتماد عورت ہیں۔ مجھے ان پر مکمل بھروسہ ہے۔“ وہ آہستگی سے اس کے بال سہلاتے ہوئے سمجھا رہے تھے۔

”اس میں تو کوئی شک نہیں ہے مگر نا معلوم کیوں میرا دل نہیں مان رہا۔ مجھے عجیب عجیب وہم آرہے ہیں..... بس میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی، خواہ کچھ بھی ہو۔“ اس کی آواز بھرا گئی تو ان کے کشادہ سینے میں منہ چھپایا۔ حرا کے ہر انداز سے مضطرب اور بے تحاشا محبت جھلک رہی تھی۔ وہ جو ایک عمر سے سچی و خالص محبت کے متلاشی رہے تھے یکدم ہی بھرپور سرشاری و شادابی ان کے انگ انگ کو طمانیت بن کر سیراب کر گئی۔

”اوہو..... یہ کیسا بچوں جیسا ڈر، خوف ہے۔ ارے بابا! میں جلد آ جاؤں گا۔ یہ عارضی جدائی ہے کوئی ابدی جدائی نہیں۔“

”آہ..... خدا خواستہ کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں۔ میری عمر بھی اللہ آپ کو لگا دے۔“ اس نے سہم کر ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنسنے لگے تھے۔

”رہنمی، عورتیں بھی بچ بچ بڑی دہمی ہوتی ہیں۔ اگر کہنے سے باتیں پوری ہونے لگیں تو کیا ضرورت ہے کسی کو اتنی محنت کرنے کی، اس قدر جدوجہد کرنے کی۔ نقطہ منہ سے نکالا اور بات فوراً قبول ہوئی۔“

”کوئی گھڑی کوئی لمحہ قبولیت کا ضرور گزرتا ہے جس میں ہمارے منہ سے نکلی بات فوراً پوری ہوتی ہے، اس لئے ہمیشہ اچھی بات کہنی چاہئے۔“

”اوکے..... آئندہ خیال رکھوں گا۔ مگر اب جو منہ سے نکل گیا اس کا کیا کروں؟“ اس کا انداز ہنوز شوخ تھا۔

”ملازمہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ ڈانٹنگ ہال میں چلے آئے جہاں میز انواع و اقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی تھی۔

”واہ..... آج بڑا ہتھام ہے، کوئی مہمان آرہا ہے امی حضور؟“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ان سے مخاطب ہوئے۔

”مہمان نہیں، گھر کے ہی بچے ہیں، مندا اور عرفان آئے ہیں بمبئی سے۔“

”مند اور عرفان؟ کب آئے وہ لوگ؟“ ان کے لہجے میں حیرت آمیز مسرت تھی۔ ایسی ہی خوشی جو اپنے بچوں کے لئے ہوتی ہے۔“

”ہیلو بابا!“ اسی لمحے ان دونوں نے اندر داخل ہو کر کہا تھا۔

”ونڈر فل سر پر اتنا..... بہت خوشی ہو رہی ہے مندا بیٹے آپ کو دیکھ کر۔“ نازک سراپے، میٹھے برو، ڈانٹا کٹ، میمر اسٹائل میں مندا کے خوبصورت چہرے پر برہمی و ترشی کے آثار تھے۔ آنکھوں میں ناکواری و نفرت تھی۔

”عرفان کو دیکھ کر آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟“

”عرفان کو کچھ ہفتے قبل دیکھ چکا ہوں، آپ کو طویل عرصے بعد دیکھ رہا ہوں۔“

”میڈم! آپ یہاں سے انھیں، یہ گریڈ مدر کی چیز ہے۔“ مندا، فرح کی جانب بڑھ کر درشت لہجے میں گویا ہوئی۔

”مند! یہ کیا بد تمیزی ہے؟ مہمانوں سے ایسے بی ہو کرتے ہیں؟“

”یہ بد تمیزی نہیں، حق ہے ہمارا۔ میری ماما کی چیز پر تو یہ عورت بیٹھ گئی ہے مگر گریڈ مدر کی چیز کوئی نہیں ہتھیا سکتا۔“ فرم صاحب کی غصے سے جینتی آواز کی پروا کئے بغیر وہ غصے سے بولی تھی۔

کمرے کی پرسکون فضا ایک دم ہی ٹپنس ہو گئی۔ فرح تو فوراً ہی ہکا بکا سی کھڑی ہو گئی تھی۔ حرا بھی کوگو کحوالت میں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھیں۔ امی حضور کسی بچے کی

طرح ساکت وصامت تھیں جب کہ عرفان کے تیر بھی گھڑے گھڑے تھے۔

”ندا! معافی مانگو۔ فوراً معافی مانگو۔ یہاں چیئر زپر نام نہیں لکھا ہوا۔“

”رہنے دیجئے خرم صاحب! معافی کی کوئی بات نہیں ہے۔ بچے ایسے ہی جذباتی ہوتے ہیں۔ میں اس چیئر پر بیٹھ جاتی ہوں۔“ خرم کا پُر جلال انداز، ندا کی ہٹ دھرمی و بد تمیزی نے انہیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ بات سنگین ہوتے دیکھ کر فرح فوراً ہی مصالحت آمیز انداز میں دوسری کرسی پر بیٹھتی ہوئی کوہا ہوئی تھیں۔ ندا اسی طرح باپ کے روبرو تن کر کھڑی تھی۔

”ہاں ہاں کھاؤ..... خوب کھاؤ..... تم جیسے گھنیا لوگوں کو کھانے سے غرض ہوتی ہے، کرسی سے نہیں۔ کرسی ہویا نہ ہو، بس کھانا چاہئے۔“

وہ حقیرانہ لہجے میں فرح کو گھور کر مخاطب ہوئی پھر پلٹ کر حراسے بولی، جو اس صورت حال سے مارے خوف کے کانپ رہی تھی۔

”یہ مہارانی اپنے باپ کی عمر سے بڑے آدمی سے شادی رچا کر اس لئے بیٹھی ہیں کہ اچھے اعلیٰ کھانوں کے علاوہ مال و دولت بھی ہزپ کر جائیں۔ گھنیا خاندان کے ذلیل لوگ۔“ ندا نے بد تمیزی و گستاخی کی حد کر اس کر دی تھی۔ خرم صاحب آگے بڑھے تھے اور کمرہ پھٹروں کی آوازوں سے کونج اٹھا تھا۔



رات خوب برف پڑی تھی۔

ہر سو سفید چادر کی طرح ہر شے لپے وجود سے ڈھانپے ہوئے تھی۔ ہر سمت گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ معمولی سی بھی ہلچل نہ تھی۔ مشعل نے کھڑکی سے ذرا سا سر نکال کر دیکھا تھا۔ اوپر آسمان بالکل صاف تھا اور دور افق پر سنہری روشنیوں کا آئینا رسا بہر رہا تھا۔ شاید سورج جلوہ افروز ہونے کی تیاریوں میں لگی تھا۔ کافی دیر بعد وہ کھڑکی سے ہٹی اور بند کر کے پردہ ہرا کر ڈالا اور بیڈ کی طرف آگئی۔ اس کی نگاہیں شاہ ویز کے چہرے سے ٹکرائی تھیں۔ رات سو نیا اور سرمد کی معنی خیز باتوں اور اشاروں نے محض اسے ہی نئی آگ سے آشنا نہیں کروایا تھا، اس سے شاہ ویز بھی خود کو نہ بچا سکا تھا۔ کمرے میں آتے ہی سونے کا اعلان کرتا ہوا نائٹ سوٹ بدل کر لائٹ آف کر کے سیدھا وہ بیڈ پر دراز ہو گیا۔ وہ پہلے ہی لیٹ چکی تھی۔ ساری رات دونوں کو کسی انجانے جذبے نے بے کل و بے چین رکھا تھا۔ وہ اپنی نسوانیت، اپنی انا، اپنے وقار کا خیال کئے بالکل اسی طرح پڑی رہی جیسے بے خبر سو رہی ہو جب کہ پہلی بار اس نے شاہ ویز کو جاتے، کروائیں بد لئے محسوس کیا تھا۔ ساری رات گزر جانے کے بعد کچھ دیر قبل ہی نیند اس پر مہربان ہوئی تھی اور وہ اس سے بھی محروم رہی تھی۔

اس کی رنگت جو کبھی گندی تھی، اب گندی رنگت میں سرخی و سفیدی شامل ہو گئی تھی۔ ناک اونچی تھی اور پیشانی کشادہ، گھنی مونچھوں کی رنگت بلیک و براؤن تھی اور ہونٹ ہلکے گلابی خوب صورت تھے۔ اس وقت بے خبر سوتا ہوا وہ اس قدر اچھا لگ رہا تھا کہ وہ بتا پلکیں جھپکائے ایک نکل اسے دیکھے گی تھی۔

جگا نہ سکے ترے لب، لکیر ایسی تھی  
ہمارے بخت کی ریکھا بھی تیر ایسی تھی  
یہ ہاتھ چومے گئے، پھر بھی بے گلاب رہے  
جو رُت بھی آئی، خزاں کے سفیر ایسی تھی

”کیا ہمارے درمیان یہ بیگانگی والا تعلقی کا رشتہ مستقل قائم رہے گا؟ مجھے میری نادانی و نا سمجھی کی سزا کب تک ملتی رہے گی؟ میں پگھل رہی ہوں، اندر ہی اندر تمام ہو رہی ہوں۔ تمہاری خاموش نفرت، سرد خاموشی مجھے مار ڈالے گی۔ میں مرجاؤں گی۔ ایک محبت کا جہاں اپنے اندر آباد لئے، اپنی حسرتوں کی بربادی شاید مجھ سے منظور نہ ہو گی۔ شاہ ویز! تم تو بہت محبت کرنے والے، از حد خیال رکھنے والے ایک قابل ستائش و قابل فخر انسان ہو۔ تم میں یہ خصوصیت ہے کہ تم لوگوں کو پہلی ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہو۔ ہر کوئی تم سے مل کر تمہارا ہو جاتا ہے پھر ذرا سی جگہ میرے لئے کیوں نہیں نکل سکتی؟“

وہ اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی دل کی دنیا زیر و زبر تھی، کسی طور پر وہ اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ اس کا ہر تم، ہر جھج، ہر بے رخی کے وار کو سہنے کے باوجود شاہ ویز سے علیحدہ ہونے کا تصور ہی سوہان روح تھا۔ نامعلوم یہ طلب کی ضالگی تھی یا محبت کی اساس، وہ اس سے تعلقات کی وابستگی چاہتی تھی۔

وہ اس کے ساتھ رہے، دمنرس سے دور کی، نگاہوں سے اوجھل نہ ہو، ہاتھ اسے چھونے سے گریزاں تھے مگر نگاہیں تو ہر دم بوسے لیتی تھیں۔ دل کے تعلقات جتنے انوکھے ہوتے ہیں اس کی چائیں اتنی ہی نرالی و متوالی ہوتی ہیں۔ اسے احساس ہی نہ ہوا اور نامعلوم کب آنسوؤں کے موئے موئے قطرے آنکھوں سے نکل کر شاہ ویز کے چہرے پر گرے تھے اور قبل اس کے کہ وہ پیچھے ہٹ کر سنبھلتی، شاہ ویز آنکھیں کھول چکا تھا۔

سرخ سرخ

خمار آلود آنکھیں مشعل کے گھبرائے ہوئے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”آنسوؤں سے میرا چہرہ دھونے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

جواباً مشعل نے کوئی لفظ نہ کہا۔ دل اس وقت کچھ ایسے ہی ان کے جذبات و احساسات سے دوچار تھا۔ جب زبان کچھ نہ کہہ سیکے تو لفظ بول اٹھتے ہیں۔ آنسوؤں کو زبان مل جاتی ہے اور پھر وہ ہر وجہات کہہ ڈالتے ہیں جو زبان نہیں کہہ سکتی۔

وہ رو رہی تھی، بے ساختہ، بے اختیار۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ آنسو کیوں اس طرح بہہ رہے ہیں جیسے یلکھت دریا میں طغیانی آجائے اور موجیں تمام بند توڑ کر حشر برپا کر دیں۔

وہ رو رہی تھی۔

شاہ ویز دیکھ رہا تھا۔

بالکل خاموش اور سنجیدگی سے۔ نہ اسے خاموش کرنے کی سعی کی تھی، نہ ہی کوئی لفظ کہا تھا۔

یہ مشغلہ ہے کسی کا نہ جانے کیا چاہے  
نہ فاصلوں کو مٹائے نہ فاصلہ چاہے  
میری بساط ہے کیا، میں ہوں برگ آوارہ  
اُزا کے لے چلے مجھ کو جدھر ہوا چاہے

”یہ بن بادل برسات کیوں؟ معلوم تو ہو مجھے کچھ۔“ قدرے توقف کے بعد شاہ ویز اس سے مخاطب ہوا تھا جس کی رقت انگیزی میں کمی آگئی تھی۔

”آئی ایم سوری، نہ معلوم مجھے کیا ہو گیا تھا۔“ دونوں ہاتھوں سے اپنا بھیگا چہرہ رگڑتے ہوئے وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“ وہ نکمیا اونچا کرتا ہوا نیم دراز ہوا تھا اور ساتھ ہی ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا تھا۔

”کل وہاں بھی بالکل خاموش بیٹھی رہی تھیں۔“

”ٹھیک ہوں میں..... بالکل ٹھیک..... بھلا مجھے کیا ہوگا؟“ وہ اس سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی سعی کرتی ہوئی کوہا ہوئی مگر اس سے ہاتھ چھڑانہ سکی تھی۔ بہت مضبوطی سے شاہ ویز نے تھام رکھا تھا۔ انداز میں ملائمت و گرم جوشی تھی۔

مضبوط گرفت میں حدت تھی، شعلوں کی سی۔ مشعل نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا اور نگاہیں جھکا لی تھیں۔

اس کی نگاہوں میں کچھ ایسی ہی وارفتگی وواہانہ پن تھا کہ اس کا دل بے ہنگم انداز میں دھڑکنے لگا۔

”ہوں، بتاؤ نا..... کیوں مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟ کیوں رو رہی ہو؟ کوئی وجوہ ہوگی قہر آلود؟“ اس نے اسے کھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے گہیر لہجے میں کہا۔

اس کی یہ جسارت نہ معلوم غیر ارادی تھی یا وہ سونیا اور سرمد کی ازدواجی خوش حالی، محبت بھری زندگی سے متاثر ہو گیا تھا۔

شادی کے ان سات اٹھ ماہ کے عرصے میں پہلی بار وہ اس سے اس قدر قریب ہوئی تھی۔ اس کی دھڑکنیں منتشر تھیں ہی، اس کے سینے سے سرھکائے اس کی سماعتوں میں شاہ ویز کے دل کی دھڑکنیں بھی خامے زور و شور سے کونج رہی تھیں۔ وہ بھی شدید خطر اب کا ڈھکا تھا۔

وہ جیسے کسی درخت کی ٹوٹی ڈال کی طرح اس کے سینے پر دھری تھی۔ پھر کتنے ہی پل اسی کو لگو کی حالت میں گزرے تھے۔

وہ بے حس و حرکت تھی۔

وہ کوہا منجھد ہو چکا تھا۔

وہاں صرف دھڑکنوں کی صدائیں تھیں اور سانسوں کی بازگشت۔

باہر سے دروازہ ٹاک کیا گیا تو ان جیتے جاگتے مجسموں میں جنبش پیدا ہوئی تھی۔ مشعل آہستگی سے دور ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے سونیا بلیونا کئی میں چائے لئے کھڑی تھی۔

”صبح بخیر۔“ وہ دلکشی سے مسکرائی تھی۔

”صبح بخیر، اندر آئیے۔“ اس نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا تو وہڑے اٹھائے اندر چلی آئی۔

”ہماری چینی دوست صاحبہ کہاں ہیں؟“ وہ سائیز ٹیبل پر پڑے رکھتی ہوئی کمرے میں لگا ہیں دوڑاتی استفسار کرنے لگی جب کہ مشعل دستک کی آواز سن کر ہاتھ روم میں چلی گئی تھی۔ وہ اس وقت ایسے احساس سے دوچار تھی کہ کسی کا بھی سامنا کرنے کا موڈ نہیں رکھتی تھی۔

”آپ کی دوست ہیں..... آپ ان کے بارے میں زیادہ جانتی ہیں کہ وہ اس وقت کہاں جا سکتی ہیں۔“ شاہ ویز نے اس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے کہا۔



”اب مجھ سے زیادہ اختیار آپ کو ہے۔ اب ساری معلومات آپ کو ہونی چاہئیں۔“

”اس سبکیٹ پر آپ کو میں مطمئن نہ کر سکوں گا۔“ اس نے کپ کو منہ لگاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

سونیا نے استعجابیہ نظروں سے شاہ ویز کی طرف دیکھا تھا جس کے وجہ یہ چہرے پر سنجیدگی اسے پُر وقار بنارہی تھی۔ آنکھوں میں خمار آلود سرخی اور لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ کے باوجود وہ ایک ٹوٹا بکھرا شخص لگ رہا تھا۔ ہاتھ روم سے شاہ ویز سے پانی گرنے کی آواز نے مشعل کی وہاں موجودگی کا پتا دے دیا تھا۔ اس نے کپ پر ساسر ڈھانپ دی تاکہ چائے مشعل کے آنے تک ٹھنڈی نہ ہو جائے۔

”آئیے، باہر کا نظارہ کریں۔ رات خوب برف پڑی ہے۔“ اس نے شاہ ویز کو دعوت دی تو وہ اس کے سنگ باہر آگیا۔

رات خوب برف پڑی تھی۔ مکانات کی چھتیں، سڑکیں، گلیاں اور نیچے اونچے درختوں، ننھے منے پھول پودوں پر برف ہی برف پڑی ہوئی تھی۔ لیکن اب آسمان بالکل شفاف تھا۔ دھلے دھلائے صاف و شفاف نیلے آسمان پر سفید براق چھوٹے چھوٹے بادلوں کے ٹکڑے بہت حسین لگ رہے تھے۔ دور افق پر سنہری روشنیوں کا آبشار سا بہہ رہا تھا۔ وہ مہموت سا کھڑا دیکھتا رہا۔

”خوب صورت چیزوں سے آپ کو کچھ زیادہ ہی دلچسپی ہے۔“ سونیا نے کہا۔

”قدرت کی طرف سے ودیعت کیا ہوا ہر شخص ہر آنکھ کو اپیل کرتا ہے خواہ کوئی کتنا ہی بد ذوق کیوں نہ ہو۔ جب ایسے نظارے سامنے ہوں تو کوئی منہ نہیں موزد سکتا۔“ اس نے دھیرے دھیرے سب لیتے ہوئے کہا۔

”ایک بات کہوں؟ آپ ماسٹر تو نہیں کریں گے؟“ سونیا کچھ جھجکتی ہوئی کو یا ہوئی تھی۔ شاہ ویز نے اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

”مشی بھی بے مثال شخص کی مالک ہے، ان نظاروں کی طرح ہی پُر کشش، سحر انگیز، اس کی طرف سے آپ کیوں بے نیازی برت رہے ہیں بلکہ بد ذوقی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔“ سونیا کے مسکراتے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ وہ چونک کر بولا۔

”مشعل نے کچھ کہا آپ سے؟“

”نہیں..... بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں شاہ ویز صاحب جن کی ادائیگی لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ بغیر انداز بیان کے اپنا آپ ظاہر کر دیتی ہیں۔ دراصل انسان ایک معمہ ہے کہ جب اس کو حل کرنے کی سعی کرو تو کوئی سراہا تھ نہیں آتا بلکہ وہ الجھتا ہی چلا جاتا ہے اور بعض اوقات ایسے آسان و سادہ لفظوں سے مزین کتاب بن جاتا ہے کہ بغیر کسی جیل و جھٹ کے ہم اس کا لفظ لفظ ازبر کر لیتے ہیں۔ سطر سطر ہم پر عیاں ہو جاتی ہے اور ہم بنا زبان کو جنبش دیے صرف آنکھ سے ہر بھید، ہر راز سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ مشعل نے مجھ سے کچھ نہیں کہا لیکن اس کے چہرے کی سادگی، آنکھوں میں تیرتی یا سیت، لہجے کی بے چارگی، سراپے کی ویرانی مجھ پر عیاں کر گئی ہے کہ وہ کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ مجھ سے چھپا رہی ہے۔ وہ الجھن بھری تکلیف میں ہے اور یہ سوچ مجھے کل سے بے کل کئے ہوئے ہے۔ مجھے آپ بتائیں، آپ دونوں کے درمیان کچھ مس اندر اسٹینڈنگ ہوگئی ہے؟ وہ آپ کے ساتھ خوش نہیں ہے یا آپ کی طرف سے کوئی بات ہے؟“ سونیا کا فکر مند و از حد پریشان کن لہجہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ مشعل کے ساتھ بہت مخلص و سچی دوستی کا رشتہ رکھتی ہے۔

”یہ سوالات آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟ بہتر ہوگا اسی سے پوچھیں۔“

”بالکل درست کہہ رہے ہیں آپ۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں ضرور مشی سے بھی دریافت کرتی مگر میں حقیقت پسند ہوں، خیالوں و خوابوں کی دنیا سے دور رہتی ہوں۔ انسانوں کا بہت گہرائی سے جائزہ لیتی ہوں اور اسے میری خوش فہمی کہیں یا حسدیت کہ مشعل کے مقابلے میں آپ مجھے ذمے دار، حساس، باشعور و با اعتماد شخص محسوس ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے آپ سے ہی معلوم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مشعل کے حوالے سے آپ بھی مجھے عزیز ہیں۔“

”تعریف و توصیف کا بے حد شکر یہ۔ اتنی ساری باتیں آپ بنا کہے بنا سننے جان گئی ہیں تو اور بھی جان جائیں گی۔ سچ کبھی چھپتا نہیں ہے۔ بہت جلد آپ کو آپ کے سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔ فی الحال ابھی کچھ بھی کہنا مناسب نہیں ہے۔“ شاہ ویز نے کول مول جواب دیا تھا اور سونیا مزید الجھن کا شکار ہوگئی تھی۔



تھپڑوں کی کونج اعلان جنگ کے نثارے کی طرح کونج کر رہ گئی تھی۔ سب ہی اس صورت حال کے زیر اثر ساکت و جامد بیٹھے تھے۔

خرم صاحب سرخ سرخ تھرا آلودنگ ہوں سے بچی کو دیکھ رہے تھے جو دونوں رخساروں پر ہاتھ رکھے باپ کی جانب پھٹی پھٹی حیران کن نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”پا..... پا..... آپ..... نے مجھے..... مارا.....“ پہلے اند ہی کا سکتہ ٹوٹا تھا۔

”یہ آپ کی بد تمیزی کی سزا ہے۔“ ان کا لہجہ بدستور کرخت تھا۔

”سزا..... ہونہ..... اب میں بچی نہیں رہی ہوں جو آپ مجھے ماریں۔“

”میرے لئے تم کل بھی بچی تھیں آج بھی بچی ہو اور تا حیات بچی رہو گی۔“

”یہ آپ کی بھول ہے پا پا! اب ہم بڑے ہو چکے ہیں اور برا بھلا سمجھتے ہیں۔ آپ کا کوئی حق نہیں ہوتا ہم پر ہاتھ اٹھانے کا، سزا دینے کا۔“ عرفان بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور بہن کی طرف داری میں کو یا ہوا تھا۔

”عرفان، تم بہن کو سمجھانے کی بجائے فضول حمایت لے رہے ہو۔“

”اب سمجھنے سمجھانے کا وقت آپ کا ہے پا پا، ہم اس سے گزر چکے ہیں۔“ اندا ان کے قریب اکڑ کر کھڑی ہوگئی تھی اور ساتھ ہی عرفان بھی بگڑے تیور لئے کھڑا تھا۔ ماحول میں وحشت مچنے لگی تھی۔ حرام، نحو و بیٹھی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف چھایا ہوا تھا۔

فرح بھی عجیب کوگو کی کیفیت میں بیٹھی تھیں اور چاہنے کے باوجود بول نہ پا رہی تھیں کہ یہاں بہت نازک رشتہ اور حیثیت رکھتی تھیں۔ اپنی حیثیت کا تعین انہیں چند لمحات قبل ہو چکا تھا اس وجہ سے وہ ان کے ذاتی معاملات میں بولنے کا حق نہ رکھتی تھیں مگر وہ اس وقت سخت الجھن و بے چینی محسوس کر رہی تھیں۔ اس وقت ایک ایسا وجود تھا جو یہاں کی ٹینشن سے بے پرواہ اپنے آپ میں مگن تھا وہ امی حضور تھیں جو سپاٹ چہرہ جھکائے مطمئن بیٹھی تھیں۔

”ماں، باپ اولاد کے لئے فخر و سرت کا باعث ہوتے ہیں۔ راحت و آرام پہنچانے کی نگ و دو میں آخری سانس تک لگے رہتے ہیں اور ایک آپ ہیں پا پا! ماں تو مر گئی ہمیں چھوڑ کر اور آپ نے ہمیں زندہ رہتے ہوئے مردہ تصور کر لیا۔“

”غلط..... بالکل غلط۔ میں نے ہر ممکن طریقے سے تم لوگوں کا خیال رکھا ہے۔ کبھی بھی تم دونوں سے بے خبر نہیں رہا۔ ہاں تم لوگوں نے میری پرواہ کرنی چھوڑ دی ہے۔ تمہاری نظروں میں میری کوئی ویلیو، کوئی پرنسپل نہیں ہے۔“

”آپ کو کس نے مشورہ دیا تھا کہ آپ شادی کریں؟“

”عرفان!“ خرم اتنی زور سے چیخے تھے کہ ان کی آواز کمرے میں کونج کر رہ گئی۔ ”تمہاری یہ جرات گستاخ، بد تمیز، دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔“

”تکلیف ہوئی نا آپ کو انہی نے اس طرح بات کی تو۔ اور آپ کی سیکنڈ میرج کی خبر نے ہمیں بھی اسی طرح تکلیف سے ہل پل زخمی کیا ہے۔ سسرال میں، میں کسی کے آگے سراٹھا کر بات کرنے کے قابل نہ رہی۔ انہی کے سسرال میں بھی لوگ اس کا مسئلہ اڑاتے ہیں۔ عزیز و اقارب ہر کوئی جان پہچان والا ہمیں تسخر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ شادی آپ نے کی اور مذاق ہمارا بن رہا ہے۔“ ندا ابھرے بادلوں کی طرح یکدم برسنے لگی تھی۔ عرفان اس کی تائید میں برابر گردن ہلاتا رہا تھا، کو یا وہ اپنے ساتھ ساتھ اس کے جذبات کی ترجمانی بھی کر رہی تھی۔

”میں نے شادی کی ہے، کوئی گناہ نہیں۔ کیوں تم لوگ ایسا سلوک کر رہے تھے؟“ خرم صاحب کے لہجے میں اب وہ تیشی و مضبوطی نہ رہی تھی۔

”اس عمر میں شادی کر کے آپ نے گناہ سے بڑھ کر گناہ کیا ہے اور مزید یہ کہ اب باپ بنا چاہ رہے ہیں۔“ عرفان کے نفرت سے لہریز لہجے نے انہیں عرق عرق کر ڈالا تھا۔ کہنے سننے کو کچھ نہ رہا تھا، ان کے گرد طوفانی ہوائیں سائیں سائیں کرتی چکرار ہی تھیں۔ وہ تو ہی حوصلہ و بلند سوچ رکھنے والا شخص، آج اپنے خون کے ہاتھوں ریزہ ریزہ ہو گیا تھا کسی مٹی کے کھلونے کی مانند۔

”ہمیں یا اپنی آنے والی اولاد میں سے آپ کو کسی ایک کو چننا ہوگا۔ یا اسے دنیا میں آنے سے قبل ختم کروادیں یا پھر ہم دونوں بہن بھائی کا گلہ دبا کر اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیں تاکہ بعد میں لوگوں کی باتیں و بلی سننے کے لئے ہم زندہ ہی نہ ہوں اور آپ اپنے نئے بیوی بچے کے ہمراہ چین کی بانسری بجائیے گا۔“ ندا عرفان دونوں مل کر بول رہے تھے۔ خرم صاحب کی نگاہیں ان کے چہروں پر تھیں۔ ان کے لبوں سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ کسی نوکیلے خنجر کی طرح ان کے دل میں پوسٹ ہو رہا تھا۔ ان رشتوں سے زخم تو انہوں نے بار بار کھائے تھے مگر آج تو کو یا ان کی نفرت، حقارت، گستاخی و بد تمیزی کے شرمناک مظاہروں نے انہیں قتل کر ڈالا تھا۔

ان کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی تھی۔

خون کی روانی میں ٹھہراؤ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ دل میں ایک دم ہی بھونچال سا آیا تھا۔ درد کی شدت سے ان کا چہرہ متغیر ہوا۔ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ لڑکھڑائے تو فرح اور حرا گہرا کر ان کی طرف بڑھی تھیں اور حرانے لپک کر انہیں سہارا دیا تھا۔

”مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔“ درد کی شدت سے ان کی آواز لرز رہی تھی۔ حرا اور فرح سہارا دے کر انہیں بیڈ روم میں لائی تھیں اور بیڈ پر لٹا دیا تھا۔

”مجھے ڈرتا انہی لمحوں کا۔ ایسے ہی کڑے وقت کا جب میں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی گناہ کا ٹھہرا لیا جاؤں۔ میں نے ساری پلاننگ پہلے کر لی تھی۔“

”آپ باتیں نہ کریں، آپ نے ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔“ حرا ان کا سینہ سہلاتے ہوئے روتے ہوئے کہنے لگی۔

”کرنے دو مجھے باتیں۔ نہ معلوم پھر موقع ملے نہ ملے۔ حالات کیسے ہی ہوں ان لوگوں پر اعتبار مت کرنا۔ میرے بعد یہ لوگ تمہیں بھی زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ میں نے اپنے بچے کے لئے اور تمہارے لئے اتنی جائیداد چھوڑی ہے کہ تم اور وہ ساری زندگی عیش و آرام سے گزار سکتے ہو۔ کاغذات تمہیں پاکستان جا کر مل جائیں گے۔“

یہاں کسی پر بھی اعتبار مت کرنا۔ پرسوں صبح کی تنہا رلی قلاٹ ہے۔ حالات کچھ بھی ہوں، تمہیں یہاں سے ہر صورت نکل جانا ہے۔ یہ میری آخری خواہش ہے۔ اس کا احترام تمہیں ہر حال میں کرنا ہے۔“

موسم سرد تھا۔ اس موسم میں بھی وہ درد کی شدت سے پسینے پسینے ہو رہے تھے مگر درد سے بے پروا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے مسلسل بول رہے تھے۔

”آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ کچھ نہیں ہوگا آپ کو..... ٹھیک ہو جائیں گے آپ۔ ہم ساتھ رہیں گے، ساتھ جائیں گے۔“ حرا ان کے ہاتھوں پر چہرہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

”کاش ایسا ہوتا.....“ ان کی آنکھوں سے بھی پانی بے آواز بہنے لگا تھا۔

کچھ دیر قبل زندگی سے بھرپور روشن نظر آنے والی آنکھیں اب چراغوں کی مدھم لوکی طرح بجھتی جا رہی تھیں۔

بڑی حسرت زدگی سے بلک بلک کر روتی ہوئی حرا کو دیکھ رہے تھے۔ ایسے جیسے آج کے بعد پھر کبھی دیکھ نہ پائیں گے۔

”جی..... را.....“ درد کی شدید ترین لہر اٹھی تھی۔ انہوں نے کرب انگیز لہجے میں حرا کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے پکارا تھا۔ ان کی بگڑتی حالت دیکھ کر حرا نے چیخ کر فرح کو پکارا تھا جو اسی لمحے ڈاکٹر کے ہمراہ اندر داخل ہو رہی تھیں۔ پیچھے پیچھے نداء عرفان اور امی حضور تھے۔ خرم صاحب کی گردن بائیں طرف ڈھلک گئی تھی۔

□●□

”سارہ! کیا سوچ رہی ہو؟ جب سے شرمین کی ڈیجھ کی خبر ملی ہے تم تو بالکل ہی گم سم ہو گئی ہو۔“ فریحہ، سارہ کے پاس بیٹھتی ہوئی کوپا ہوئی تھی۔

”بھابی! کیا شرمین نے سوچا ہوگا کہ جس شخص کے ساتھ اس نے زندگی بھر کا بندھن باندھ رکھا ہے وہی شخص اسے نہایت سفاکی سے زندگی کی روشنی سے موت کے اندھیرے میں پہنچا دے گا۔“ اس کے لہجے میں قنوطی پن تھا۔

”ایسا کوئی سوچ نہیں سکتا، نہ ہی کسی کے عزائم اس کی پیشانی پر لکھے ہوتے ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کی سب سے اچھی مخلوق ہے، بہترین سمجھ سوچ رکھنے والی اعلیٰ و برتر فیصلے کرنے کا حق رکھنے والی۔ لیکن جب تہذیب یافتہ انسان انسانیت کی بلند سطح سے گر کر ذلالت و حیوانیت کے پاتال میں گرتا ہے تو درندوں سے بھی زیادہ درندگی کا ثبوت دیتا ہے اور اس کے اس وحشیانہ طرز عمل سے کئی خاندان ظلم و ستم کا شکار ہو کر سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“

”ہمارے معاشرے میں ایسی وارداتیں، ایسے جرائم روز بروز ہ رہے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی ضد میں اس طرح کی ظالمانہ کارروائیاں کر گزرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی نفرت یا ضد و غصے کی آگ اس طرح سرد کر لیتے ہیں کہ جانتے ہیں اپنے جرم کی سزا سے وہ کہیں اثر و رسوخ استعمال کر کے اور کہیں رشوت سے منہ بند کر کے خود کو بچالیں گے۔“

”جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ شرمین کی زندگی اتنی لکھی تھی وہ گز ار گئی۔ اسے اسی طرح رخصت ہونا تھا، سو ہو گئی۔ بھول جاؤ اسے۔ ہماری زندگی میں لوگ اس طرح آتے جاتے رہتے ہیں۔ کسی دن ہم بھی چلے جائیں گے۔ اس دنیا میں ٹھہرنا کس کو ہے، سب ہی مسافر ہیں۔“ فریحہ اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے رمانیت سے سمجھا رہی تھی۔

”بھابی! باقر کو اگر میں شادی کی اجازت نہ دیتی تو وہ بھی میرے ساتھ ہی سلوک کرتا۔ مرد اپنی منوانے کیلئے ہر قسم کا سلوک روا رکھنا جائز سمجھتے ہیں۔“

”سارہ! تم نے باقر کو شادی کی اجازت کیوں دی اور کب دی؟“ جس بات کو اس نے اپنے اندر بہت چھپا کر رکھا تھا اس وقت جلد بازی میں اس کے ہونٹوں سے عیاں ہو گئی تھی جس کا ادراک ہوتے ہی وہ ہم سہی گئی تھی، مزید گھبراہٹ میں بتلا ان کے سوال نے کر ڈالا تھا۔

”وہ..... وہ..... بھابھی..... وہ.....“

”گھبرا کیوں رہی ہو؟“ اس نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت و اپنائیت سے کہا تو بے اختیار اُلٹ آنے والے آنسوؤں کو نہ روک سکی۔

”مجھ پر یقین کرو۔ میں تمہارے اعتماد کے آئینے کو معمولی سی ٹھیس بھی لگنے نہ دوں گی۔ جو دل میں ہے کہہ ڈالو۔ کیا روگ لگائے بیٹھی ہو؟“

”تم پر بھروسہ کر رہی ہوں بھابی! اماں اور بھائی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ باقر کا فون آیا تھا دو ماہ قبل۔ وہ مجھے طلاق دینے پر آمادہ تھا۔ اس کے گھر والوں نے اس کی دوسری شادی کی مکمل تیاریاں کر رکھی تھیں۔ وہ بھی ہر صورت میں شادی کے لئے بے قرار تھا اور اس نے مجھ سے علیحدگی کی خاطر ہی فون کیا تھا مگر میں نے بڑی منت و سماجت کے بعد اسے راضی کر لیا کہ وہ مجھے طلاق دیئے بغیر شادی کر لے۔“ اس نے کوپا دھماکا کیا تھا۔ وہ ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہی تھیں جس پر ضبط و کرب کے کئی تکلیف دہ رنگ پھیلنے سٹھنے نظر آرہے تھے۔

”ایسا کیوں کیا تم نے؟ اپنی مرضی سے سو کن قبول کر لی؟ تم جانتی ہو عورت سب کچھ بانت سکتی ہے مگر شوہر کی تقسیم برداشت نہیں ہوتی اس سے۔ یہ درد سب سے بڑا درد ہوتا ہے جو برداشت نہیں ہوتا۔ پھر.....“

”میں اس سے بھی بڑے دکھ سے گزر رہی ہوں۔ میرے نزدیک بے اولادی سے بڑا اور ناقابل برداشت دکھ کوئی نہیں ہے۔ اتنے سالوں میں، میں ان کو یہ خوشی نہ دے سکی تو انہیں مزید روکنے کا حق بھی نہیں ہے مجھ کو۔“ وہ صبر و استقلال کی زندہ مثال بنی اس کے سامنے بیٹھی اپنے دھیرے دھیرے بہنے والے آنسو صاف کر رہی تھی اور فریحہ کو اس کے حوصلے و قربانی نے از حد متاثر کیا تھا۔ کتنا بڑا دکھ وہ خاموشی سے سہہ رہی تھی۔

”تم نے سوچا ہے یہ بات کب تک چھپ سکتی ہے؟ کبھی بھی اماں یا اصغر کو معلوم ہو گیا تو وہ طوفان اٹھا کر رکھ دیں گے۔“

”جب اپنی کشتی میں نے اپنے ہاتھوں تا راج کر دی تو اب کسی طوفان کا کیا خطرہ۔ میں سمجھا دوں گی، عیب دار ان کی بیٹی ہے۔“

”دونوں سر جوڑ کر بیٹھ جاتی ہو تو بیٹھ ہی جاتی ہو۔ ارد گرد کا ہوش ہی نہیں رہتا ہے۔ ابھی کچھ دیر اور میں نہ آتی تو وہ نا ہنجار بلی سارا دودھ گرا دیتی۔“ زریں کی تیز آواز سن کر وہ دونوں بری طرح چونکی تھیں۔ سامنے سے وہ ہاتھ میں دودھ کی دپٹی پکڑے فریج کی طرف بڑھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔ سارہ نے پریشان نظروں سے فریحہ کی طرف دیکھا فریحہ نے اشارے سے ہی کہا کہ سب ٹھیک ہے۔ اماں نے کچھ نہیں سنا۔

”بہنو تو پھوہڑ ہے ہی، اب بیٹی بھی اس کے نقش قدم پر چلنے لگی ہے۔ اس مہنگائی نے ہم جیسوں کی تو کمر توڑ دی ہے، تم ایسی لا پرواہی دکھا کر گلا کاٹ دو۔ بڑی محنت کرنا ہے میرا بچہ تب سامان لانا ہے۔ کوئی درختوں پر نوٹ نہیں لگتے کہ توڑے اور لے آئے۔“ وہ حسب عادت شروع ہو چکی تھیں۔

”اماں! دودھ گرم تھا۔ بھابی کہنے لگیں ٹھنڈا ہو جائے گا تو فریج میں رکھیں گی۔ اتنی سی بات ہے بس۔“ سارہ نے حسب عادت وضاحت کی۔

□●□

رکتا بھی نہیں ٹھیک سے چلنا بھی نہیں ہے  
یہ دل کہ تیرے بعد سنبھلتا بھی نہیں ہے  
اس عمر کے صحرا سے تیری یاد کا بادل  
مٹتا بھی نہیں ہے اور برستا بھی نہیں ہے

اس روز موسم کچھ زیادہ ہی خشک ہو رہا تھا، ہوائیں پھولوں کی مہک لئے ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ شام دھیرے دھیرے ماحول پر چھا رہی تھیں اور ہر طرف ایک خواب ناک سا سناٹا بکھیر رہا تھا۔ وہ اس اداس شام میں اس کا ایک حصہ لگ رہی تھی۔ بے ترتیبی و منظر اب تو اس کی زندگی میں بہت عرصہ قبل داخل ہو چکا تھا اب تو وہ اس کی عادی ہو چکی تھی مگر سونیا کے ہاں رہائش سے وہ عجب شش و پنج میں مبتلا ہو گئی تھی۔

شاہ ویز کے سنگ و ہتھا تھی۔ اس کی بے بسی و مصنوعی زندگی کا تماشا دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ کھل کر روتی تھی۔ بے فکری سے اپنا غم مناتی تھی۔ اپنی تہائیوں پر کڑھتی تھی۔ اپنی حسرتوں پر آنسو بہاتی تھی۔

شاہ ویز کا ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ وہ اس کے لئے اپنے ہونے نہ ہونے کا احساس رکھتا بھی نہ تھا۔ وہ رو کر اپنے آنسو خود پونچھ لیا کرتی تھی۔ خود کو تسلی دے کر مٹا لیا کرتی تھی مگر یہاں آ کر وہ جیسے خود کو غیر محفوظ و کمزور محسوس کرتی تھی۔ ہر وقت اس پر خوف مسلط رہا کرتا کہ سونیا اور سردان کی بناوٹی اور کھوٹی زندگی کے بارے میں نہ جان جائیں۔ وہ کس طرح ان کا سامنا کرے گی۔

سونیا اس کے ماضی کی ایک ایک اداسے واقف تھی۔ اس کی دولت، اس کے کرہ خیر، اس کے گھمنڈ سے۔

کچھ بھی تو خفی نہ تھا۔ کس کس طرح سے وہ جنس مخالف کے دلوں سے کھینچتی تھی اور کھیل کر ایک ٹھوکریں اڑا دیا کرتی تھی۔ فلرٹ اس کی ہابی تھی۔

محبت کی فسوں خیزی سے وہ واقف نہ تھی۔

چاہت کی چاشنی اس کے لبوں کو چھو کر نہ گزری تھی۔

کل تک وہ جسم ہی جسم تھی اور آج روح تھی۔ عشق کی روح، محبت کی روح، چاہت کی روح۔

عشق روجوں کا ملاپ ہے۔ روح کوئی توقع نہیں رکھتی۔ وہ توقعات سے بالا ہوتی ہے۔ ہوس کی کوئی تاریکی ان پاکیزہ روشنیوں کے قریب نہیں آسکتی۔

”اوہو..... بہت گہری سوچ ہے بھئی..... کیا سوچا جا رہا ہے؟“ سونیا مسکراتی اس کے قریب بیٹھتی ہوئی کوپا ہوئی تو وہ بھی مسکرا دی تھی۔

”کچھ نہیں..... ایسے ہی بیٹھی تھی۔“ اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

”کچھ نہیں، ایسے ہی ہم ان لفظوں کا استعمال زیادہ ہی کرنے لگی ہو۔“

”بعض اوقات محسوس نہیں ہوتا اور انسان ایک جیسے ورڈز بول دیتا ہے۔“

”اسی محسوس پرتو میں فکر مند ہوں۔ پہلے تو تم ان احساسات کے بحر میں گرفتار نہ ہوتی تھیں خاصی با معنی اور دو ٹوک گفتگو کیا کرتی تھیں۔“ سونیا کے لہجے میں وہی تفتیش و تشویش تھی جس سے وہ بچنے کی سعی میں رہا کرتی تھی۔

”تم تو جانتی ہو اچھی طرح، انسان کبھی بھی یکساں نہیں رہتا۔ وقت و حالات کی طرح وہ بھی بدلتا رہتا ہے۔ مجھ میں آئی تبدیلی نے تمہیں کیوں اس قدر متحیر کر رکھا ہے.....

مجھے سمجھ نہیں آتا۔“

”یہ بات نہیں ہے مشی! میں تمہارا بدلا ہوا رنگ ڈھنگ دیکھ کر بہت زیادہ خوش ہوں اور مطمئن ہوں کہ تمہیں ایسا لائف پارٹنر ملا ہے جس کی رفاقت پر تم جتنا بھی ناز کرو کم ہے۔“

”پھر کیوں ڈسٹرب ہو میری طرف سے؟“

”ان ساری باتوں کے باوجود تم دونوں کے درمیان کوئی ایسی دیوار ہے جو دکھائی نہیں دیتی مگر محسوس ضرور ہوتی ہے۔“

وہ اس کے بالکل درست تجربے پر لمحے بھر کو شرمندگی کے احساس سے کانپ اٹھی تھی مگر اتنی بے وقوف نہ تھی کہ اپنی دکھتی رگ پر اس طرح ہاتھ رکھنے دیتی سو سنبھل کر کوبیا ہوئی۔

”شادی کر کے تم نے خوشنواہ اپنے ٹیلنٹ کو ضائع کیا ہے ورنہ ایک اچھی ڈکٹیٹیو بن سکتی تھیں اور اس طرح تمہیں اپنے لوگوں میں جاسوسی نہ کرنا پڑتی۔“ اس نے ہنسی میں اس کی بات اڑانے کی سعی کی تھی۔

”تم مجھے اس طرح بد دل نہیں کر سکتیں۔ پلیز تم دونوں کے درمیان جو کچھ چل رہا ہے وہ مجھ سے شیکر کرو، ابھی وقت ہے۔ ہم بہت کچھ سدھار سکتے ہیں۔ غلط فہمیاں، رنجشیں دور کر سکتے ہیں۔ اگر وقت گزر گیا تو پھر صرف بچھتاوے رہ جائیں گے۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ پلیز۔“

”تمہیں وہم ہو گیا ہے سونی۔ ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہم اچھی لائف گزار رہے ہیں۔“

”خدا کرے یہ سب میرا وہم ہی ہو۔ تم سدا خوش رہو۔ سچی خوشیوں کے ہمراہ۔“ اس نے محبت سے اس کے گلے میں بانٹیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”سونی! تم میرے بارے میں اتنی فکر مند کیوں ہو؟“

”میں دیکھ رہی ہوں تمہاری شادی کو ابھی اتنا عرصہ نہیں ہوا یعنی تمہارے اور شاہوین کے درمیان لافعلی ہے۔ اتنے بیگانہ تو وہ بھی نہیں ہوتے جن کی شادی کو پچاس ساٹھ سال ہو جاتے ہیں بلکہ سرد کوئی دیکھ لو، ہماری شادی کو دو سال ہونے والے ہیں اور وہ ابھی تک اول روز کی طرح ہی چاہتے ہیں اور اس چاہت میں گزرتے وقت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ایک تم دونوں ہو کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ ایک شمال کی طرف منہ کر کے بیٹھا ہے تو دوسرا جنوب کی سمت میں۔ اب بھی شاہوین بھائی اوپر ٹیرس پر بیٹھے ہیں اور تم یہاں نیچے لان میں اداس بیٹھی ہو۔“ سونیا نے اچھی طرح کھنچائی کی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی تھی۔

”سونیا ڈیئر! کیا ضروری ہے کہ تم لیلیٰ مجھوں بنے رہتے ہو تو ہم بھی لیلیٰ مجھوں بن کر دکھائیں؟“

”مشعل! ارنگ! لیلیٰ مجھوں بن کر دکھایا نہیں جاتا بلکہ محبت خود ہی لیلیٰ مجھوں بنایا کرتی ہے۔ اپنی وے، اس ٹاپک کو ہم کلوز کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ رات ڈنر میں کیا بناؤں؟“

”ہم دونوں مل کر کوکنگ کریں گے، اپنی مرضی سے ڈشز بنائیں گے۔“ وہ کھڑی ہوتی ہوئی پُر جوش لہجے میں کوبیا ہوئی تھی۔

رات کھانے کی ٹیبل پر وہ چاروں جمع تھے۔

”آج کھانے کی خوشبو کچھ مختلف و منفرد ہے۔ آپٹشل کھانا بنو یا ہے کیا؟“ کھانے کے شوقین سرد نے خاصے بے صبرے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹیبل پر موجود ڈشز کے ڈھکنے ہٹاتے ہوئے استفسار کیا۔

”ہوں..... آج مشعل نے یہ سارا اہتمام کیا ہے۔ میں نے صرف سلا دورایتے بنانے میں مدد کی ہے اس کی۔“ سونیا پلیٹیں سیدھی کرتی ہوئی بولی۔

”سرد صاحب! یہاں قریب میں کوئی ڈاکٹر وغیرہ موجود ہیں نا؟“

”خیر میت..... کوئی پرائیم ہے کیا؟“ وہ دونوں میاں بیوی یکدم ہی پریشانی سے کوبیا ہوئے جب کہ مشعل نے ہونٹ بھیجنے لئے تھے۔ وہ اس کے طنز کو سمجھ گئی تھی۔

”ہماری ہیگم کے ہاتھوں سے پکائے کھانے کھا کر ڈاکٹر کی ضرورت ہمیں فوراً پڑے گی۔“ اس نے اس انداز میں کہا کہ وہ دونوں مسکرا دیے۔

”یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ کھانے کی خوشبو بتا رہی ہے کھانا یقیناً لذیذ ہے اور میں تو اس معاملے میں ایکسپٹ ہوں، کھانا سوگھ کر ہی بتا سکتا ہوں کہ کھانا کس کو اپنی کا ہے۔“ سرد نے چکن روسٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ شاہوین نے بھی ڈش سے چکن بریانی پلیٹ میں نکالی جب کہ مشعل سلاؤ، رائیڈ کالج کی پلیٹ و بیالی میں نکال کر دے رہی تھی۔

کچے قیتے کے کباب، بروسٹ، بریانی اور پا لک پیس اس نے خود بتایا تھا۔ ساتھ سونیا کو رکھا تھا کہ اس میں ابھی اعتدال تھا کس کو کتنی دیر پکانا ہے اور کس ڈش میں کتنا سالہ ڈالنا ہے۔ یہ سب اسی کی ہیلپ سے کیا تھا۔ ایک ہفتہ اسے ہو گیا تھا یہاں آئے ہوئے اور اس ایک ہفتے میں اس نے سونیا سے بہت سی گھر داری سیکھ لی تھی۔ کھانے پکانے کی خاصی ترائیک اسے ازبر ہو چکی تھیں۔ آج اس نے عملی قدم اٹھایا تھا اور دھڑکتے دل سے منتظر تھی کہ اس کی کوکنگ کارزنٹ کیا نکلتا ہے؟

”واہ..... فنکشنلک..... کھانا بے حد شیشی ہے۔“ سرد نے تمام ڈشوں سے لقمے لے کر ستائشی لہجے میں کہا۔

مشعل کی بے ساختہ نگاہ شاہوین کی جانب اٹھی تھی جو خاموشی سے کھانے میں مگن تھا جس کے لبوں پر نہ تعریفی جملے تھے نہ چہرے پر ستائش۔ اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔ یہ ستائشی ڈوٹھی جملے وہ اس سے سننا چاہتی تھی۔ سونیا نے نککیوں سے اسے، پھر شاہوین کو دیکھا تھا۔

”بہت لگی ہو یا، جو حسین ہونے کے علاوہ ذالقد و دار کھانے پکانے والی بیوی کے شوہر ہو۔ ورنہ میں نے حسین عورتوں کو صرف ادائیں دکھاتے ہی دیکھا ہے یا ناز اٹھواتے ہوئے۔“ وہ ہر دکھ کے آلو ہوتے ہوں گے۔ شاہوین بھائی جیسے کٹھور مر ڈنیں جو بیوی کی جائز تعریف کرنے پر بھی کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔“ سونیا ٹیٹھے لہجے میں طنز کرنے سے باز نہ رہ سکی تھی۔

”دراصل مجھے موٹی بھدی عورتیں پسند نہیں ہیں اور مشعل کی اس رائٹس کی سلامتی اسی میں ہے کہ تعریف ڈو صیف کی کیلوریز سے دور رکھا جائے۔“ اپنا دفاع کرنا وہ خوب جانتا تھا سچی باتیں بنا کر چکنی مچھلی کی طرح ان کی گرفت سے نکل گیا تھا۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا تھا اور ساتھ ساتھ باتیں بھی چل رہی تھیں۔ سرد اور سونیا دونوں ہی خوب باتیں کرنے کے عادی تھے اور ان کی عادت انہیں خوب بھائی تھی کہ انہیں بولنے کا موقع کم سے کم ہی ملتا تھا۔

□●□

”بھائی جان! حالت دیکھی ہے اپنی، کتنے کمزور ہو گئے ہیں۔ نہ معلوم کیا وجہ ہے جو اپنا محل کی طرح گھر ہوتے ہوئے بھی مہمانوں کے ریٹ ہاؤس میں رہائش پذیر ہیں۔“ رانفہ آج صبح ہی ان کے آفس چلی آئی تھیں۔

”وجہ کچھ نہیں ہے۔ اتنے بڑے گھر میں تنہا کس طرح رہ سکتا ہوں؟“

”یہ کیا بات ہوئی بھائی جان، آپ تنہا کیوں رہیں گے؟“ وہ لمحے بھر تو قف کے بعد کوبیا ہوئیں۔ ”میں ہوں، جو جو ہے آپ کے ساتھ۔ آپ خود کو تنہا کیوں سمجھ رہے ہیں؟ پھر ایک نہ ایک دن مشعل بھی لوٹ آئے گی۔ آپ تنہا کبھی نہیں ہو سکتے۔“ اس وقت وہ قدرے مہربان و شیریں نظر آ رہی تھیں۔

”اب تمہارے بچے کی عادت پڑ گئی ہے۔ تم میری طرف سے فکر مند مت ہو کرو۔“ وہ سادہ مزاج و نرم طبیعت کے مالک تھے، کسی کی زیادتی پر وقتی طور پر ملول و برہم ہو جاتے تھے اور اس شخص سے بات صاف ہوتے ہی تمام ناراضگی و لال حریف غلطی کی طرح مٹ جایا کرتا تھا۔

رانفہ کی طرف سے پہنچائی گئی تمام تکلیفیں و زیا دتیاں ان کے معافی مانگنے پر وہ بھلا چکے تھے لیکن رانفہ نے سگی بہن ہوتے ہوئے بھی ان سے بالکل مختلف مزاج پایا تھا۔ ان کے اندر چالاکی و مکاری اُزدھ تھی۔ گرگٹ کی طرح ماحول دیکھ کر رنگ بدلنے کی عادی تھیں۔ ان کے تمام منصوبے، تمام راستے صرف اپنی بہبود و فلاح کی طرف جاتے تھے۔ خود پرستی اور موقع پرستی میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

”یہ کیسی بات کی آپ نے بھائی جان! آپ کی فکر میں نہیں کروں گی تو کون کرے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ نے میری نادانی و بے وقوفی کو دل سے معاف نہیں کیا۔ آپ ابھی بھی مجھ سے نفرت ہیں۔“ انہوں نے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونا شروع کر دیا۔

”ارے رانفہ! یہ کیا بچوں جیسی حرکت ہے۔ بھلا ایسا بھی ہوتا ہے؟ ہمارے درمیان ناراضگی تھی جو اب ختم ہو چکی ہے۔ بھلا میں اتنا عرصہ کسی غیر سے نفرت نہیں رہ سکتا پھر تم تو میری پیاری بہن ہو۔“ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”بس آپ میرے ساتھ چل کر رہیں، میں آپ کو تنہا نہیں رہنے دوں گی۔ آپ کی صحت کی مجھے اُزدھ فکر ہے۔“

”تمہارے ساتھ..... لیکن صرف دو کمرے ہیں، وہاں گنجائش کہاں ہے؟“ ان کی نگاہوں میں ان کے دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ گھوم گیا۔

”وہاں..... وہاں کہاں گنجائش ہے۔ میں تو مشعل بیلس کی بات کر رہی ہوں، وہاں ہم آرام سے رہیں گے اور جس فلیٹ میں، میں رہ رہی ہوں وہاں تو بھائی جان سایہ ہے کسی کا۔“ وہ آہستگی سے کوبیا ہوئیں۔

”سایہ؟ کیسی باتیں کر رہی ہو رانفہ؟“ وہ بے ساختہ مسکرا اٹھے۔

”پہلے مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ شروع شروع میں جو جو نے مجھے بتایا کہ کوئی اس کے کمرے میں سے قیمتی چیزیں غائب کر رہا ہے۔ میں نے ملازمہ پر نگاہ رکھنی شروع کی مگر ملازمہ ایسی نہ تھی۔ پھر میرے کمرے میں سے میری جیولری، پرفیومز، ڈریسز اور رقم غائب ہونا شروع ہو گئی ہے۔“

”وہم ہے سب تمہارا..... کہیں اور رکھ کر بھول جاتی ہوگی۔“

”نہیں، میں اب تو لا کر میں یا وارڈ روپ لاک کر کے رکھتی ہوں اور لاکڈ میں سے ہی سامان غائب ہو جاتا ہے اور اسی بات سے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کسی پراسرار ہستی کا ہی ہاتھ ہے جولا کے باوجود سامان نکال لیا کرتی ہے۔“

ان کے چہرے پر، لہجے میں حقیقی خوف و وحشت تھی۔ حسن بیگ بھی چند ساعت سوچوں میں مستغرق رہے تھے۔

”میرے خیال میں تم گھر پر ہی آ جاؤ۔ واج مین کے پاس رومز کی چابیاں ہیں وہ لے لیتا۔ میں دفتر سے فارغ ہو کر وہیں آؤں گا۔“

□●□

ایک قیامت تھی جو اچانک اس پر ٹوٹی تھی۔

آخری سانس تک وفا نبھانے کے وعدے کرنے والا احمد وفا کر گیا تھا۔ خرم کی لدی جدائی بجلی بن کر حرا پر گری تھی اور اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر گئی تھی۔

سات ماہ پہلے اس نے شادی کا سرخ جوڑا پہنا تھا۔ بہت محبت و اعتماد کے ساتھ خرم نے اسے زندگی میں شامل کیا تھا۔ اس قلیل عرصے میں اسے صدیوں کی محبت و پیار دیا تھا۔

اس قدر چاہتا تھا اسے، اس قدر اہمیت، وقعت دی کہ وہ اپنی تمام مٹرومیوں کو بھول بیٹھی تھی۔

خرم کی رفاقت میں زندگی زندگی لگنے لگی تھی۔

ابھی تو اس نے خوش رہنا سیکھا تھا۔

ابھی اس کے ہنکھ پر واز سے آشنا ہوئے تھے۔

یہ کیسی آندھی چلی تھی کہ ایک جھونکے میں ہی اس کے ہنکھ توڑ ڈالے تھے۔ آشیانہ اجاڑ ڈالا تھا اور اس کا وجود خزاں زدہ پتے کی مانند ہواؤں میں اڑتا پھر رہا تھا۔

اس کی سرت، عیش و نشاط، خوش کواری زندگی کے دن کتنے کم تھے۔ بالکل بہار کے موسم کی طرح مختصر، اس کے آنسو خشک نہیں ہو رہے تھے۔ وہ خود سے بالکل بیگانہ ہو کر رہ گئی تھی، خرم کی موت نے حالات کی یگیگی کا احساس بھی مٹا دیا تھا۔

کل ڈاکٹر نے خرم صاحب کے ہارٹ فیل کی جیسے ہی تھدیق کی، کمرے میں بھونچال سا آگیا تھا۔ حرا اس صدمے کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ دل و دماغ کو جھٹکا تو فرح کو بھی خرم کی موت سے لگا تھا، خرم کے مردہ جسم کے ارد گرد اند اور امی حضور بیٹھ گئی تھیں۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں مگر کیوں پر حرا کے لئے کوئے وگالیاں تھیں۔ فرح کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح صورت حال کو سنبھالیں۔ ایک طرف مردہ، بہوئی تھا، دوسری طرف بہن ہوش و حواس سے عاری پڑی تھی۔ مستزادان دادی، پوتی کا ہیما نہ رویہ، ان کی بے حسی و خود غرضی نے خرم صاحب کی جان لے لی تھی اور وہ یہ الزام حرا پر لگا رہی تھیں۔ نہ معلوم صورت حال کیا روپ اختیار کرتی اگر عرفان مداخلت نہ کرتا۔ اس نے سمجھا بھجا کر بہن اور دادی کو خاموش کیا اور حویلی نمائنگ کے سب سے آخری حصے میں بنے کمرے میں انہیں پہنچا کر گیا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ وہ محفوظ جگہ پر انہیں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ ان کا غصہ اترتے ہی انہیں یہاں سے نکال لے جائے گا۔ یہ اس کی چال تھی۔ یہ حقیقت اس وقت آشکار ہوئی جب انہوں نے دروازہ کھول کر باہر جانے کی کوشش کی تو باہر سے دروازہ بند ملا۔ کھڑکیوں پر بھی سلاخیں لگی تھیں۔

کھڑکیوں سے باہر ہال نما کمرے میں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں جن میں اناج کی بوریاں بھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ کوئی ذی روح نظر نہ آتا تھا۔ حرا کو رونے کے سوا کچھ نہ سوچ رہا تھا۔

”حرا! خود کو سنبھالو میری بہن۔ حالات کی فزاکت کو سمجھو۔ ہمیں یہاں دھوکے سے قید کر دیا گیا ہے۔ نامعلوم انہوں نے کیا پروگرام بنایا ہے..... کیا چاہتے ہیں وہ۔“ وہ اس کے دوپٹے سے آنسو صاف کرتی ہوئی کوپا ہوئیں۔

”وہ صرف میری موت چاہتے ہیں۔ مجھے مارنا چاہتے ہیں اور کیا چاہیں گے۔ تو مار دیں مجھے۔ خرم کے بعد اب زندہ رہنے کی تمنا نہیں رہی ہے۔ مرنو میں گئی ہوں۔“ وہ ہلک ہلک کر رونے لگی تھی۔

”میں سمجھتی ہوں تمہارا دکھ۔ تمہاری زندگی کی بہاریوں پر خزاں چھا گئی ہے۔ تمام شوخ رنگ روٹھ گئے ہیں۔ زندگی تلخ ہو گئی ہے۔ مگر تمہیں اس زہر کو گھونٹ گھونٹ پینا ہوگا، جینا ہوگا، اپنے لئے نہ سہی مگر اپنے آنے والے بچے کے لئے۔ خرم کی نشتانی کو پرورش کرنے کے لئے۔“

”جب خرم نہ رہے تو.....“

”ایسے مت کہو..... وہ نظروں سے اوجھل ہوئے ہیں، دل سے نہیں۔ اور جو دل میں بستے ہیں وہ دور ہو کر بھی کبھی دور نہیں ہوتے۔ سنبھالو خود کو۔“ فرح نے اس کی بات قطع کر کے دھیرے سے سمجھایا۔

”کس طرح خود کو سنبھالوں آپ! کیا کروں میرے دل میں درد ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا خرم اتنی جلدی مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ وہ شہر سے باہر جانے سے ہفتوں قبل مجھے بتا دیا کرتے تھے۔ اب اتنی دور اچانک چلے گئے۔ کوئی ایسے بھی جاتا ہے؟ وہ بالکل ٹھیک تھے، صحت مند تھے، کہہ رہے تھے تم جاؤ کچھ دنوں بعد میں بھی پاکستان آ جاؤں گا پھر دنیا سے کیوں چلے گئے مجھے چھوڑ کر..... کیوں گئے؟“

صبر کا پیمانہ اس کا لبریز تھا۔ فرح جتنا اسے بہلانے کی تلقین کرتیں، چپ کروانے کی سعی کرتیں وہ اتنا ہی بے قابو ہو رہی تھی۔ وہ اسے صبر کی تلقین کرتیں پھر خود بھی رونے لگتیں کہ ان مختصر سے دنوں میں خرم نے اپنی خوش مزاجی و مہمان نوازی کا بھرپور احساس دیا تھا اور سب سے زیادہ اپنی بہن کو خوش و خرم ان کی سنگت میں دیکھ کر وہ دل سے ان کا استراہم کرتی تھیں۔ ان کی اچانک موت نے فرح کو بھی از حد ڈسٹرب کیا تھا مگر اسے خود کو اور حرا کو بھی سنبھالنا تھا۔ خرم کی ماں اور بچوں کے رویوں نے پہلے ہی اسے دل برداشتہ کر دیا تھا اب یہاں بہانے سے قید کرنے نے پریشان کر ڈالا تھا۔ کل سے اب تک وہ دونوں یہاں قید تھیں۔ کسی نے ان کی خبر تک نہ لی تھی۔ وہ ہر بات سے بے خبر تھیں۔

”حرا! مت ہلکان کرو خود کو۔ جو ہو گیا اسے ہم بدل نہیں سکتے۔ یہ آنسو اب تا حیات تمہارے ساتھ رہیں گے۔ موت ایسی بھی آتی ہے بلکہ موت تو ہمیشہ ہی ہمارے آگے پیچھے رہتی ہے۔ ہم غافل رہتے ہیں اس سے، وہ ہم سے غافل نہیں ہوتی۔ جب بندے کا وقت آ جاتا ہے دیو بچ لیتی ہے۔ انسان کو موت سے غافل کبھی نہیں ہونا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں ناکہ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔

”ان ظالموں نے ان کے آخری دیدار سے محروم کر دیا۔“ حراسسکیوں کے دوران بولی۔ اسی دم باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹیں گزری تھیں۔ وہ دونوں ایک دم چونک گئیں۔ وہ آہٹیں دور جا کر غائب ہوئی تھیں۔

فرح نے خوف زدہ ہو کر بہن کو سینے سے لگا لیا تھا۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ بائیں دیوار کی درمیان کا حصہ دروازے کی مانند ہٹ گیا۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے کوئی تدبیر کرتیں یا کوئی آواز نکالتیں، اس غلا سے ان کا پرانا ملازم بنے میاں داخل ہوا تھا۔

”مالکن! میں آپ کا نمک حلال ملازم ہوں، مجھ سے خوف زدہ مت ہونا۔“ اس نے اندر آتے ہی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟ ہمیں یہاں قید کیوں کیا گیا ہے؟“ فرح آگے بڑھ کر اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”بہت خراب لوگ ہیں جی وہ سب۔ یہاں آپ لوگوں کو قید کر دیا وہاں سب مہمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ آپ ان کا سب روپیہ، زیور اور نامعلوم کیا کیا لے کر بھاگ گئی ہیں، اسی صدمے میں صاحب کی موت ہو گئی ہے۔“ بنے میاں کے انکشاف پر وہ دونوں ہی بھونچکا رہ گئی تھیں۔

”کیسے بے ضمیر و بے ایمان لوگ ہیں..... ایسے بہتان باندھتے ہوئے ان کے منہ کیوں نہیں ٹوٹ گئے۔ کتنے بدنیت اور بد احساس لوگ ہیں۔“ حرا کے زہموں پر کوپا نمک چھڑک دیا گیا تھا۔ درد و کرب سے وہ ہلہلا گئی تھیں۔

”مالکن! ابھی بہت بروقت ہے۔ ان لوگوں کے ارادے بہت خطرناک ہیں۔ صاحب کو آج دوپہر میں پیردخاک کر چکے ہیں۔ مہمانوں سے گھر بھرا ہوا ہے، کل تک سب چلے جائیں گے تو وہ آپ کو مار کر کہیں دفنادیں گے۔ وہ لوگوں کے جانے کے انتظار میں ہیں تا کہ کوئی ان پر شک نہ کرے۔“

”تمہیں یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئیں؟ اور ہم کس طرح تم پر یقین کر لیں؟ تم بھی تو اس گھر کے ملازم ہو اور پھر جس طرح یہ خفیہ دروازہ کھول کر تم آئے ہو اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تم ہر جگہ سے واقف ہو اور یقیناً تم ان سے ملے ہوئے ہو گے۔“ فرح دل کے خدشے کو زبان پر لے آئی تھیں جسے سن کر وہ ادھیڑ عمر ملازم ہاتھ جوڑ کر گر گر کر آ کر کوپا ہوا۔

”مجھ غریب پر شک کر کے آپ میری وفاداری کو داغ دار مت کریں بیگم صاحب! میری پچیس سالوں سے اس خاندان کی خدمت کرتی آرہی ہیں۔ وفاداری ہماری رکوں میں خون کی طرح دوڑتی آرہی ہے۔ ہم موت سے ڈکا ہیں ملا سکتے ہیں مگر اپنے مالکوں سے غداری نہیں کر سکتے۔“ بوڑھے ملازم کے لہجے میں وفا و یقین کی مضبوطی تھی جو فرح کو اطمینان دلا گئی تھی۔ ویسے بھی حالات ایسے تھے کہ کسی پر تو اعتبار کرنا ہی تھا۔

”بڑے مالک کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ ان احسانات کا بدلہ تو میں نہیں اتا رسکتا مگر میں چھوٹے مالک کو آپ کا خون کرنے نہیں دوں گا۔ میں مالک کے کمرے کی صفائی کر رہا تھا جب میں نے سنا تھا۔ وہ سب مل کر آپ دونوں کو مارنے کی باتیں کر رہے تھے۔ ساتھ ان کے ندابی بی کے خاوند اور عرفان صاحب کی بیوی بھی شامل ہیں۔ بلکہ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ وکیل کو بھی خرید چکے ہیں۔ ان سے ہی میں نے سنا تھا کہ آپ لوگوں کو یہاں قید کر رکھا ہے۔ بس میں موقع کی تلاش میں لگ گیا اور یہاں آ گیا کہ ہر جگہ سے واقف ہوں۔“

”کیا تم ہمیں یہاں سے نکال کر ایئر پورٹ پہنچا سکتے ہو؟“

”میں آپ کو یہاں سے نکالنے کے ارادے سے ہی آیا ہوں۔ اللہ ہماری مدد کرے گا، ہم پہنچ جائیں گے وہاں تک انشاء اللہ۔“

”لیکن ہمارا نکلتا اتنا آسان ہے؟ عرفان ہمیں قید کر کے مگرانی سے غافل کس طرح ہوگا؟“ حرا دھیسے سے بولی۔

”بنے میاں! تم نے دیکھا ہے باہر کوئی ہے پھر یہ اری پر؟“ فرح مخاطب ہوئی تھیں۔

”باہر کوئی نہیں ہے، پھر عرفان صاحب کہہ رہے تھے کہ وہ نہیں چاہتے کسی طرح بھی آپ لوگوں کا کسی کو معلوم ہو۔ لوگ یہی سمجھیں کہ آپ روپیہ، زیور لے کر فرار ہو گئی ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے کسی پر بھی اعتبار نہیں کیا ہے۔ اگر کسی ملازم کو پھر پر لگاتے تو انہیں ڈر ہے یہ بات کسی نہ کسی طرح ضرور باہر پہنچے گی اور اسی وجہ سے انہوں نے مگرانی کے لئے کسی کو نہیں رکھا۔“



انہوں نے کچھ دیر مزید تاریکی پھیلنے کا انتظار کیا تھا۔ رات جب گہری ہو گئی تو وہ دبے قدموں سے بنے میاں کے ساتھ اس قید خانے سے نکل گئی تھیں۔ آسمان پر اس کے نصیب کی طرح سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ ہواؤں میں خشکی رچی ہوئی تھی۔ چراگے آنسو پھر رواں ہو گئے تھے اور دل نوہ کنناں تھا۔

□●□

شاہ وزیر نے کٹھنیوں سے مشعل کی جانب دیکھا، میرون اور بلیک کنٹراسٹ سوٹ میں شانوں پر بال بکھرائے وہ بے کل بے کل سی اس کے ارد گرد گھوم رہی تھی جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو اور کہہ نہ پا رہی ہو۔

”کچھ کہنا ہے؟“ اس سے زیادہ مشعل کی بڑبڑاہٹ برداشت نہ ہو سکی تھی۔

”ہاں..... ہم یہاں سے کب چلیں گے؟“ وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے کوپا ہوئی تھی۔

”جب تم کہو، میں تیار ہوں۔“

”آج شام تک۔ میرادل نہیں لگ رہا، مجھے پاپا شدت سے یاد آرہے ہیں۔ میں کسی قیمت پر یہاں رکنے کو تیار نہیں ہوں۔“ بہت عرصے بعد اس کے لہجے میں بے قراری وہٹ دھری آئی تھی۔

”میں تیار ہوں، تم اپنی فرینڈ سے اجازت لو تب تک میں سیٹ کنفرم کروالیتا ہوں۔“ وہ موہا بل ہاتھ میں لے کر نمبر پش کرنے لگا۔ وہ سونیا کے روم میں آگئی جہاں سونیا نماز پڑھ کر جا نماز لپیٹ رہی تھی۔

”تم نماز پڑھتی ہو ریگولر؟“ مشعل صوفے پر بیٹھتے استعجابیہ لہجے میں کوپا ہوئی تھی۔ اس سے قبل بھی اس نے سونیا کو کئی بار نماز ادا کرتے دیکھا تھا۔

”ہاں..... اب عادت ہو گئی ہے۔“ وہ دوپٹہ کھول کر عام طریقے سے اوڑھتے ہوئے بولی۔

”پہلے تو تم کو کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا؟“

”سرمد کی فیملی ماڈرن ہونے کے باوجود مذہب سے بے حد قریب ہے۔ سرمد خود نماز پابندی سے ادا کرتے ہیں اور مجھے بھی تلقین کرتے ہیں۔“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کوپا تھی۔

”شاہ وزیر بھی نماز پابندی سے پڑھتے ہیں، مجھے بھی انہوں نے کئی بار کہا مگر میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ مگر میں نے نوٹ کیا ہے جو لوگ نماز پڑھتے ہیں ان کے چہرے بڑے فریش نظر آتے ہیں۔ ان چہروں پر ایسا حُسن، ایسا عجیب نکھار و کشش نظر آتی ہے جو کسی میک اپ سے نہیں آتی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

”نماز پڑھنے سے بہت سکون ملتا ہے، نماز پانچ وقت کی ہوتی ہے اور جب انسان پانچ وقت وضو کر کے اپنے مالک و خالق کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے تو اللہ کی رحمتیں و نور کی بارش بندے پر برکتی ہیں جو اسے روحانی و جسمانی طور پر آسودہ و خوش حال کر دیتی ہیں۔ ہر غلاظت و نحوست سے پاک کر دیتی ہیں۔ یہ جو تم کو خوب صورتی و کشش نظر آتی ہے یہ نور ہوتا ہے۔“

”میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ کیا اللہ مجھے معاف کر دیں گے؟“ وہ بچوں کی سی معصومیت سے کوپا ہوئی۔

”اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں۔ اللہ کا در ہمیشہ وار ہوتا ہے، وہ اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوتا۔ وہ ہمہ وقت بندوں کے پکارنے کا منتظر رہتا ہے۔ وہ ہمیں ستر ماؤں سے زیادہ چاہنے والا ہے۔“

”ارے بھئی! کچھ سنا تم نے؟ یہ ہمارے مہمان جانے کے لئے تیار ہیں۔“ سرمد کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ساتھ ہی دوسرا ہاتھ شاہ وزیر کا بھی پکڑا ہوا تھا۔

”کہاں جا رہے ہیں؟“ سونیا، مشعل اور شاہ وزیر کی جانب دیکھتے ہوئے حیرانگی سے کوپا ہوئی تھی۔

”میں تم سے اجازت لینے آئی تھی اور باتوں میں بیٹھ گئی۔“ مشعل نے مسکرا کر کہا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ وہ حیران تھی۔

”کراچی..... پاپا کے پاس۔“

”میں ابھی نہیں جانے دوں گی اتنی جلدی۔“

”میں پھر آؤں گی۔“

”آپ تنہا کیوں، شاہ وزیر کو ساتھ نہیں لائیں گی؟“ سرمد فوراً مخاطب ہوا۔ اس کے سوال نے لمحے کو مشعل کو بوکھلا ڈالا تھا جب کہ شاہ وزیر کے لبوں پر گہری مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہوئی تھی۔

”سرمد! آپ کو بال کی کھال نکالنی آتی ہے۔ اس کے کہنے کا مقصد یہی تھا۔“ سونیا نے اس کی حمایت لے کر مشکل آسان کر دی تھی۔

وہ دونوں میاں بیوی انہیں چھوڑنے ایئر پورٹ تک آئے تھے اور سرمد اور شاہ وزیر خوش گپیوں میں لگے رہے تھے۔

سونیا اسے سمجھاتی رہی تھی۔ آخری وقت تک یہ معلوم کرنے کی سعی کرتی رہی کہ ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے وہ اسے بتا دے تاکہ معاملہ سنبھالا جاسکے اور وہ مسکرا کر اس کے ہر خدشے کی نفی کرتی رہی تھی۔

جہاز قذافی کر گیا تھا۔ وہ دونوں اپنی سیٹوں پر ایڑی طریقے سے بیٹھے تھے۔ شاہ وزیر بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ خاصی دیر گزر جانے کے بعد بھی جب اس کی چپ نہ ٹوٹی تو مشعل کو وحشت محسوس ہونے لگی۔ وہ مخاطب ہوئی۔

”ہم پہلے پاپا کے پاس جائیں گے یا بے جی کے پاس؟“

”تم اپنے راستے جانا، میں اپنے راستے جاؤں گا۔“ اطمینان سے جواب ملا۔

”کیا مطلب؟“ اس کا دل بری طرح دھڑکا۔

”مطلب بالکل واضح ہے۔ میں اپنی بے جی کے پاس تم اپنے پاپا کے پاس۔ حسن صاحب کو میں نے کال کر کے تمہاری بے تابی و بے قراری کا بتا دیا ہے۔ اتنے ہی بے قرار و بے چین وہ بھی تم سے ملنے کے لئے ہیں۔“ اس کے لہجے میں اتنی بیگانگی و لاتعلقی تھی جیسے وہ اس سے کوئی رشتہ نہ رکھتا ہو۔ اتنے دنوں کی رفاقت کوئی معنی نہ رکھتی ہو۔ دو ٹوک انداز میں اس نے علیحدہ راستوں کا بتا دیا تھا۔ وہ نادان یا کم عقل نہ تھی جو اس کی باتوں کے معنی نہ سمجھ سکتی تھی۔

عورت کی جیت تو یہ ہوتی ہے کہ مرد کا دل موہ لے نہ کہ وہ اس سے چھٹکارا پانے کی تدبیریں سوچے۔ اپنے من پسند مرد کے لئے عورت کتنی قربانیاں دیتی ہے، کتنے دکھ اٹھاتی ہے، کتنے روپ دھارتی ہے اور وہ بے احساس، بے قدر کچھ نہ سمجھے، کوئی قدر نہ کرے۔ آخر عورت کو جیتنا بھی ایک کمال ہے، ایک اعزاز ہے۔ اگر عورت نکاح کے تین بولوں سے اسیر ہو جائے تو کوئی عورت طلاق نہ لے۔

”میری زندگی میں بہت سے مرد آئے مگر تم جیسا نہیں آیا شاہ وزیر! تم جو دولت کو ٹھوکر میں رکھتے ہو، آن، بان، شان سے جینا جانتے ہو، تم جیسے مرد کو سخر کرنے میں بعض اوقات جان سے گزر جانے کو دل چاہتا ہے لیکن تم کہاں سمجھو گے میری دلی کیفیت؟“ سوچوں کے درمیان ایک طویل آہ اس کے لبوں سے خارج ہوئی تھی۔

”تم نے مجھ سے بار بار آزادی کا مطالبہ کیا تھا اور ہر بار میں نے تمہیں یہی کہا تھا کہ جب تک تمہیں انسانیت سے روشناس کرا کے رشتوں کا احترام نہ کروادوں تب تک تمہیں آزادی نہیں کروں گا۔“ وہ اپنی گہیر آواز میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”یہ..... یہ کون سا موقع ہے اس گم گشتہ بات کو یاد کرنے کا؟“ وہ دل و جان سے لرز کر رہ گئی۔

”میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ تم اپنا عزم بھول جاؤ گی مگر میں اپنا وعدہ یاد رکھوں گا۔ میں وعدے کا پکا ہوں، میری یادداشت قابل رشک ہے۔“

مشعل کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ نہیں آرہا تھا وہ کہاں ہے؟ کیا دیکھ رہی ہے؟ اسے کیا کرنا چاہئے اور کہنا چاہئے؟

”تو آج.....“ وہ پر اسرار انداز میں مسکرایا۔ ”میں آپ کو آپ کی آزادی لوٹا رہا ہوں، آپ نے واقعی ایک بہترین قابل فخر عورت بن دکھایا، بڑی محنت کے ساتھ زندگی کا قرینہ سیکھا، بڑے نظم و ضبط، صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ ہر وہ ناپسندیدہ کام کیا جو کبھی خواب میں بھی نہ کیا ہوگا اور بت کر دیا کہ ہر برے انسان کے اندر اچھا انسان چھپا ہوتا ہے جس کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح ایک پتھر کو قابل جوہری تر اش خراش کر قیمتی و نایاب بنا دیا کرتا ہے اسی طرح تمہیں بھی ایک گائیڈ کی ضرورت تھی۔ کچھ عرصہ قبل حسن بیگ صاحب نے جس قدر شرمندگی و خجالت سے تمہیں مجھے سونپا تھا، تمہارے مزاج، تمہاری تربیت، تمہارے ایٹنیٹیوڈ نے جس قدر انہیں ٹینس و فکر مند کر رکھا تھا، ان کی پریشانی ان کا درد محسوس کر کے تب ہی میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں اس قابل بناؤں گا کہ وہ بہت فخر سے تمہارے متعلق سوچ سکیں، تعارف کروا سکیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ آج موڈ اس کا بہت خوشگوار و دوستانہ تھا۔ اس سے چھٹکارا پانے کی خوشی میں اس کا انگ انگ کھل رہا تھا۔ وجہ یہ چہرے کو شفاف مسکراہٹ نے روشن کر رکھا تھا۔

جدائی کا دکھ۔

علیحدگی کا رنج۔

کہیں سے بھی ظاہر نہ ہو رہا تھا جب کہ اس کا دل بند ہوتا جا رہا تھا۔

آگھوں میں رہا دل میں اتار کر نہیں دیکھا

کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

پتھر مجھے کہتا ہے میرا چاہنے والا

میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

”میں نے آپ پر ایک مہر بانی کی ہے مائیں یا نہیں مائیں، میں نے آپ کے ساتھ جسمانی تعلق نہیں رکھا، جسمانی تعلق رشتے کی مضبوطی کے لئے، محبت کی پختگی کے لئے قائم کئے جاتے ہیں۔ محض حیوانی جذبات کی تسکین کے لئے ہرگز نہیں اور بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ جسم کا تعلق جذباتی وابستگی کا سبب بن جاتا ہے۔ میں نے کبھی بھی حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی تنہائی کی قربت سے فائدہ اٹھانے کی سعی نہ کی۔ حالانکہ میں ایسا چاہتا تو آپ کی طرف سے ایسی کوئی پابندی نہ تھی مگر میں دل کے رشتوں کے ساتھ ہی جسم کے تعلقات کو پروان چڑھانا چاہتا ہوں۔“ وہ چپ ہو گیا۔ کويا اب کچھ سننے سنانے کو باقی رہا نہ ہو۔ لفظ گم ہو گئے۔ سب کو پائی کھو بیٹھے تھے۔ سب کچھ فنا ہو گیا تھا۔ ان کا تعلق نہیں، ایک کا بچ کا گلہ ان تھا جو ایک ٹھوکر میں ہی کرچی کرچی ہو کر نکھر گیا اور وہ ساری کرچیاں اس کے دل میں پوستان ہو گئی تھیں۔ اسے ہر سمت اپنا نظر آ رہا تھا۔ ہر سمت، ہر شے پر لہو تھا۔ اس کے ارمانوں کا، خواہشوں کا، آرزوؤں اور وفاؤں کا۔ اس نے درہمیری نظروں سے شاہ ویز کی جانب دیکھا جو سیٹ سے سرٹکائے آنکھیں بند کئے آسودہ تھا۔

ایک بار، دوبار، کئی بار اس نے شاہ ویز کی جانب دیکھا تھا۔

وہ کويا دل کی پیش بجا کر بے خبر، بے فکر ہو کر مزے سے آنکھیں بند کر کے طمانیت حاصل کر رہا تھا یا شاید ایک ٹنگ کر رہا تھا سونے کی۔ اس کے چہرے پر چھائی آسودگی و سرشاری مشعل کو بھسم کر رہی تھی۔ اس کے لبوں سے نکلنے والے لفظوں نے اسے وحشتوں کے صحرا میں متوحش بھٹکا ڈالا تھا۔ وہ کويا کانٹوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

کائنات کی ہر شے میں تغیر ہے خواہ وہ جاندار ہوں یا بے جان۔ وقت، موسم، ماحول اور حالات، یہ سب تغیرات کے مراحل سے گزرتے ہیں، گھومتے ہیں۔ اسی طرح جس طرح زمین اپنے مدار کے گرد چکر لگاتی ہے اور کئی تغیرات وجود میں آتے اور جاتے رہتے ہیں۔

صبح، دوپہر، شام، سردی، گرمی، خزاں، بہار، بارش..... اسی طرح انسان بھی کائناتی نظام کا ایک خاص اور حساس حصہ ہے اور اپنے اندر یہ تمام تبدیلیاں رکھتا ہے اور وقت و حالات کے مطابق ان کا استعمال کرتا ہے۔ مشعل کے اندر بھی یہ تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ کل وہ شاہ ویز کو سخت ناپسند کرتی تھی اور آج اس کے سوا اس کی کوئی پسند ہی نہ تھی۔ کل وہ اس کے ساتھ ایک پل رہنا کوارہ نہ کرتی تھی اور اب اسی کی جدائی اس کے لئے سوبان روح تھی۔

وہ ایسا پرندہ تھی جو اپنے صیاد کی شیدائی ہو گئی تھی اور رہائی پا نا نہ چاہتی تھی۔

شاہ ویز۔ بے خبر سو رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی اسے شاہ ویز کی جدائی کا سوگ منانا چاہئے یا پاپا سے ملنے کی خوشی؟

لیکن نامعلوم کیا ہوا تھا، پاپا سے ملنے کے لئے وہ جس طرح تڑپتی، بے چین رہی تھی اب جب کہ ان سے ملنا کچھ دیر بعد تھا تو وہ بے چینی، وہ اضطراب و انتظار نہ رہا تھا۔ احساسات و جذبات پر ٹھنڈی کھر چھا گئی تھی۔ اس کی ساری حسیات، تمام توجہ و شوق کا محور نقطہ وہ بے حس شخص ہو گیا تھا جو اس کے اندر وحشتیں جگا کر بے نیاز کر گیا تھا۔ ”اے کہاں گم ہو؟ کیا ٹیلین سے باہر جانے کا ارادہ نہیں ہے؟“ اندر ہی اندر جلتے بجھتے وہ غنودگی میں ہو گئی تھی۔ جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ مسافر اتر رہے تھے۔

شاہ ویز اسے مطلع کر کے خود بھی اٹھ گیا تھا جب کہ وہ بیٹھی ہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ اس نے دوبارہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ڈونٹ نیچ می۔“ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا بھاری ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر سخت لہجے میں کہا تھا۔

”ابھی ہمارے درمیان رشتہ موجود ہے۔“ اس نے حیرانگی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بتایا تھا۔

”ہونہہ..... جس رشتے کی دیواریں کھوکھلی ہیں اور چھت کسی لمحے منہدم ہونے کو ہے۔“ اس کے سکون، اطمینان و بے فکری نے اسے سگا ڈالا تھا۔ وہ اس سے چھٹکارا پا کر جس راحت و مسرت سے سرشار تھا، اسی کیفیت نے از حد غمگین و اداس کرنے کے علاوہ بے کل و متنفر بھی کر دیا تھا جس نے ان لمحوں میں اس کو ترش رو بنادیا۔

”اوکے، ایز یوش۔“ اس نے بے پرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا اور کھڑا ہوا تو اسے بھی اس کی تھلید کرنی پڑی۔

حسن صاحب کے انداز میں بے حد بے قراری و محبت و چاہت کا بے کراں سمندر موجزن تھا۔ متاع حیات حیا کی طرح انہوں نے مشعل کو سینے سے لگایا تھا۔

وہ بھی کسی معصوم بچے کی طرح بھاگ کر ان کے سینے سے لگی تھی۔ اشکوں کا سیلاب جو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا تھا، وہ ان کے سینے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کی زبان پر ایک ہی لفظ کی ٹکرائی تھی۔ پاپا، پاپا..... اس کا انداز و الہانہ محبت و بے پناہ چاہت کا غماز تھا۔ ایک عرصے کی جدائی کے بعد وہ ان سے ملی تھی۔ حسن بیگ کے لئے بھی یہ جدائی ایک اذیت ناک تکلیف تھی۔ اب ملنے پر اسے سینے سے لگائے دائیں ہاتھ سے سرسہلاتے ہوئے فرط جذبات سے ان کی آواز رندہ گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ شاہ ویز ملاپ کے ان جذباتی لمحات سے از خود دور چلا گیا تھا۔ حسن صاحب سے وہ مشعل سے پہلے ہی مل چکا تھا۔

”میرے پاس آگئی ہو، اب جب تک دل چاہے میرے پاس رہنا۔ شاہ ویز سے میں پہلے ہی اجازت لے چکا ہوں اور اس نے بے خوشی اجازت دے دی ہے کہ تم جب تک مرضی ہو میرے پاس رہ سکتی ہو۔ اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

”مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا ان کی اولین کوشش تھی۔ اب تو وہ حسن آزادی منارہا ہے مجھ سے نجات پانے کی خوشی میں۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ بڑے زہر خند انداز میں اس کی سوچ ابھری تھی۔

”اوکے بیگ صاحب، مجھے اجازت دیں۔ بے جی شدت سے انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ پارکنگ میں موجود کويا ہوا تھا۔

”ہم آپ کو گھر ڈراپ کر دیں گے۔“ انہوں نے خوش دلی سے کہا تھا۔ مشعل سے ملنے کے بعد ان کے چہرے پر مسرت کی سرخی زندگی بن کر دوڑنے لگی تھی۔

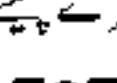
”تھینکس، آپ کا راستہ الگ ہے اور میرا الگ، خواہ مخواہ آپ کو زحمت دینا مجھے کوارہ نہیں ہے۔“

”زحمت کیسی..... کارڈ رائیور، ڈرائیو کر رہا ہے۔“

”کوئی بات نہیں پاپا..... اگر یہ اپنے راستے پر تنہا جانا چاہتے ہیں تو ان کی مرضی..... جس طرح میں آپ سے ملنے کو بے قرارتھی اسی طرح یہ بھی بے چین ہیں۔ مت اصرار کریں، جانے دیں۔“ مشعل جانتی تھی اس کی نا، کبھی ہاں میں نہیں بدلتی خواہ مخواہ اصرار و انکار میں وقت برباد ہوگا۔

”اوکے بیٹے، اللہ حافظ۔“ انہوں نے ہاتھ ملایا تھا اور وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ملاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے اخلافا بھی مشعل کی طرف نظر نہ ڈالی تھی جب کہ وہ اس کی ایک نگاہ کی منتظر بیٹھی تھی۔

وہ قدم بہ قدم اس سے دور ہوتا جا رہا تھا اور اسے اپنے ارد گرد اندھیرے ہی اندھیرے پھیلنے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا ہر دور ہوتا قدم اسے کويا زندگی سے دور کر رہا تھا۔



آسمان پر چھائے گہرے بادل اس کی آنکھوں کی طرح برسنے لگے۔ ماحول پر چھائی وحشت، اُداسی و ویرانی اس کے اندر کا منظر پیش کرنے لگی۔ تیز بھیگی ہوا کے تھپڑے اس کی سسکیوں و آہوں کا ساتھ دے رہے تھے اور سردی کے نچ بستہ موسم میں برستی یہ بارش بھی اس کے دل میں بھڑکتی آگ کو سرد کرنے میں ناکام تھی۔

بنے میاں اور فرح از حد محتاط و چوکنا انداز میں قد آور کھیتوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ سخت سردی سے ان کے جسم شل ہو رہے تھے۔ عرفان کے خوف سے بہت ہراساں و خوفزدہ آگے بڑھ رہے تھے۔

حرا ہر خوف و احساس سے عاری آنسو بہاتی ان کے ساتھ ٹھسٹ رہی تھی۔ فرح نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا ورنہ اندھیرے اور بارش کے پانی سے بھر جانے والے گڑھوں میں وہ کئی بار گر تے گرتے پگی تھی۔

قدرت کوئی پلان بناتی ہے تو اسے بگاڑنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ پراسرار طریقے سے ہر کام خود بہ خود ہو جاتا ہے۔ ان کی زندگیاں اللہ کو بچانی تھیں سو وہ اتنے خطرات و مشکلات سے نکل کر بنے میاں کی ہمرای میں ایئر پورٹ تک پہنچ گئیں اور محفوظ طریقے سے پاکستان آگئیں جہاں منصور نے انہیں خوش آمدید کہا۔ کراچی آئے ہی اس نے اپنی دوست کے ہسپتال میں حرا کا مکمل چیک اپ کرایا۔ جن حالات و صدمے سے وہ گزر کر آئی تھی وہ ٹینشن ماں اور بچے دونوں کے لئے خطرناک تھی کہ حرا کا بی بی لیول شوٹ کر گیا تھا۔

ایک ہفتے تک اسے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا تھا جہاں بہترین ٹریٹمنٹ کے بعد اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو اسے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا۔

فرح اور منصور اس کی بڑے خلوص کے ساتھ دیکھ بھال کر رہے تھے۔ دو ہفتے بعد اس کی طبیعت بہتر ہوئی تو وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ یہاں لاکر بھی ان کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ ایک ماں کی طرح اس کی دلجوئی کرتی تھیں۔ فرح بے اولاد تھیں اور سسرال میں بھی کوئی عزیز نہ تھا جسے حرا کے یہاں رہائش یا ان کی محبتوں و خدمتوں پر کوئی اعتراض ہوتا۔ منصور بھی ان مردوں میں سے نہ تھے جن کو سسرالیوں سے کوئی بغض یا خار ہوتا ہے بلکہ وہ حسب توفیق حرا کا خیال رکھ رہے تھے۔

”کیا سوچ رہی ہو حرا؟ اب تو خاموشی تو زردو۔ میرا دل چاہتا ہے تم سے باتیں کرنے کو، تمہاری آواز سننے کو۔ گھر کی اس خاموشی سے میں پاگل ہونے لگی ہوں۔ دو ماہ سے منصور کی مصروفیات بھی اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ وہ مجھے نا تم ہی نہیں دے پا رہے۔“ وہ حرا کے نزدیک بیٹھتے ہوئے افسردہ سی بولیں۔

”دل بھر گیا ہے مجھ سے؟ آپ کہتی تھیں مجھ سے کبھی گھبرائیں گی نہیں؟“ وہ آہستگی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“

”خرم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو ہر رشتے پر سے میرا اعتبار ختم ہو گیا ہے۔“

”خرم پر آ کر سب رشتے ختم نہیں ہو جاتے حرا..... خرم سے رشتہ ہمارے بعد جڑا ہے اور تم نے سب رشتوں کو فراموش کر کے صرف ایک رشتے کو یاد رکھا ہے۔ میری محبت اور خلوص کو تم نے ٹھیس پہنچائی ہے اور خرم کی محبت کو بھی تم نے نہیں بخشا۔“ انہوں نے نرم لہجے میں اس کی کھنچائی کی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ حرا کا انداز استعجابیہ تھا۔

”اپنی اولاد کے بدترین سلوک نے خرم کو ہلاک کر دیا تھا۔ مرنے کے بعد تمہارا سلوک انہیں بے سکون رکھے ہوئے ہے۔ مجھ رہی ہو تم؟“

”میرا سلوک..... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”خرم کی خواہش تھی تم اور تمہارا بچہ خوش و خرم رہو، ہر پریشانی و دکھ سے بچانے کی خاطر انہوں نے تمہیں یہاں بھیجے کا پلان ترتیب دے ڈالا تھا۔ پھر مکمل تیاری بھی ان کی بے لوث و شدید محبت کی کواہی ہے۔ وہ ہر رشتے پر تمہاری خوشی اور اپنے بچے کی سلامتی کو فوقیت دیتے ہیں اور ان کی محبت بلکہ دلی وابستگی کا ثبوت ہے کہ تم آج یہاں خیریت سے بیٹھی ہو ورنہ جانتی ہو ہمارے زندہ بچ جانے کا چانس ہی نہ تھا۔ یہ سب اس شخص کی دوراندیشی کا نتیجہ ہے جو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ ورنہ ہماری تو قبروں کا نام و نشان بھی کسی کو نہ ملتا۔“ فرخ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے رسائییت سے سمجھا رہی تھی اور حرا کی آنکھوں سے رم جھم برہ کھارے گئی تھی۔

خرم کی یادوں کے چراغ اس کے اندر ہمہ وقت روشنی نکھیرتے رہتے تھے۔ وہ اس روشنی سے اپنی اندھیر دنیا کو آخری سانس تک روشن رکھنا چاہتی تھی۔ ایک با وفا بیوی کی پہلی آرزو ہوتی ہے شریک حیات کے لئے اپنا آپ وقف کر ڈالنا، اس کے لئے جینا، اس کے لئے مرجانا۔ عورت کی زندگی میں آنے والا مرد اول و آخر ہوتا ہے جس کے ساتھ اس کے سب تعلقات وابستہ ہو جاتے ہیں، جذبات و احساسات کی تمام ڈوریں اس سے منسلک ہو جاتی ہیں۔ محبت، الفت، ناراضگی، خفگی، ہجر و وصال، سب ایک رشتے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی محبت اس نے خرم سے کی تھی کہ اس کی جدائی اس کے لئے موت تھی۔ وہ اس کی چاہتوں کا کفن پہن کر اس کی یادوں کی قبر میں ہمیشہ کے لئے سو جانا چاہتی تھی۔ مگر آپ نے کیسی بات کی تھی کہ وہ خرم کی روح کو بے سکون رکھے ہوئے ہے؟

”یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟“

”مجھے سکون و مسرت سے آشنا کروانے والا شخص بھلا کیوں میری وجہ سے بے سکون ہونے لگا؟ ہاں شاید میرے آنسو، یہ ان کی یادیں، ان کی جدائی میں بستے ہیں۔ لیکن وہ مجھ سے جدا کب ہوئے ہیں؟ ان کے سانسوں کی مہک تو آج بھی میری سانسوں میں بسی ہے۔ ان کا احساس میرے وجود سے لپٹا ہوا ہے۔ وہ جدا کہاں ہوئے ہیں۔ آنکھیں بند کرتی ہوں تو ان کو اپنے قریب پاتی ہوں۔ وہ میرے دل کے مکین ہیں۔ ذرا آنکھیں بند کیں اور دیدار کر لیا۔ ہماری محبت لازوال و بے مثال ہے۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، میں بچ بچ خرم کو تکلیف دے رہی ہوں۔“

□●□

بے جی شاہ ویز سے اسی بے تابی سے ملی تھیں جیسے صدیوں کے بعد وہ آیا ہو۔ کافی دیر تک اسے سینے سے لگائے کھڑی رہی تھیں۔ وہ بھی کسی معصوم بچے کی طرح ان کے سینے سے سر نکائے کھڑا تھا۔ سکون و سکون، طمانیت بھری غنودگی اس کی رگ رگ میں دوڑنے لگی تھی۔ مشعل کی یہاں موجودگی میں جو کوفت، ذہنی امتنا را سے مضطرب و مضطرب کئے رکھتے تھے آج ان سے وہ بالکل آزاد تھا۔

”میرے خیال میں کھانا تو آج نہیں کھائیں گے آپ لوگ؟“ سا رہ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے شوخی سے کویا ہوئی۔

”کیوں؟“ شاہ ویز جو بے جی کے شانے سے سر نکائے بیٹھا گفتگو کر رہا تھا، چونک کر کویا ہوا۔

”جب سے آپ آئے ہیں یہ محبت و الفت ختم نہیں ہو رہی۔ میرے خیال میں اسی سے آپ کا پیٹ بھر چکا ہوگا۔ پھر کھانا کھانے کی گنجائش کہاں ہوگی؟“

”بے جی کی محبت سے کبھی میرا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ اس معاملے میں، میں ہمیشہ فاقہ زدہ رہتا ہوں۔“ اس کی شوخ وضاحت پر وہ دونوں مسکرائیں۔

”ہاں، ہاں..... مجھے معلوم تھا، بند بے تم سدا کے ہو۔ چلو کھانا کھاؤ، کھانا لگ چکا ہے۔ خالد جان نے مسالہ جات سے زیادہ اپنی محبت ڈال کر کھانا بنایا ہے۔“

”تم نے بھی میرے ساتھ برابر کی محنت کروائی ہے۔“

”بے جی ہیلپر کی کوئی ویلین نہیں ہوتی، داد لگ کوئی ملتی ہے۔“ خلاف عادت وہ بہت شوخ ہو رہا تھا۔

سا رہ سے چھیڑ چھاڑ، مسکراہٹ سے جگمگا تا چہرہ، روشن روشن آنکھوں میں سکون و اطمینان، چہرے کی شادابی اس کی وجاہت میں اضافہ کر رہی تھی۔ بے جی نے بہت گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔

ٹہیل پر اس کی تمام پسندیدہ ڈشز موجود تھیں۔ بے جی نے اپنے ہاتھوں سے اس کے لئے پلیٹوں میں چکن بریانی، شامی کباب اور بروسٹ نکالے تھے۔ سا رہ دیگر لوازمات نکال رہی تھی۔ میز پر ہر شے موجود تھی۔ بے جی اس کی برابر والی کرسی پر براجمان تھیں۔ ایک اضافہ سا رہ کی صورت میں تھا۔ مگر پھر بھی اسے کوئی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ بار بار رک سا جاتا تھا۔ نگاہیں بے اختیار کسی وجود کی کھوج میں لگ جاتی تھیں۔ اپنی دلی کیفیت و مضطربانی انداز کو سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کس کی تلاش ہے؟ وہ کیا چاہتا ہے؟

”کیا ہوا بیٹا..... ڈھنگ سے کیوں نہیں کھا رہے؟“ بے جی کی نگاہیں اس کے چہرے پر ہی فوکس تھیں۔

”اتنا عرصہ بھابھی صاحبہ کے ساتھ رہ کر آئے ہیں تو ظاہر بات ان کی غیر موجودگی محسوس کر رہے ہیں۔“ سا رہ کی شرارت پر وہ مسکرا بھی نہ سکا تھا۔

□●□

شو نہیں تو زندگی میں اور کیا رہ جائے گا  
دور تک تنہائیوں کا سلسلہ رہ جائے گا  
آکھ تازہ منظروں کی آس میں کھو جائے گی  
اور دل پرانے موسموں کو ڈھونڈنا رہ جائے گا

”ہاں معلوم کس کجنت کی نظر لگ گئی میری پھولوں سی بچی کو؟ جس کا رنگ روپ پھولوں کو شرماتا تھا وہ اب سرسوں کا پھول بن کر رہ گئی ہے۔“ وہ خاموش بیٹھی اپنی سوچوں میں گم تھی جب رافعہ اس کے قریب بیٹھتی ہوئی دہائی دینے والے انداز میں کویا ہوئی تھیں۔

”آئی! اچن! ہمیشہ بہاروں سے خوشنما نہیں رہتا۔ خزاں اسے بھی شڈ منڈ کر جاتی ہے۔ پھر انسان صد ایک جیسا کیسے رہ سکتا ہے؟“

”خزاں چھائے تمہارے دشمنوں پر..... غارت ہوں وہ لوگ جو تمہیں اس حال تک لے آئے ہیں۔ میں تو رات دن ان کے مرنے کی دعائیں مانگتی ہوں جنہوں نے تمہیں ہنسنا مسکراتا سب بھلا دیا۔ زندگی کی خوشیوں سے دور کر دیا۔“

”کیوں خود کو بد دعائیں دیتی ہیں آئی! آپ؟“

”ارے، میں خود کو بد دعائیں کیوں دوں گی؟ میں تو ان کو کوئی ہوں جنہوں نے تمہارا یہ حال کیا ہے۔“ ان کے لہجے میں تعجب تھا۔

”آپ ہی تو ذمے دار ہیں میری اس حالت کی۔“

”ہیں..... کیا کہہ رہی ہو..... میں کیوں ہونے لگی؟“

”آپ نے ہی تو چیلنج کیا تھا کہ مجھ جیسی لڑکی سے کوئی شادی نہ کرے گا۔ نہ آپ چیلنج کرتے ہیں نہ یہ سب ہوتا۔“ اس کے لہجے کی کاٹ رافعہ کو بری طرح تلملا گئی تھی۔ اگر انہیں غرض نہ ہوتی تو وہ حشر چا دیتیں مگر بہ مشکل انہوں نے اپنے غصے پر قابو پایا کیونکہ وہ دیکھ رہی تھیں جب سے وہ آئی ہے بالکل بدل گئی ہے۔ ایک عام سادہ و گھریلو ناپ کی لڑکی بن گئی ہے۔ جو جو کے ہزار ہا ہراسہ کے باوجود اس کے ساتھ کہیں جانے کو تیار نہ تھی۔ نہ اسے کہنی دینے کو۔ حد تو یہ تھی کہ ان سے بھی گریزاں تھی۔ بہت کم ان کے پاس بیٹھنے کا موقع دیتی یا بیٹھتی بھی تو رویہ اتنا بیگانہ و سرد رہتا کہ وہ ایک آدھ چا پلو سانہ جملے کے علاوہ کچھ نہ کہہ پاتیں نہ کچھ پوچھ پاتیں۔ اب بھی اس کا رویہ اتنا ہی خنک و سرد تھا۔

”ہاں صحیح کہہ رہی ہو میری جان، یہ سب میرا ہی کیا ہوا ہے۔ نہ میں اس دن غصے میں آتی نہ یہ سب ہوتا۔ یہی تو ملال مجھے اور جو جو کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ غصے میں کتنا برا نقصان کر لیا۔“ روانی میں ان کے منہ سے بچ نکل گیا تھا جس کا احساس ہوتے ہی انہوں نے چونک کر مشعل کو دیکھا جو پہلے کی طرح ہی سپاٹ چہرہ لئے بیٹھی تھی تو وہ مطمئن ہو گئیں۔

”ارے تمہیں کھانا تو نقصان سے برا نقصان ہے۔ دولت جائیداد کی تمنا تو وہ شاہ ویز جیسے لالچی کرتے ہیں جنہوں نے کبھی یہ دیکھی نہیں ہوتی۔“

”اس کا نام نہ لیں پلیز۔“ دل کی بے قراری سواہو نے لگی تھی۔

”میں کون سا چاہتی ہوں اس مخوس نام کو..... بلکہ میں چاہتی ہوں بینام تمہاری زندگی سے بھی ہمیشہ کے لئے نکل جائے۔“

دل میں شدید ہلچل ہوئی تھی۔ اس نے زخمی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا تھا جو اس کی حالت سے بے خبر اپنی کہنے میں لگن تھیں۔

جو جو تم سے اب بھی شادی کرنے کو تیار ہے، وہ تم سے روز اول کی طرح محبت کرتا ہے۔ تم شاہ ویز کے ساتھ رہی ہو نو دس ماہ تمہارا رے ان تعلقات کو بھی وہ نظر انداز کر رہا ہے اور یہ اس کی محبت کی انتہا ہے جو وہ ہر داشت کرنے کو تیار ہے۔ ورنہ کوئی اتنا اعلیٰ ظرف و روشن خیال نہیں ہوتا کہ کسی کا جھوٹا کھائے یا اترن استعمال کرے۔ یہ تو جو جو کی محبت کی مثال.....“

”دماغ درست ہے آپ کا؟ کیا بکواس کر رہی ہیں؟“ وہ ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے چیخی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ تھا۔

”مم..... میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟“ وہ بھی گھبرا کر بولکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اتنی بے ہودہ بکواس کرنے کے باوجود آپ کو احساس نہیں ہے کہ آپ نے کیا کہا ہے؟ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو وقت کے ساتھ ساتھ شوہر بھی بدلتی ہیں، جس طرح میری ماں کا ایک شوہر تھا، جس طرح میرے باپ کی ایک بیوی تھی اسی طرح میرا بھی ایک ہی شوہر رہے گا۔ خواہ وہ مجھے چاہے یا نہ چاہے۔ مجھے آزاد کرے یا برباد، مجھے رکھے یا چھوڑے، خواہ غریب رکھے یا فقیر، مجھے صرف وہی عزیز رہے گا، میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد بھی وہی ہے اور آخری بھی۔ آپ کو کسی خوش فہمی میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ایک عرصے بعد اس کا جلالی روپ لوٹا تھا۔ رافعہ کے خوش فہمی کے تمام گھڑے زمین بوس ہو گئے تھے۔

□●□

ان کے سمجھانے کا اثر حرا پر خاصی حد تک ہوا تھا۔ پہلے وہ ایک طرف بیٹھی روتی یا خلاؤں میں گھورتی رہتی تھی مگر اب اپنے کمرے سے نکل کر زندگی کی سرگرمیوں میں حصہ

لینے لگی تھی اور اس جو دسے کھل کر اس کے چہرے پر زندگی کی تازگی آگئی تھی جس نے اس کی سنجیدگی کو پروتھار کر دیا۔ فرح اس کی طرف سے مطمئن ہوئیں تو منصور کی طرف سے پریشانی لاحق ہوگئی جو یکدم ہی کاروبار کی تباہی کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کے دن رات اسی فکر میں گزر رہے تھے، قرض داروں اور پارٹنرز کو رقم کی ادائیگی کس طرح اور کہاں سے ہوگی۔ معاملہ بھی کروڑوں کا تھا۔ کوئی بینک قرضہ دینے کو تیار نہ تھا۔ ان ہی سوچوں میں ایک رات منصور فرح سے مخاطب ہوئے۔

”ان مشکلات سے نکلنے کا ایک حل ہے میری نظر میں، اگر تم مانو تو ہم سب کا فائدہ ہے۔“ وہ مصالحتانہ لہجے میں کوپا ہوئے۔

”ایسے حالات میں کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہے۔“

”حرا تمہاری بہن ہونے کے ناتے میری بھی بہن ہے اور مجھے بہنوں کی طرح ہی عزیز ہے۔ یہ جانتی ہونا تم؟“ وہ بغور برابر میں نیم دراز بیوی کا جائزہ لیتے ہوئے سنبھل کر کہہ رہے تھے۔

”میں نے سوچا ہے خرم صاحب نے حرا کا اکاؤنٹ بہت بھاری بھر کم کر دیا ہے، اتنی رقم ہے کہ اس کے بچے کو بڑھاپے تک چلے گی۔ میرا خیال ہے ہم وہ رقم استعمال میں لے لیتے ہیں، بعد میں کاروبار بہتر ہو جانے پر دگنی واپس کریں گے۔ پھر حرا کا اور اس کے بچے کا ہمارے سوا بچے بھی کون۔“

”ہاں تو یوں کہیں نا دولت دیکھ کر آپ کی نیت خراب ہوگئی ہے اور آپ نے ہتھیا نے کے لئے پوری اسکیم بنا ڈالی۔“ وہ ایک جھٹکے سے دور ہنسی تھیں۔

”میری نیت پر شک مت کرو، اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔“ ان کے لہجے میں مفاد پرستوں والی نرمی اور آنکھوں میں عیارانہ چمک تھی۔

”میں جانتی ہوں اس بھلائی کو، تمہاری اسی جوئے کی لت نے ہر شے داؤ پر لگا دی ہے۔ آخر میں میرے زیور بچے تھے وہ بھی تم نے نہیں چھوڑے۔ اب حرا کی دولت پر آنکھیں لگائے بیٹھے ہو۔ تم ایک بدنیت اور بد نظرت آدمی ہو اور میں تمہیں حرا اور اس کے بچے کے حق پر ڈاکو ڈالنے نہیں دوں گی۔“ وہ ہری طرح پھر اٹھی تھیں۔

”کول ڈاؤن مائی ڈیزیز، کول ڈاؤن آرام سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔“ انہوں نے بڑے لاڈ سے چمکا رہا تھا۔

”جویرا فیصلہ آج ہے وہ کل بھی ہوگا، کبھی نہیں بدلے گا۔“ ان کا لہجہ اٹل تھا۔

”میں سوچ رہا تھا تم دانش مندی سے کام لوگے تو کام بن جائے گا۔“ منصور کی کوشش انہیں موم کرنے کی جاری تھی۔

”یہ عقل مندی کا ہی فیصلہ ہے..... میرا مقدر تو تم تاریک کر ہی چکے ہو مگر اب بیٹا ریکی اپنی مظلوم بہن کے مقدر پر نہیں پھیرنے دوں گی۔“ ان کا لہجہ بچتہ اور ارادہ اٹل تھا۔

”ٹھیک ہے..... بعد میں مجھ سے شکایت مت کرنا۔“ ان کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ ایک خوفناک فیصلہ جو وہ پہلے ہی کر چکے تھے، اب اس پر عمل درآمد کا وقت آپہنچا تھا.....!

□●□

”مما! مٹی اتنی بدل کیوں گئی ہے، پاگل بالکل اولڈ وومن بن گئی ہے، جس کو نہ ہنسا آتا ہے نہ مسکرا نا، بلکہ ہر وقت ناگن کی طرح ڈسنے کو تیار رہتی ہے۔“

”اس ناگن کے بچن کو تو میں خود کچل ڈالوں گی، بس مجھے موقع مل جائے، دیکھنا کیسے کیسے تڑپا کر ماروں گی۔“ رانہہ کسی زہریلی ناگن کی طرح ہی پھنکاری تھیں۔

”اب موقع نہیں ملنے والا ماما! بہت اونچا اڑ رہی ہے، پروں پر ہاتھ کہاں رکھنے دے گی۔ نا معلوم کیسا سحر پھونکا ہے اس کنگلے نے کہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی۔“

”ارے احمق، اس سحر کا تو ڈنڈہ بہت آسان ہے۔“ وہ مسکرائی تھیں۔

”کیا آپ نے کوئی پلاننگ کی ہے؟“ ماں کی ہنسی سے وہ سمجھ گیا انہوں نے کوئی چالاکی دکھا ڈالی ہے، بڑے سرور انداز میں ماں کے نزدیک بیٹھا تھا۔

”گھر کے تمام فون کے کنکشنز پر اب ہمارا قبضہ ہے، جس کا بھی فون آئے گا پہلے ہمارے کمروں میں رکھے فونز وہ کال ریسیو کریں گے اور اس طرح ہم بھائی کے بزنس کے متعلق بھی تمام باتیں معلوم کر لیں گے اور سب سے اہم بات یہ کہ شاہ ویز اور مشعل کے درمیان کوئی رابطہ نہ ہونے پائے، ورنہ تمام کھیل بگڑ جائے گا۔“

”یہ کس طرح ممکن ہے..... وہ ہر فون فیل پر پاگلوں کی طرح بھاگتی ہے جیسے وہ فون اسی کے لئے ہو۔“ جو جو منہ بنا کر کوپا ہوا تھا۔

”تب ہی تو میں نے موقع لگایا ہے کہ ایک دفعہ شاہ ویز کا فون آیا تھا، میں نے اس کا نام سنتے ہی کہہ دیا کہ مشعل گھر پر نہیں، جو جو کے ساتھ کلب گئی ہوگی۔ اس نے جل کر کہا۔ اسے مشعل سے نہیں بھائی جان سے کام تھا اور جھٹ فون رکھ دیا۔

”مجھے محسوس ہوتا ہے ان دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا چل رہا ہے، ایک ہفتہ ہو گیا اسے گھر آئے ہوئے۔ نہ یہ ادھر گئی اور نہ وہ ادھر آیا۔ کوئی گڑبضرور ہے۔“

”لگتو مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے، مگر وہ بتاتی نہیں ہے۔ خیر کب تک چھپا سکتی ہے۔“

اسی دم ملازمہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ ڈانگ روم میں چلے آئے جہاں حسن صاحب کرسی پر بیٹھے تھے۔ دوسری کرسی پر مشعل بیٹھی تھی۔ بلیک اور پرہل سوٹ میں ملبوس ہمرنگ دوپٹہ قرینے سے اوڑھے، بہت اچھی لگ رہی تھی۔

”آؤ، آؤ رانہہ! آج تو کمال ہو گیا۔ مشعل نے کوئنگ کی ہے، یہ تمام ڈشیں خود بنائی ہیں۔“ وہ میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوشی سے کوپا ہوئے۔

”ہائے مٹی نے کوئنگ کی..... کیا سارے ملازم مر گئے؟“

”ملازم کو کیوں کوئی ہیں آنٹی! یہ سب تو میں نے اپنی خوشی سے کیا ہے۔“ مشعل حسن صاحب کی پلیٹ میں چائینز راس ڈالنے ہوئے خوش دلی سے بولی تھی۔

”بھائی جان کی بے حساب دولت کی تمہا وارث ہو جیو تم۔ پھر کیوں تھرڈ کلاس عورتوں کی طرح جان ماری کر رہی ہو۔ کیا ضرورت ہے یہ مغز ماری کی؟“

”پہلے تو تم نے کبھی کچن میں جھانک کر بھی نہ دیکھا تھا۔“ جو جو نے کہا۔

”بہی تو افسوس ہے مجھے کہ پہلے کتنی احمق و بے خبر تھی، کبھی ان چیزوں کے بارے میں سوچا نہیں۔ پاپا کی صحت کی فکر نہ اپنی پرواہ۔ کک لذیذ کھانا بنا تا ہے مگر پھر بھی ان ڈانقوں میں پیار، محبت اور اس احساس کی لذت نہیں ہوتی جو ہم اپنوں سے کرتے ہیں۔ اور تھرڈ کلاس عورت وہ نہیں ہوتی جو اپنی محنت سے گھر چلاتی ہے، سنواریتی ہے بلکہ تھرڈ کلاس وہ ہے جو گھر کی مالک تو بن جاتی ہے مگر گھر داری سے نا بلدرہتی ہے۔“

”مائی گاڈ! مٹی تم کتنی عجیب عجیب باتیں کرنے لگی ہو۔ ہاؤ ویری امیزنگ۔“ جو جو شانے اچکا کر حیرانگی سے کوپا ہوا۔

”رانہہ! تمہارے آسیب کا کیا حال چال ہے، یہاں تو تمہیں تنگ نہیں کر رہا؟“ ماحول میں یکدم پیدا ہونے والے تناؤ کو ختم کرنے کے لئے حسن بیگ کو بات بدلنی پڑی۔

”بھائی جان، تنگ تو کر رہا ہے مگر کوئی نقصان نہیں ہو رہا۔“

”آسیب؟ کیا مطلب پاپا؟“ مشعل نے چونک کر کہا۔

”ایک دلچسپ بات ہے، رانہہ جس جگہ رہ رہی تھیں وہاں کوئی ان دیکھا یعنی پراسرار وجود رانہہ کے زیورات، قیمتی پرفیومز وغیرہ چوری کرتا رہا۔ رانہہ نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے اسے یہاں آکر رہنے کا مشورہ دیا۔“

”یہاں آکر لگتا ہے بھائی جان اس آسیب کی طاقت کمزور پڑ گئی ہے کیونکہ کمرے میں چیزیں ایسی ملتی ہیں جیسے کوئی ان کی تلاش لیتا رہا ہو۔“

”اوگاڈ! اس دور میں بھی آپ ایسی باتوں پر یقین رکھتی ہیں؟“ وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ”یقیناً یہ تمام شرارتیں جو جو کی ہوں گی کیونکہ پاکٹ منی دینے میں آپ شروع سے ہی سست ہیں، سو اس نے یہ سلوشن نکالا ہوگا۔“

”پاگل ہوگئی ہو کیا..... میں کیوں چوری کرنے لگا؟“ کسٹر ڈکی پیالی اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ وہ گھبرا کر بولا۔

مشعل اور حسن بیگ کے لمبوں پر معنی خیز تبسم تھا جب کہ رانہہ بھی بیٹے کی اڑی اڑی رنگت و بو کھلاہٹ سے چونک اٹھی تھیں۔

”اپنے گھر سے سامان لینا کوئی چوری تھوڑی ہوتا ہے؟ بس تم نے یہ بد تمیزی کی کہ آنٹی کو نہیں بتایا بلکہ ان کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھایا۔“ مشعل کے لہجے میں بلا کی خود اعتمادی و یقین تھا جو، جو جو کو زیادہ دیر تک اپنی چوریوں کے اعتراف سے روک نہ سکا۔

”سوچ سمجھ کر بولا کرو مشعل! بھلا جو جو کو کس چیز کی کمی ہے جو یہ چوری کرے؟“ رانہہ بیٹے کی حالت سے سمجھ گئی تھیں مگر رسوائی کس طرح کوارہ کرتیں سو غصے سے کوپا ہوئیں۔

”بات کو غلط رنگ مت دو، بچے ایسی حرکتیں کرتے ہیں تو قصور وار مائیں بھی ہوتی ہیں، جو بچوں کو ان کی خواہشوں و ضرورتوں سے محروم کر کے ایسے سنگین جرم کرنے پر مجبور کرتی ہیں جو آگے بڑھ کر ان کے لئے ہی نہیں معاشرے کے لئے بھی بے سکونی و بد امنی کا سبب بنتے ہیں، جو اد آپ کی یہ نادانیاں میں اسی دن سمجھ گیا تھا جس دن رانہہ نے مجھے بتایا تھا۔ بہر کیف اپنی ماں سے معافی مانگو اور آئندہ کبھی ایسا خواب میں بھی نہ سوچنا ورنہ بہت برا ہوگا۔“ ان کے انداز میں پیار و سرزنش دونوں شامل تھیں۔

جو جو ان کی کم کوئی و سنجیدگی کے باعث از حد مرعوب رہتا تھا۔ اب حقیقت کھل جانے پر بالکل مت بن گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ باپ بیٹی اس کی چالاکیوں کو اتنی جلدی سمجھ جائیں گے۔ حالانکہ رانہہ کو وہ کامیابی سے آگو بنانا آ رہا تھا۔ شروع شروع میں رانہہ سے جیب خرچ نہ ملنے پر چھوٹی موٹی چیزیں چوری کرتے ہوئے خوفزدہ رہتا تھا کہ ماما کو معلوم ہوگا تو خیر نہیں ہوگی مگر رانہہ کی بے پروائی نے اس کے حوصلوں کو جلا بخشی اور اس نے بہت چال بازی سے تمام لاکرز اور رومز کی ڈپلی کیٹ چابیاں بنوالیں۔ جب لمبی رقیں اور بھاری سامان چوری ہونے لگا تو اس نے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے آسیب کا ڈرامہ کھیلا اور خود رانہہ کو اپنی مہنگی چیزیں چوری ہونے کی جھوٹی اطلاعات دیتا رہا تا کہ اس پر شک نہ کیا جاسکے۔ لیکن فریب اور جھوٹ کا پوئل کھل کر رہتا ہے جو آج کھل چکا تھا۔ اس نے اعتراف کر لیا تھا اور رانہہ کو دکھ اس کی اس حرکت پر نہیں تھا کہ اس نے ان کے پیار و اعتماد کو بری طرح کچل ڈالا بلکہ تملہاہٹ اس بات کی تھی کہ یہ سب ان دونوں کے سامنے کیوں ہوا، بعد میں خود خود سنبھال لیتیں۔

□●□

زرینہ بہت عرصے بعد ہنستی مسکراتی آئی تھیں۔ بے جی بہن کو دیکھ کر نہال ہوئی تھیں۔ سارہ کو بھی ماں کو خوش دیکھ کر سچی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اصغر نے اپنے اور فریجہ کے علاوہ زرینہ اور بے جی کی بھی حج درخواستیں جمع کروائی تھیں جن کی منظوری آگئی تھی۔ ایسی سعادت مند و پرایمان خوشخبری نے ان سب کو ہی سرور کر ڈالا تھا۔ وہ سب بے جی کے گرد جمع تھے۔



”اللہ جب سنتا ہے تو کوئی غلط باقی نہیں رہتی۔ اصغر نے جب حج کی بات کی تھی تو میرا دل رواٹھا تھا کہ سارہ کا مسئلہ کس طرح حل ہوگا؟ اسے کہاں چھوڑ کر جاؤں گی؟ باقربا اس کے گھر والوں نے پلٹ کر خبر نہ لی۔ لیکن اللہ واقعی سب کی سننے والا ہے، صرف اس کو دل سے پکارنے کی ضرورت ہے۔ ہر پکار پر وہ لبیک کہنے والا رب ہے۔“

”کتنی دفعہ کہا ہے سیدھی سیدھی بات کیا کرو۔ کیا باقرمیاں نے کچھ کہا ہے؟“ بے جی نے انہیں جھڑکا تھا۔ سارہ باقر کے ذکر پر ہمت کوں تھی۔ جب کہ قریب بیٹھی فریجہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

”سیدھی بات یہ ہے کہ جب سے سارہ آئی ہے تب سے باقرمیاں کے فون آرہے ہیں۔ وہ اپنے طرز عمل پر بہت شرمندہ ہے، معافیاں مانگ رہا تھا، کہہ رہا تھا آئندہ قانون مرجائے گا مگر کبھی بیوی کو ہاتھ پھیلائے کے لئے میسج نہیں بھیجے گا۔ اس کی غیرت زندہ ہوگئی ہے۔“

”شکر ہے، دیر آید درست آید۔ صبح کے بھولے کو گھریا تو آیا اور یہ سب سارہ بیٹی کے چٹائی صبر و استقلال کا پھل ہے۔“ بے جی نے بڑی شفقت سے سارہ کو سینے سے لگایا تھا۔

”باقربا کوئی شادی وادی نہیں کی ہے۔ اتنا عرصہ انہوں نے اس لئے لگایا کہ کاروبار میٹ کرنے میں لگے ہوئے تھی، میری بات ہوئی تھی ان سے، وہ ہر سزا بھگتے کو تیار ہیں تمہاری محبت کی خاطر۔“ فریجہ نے اس کی کیفیت جانتے ہوئے وضاحت کی تو وہ دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

وہ شوہر پرست عورت تھی۔ اس میں اتنا حوصلہ مضبوط تھا کہ ہزار بے وفائی اور بے مروتی کے تیروں سے گھائل ہونے کے باوجود اپنی وفا پر حرف نہ آنے دے۔ صلح و امن، ہمدردی و خدمت گزاری اس کی فطرت تھی۔

”السلام علیکم خالہ جان! کیسی ہیں آپ؟“ شاہ ویز آفس سے آیا تھا۔

”وعلیکم السلام بیٹا، تم تو عید کا چاند ہو گئے جو مدتوں بعد نظر آتا ہے۔ پہلے ہفتے، مہینے میں چہرہ دکھا دیا کرتے تھے اب تو مہینوں گزر جاتے ہیں۔ اور دلہن کہاں ہے تمہاری؟ جب سے آئی ہوں نظر نہیں آ رہی۔“

”بہو میسج گئی ہوئی ہیں کچھ دنوں کے لئے۔ شاہ ویز! کپڑے بدل لو پھر کھانا لگواتی ہوں۔ اصغر اندر بیٹھا خبریں دیکھ رہا ہے، بھوک کے باوجود تمہارے انتظار میں بیٹھا ہے۔“ بے جی فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں، جانتی تھیں زرینہ حسب عادت پے در پے سوالات کرے گی اور بات کچھ سے کچھ بن جائے گی سو بہانے سے مخاطب ہوئی تھیں۔

شاہ ویز بے جی کی دانش مندی کو سراہتا کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔



ایک غیر معروف ہوٹل میں وہ آمنے سامنے ایک دوسرے کو جا بٹختی نگاہوں سے پرکھ رہے تھے۔ ایک کا انداز اذ حد محتاط و چوکنا تھا، دوسرے کے انداز سے سرسرت و اعتماد ظاہر ہو رہا تھا۔ اچھی طرح اطمینان حاصل کرنے کے بعد پہلے شخص نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے مھانے کے لئے لب کشائی کی۔

”میں منصور حیدر آپ کو پاکستان میں خوش آمدید کہتا ہوں مسٹر عرفان خرم۔“

”مسٹر منصور! مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ بہت والہانہ انداز میں اس نے ہاتھ ملا یا تھا۔

”آپ بالکل ٹھیک نام پر پہنچ گئے ہیں عرفان، ورنہ مجھے تو خدشہ تھا کہ حرا کی ڈلیوری کے بعد آپ یہاں آئے تو بے حد مسئلہ ہو جائے گا۔“ وہ ایک کمرے میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔

اس نے فرح کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر فرح ان کی لالچی فطرت کو بہ خوبی جانتی تھی۔ اس نے کسی طرح ہامی نہیں بھری حرا کی رقم استعمال کرنے کی تو انہوں نے حرا کے کاغذات سے دہلی کا ایڈریس نکال کر عرفان سے رابطہ کر لیا۔ پھر ایک بے ایمان ہی دوسرے بے ایمان پر بھروسہ کر سکتا ہے۔ دولت کی موس میں اندھے ہو کر عرفان نے سگے باپ کی پرواہ نہ کی تھی تو پھر منصور کا کوئی خونی رشتہ حرا سے نہ تھا جو وہ ایسی حرکت کرتا۔ ان دونوں کے درمیان رابطے بڑھے، عرفان، بنے میاں کوٹا رچ کر کے پہلے ہی سب کچھ معلوم کر چکا تھا اور پاکستان آنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا بہت جلد وہ حرا کو ڈھونڈ لے گا اور اس کی بیہ پریشانی منصور کی بے ضمیری و کم ظرفی نے پوری کر دی تھی۔

”یہ کس طرح ممکن تھا کہ ہمارے حقوق پر کوئی قبضہ جمانے کے لئے وارد ہونے والا ہے اور ہم بیٹھے چین کی بانسری بجاتے رہیں۔ نام پر پہنچ گیا یا فرینڈ؟“ کافی کے سپ لیتا ہوا عرفان چکا۔

”آپ نے تمام مراحل کیسر کر لئے ہیں، کوئی پرابلم تو نہیں ہوگی؟“

”آپ بے فکر رہیں..... لیبر روم کے تمام اسٹاف کو فرید لیا ہے اور ایک مُردہ بچے کا انتظام بھی وقت پر ہو جائے گا۔ وقت پر میرا کام وہاں سے فرح کو ہٹانا ہے اور اس عرصے میں آپ کو اپنا کام کر کے کچنوں میں وہاں سے اوجھل ہونا ہے۔ اگر فرح کی نظر آپ پر پڑ گئی تو نہ صرف یہ کام بگڑ جائے گا بلکہ میرا گھر، میری لائف بھی تباہ ہو جائے گی۔“ لمحے لمحہ کو منصور پریشان سا ہوا تھا۔

”ڈونٹ وری مائی فرینڈ۔ مجھ سے کوئی کوتاہی نہ ہوگی۔“

”اوکے، میں چلتا ہوں۔ فرح، حرا کے پاس ہسپتال میں ہے۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔“ منصور اس سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔

گزشتہ چار روز سے وہ ہسپتال میں تھی۔ فرح اسے وقت پر یہاں لے آئی تھی۔ اس کی دگرکوں حالت دیکھ کر فوراً لیبر روم میں لے جایا گیا تھا اور وہ جو سوچ رہی تھی جلد ہی وہ کوئی خوشخبری سنیں گی اسی انتظار میں آج چوتھا روز تھا۔ حرا تکلیف میں تھی اور وہ بے چین ہو رہی تھیں۔

”فرح کیوں جان کر اپنی بہن کو تکلیف میں مبتلا کر رہی ہو۔ ڈاکٹر نے سرجری کا کہا ہے تو سائن کر دو۔ کیوں وقت برباد کر رہی ہو؟ کوئی تو پراہلم ہوگی جو لیڈی ڈاکٹر نے آپریشن کا کہا ہے۔“ منصور ہسپتال کے کیفے میں فرح سے مخاطب تھے۔

”میرا دل نہیں مان رہا۔ آصفہ نے پچھلے ہفتے چیک اپ کے بعد رپورٹ دی تھی کہ سب ٹھیک ہے، کیس نارمل ہوگا۔ پھر چارپانچ دن میں کس طرح پیچیدہ ہو گیا؟ مجھے یہ صحیح نہیں لگ رہا، نہ معلوم کیوں مجھے عجیب عجیب دوسوے آرہے ہیں۔“ فرح رو ہانسی ہو گئیں۔

”ایجوکیڈ ہو کر جاہلوں جیسی باتیں مت کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو تمہاری یہ فضول وہمی طبیعت ماں یا بچے کو کوئی نقصان پہنچا دے۔“

منصور کے سمجھانے پر اور حرا کی تکلیف دیکھتے ہوئے وہ راضی ہو گئیں۔ اسی وقت ڈاکٹر نے آپریشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ فرح ایک طرف دل تھام کر بیٹھی دعا کر رہی تھیں۔ میڈیکل کی تمام ذمے داریاں منصور نے سنبھالی تھیں۔ اس وقت وہ دہرا کردار ادا کر رہے تھے۔ ایک طرف ذمے داری و فرض شناسی کا دکھاوا کر کے فرح کو متاثر کر رہے تھے دوسری طرف فون کر کے عرفان کو بلا لیا تھا جو وہیں ایک تاریک کوشے میں روپوش تھا۔ ڈاکٹر سمیت تمام اسٹاف اس سے ملا ہوا تھا۔ پھر نرس نے دوا منگوانے کے بہانے سلسلے پر لکھ کر دیا کہ وہ فرح کو یہاں سے لے جائیں اور عرفان کو بھیج دیں۔ وہ فرح کو بہانے سے وہاں لے گئے کہ چند منٹ تازہ ہوا میں کھڑی ہو جائیں تاکہ ٹینشن دور ہو اور اسی اثناء میں ان کے پیچھے بہت بھیاں کھیل کھیلایا گیا تھا۔ نرس نے چادر میں لپٹا بچہ عرفان کے حوالے کیا تھا جسے لے کر وہ فوراً ہی پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔

”اوہ منصور..... وہ..... وہ عرفان.....“ اندر داخل ہوتے وقت فرح کی اپنی نگاہ نے ایک سرسری جھلک عرفان کی دیکھی تو وہ گھبرا کر گویا ہوئیں۔

”عرفان؟ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا..... اسے کس طرح یہاں کا ایڈریس مل سکتا ہے؟ میں اس لئے تمہیں یہاں لایا تھا کہ کچھ تازہ دم ہو جاؤ گی مگر تمہارے وہم تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ چلو، اوٹی میں چلتے ہیں۔“ اندر ہی اندر وہ بری طرح لرز اٹھے تھے مگر سمجھداری سے ان کا ہاتھ پکڑ کر آپریشن تھیٹر سے وہاں لے آئے۔ ابھی وہ وہم و حقیقت کی کشاکش میں مبتلا تھیں کہ نرس نے اطلاع دی کہ حرا کے ہاں مُردہ بیٹا پیدا ہوا ہے.....!



وہ دن کی ہر نسل پر بے قرار ہو کر بیٹھی تھی۔

سماعت ہر آہٹ پر بڑھ جاتی تھی۔

آنکھیں اس کی دید کی تمنائی تھیں اور دل اس سے ملنے کا خواہش مند۔ اسے یہاں آئے چار ہفتوں سے زائد عرصہ ہو چکا تھا اور وہ پہل پہل اس کے لئے بے چین رہتی تھی، بے قرار تھی، اس کے بغیر زندگی، زندگی نہ رہی تھی۔ وہ اس کی ضرورت نہ تھی، خواہش نہ تھی، اس کا حاصل نہ تھی۔ وہ زبردستی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ شرافت سے اسے برداشت کر رہا تھا۔ غضب کا حوصلہ مضبوط تھا اس کی ذات میں۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی وہ بے کل تھی۔

اپنی پچھلی زندگی پر ندامت ہوتی تھی، اپنی نادانی پر رنج ہوتا تھا۔ کتنی بے وقوف تھی وہ۔ بھلا یوں بھی کسی مرد کو تغیر کیا جاتا ہے؟ دولت کے زعم میں، جس کے غرور میں، خود کو برباد کیا ہی کیا، شاہ ویز کی زندگی بھی برباد کر ڈالی تھی۔ کتنی کٹھن منزلوں سے گزر کر محسوس ہوا ہے کہ عشق کیا بلا ہے۔

محبت کیسی آگ ہے جو جلاتی ہے لمحہ لمحہ مگر مرنے نہیں دیتی۔

وفا کی منزل کہاں ہے؟

فنا کا طریقہ کیا ہے؟

میں فضول جذبوں کو محبت سمجھتی رہی۔ عشق سے مجھے نفرت تھی لیکن اب معلوم ہوا عشق اور محبت کے درمیان جسم کوئی پڑاؤ نہیں، کوئی منزل نہیں۔ عشق جسمانی قرب سے

ماورا ہے۔ چاہت گھل جانے، مٹ جانے، فنا ہوجانے کا نام ہے۔

شاہ ویز کا دل جیتنا میرے لئے ناممکن ہے..... نہ معلوم وہ کون خوش نصیب ہوگی جو اس تک رسائی حاصل کرے گی، اس کی چاہتوں کا مرکز بنے گی۔ میرے مقدر میں یہ

خوش ہرگز نہیں ہے۔“ وہ قوطی ہو رہی تھی۔ اسی پہل حسن بیگ کو دیکھ کر وہ جبراً مسکرائی تھی۔

”گھر سے باہر نکلنا بالکل چھوڑ دیا ہے بیٹا؟“ وہ شفقت سے گویا ہوئے۔

”جب باہر نکلتی تھی تو گھر میں رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اب باہر نکلنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ کی بیٹی پاگل ہے پاپا، اس کا کوئی کام ناپل نہیں ہوتا۔“

”نہیں، نہیں..... میری بیٹی جیسی شاید ہی کوئی ہو۔ آپ تو میرا فرزند ہو۔“ انہوں نے اس کا سراپے شانے سے لگاتے ہوئے کہا۔

”آفس چلوں پاپا؟“ اس سنگدل کو دیکھنے کی امید برآئی تھی۔

”ہاں چلو۔ آج شاہویز سائٹ پر جائیں گے۔ کام کی تمام ذمہ داری مجھ پر ہی ہوگی۔ اچھا ہے مجھے آپ کی موجودگی میں ریلیکس مل جائے گا۔“ پاپا نے سرست کا اظہار کیا تھا مگر اس کی سرست کی کلی بن کھلے ہی مرجھا گئی تھی۔ اسے اپنی بے قراری پر غصہ آنے لگا تھا۔

□●□

”یہ تماشا کب ختم ہوگا بیٹے! اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود تم اس بچی کو وہ جگہ، وہ مقام دینے سے کترار ہے ہو جو اس کا حق ہے۔ آخر کب تک تم دونوں کے درمیان یہ رسہ کشی رہے گی؟“ بے جی جونچ پر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ شاہویز کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ مشعل کی جانب سے اس کی خاموشی اور لا تعلقی انہیں بری طرح کھلنے لگی تھی۔ بالآخر انہیں بولنا ہی پڑا تھا۔

”بے جی! میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں؟ آپ کو میری آزادی پسند نہیں آرہی ہے۔“ وہ مسکراتا ہوا ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”مجھے سمجھانے سے بہتر ہے اپنے دل کو سمجھاؤ۔“

”دل کو..... دل کو کیا ہوا ہے؟“

”جو سمجھ کر بھی نہ سمجھ سکے اسے کوئی نہیں سمجھا سکتا۔“

”میرے پیچھے سے آپ خاصی پہیلیاں وغیرہ کہنے میں ماہر ہو گئی ہیں۔“

”مذاق میں اڑانے کی کوشش مت کرو میری بات۔ سیدھے جاؤ، جا کر بہو کو لے آؤ۔ اس میں میری خوشی ہے، اس گھر کی خوشی ہے اور تمہاری بھی۔“ اسے سنجیدہ دیکھ کر انہیں سنجیدہ ہونا پڑا۔

”شادی کے بعد لڑکی کے لئے باپ کا گھر پر لیا ہو جاتا ہے، اس کا سرال ہی اپنا ہوتا ہے، وہیں بسنے میں اس کی شان و توقیر ہوتی ہے۔ جس طرح اینٹ دیوار سے علیحدہ ہو تو اینٹ کھلاتی ہے۔ دیوار بن جاتی ہے تو مضبوط گھر کھلاتی ہے۔“

”بے جی! آپ اس کی گستاخیوں، بد تمیزیوں کو دوبارہ جھیلنا چاہتی ہیں؟“

”پرانی باتیں رہنے دو، وہ اب ایسی نہیں ہے۔ میں سب بھلا چکی ہوں، ہم بھی بھول جاؤ، بھائی صاحب بتا رہے تھے وہ بالکل بدل گئی ہے۔ ایک بہترین و قابل فخر بیٹی بن گئی ہے اور اس کے لئے وہ تمہارے بہت شکرگزار ہیں۔“

”مجھنا چیز کا کیا شکریہ ادا کرنا۔“ وہ دھیسے سے مسکرایا تھا۔

”دیکھتی ہوں تم کب تک اپنی ضد اور فضول انا کی حفاظت کرتے ہو۔ اب میں نہ کہوں گی مشعل کو لانے کے لئے، نہ بھائی صاحب مشعل پر زور ڈالیں گے۔ اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود تم دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ رہ سکتے ہو تو تم دونوں کی مرضی ہے۔“ بے جی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں اور وہ آگے بڑھ کر انہیں روک بھی نہ سکا۔

اس کے اندر اسی دن سے ٹوٹ پھوٹ جاری تھی جب اس نے جہاز میں مشعل کو آزاد رہنے کا سندیدہ سنایا تھا اور جواب میں اس کے چہرے پر چھائی درد بھری حیرانگی، آنکھوں میں اتنی شکوہ کناس و حسرت اور وجود پر پھیلے گہرے سناٹوں کی ردا، اس کا گم صم ہو جانا، اندر دگی ورنجیدگی کی پُر ملال کیفیت، وہ بار بار ہونٹ وا کرنا مگر پھر کچھ سوچ کر لفظوں کا اندر ہی کا گھونٹنا اور گہری سوچوں میں دانتوں سے ہونٹ زخمی کرنا، چپکے چپکے آنسو صاف کرنا کچھ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھا۔

بد ظاہر سونے کی اداکاری کرتے ہوئے نکٹھیوں سے وہ اس کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس وقت اس کے دل کو بڑی تسکین مل رہی تھی۔ اس کی مردانہ لائبریری سرور ہو رہی تھی۔ وہ خوش تھا۔ بہت خوش۔

لیکن اب اسے لگ رہا تھا اس کی زندگی میں کوئی خلا پیدا ہو گیا ہے۔ انجانے میں ہی وہ اس کے وجود کا عادی ہو چکا ہے۔ لان، لاؤنج، ڈائننگ روم، کچن اور بیڈ روم ہر جگہ وہ ویرانی و اداسی محسوس کر رہا تھا۔ شاید وہ اس کی محبت نہیں، ضرورت تھی۔ اس کی سنگت میں وہ نا زغرے اٹھوانے کا عادی ہو چکا تھا۔ محبت کے شمر وفا کی کھاد اور چاہت کی برکھا سے نموپاتے ہیں۔ جن کے تنے کاٹ بھی دیئے جائیں تو ان کی جڑیں اپنا وجود قائم رکھتی ہیں۔ ضرورت محبت سے بالکل متضاد ہے، مفاد ہر طریقے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کو ضرورت کو الفت اور الفت کو محبت میں بدلنے کا انتظار تھا۔

□●□

”آپ کہتی تھیں آپ! ارب اپنے بندوں کو ان کے حوصلوں سے زیادہ نہیں آزمانا، پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ میں ہر در سے کیوں ٹھکرائی جا رہی ہوں؟ پہلے مجھ سے خرم جدا ہوئے، ان کے بعد میں نے اپنی زندگی کا مقصد اپنے بچے کو بنالیا اور اب وہ سہارا بھی مجھ سے چھین گیا، اس بچے کی خاطر میں نے سب کچھ برداشت کیا، وہ مجھے دیکھے بنا، ماں کہے بنا چلا گیا۔“ حرا ایک ہفتے قبل ہسپتال سے گھر آچکی تھی اور ایک بار پھر اس کے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

”صبر کرو..... نامعلوم اس میں رب کی کیا مصلحت ہوگی۔“

”میں اجڑ گئی، برباد ہو گئی۔ کیسے صبر کروں؟..... کس طرح صبر کروں؟“ حرا اچھل رہی تھی۔ فرح اسے سمجھا رہی تھیں۔ اسی دم پردے کے پیچھے سے منصور نے انہیں پکارا تھا۔ وہ باہر آئیں تو وہ بے حد غصے میں کھڑے تھے۔

”گھر سے یہ نحوست کب دفع ہوگی؟ یہ میرا گھر ہے اور میں یہاں ہر وقت رونا، پیٹنا برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ سخت غصے میں چیخ رہے تھے۔

”منصور..... منصور، پلیز یہاں سے چلو، یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم جانتے ہو حرا کتنے بڑے دکھ سے گزری ہے۔ وہ سن لے گی تو.....“

”منشی ہے تو سن لے..... یہ میرا گھر ہے، کسی کے باپ کا نہیں۔“ منصور اس وقت بے نیام تلوار بنے ہوئے تھے۔ فرح کبھی ان کی طرف بدحواسی سے دیکھتی کبھی پر دے کے اس پار دیکھتی جس طرف حرامو جو تھی جس نے سب سن لیا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو..... آپ ایسے تو نہ تھے۔“

”تم نے کر دیا ہے ایسا۔ کیا ہو جاتا اگر تم مجھے حرا کے اکاؤنٹ استعمال کرنے کی اجازت دے دیتیں؟ اگر میری جگہ حرا کا بھائی ہوتا تو تم اسے اجازت دے دیتیں۔ اس لئے کہ وہ تمہارا بھائی ہوتا اور میں تمہارا شوہر ہوں۔ مجھ پر تمہیں یقین نہیں ہے۔ ہونہ، عورتیں شوہروں کے کاروبار کی خاطر نامعلوم کیا کچھ کر ڈالتی ہیں۔ ایک تم ہو جو گھر آئی دولت پر ناگن بن کر بیٹھ گئی ہو۔“

”میں کہتی ہوں خاموش ہو جاؤ..... بات بڑھانے کی کوشش مت کرو۔“

”کیوں خاموش ہو جاؤں..... اس دن تو بڑی ٹرژر کر رہی تھیں اور میں خاموشی سے سن رہا تھا کہ میرا وقت تھا۔ اور اب تمہارا وقت ہے، تمہیں سننا ہوگا۔ کیا سمجھتی ہو، بولنا صرف تم جانتی ہو؟ زبان صرف تمہارے پاس ہے؟ اور انسان کے پاس زبان ہونا کافی نہیں ہوتا۔ اس کے استعمال کے لئے ذہن اور موقع کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے موقع مل گیا ہے۔“

”ہاں میں جانتی ہوں تم کتنے موقع پرست اور گھٹیا انسان ہو بلکہ تمہارے اندر انسانیت کی رقی بھی نہیں ہے۔ تم لالچی اور دوسروں کے مال پر نگاہ رکھنے والے بدنیت مرد ہو۔“ فرح سمجھ گئی تھیں وہ جان بوجھ کر حرا کو سنانے کی خاطر اس کے کمرے کے باہر یہ تماشہ کر رہے تھے۔

ان کا جڑا لہجہ، خنجر کی طرح لفظ اور تمام مروت و اخلاق کو بالائے طاق رکھنا رویہ فرح کو بھی تاؤ دلا گیا تھا۔ پوری زندگی انہوں نے نہایت صبر مضبوط سے اس جیسے لالچی و خود غرض شخص کی خدمت میں گزاری تھی اور ایک اسی کے حق کی خاطر وہ تمام اخلاقی حدود پھلانگ گئے تھے۔ غصہ، نفرت، بدگمانی اور اشتعال کے سمندر میں وہ ڈوب ڈوب گئیں۔

”مجھے تم جیسی بد کو، زبان دراز اور بد تمیز عورت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جا رہا ہوں اور سزا کے طور پر تمہیں طلاق دے کر نہیں جا رہا۔ ساری زندگی تم میرے نام سے چپکی رہو گی۔ کسی اور کی نہیں ہو سکتیں اور میں دوسری شادی کر کے عیش کروں گا۔ تم اسی طرح سلگتی رہنا۔“ وہ طنز پر انداز میں فیصلہ سنا کر آگے بڑھنے لگا۔ اسی وقت حرا کمرے سے نکل آئی۔

”بھائی! میں اجازت دے رہی ہوں آپ کو..... اکاؤنٹ آپ استعمال کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ کانپ رہا تھا اور چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ منصور نے اس کی آواز سنی نہیں تھی کیونکہ فرح نے آگے بڑھ کر اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”جانے دو اس شخص کو۔“ ہاتھ ہٹاتے ہوئے فرح نے کہا۔

”آپ! آپ میری وجہ سے کیوں اپنا گھر برباد کر رہی ہیں؟ روک لیں بھائی کو۔ نہیں چاہئے مجھے بیسہ۔ مجھے آپ کی خوشیاں چاہئیں۔“ وہ بہن سے پسٹ گئی تھی۔ فرح بہت حوصلے ہمت والی عورت تھی۔

منصور کے بگڑے تیور و چال چلن سے وہ بہت پہلے ہی ان کے ارادے جان گئی تھیں۔ آج ان کے منہ سے دوسری شادی کا اعلان اور کبھی نہ چھوڑنے اور رابطہ بھی نہ رکھنے کی دھونس نے ان پر کوئی اثر نہ کیا تھا۔ وہ حرا کو سہارا دے کر کمرے میں لے آئی تھیں۔

”تمہیں کسی طرح کی کوئی فکر کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں تمہارے پاس، تمہارے ساتھ۔ نہ تمہیں کسی کی ضرورت ہے، نہ مجھے خواہش۔ ہم ایک دوسرے کا سہارا ہیں اور ہمیں کسی کی ضرورت نہیں ہے۔“

حرا انہیں دیکھ رہی تھی جو ایسے نکھن وقت میں عزم و حوصلے کی چٹان بنی ہوئی تھیں۔ چند لمحوں قبل کیسی آندھی آئی اچانک ان کی زندگی میں جوآن کی آن سب کچھ اڑا کر لے گئی۔

اب باقی کیا بچا تھا، ان کی کھوکھلی ذات، کتنا مضبوط طاقت و نظر آنے والا ازدواجی رشتہ کس قدر کمزور اور ناقابل بھروسہ ہوتا ہے اور مرد کی ذات بالکل ہی کمزور و ناقابل اعتبار، ساری زندگی ساتھ جینے مرنے، ساتھ بھانے کی قسمیں کھانے والے بچہ راہ میں دغا جاتے ہیں۔

”فضول سوچوں میں ذہن کو مت تھکاؤ، سو جاؤ، کسی بھی قسم کی ٹینشن تمہارے لئے اچھی نہیں ہے۔“ فرح اس پر کبل ڈالتے ہوئے کوپا ہوئیں۔

”اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد آپ مجھے بر سکون ہونے کی تلقین کر رہی ہیں..... آپ کی بر سکون زندگی میں میری وجہ سے آگ لگی اور کس طرح سکون حاصل کر سکتی ہوں؟ سچ ہے میری خواست نے میرے بعد آپ کے گھر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آپ اپنی ابھی بھی وقت ہے آپ دولہا بھائی کو روک لیں، انا کا مسئلہ مت بنائیں۔ ایسے لڑائی جھگڑے ہر گھر میں ہوتے ہیں اور شوہر اکثر دوسری شادی کی دھمکی دیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ وہ ایسا ہی کرتے ہیں یا ان کی ناراضگی کبھی دور نہیں ہوتی، نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ سب وقتی غصہ ہوتا ہے۔ جب غصہ اتر جاتا ہے تو غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور جب غصہ ختم ہو گیا، غلطی کا احساس ہو گیا تو بات صاف، لڑائی ختم۔“

”وہ اس طرح کامر نہیں ہے، اول تو اپنی غلطی کبھی تسلیم کر ہی نہیں سکتا، پھر معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ بے دم انداز میں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کوپا ہوئیں۔ اس وقت استخلال و زن ان کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔

”طویل عرصے سے میں اس کی لالچی و مطلب پرست طبیعت کو کھیل رہی ہوں اور کئی بار اس سے چھٹکارا پانے کی خواہش میں مجبوراً ساتھ رہتی آئی ہوں۔“ حرا کے چہرے پر حیرانگی دیکھ کر وہ دکھ سے مسکرائیں۔

”تمہارے ساتھ ہمیشہ خوش و خرم حال نظر آنے والی یہ بہن اس شخص کی سنگت میں پائی پائی کو ترستی رہی ہے۔ پھر فاقوں اور منصور کے طعنوں سے تنگ آ کر میں نے ملازمت کی جس کا آدمے سے زیادہ حصہ اس کی جیب میں جاتا ہے۔ اتنی محنت کے باوجود مجھے وہ تحفظ و اعتماد نہیں ملا جو ایک خاوند اپنی بیوی، اپنی شریک حیات کو دیتا ہے۔ غیر اخلاقی سرگرمیوں میں پڑ کر وہ زنس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیر مالی سپورٹ اس نے مجھے کبھی نہیں دی اور مجھے اس کا لال نہیں۔ ہاں اگر چند الفاظ سچے پیار کے میرے دامن میں ڈال دیتا تو میں اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ ہوس کا پجاری ہے، دولت کا غلام ہے۔ اس کی دنیا، اس کا ایمان سب دولت ہے، صرف دولت..... جس کو حاصل کرنے کے لئے وہ ذلت و کمینگی کی آخری حد تک کر اس کر سکتا ہے اور ایسے مرد کے سنگ مزید آگے نہیں چل سکتی۔“

فرح نے جو کہا وہ کر کے دکھایا۔ اس کا وجود حرا کے لئے گھنی چھاؤں بن گیا، وقت کے ہر کڑے موڑ پر وہ اس کی ڈھال تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ زخم مندمل ہو گئے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا بنی زندگی کی ناؤ کو رواں رکھے ہوئے تھیں۔ وقت کی لڑی سے ماہ و سال مومی موتیوں کی طرح یکے بعد دیگرے گرتے چلے گئے اور وہ سب بھولنے میں کامیاب ہوئی بھی نہ تھی کہ آج بائیس سال بعد جب وہ دکھ کے بھنور سے نکل پائی تھی کہ پھر وہی آسب پیچھے لگ گیا تھا جس نے بائیس سال پہلے اسے کمپری کی حالت میں اپنے گھر سے فرار ہونے پر مجبور کیا تھا اور مرحوم شریک حیات کے آخری دیدار سے بھی محروم رکھا تھا۔

شاپنگ سینٹر میں عرفان کو دیکھ کر حرا ہد حواس ہو کر وہاں سے بھاگ لی تھیں اور گھر آ کر مارے ڈر کے تمام کھڑکیاں دروازے بند کر کے بیٹھ گئی تھیں۔ مندمل زخموں سے دھیرے دھیرے ٹیسس اٹھنے لگی تھیں اور عرفان کی صورت نے ماضی کی کتاب کے اوراق پلٹ دیئے تھے جن میں کھا ایک ایک لفظ اپنی کہانی سناتے لگا تھا اور نامعلوم وہ ان لفظوں کی طلسماتی دنیا میں کب تک کھوئی رہتی اگر ڈور نیل خوب شور نہیں مچاتی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی تھی اور کی ہول سے دوسری طرف فرح کو دیکھ کر دروازہ وا کر کے تیزی سے ان کے گلے لگ گئی۔

”ارے خیریت تو ہے نا..... کیا ہوا؟“ وہ سخت گھبرا گئی تھیں۔

”وہ..... عرفان.....“ ان کے پیچھے کھڑے شاہ ویز کو دیکھ کر وہ خاموشی سے اندر بڑھ گئی۔

شاہ ویز نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ اس کے اندر عجیب سے احساسات ابھرے تھے۔ اس سے قبل اس نے وہ چہرہ غور سے نہیں دیکھا تھا جواب ان پر نگاہ ڈال کر وہ جن احساسات سے دوچار ہوا تھا۔

”آؤ بیٹے!“ حرا اندر آگئی تو انہیں شاہ ویز کی موجودگی کا احساس ہوا۔

”آئی! میں نیکسٹ نام آ جاؤں گا۔ اس وقت کوئی پرنٹل میٹر ہے۔“ حرا کی اڑی رنگت و پریشان چہرہ دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ ان کی کوئی گھریلو پرالیم ہے اور اس دوران اسے ان کے درمیان نہیں ہونا چاہئے۔

”ارے ایسی کوئی بات نہیں، حرا بہت کمزور دل کی ہے۔ ڈرگئی ہوگی کسی چھپکلی یا کاروچ سے۔“ فرح اسے سنگم روم میں لاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے اکثر خواتین بری طرح خوف زدہ رہتی ہیں۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کوپا ہوا تو فرح نے مسکرا کر تائید کی تھی۔

وہ ان کی رقم لے کر آیا تھا جس کو انہوں نے وصول کر کے کچھ کاغذات پر سائن کر دیئے تھے۔ اس کارروائی میں کچھ وقت گزرا تھا۔

اتنی دیر میں حرا نے کافی تیار کر لی تھی۔ ان کے فارغ ہوتے ہی لے آئی تھی۔

”آپ بھی ہمارے ساتھ کافی بیٹیں۔“ وہ کافی سرو کر کے جا رہی تھی جب نامعلوم کس جذبے کے تحت شاہ ویز کے لب میکا کی انداز میں واہوئے۔

”میں.....؟“ حرا نے استعجابیہ انداز میں شاہ ویز کی طرف دیکھ کر کہا۔ نامعلوم کس جذبے کے تحت وہ کہہ اٹھا تھا۔ قبل اس کے کبھی دل اس طرح انہیں دیکھنے اور دیکھتے رہنے کی خواہش بھی نہ ہوئی تھی۔

”ہاں ہاں حرا! بیٹھ جاؤ۔ شاہ ویز سے کوئی غیریت، کوئی اجنبیت والی بات نہیں ہے۔ اس دور میں جب کہ سچائی کو لوگ داغدار کر چکے ہیں، ایمانداری اور اصولوں کی صورتیں مسخ کی جا چکی ہیں۔ اس خود غرض اور مفاد پرست دور میں انہوں نے ثبوت دیا ہے کہ سچائی اور ایمانداری رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گی۔ ان کے اصولوں نے ہمیں گرویدہ بنا دیا ہے۔“

حرا نے ان کے درمیان بیٹھ کر کافی پی۔ اس دوران باتوں کا سلسلہ چلتا رہا اور شاہ ویز بلا ارادہ ان کے چہرے کا گہرائی سے جائزہ لیتا رہا اور ہر نظر کے بعد اس کے اندر عجیب سی ہلچل مچنے لگی تھی۔

ان دیکھے احساسات اس کے دل پر احاطہ کرنے لگے تھے۔

□●□

کاش تم سے ہم نہ ملے ہوتے

پھر سے ملنے کی نہ خواہش ہوتی

نہ محبت کو انتہا ملتی

اپنی چاہت کو نہ وفا ملتی

آرزوؤں کا خون نہ ہوتا

نہ وفاؤں کا امتحان ہوتا

کاش ہم تم جد انہیں ہوتے

کاش کہنے سے کچھ نہیں ہوتا

اصل میں بات صرف اتنی ہے

ٹو سمجھتا اگر وفا کو میری

تو کسی اور کا نہیں ہوتا

کیونکہ اب تک ہمارے اسی دل نے

بعد تیرے کسی کو چاہا نہیں

اس نے کرسی کی بیک سے سر ہٹا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اتنی شام کی تمام شادابی اس کے دل کش سراپا کا حصہ لگ رہی تھی۔ وہاٹ کاش کے سوٹ پر رنگین دھاکوں کی خوب صورت ملتان کی کڑھائی تھی۔ دو پنڈ بھی اسی رنگین دھاکوں سے کڑھا ہوا تھا جسے اس نے کھول کر شانوں پر پھیلا رکھا تھا۔ بال بے ترتیب سے آدھے شانے پر آدھے پشت پر پکھرے ہوئے تھے۔ وہ ارد گرد اور اپنے آپ سے بیگانہ آنکھیں بند کئے نیم دراز تھی۔ اس کی تمام جامہ زیبی اور فیشن اپنا وجود کھو بیٹھے تھے۔

اس کی تیزی و طراری، پھرتی و چستی کا ذکار ہو گئی تھی۔ خیالوں و خوابوں سے دور بھاگنے والی لڑکی یکدم ہی خوابوں کی دنیا کی باسی بن گئی تھی جو ہمہ وقت خیالوں کے سمندر میں غوطہ زن رہتی تھی۔ اسے اپنی پرواہ نہ تھی۔

وہ خود سے روٹھ گئی تھی اور جو خود سے روٹھ جائے اسے پھر کسی کی پرواہ نہیں رہتی اور وہ بھی ایسی ہی ہو گئی تھی۔

رافعہ ہر ممکن کوشش کر کے ہار چکی تھیں اسے راہ راست سے ورغلانے کی۔ جو جو بھی اسے اپنی طرف راغب کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ان کے ہر پلان، ہر خواہش کو مشعل کی بے رخی و بے پروائی نے لمبا میٹ کر ڈالا تھا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اسے دام میں لانے کی کوشش کرنے میں اب بھی مصروف تھیں کہ اس کی رضا کا حاصل ہی ان کے لئے امیدوں و خواہشوں کے دروازے کا ذریعہ تھا۔

وہ اسے چارہ بنا کر اپنے بھائی کی تمام دولت و جائیداد کا شکار کرنا چاہتی تھیں جو وہ شروع سے کرتی رہی تھیں۔ خود بھی بڑی فیاضی سے اپنا حق سمجھ کر بھائی کے آگے دست طلب پھیلاتی رہی تھیں اور چیلے بہانوں سے مشعل کے ذریعے بھی سب کچھ حاصل کرتی رہی تھیں۔

ان کا تعلق ہر معاشرے میں بسنے والے ان خود غرض و مفاد پرست لوگوں سے تھا جو جھوٹ، فریب، مکاری، جعل سازی و چالاکي سے فقط حاصل کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت گھناؤنے اور بے ضمیر ہوتے ہیں جو اپنا مطلب، اپنی غرض حاصل کرنے کے لئے انتہائی ہستی میں بھی آسانی سے گر جاتے ہیں۔ جن کی پہلی و آخری چاہ پُر تعیش زندگی ہوتی ہے۔

اس وقت بھی انہوں نے مشعل کو تنہا گرم بچھا دیکھا تو جھٹ اس کے پاس چلی آئیں اور بڑے دل گذار لہجے میں کوپا ہوئیں۔

”سمجھ نہیں آتا کیا ہونا جا رہا ہے تمہیں؟ نامعلوم کس بد نظر کی نظر کھا گئی شوخی و ہنسی کو۔ بلبل کی طرح چپکنے والی میری بچی کسی مجتہد کی طرح گم سم ہو گئی ہے۔ کچھ بتاؤ تو سہی میری جان، تمہارے اندر ہی اندر کون سا زہر پھیل رہا ہے..... کیا ہوا ہے آخر؟ ایسی کیا بات ہوئی ہے؟ میری طرف سے شاید آپ کے دل میں نفرت کی جو گرہ پڑی ہے وہ کبھی نہیں کھل سکتی مگر میرا نہیں تو بھائی جان کا خیال کرو، وہ تمہاری حالت دیکھ کر کیسا محسوس کر رہے ہیں۔ وہ خوش نہیں ہیں۔ وہ از حد پریشان و متشکر ہیں۔ کچھ لیوں سے بے شک نہ کہیں مگر میں ان کی، بہن ہوں۔ ان کی نفرت سے اچھی طرح واقف ہوں کہ وہ بے حد پریشان ہیں۔“

”میں نے پاپا کو پریشان نہیں کیا اور نہ ہی وہ ہیں اور پریشان ہونے بھی کیوں لگیں؟ کیا شادی کے بعد بیٹیاں باپ کے گھر پر رہنے نہیں آتیں؟ کیا سارا حق، ساری محبت، سارے رشتے بیٹی کی وداع کے ساتھ رخصت ہو جاتے ہیں؟“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”یہ میں نے کب کہا میری جان! بیٹی پر اپنی ہو جانے کے بعد اور زیادہ عزیز و پیاری ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت مزید بڑھ جاتی ہے اور رشتے بھی استوار رہتے ہیں مگر بیٹی سرال سے ہنسی خوشی، مطمئن و خوش و خرم آئے تو۔ لیکن جب سے تم آئی ہو ایسی کوئی بات، ایسی کوئی خوشی دیکھنے کو نہیں ملی۔ شادی کے بعد تو لڑکیاں پھولوں کی طرح مہکنے لگتی ہیں، گلاب کی طرح کھل اٹھتی ہیں، چہروں پر قوس قزح کے رنگ چھائے ہوتے ہیں، آنکھوں میں جگنوؤں کی سی چمک۔ وہ سر ہلکا بہا رہن جاتی ہیں۔“ از حد ملامت و شفقت سے ایک ایک کر کے گھاؤ وہ اس کے وجود کو لگا رہی تھیں اور وہ خاموشی سے گھائل ہو رہی تھی۔ ایک سسکی تک اس نے لیوں سے خارج ہونے نہیں دی تھی اور خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

مقابل کی زبان بچے سے آشنا کر رہی ہو تو پھر لفظ کو یانی کھو بیٹھتے ہیں، زبان لنگ ہو جاتی ہے۔ اس وقت صرف وہ ساتھی ساتھ دیتے ہیں جو خوشی، غم ہر موقع پر ساتھ دیتے ہیں۔ اس وقت بھی پوری شدت سے وہ اندر بے تحہ جن کو چھپانے کے لئے اسے کمرے میں پناہ لینی پڑی تھی۔ اور دروازہ لاک کرتے ہی اس کا صبر پھلک پڑا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ کھڑکی کی ایک درز سے جھانکتی ہوئی رانہ کے لیوں پر مدت بعد فاتحانہ مسکراہٹ ابھری تھی۔



فائیو اسٹار ہوٹل کے ویل ڈیکور، جنڈ روم میں صوفوں پر وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان سینئر ٹیبل پر اعلیٰ قیس کا چُج کے برتنوں میں کافی دھواں اُڑاتی کہوں میں موجود تھی جو کچھ دیر قبل ایک ویٹر تیار کر کے گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں قیمتی سگارز تھے۔ گرے اور براؤن تھری پیس سوٹ میں ملبوس ان دونوں کی شخصیتیں خاصی پُر وقار تھیں۔ خاموشی کے طویل وقفے کے بعد گرے سوٹ والے نے براؤن والے کی جانب ٹیبل سے کافی کا کپ اور سارٹھا کر سر و کرتے ہوئے کہا۔

”میرے پاس صرف چند دن کا ویزا موجود ہے اور ظاہری بات ہے ویزا آؤٹ ہوتے ہی مجھے یہاں سے جانا پڑے گا اور جانے سے قبل میں چاہتا ہوں جو کام کرنا ہے وہ آج بلکہ ابھی ہی کیوں نہ کر دیں؟“

”ہاں..... پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔ ہم نے انہیں بری طرح نقصان پہنچایا ہے اور گناہوں کی پاداش میں ایسے پھنسے کہ خود کو بھی ناقابل معافی نقصانات میں پھنسا لیا۔ عرفان صاحب! سنتے تھے مظلوموں کی آہ عرش کا سینہ چیر کر سیدھی اوپر پہنچ جاتی ہے اور عرش الہی کو ہلا ڈالتی ہے۔ اور جب اللہ کی لاشیں ملتی ہے تو آواز نہیں ابھرتی اور گناہ گار اپنے بدترین انجام کو پہنچ جاتا ہے۔“ منصور کے لہجے و انداز میں مذمت، پشیمانی اور بہت کچھ کھوینے کا احساس جاگزیں تھا اور ایسی ہی دگرگوں حالت عرفان کے سراپا سے عیاں تھی۔ دولت، عزت پالینے کے بعد بھی نا آسودگی و نامرادی کی تحریر ان کے چہرے کے نقوش سے عیاں تھی۔

”ہاں..... اسی امر کو ہم نے اب مانا ہے۔ طاقت کے غرور اور دولت کے حصول کی خاطر میں انسان سے حیوان بن گیا بلکہ حیوانیت کو بھی شرمسار کر ڈالا۔ حرامیری اسٹیپ مدر، میں نے ہر ممکن طریقے سے اسے ختم کرنے کی سعی کی اور جب اس میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس کی کودا جا ڈکر میں مطمئن ہو گیا کہ اب دولت بانٹنے والا کوئی نہیں رہا۔ آہ، کتنی گھٹیا اور مجرمانہ سوچ تھی۔ میں یہاں سے اٹھ یا پہنچا تو میرے لئے ایسی خبر موجود تھی کہ جس نے ایک عرصے تک میرے ہوش و حواس گم رکھے تھے یا یوں کہہ سکتے ہیں اوپر میرے عمل کا احتساب شروع ہو چکا تھا۔“ کچھ توقف کے لئے وہ خاموش ہو گئے اور اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو رومال میں جذب کرتے ہوئے کوپا ہوئے۔

”وہاں جاتے ہی مجھے خبر ملی کہ ند امیری بہن اپنی فیملی سمیت ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی۔ کیونکہ رازداری کے خیال سے میں اپنا ٹھکانہ کسی کو بتا کر نہیں آیا تھا اور نہ ہی کسی کو واپسی کا علم تھا، ندا، اس کے بچوں اور شوہر کو دفن دیا گیا تھا۔ ندا میں میری جان تھی۔ وہ میری از حد عزیز بہن تھی۔ اس کی ابدی جدائی اور اپنی بد قسمتی کا احساس مجھے مہینوں اندر وہ بے سکون رکھے ہوئے تھا کہ نہ میں اس کا آخری دیدار کر سکا اور نہ کندھا دے سکا۔ دولت و جائیداد بیٹھنے کا ارادہ ہم دونوں کا تھا مگر وہ اپنی بھی گھر داری برت نہ سکی۔ ندا کی جدائی کا زخم مندمل ہو ابھی نہ تھا کہ وادی حضور پر اچانک ہی دیوانگی کے دورے پڑنے لگے جن میں رفتہ رفتہ شدت آتی گئی اور ایک دن یہ نوبت آئی کہ انہیں مینٹل ہسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑا اور مرنے کے بعد ہی ان کو وہاں سے رہائی ملی۔ پھر مجھے اس شہر، اس ملک سے وحشت ہونے لگی۔ خوف محسوس ہونے لگا اور میں اپنی فیملی کو لے کر ساؤتھ افریقہ شفٹ ہو گیا اور آج تک وہیں رہائش پذیر ہوں۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود گناہوں کا عذاب مجھ پر ختم نہیں ہوا۔ میرے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ امیر ترین فیملی سے میری، بہوؤں اور دامادوں کا تعلق ہے۔ ان کی شادی کو خاصا عرصہ گزرنے کے باوجود میں آج تک دادا اور نانا بننے کی سعادت سے محروم ہوں۔ وہ ہر طریقے سے فٹ ہیں، ان کی رپورٹس اوکے ہیں اس کے باوجود میرا خاندان اپنے وارثوں سے محروم ہے۔ اب لوگ ہماری طرف تمسخر نہ لگائے ہوں سے دیکھتے ہیں اور باتیں بناتے ہیں۔ یقیناً ہم نے کوئی ایسا بڑا گناہ کیا ہے جس کی پاداش میں ہم اپنی نسل سے محروم ہیں۔ گناہ میں نے کیا، میرے ساتھ میری اولاد بھی غیازہ بھگت رہی ہے۔ اب مجھ میں سکت نہیں ہے۔ میں حرا کے قدموں میں گر کر معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ ہر وہ طریقہ اپنانا چاہتا ہوں جس سے وہ مجھے معاف کر دیں۔“



جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، بے جی کی تیاریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ پہلے تو وہ سامان وغیرہ کی تیاریوں میں مصروف رہی تھیں۔ احرام کے علاوہ انہوں نے کچھ سوٹ، چادریں اور دیگر اشیاء کی خریداری و تیاری میں وقت گزرا تھا۔ اب ان سے فراغت پا کر عزیزوں، رشتے داروں اور محلے داروں سے ملنے ملانے میں مصروف تھیں۔ اس وجہ سے ان کی لگی بندھی روٹین میں بھی کافی پیچھے آ گیا تھا۔ شاہ ویز کو وہ دانستہ نظر انداز کرنے لگی تھیں۔ کبھی شام کی چائے پر غائب ہوتیں تو کبھی رات کو کھانے پر ساتھ نہ دیتیں یا فارغ اوقات میں دعائیں وغیرہ یاد کرنے میں مصروف نظر آتیں۔ شاہ ویز انہیں ڈسٹرب کرنا ایسے میں مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ ویسے بھی اس پر عجیب قنوطیت طاری رہتی تھی۔ مشعل سے علیحدہ رہ کر وہ سمجھتا تھا کہ بے سکون و طمانیت سے رہے گا۔ اس کی موجودگی میں جو چڑچڑاہٹ اور بیزارگی چھائی رہتی ہے اس سے نجات مل جائے گی، پھر ان رویوں سے نجات بے شک مل گئی مگر احساسات کی دنیا بھی بدل کر رہ گئی تھی۔ جو وہ چاہ رہا تھا وہ دل کو منظور نہ تھا اور جودل کی لگن تھی وہ اس سے دانستہ نگاہ ہار رہا تھا۔

انا پرست تھا۔

کچھ مردانگی و خودداری کا گھنڈہ سے سوا تھا۔

وہ تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ دل کی بے کلی لاعلاج تھی۔

وہ اپنی ہمت و حوصلے کا امتحان لینے پر کمر بستہ تھا۔

”کھانا ابھی لگاؤں یا ٹھہر کر؟“ بے جی نے کمرے میں آ کر دریافت کیا۔

”ابھی تو بھوک نہیں لگ رہی ہے۔“ وہ بیٹھتے ہوئے کوپا ہوا۔ بے جی قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔

”لوگوں سے ملنے ملانے کا کام باقی ہے ابھی؟“

”چند گھر ہی رہ گئے ہیں لیکن اب دل نہیں چاہ رہا۔ مجبوراً ملنا پڑ رہا ہے۔“ بے جی کے تنجیدہ لہجے پر وہ چونک کر کوپا ہوا۔

”کیوں بے جی! کوئی بات ہو گئی ہے؟“

”جن سے بھی ملنے لگی ہوں سب نے یہی کہا ہے کہ اپنے بہو بیٹے کے ساتھ کیوں نہیں جا رہی ہو۔ کوئی بات ہی ہو گی جو بہن کے بیٹے بہو کے ساتھ جا رہی ہو ورنہ وہ بھی اس لائق ہیں۔“

”بعض لوگوں کو فضول باتیں کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ آپ کیوں ایسی باتوں کی پرواہ کرتی ہیں؟ نہ سوچا کریں ایسے تنگ ذہن و تنگ نظر لوگوں کے متعلق جن کا کام ہی ایسی بے سرو پا باتیں کر کے گھٹیا ذہنیت کو تسکین دینا ہوتا ہے۔“ اس نے اپنائیت سے ان کے شانے پر بازو رکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! بات لوگوں کی نہیں ہمارے دل کی ہوتی ہے، احساسات کی ہوتی ہے۔ ہمارے درمیان تعلقات خوشگوار و اپنائیت سے لبریز ہوں تو لوگوں کی طرف سے پھینکے گئے کانٹے پھول لگتے ہیں ورنہ پھول بھی کانٹے بن جاتے ہیں۔ بہو گھر میں ہوتی تو لوگوں کی باتیں مجھے کبھی نا کو ارنہ محسوس ہوتیں۔“

”بہت جذباتی ہو رہی ہیں آپ بے جی۔“

”ابھی بھی وقت ہے، پکڑ لو ان بھاگتے دوڑتے لمحوں کو۔ کہیں ایسا نہ ہو وقت گزر جائے اور پچھتاوے کی دھول اپنے سر میں ڈالتے نظر آؤ۔“ وہ اصحانہ لہجے میں کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھیں۔





فضا میں خنکی بڑھ رہی تھی۔

موسم ہر آلود تھا۔ ہوائیں تیز اور بے ہمت تھیں۔

ماحول پر ہلکا ہلکا سرمئی اُجالا ہر سُو پھیلا ہوا تھا۔ درود یوار خاموشی کے کہر میں لپٹے ہوئے دلوں کو وحشت زدہ کر رہے تھے۔

”تم نے اسے ٹھیک طرح سے پہچانا کہ وہ کچھ عجیب عرفان ہی تھا؟“

بچھلے ایک ہفتے سے ان کا یہی موضوع تھا اور ہر بار وہ یہی سوال ضرور کرتیں۔

”جس نے میری زندگی تباہ کر دی میں اس خوبی درندے کو کس طرح بھول سکتی ہوں؟“

”اب وہ کیا کرنے آیا ہے؟“ فرح مضطربانہ انداز میں بڑبڑا رہی تھیں۔

”یہی خوف مجھے کھارہا ہے آپ! مجھے دکھ رہا تھا بہت غور سے۔ اگر میں وہاں سے بھاگ نہ لیتی تو نا معلوم کیا کرتا۔ میں اسے دیکھتے ہی بھاگ لیتی تھی مگر مجھے لگ رہا ہے وہ میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہے اور گھر دکھ گیا ہے اور..... اور ہر گاڑی کی آواز پر مجھے اس کی آمد کا احساس ہوتا ہے اور مجھے خوف ہے کہ وہ یقیناً مجھے مارنے آیا ہے۔“ وہ فرح کی آغوش میں چہرہ چھپائے ہوئے تھی۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ہوں تمہارے پاس۔ کوئی تمہارا بال بھی بیک نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے اپنے حصار میں اسے مقید کرتے ہوئے اعتماد سے کہا۔

”نہیں آپ! مجھے احساس ہو گیا ہے۔ ہم دو عورتیں کمزور ہونا تو اہل ہیں، ہم کس طرح اپنی حفاظت کر سکتے ہیں؟ جس قدر احساس اب ہو رہا ہے مجھے اپنی کمزوری اور بے بسی کا اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے روتے ہوئے کویا تھی۔

”کاش میرا بیٹا زندہ ہوتا تو آج یہ خوف، بے بسی ولا چاری کا احساس ہمیں اس طرح متوحش نہ کئے ہوتا۔ اس کا خیال، اس کا تصور ہر دم ہماری سانسوں کی طرح میرے ساتھ رہا ہے مگر ان دنوں اس کی غیر موجودگی کا کرب ایک قیامت بن کر گزر رہا ہے۔ اتنی اذیت اور تکلیف تو مجھے اس کے مردہ ہونے کی خبر سن کر بھی نہ ہوئی تھی۔“

”جب تک ہم رشتوں کے تلاشی رہتے ہیں یا ہمیں یہ احساس و یقین ہو کہ کوئی ہمیں بچالے گا، مصیبتوں سے چھٹکارا دلادے گا یا اس کے سہارے ہماری مشکلات سہل ہو جائیں گی۔ دراصل سہارے کمزور کرتے ہیں، بزدل بناتے ہیں اور ہمیں ان سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر زندگی کو زندگی کی طرح گزارنا ہے تو خود پر بھروسہ کرنا سیکھو۔ اپنی قوت، اپنی ذات پر انحصار کرنا سیکھو، ورنہ غلامی زندگی نہیں ہوتی اور یہ تم نے کس طرح سوچ لیا کہ عورت کمزور ہوتی ہے؟“ اس وقت ان کے خوبصورت پُرو قارچہر سے پر بلا کی سنجیدگی اور گہیرنا چھائی تھی۔

”عورت کمزور ہوتی ہے اس وقت تک جب تک وہ خود کو کمزور سمجھتی ہے ورنہ تنہا عورت شیروں کے جتنے کوفنا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ جس خالق نے مرد کو بنایا ہے اسی نے عورت کو بھی تخلیق کیا ہے اور اس نے اپنی ہر تخلیق میں بے پناہ صلاحیتیں و خوبیاں رکھی ہیں اور پھر جو اپنی مدد آپ کرے اس کی رہنمائی و مدد قدرت کرتی ہے۔ ہم اس کے شہر سے، اس کے ملک سے اس وقت بھی بے خبریت لوٹ آئے تھے جب امید بھی نہ تھی تو اب یہ شہر، یہ ملک ہمارا ہے اور یہاں وہ کچھ نہ کر سکے گا، انشاء اللہ، اللہ پر یقین کامل رکھو۔“ ہر ممکن طریقے سے فرح نے اسے سمجھایا تھا اور کامیاب ہو گئی تھی۔

”گھر کا تمام راشن ختم ہو چکا ہے اور فریج میں بھی ایسا کچھ نہیں ہے جو رات کو پکایا جاسکے۔ میں مارکیٹ جا رہی ہوں۔ تم چل رہی ہو؟ طبیعت بہل جائے گی۔“

”آپ تو جانتی ہیں آپ! مجھے پُرہجوم جگہوں پر وحشت ہوتی ہے۔ آپ جائیں، میں آپ کی غیر موجودگی میں ڈسٹنگ وغیرہ کر لوں گی۔ ملازمہ کی تو ابھی تک چھٹیاں چل رہی ہیں۔“

”فکرمت کرو، سیلری لینے سے چند روز قبل آجائے گی، کسی نئی اسٹوری کے ساتھ۔“ فرح ہنستے ہوئے کویا ہوئیں تو وہ دھیسے سے مسکرائی تھی۔

سیاہ چادر اپنے گرد باوقار طرے سے لپیٹے وہ پرس سنبھالے خرماں خرماں چل رہی تھیں۔ مارکیٹ گھر سے قریب تھی اس لئے انہوں نے کار کے بجائے پیدل آنے کو ترجیح دی تھی۔

موسم کی ٹھنڈک عروج پر تھی۔ شام کا وقت تھا مگر سڑکوں پر پُرفیٹ معمول کے مطابق تھا۔ ارد گرد دلوں کا ہجوم بہت کم تھا۔ فرح نے حرا کو کافی تسلی و حوصلے دیئے تھے لیکن عرفان کی یہاں موجودگی اور حرا کے تعاقب نے انہیں بھی ذہنی خلفشار میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں عرفان اتنے عرصے بعد کیا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی سوچوں میں گم یہ محسوس نہ کر پائیں کہ ایک نیلی گاڑی کب سے ان کے تعاقب میں چل رہی ہے۔ ایک سمنان موٹر پر یکدم ہی وہ کار ان کے آگے رکی تھی اور قبل اس کے کہ وہ ہوشیار ہوتیں سائینڈور کھول کر دوسرا دانہ ہاتھوں نے انہیں انتہائی سرعت سے اندر گھسیٹ لیا تھا اور کار تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

□●□

جو جو نے منہ بنا کر رانچہ کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا جب کہ وہ اسی زور و شور سے رونے میں مصروف تھیں۔

”مما! آخر کب تک آپ کی یہ گریہ و زاری چلے گی؟“ اس نے زچ ہو کر کہا۔

”جب تک میرا دل جلے گا۔“

”اس کو تو شاید اب ساری زندگی جلنا ہے۔“

”ہاں ہاں اُڑالوند اتق۔ تم سے اب امید کیا رکھی جاسکتی ہے، ہونہہ..... دنیا کی مائیں کس چالاکی سے بیٹوں کو کیش کروا کر اپنی آرزوئیں پوری کر رہی ہیں، ارمان نکال رہی ہیں ایک میں بد نصیب ہوں جو ان آسانشوں سے محروم بھائی کے ٹکڑوں پر پڑی ہوں، آہ کل سز قمر کو دیکھا تھا؟ اوہ، کیسی دولت مند ہو لے کر آئی ہے۔ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن کیا کچھ نہیں لائی ہے چیزیں میں۔ ایسا لگتا ہے دنیا کی تمام اشیاء و دولت اس کی بہو سمیٹ لائی ہے اور سز قمر بہو کے میکے کی جانب سے ملنے والے ڈائمنڈ پیکلس میٹ کو پکین کر کیسی ہواؤں میں اُڑ رہی تھی کویا زمین پر پاؤں رکھنا جانتی ہی نہ ہو۔ اور وہ سز طلعت کیسے کروفر سے بہو کو چیزیں ملنے والے ہزار گز کے ویل ڈیکورینڈ بنگلے میں شفٹ ہوئی ہے اور ایک میں ہوں، اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں، بیٹے کے ہوتے ہوئے بھی بہو کے ذریعے اٹھائے جانے والے عیش و آرام کو ترس رہی ہوں۔“ تفصیلات بتانے کے دوران تھم جانے والے آنسو دوبارہ رواں ہو گئے تھے۔

”مما! آپ کے قابو میں زبان رہتی ہے نہ جذبات۔ ورنہ مشعل جیسی بہو آپ کی کسی جاننے والی کی نہ ہوتی۔ دولت و جائیداد کے علاوہ وہ ساری زندگی آپ کی تابعدار رہتی اور آپ کے عیش ہی عیش تھے۔“

”ہاں درست کہہ رہے ہو۔ رونا اس بات کا ہے، میں نے خود اپنے نصیب پر کلہاڑی چلائی ہے۔“ پچھتاووں کے بحر میں وہ کافی دیر تک غوطہ زن رہی تھیں۔ جو جو کے وجود پر بھی تاسف و ملال کی کیفیت تھی۔

وہ ان یادوں میں بھرتھا جن میں مشعل کی دوستی کے علاوہ مراعات بھی حاصل تھیں اور رانچہ کا مکافہ ذہن کسی ایسی ترکیب میں الجھا ہوا تھا کہ جس کے ذریعے وہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کر کے فارن کنٹری کی طرف کوچ کر جائیں، جہاں ان کے شوہر ان کے انتظار میں وقت گزار رہے تھے۔ حسن بیگ سے انہیں استعمال کے لئے وقتاً فوقتاً رقم ملتی رہتی تھی لیکن یہ رقم اس رقم سے بہت کم ہوتی تھی جس کی وہ عادی تھیں اور اب ان کی یہی پلاننگ تھی کہ کسی طرح بھی لبا ہاتھ ماریں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس ملک سے نکل جائیں۔

نظر تا وہ لالچی اور خود غرض عورت تھیں اور دوسروں کی خوش حالی و مسرتوں سے انہیں سخت رنج پہنچتا تھا۔ آج کل تمام تقریبات میں شوق و ذوق سے شرکت کر رہی تھیں جہاں ان کی حریصانہ نگاہیں بیٹا لڑتی رہتی تھیں کہ کسی کو کیا گفٹ ملا اور دیئے والی جگہوں پر ان کی آنکھیں کام کرنا بند کر دیا کرتی تھیں۔ کل سے ان کی نگاہوں میں سز قمر کا ہیرے کا میٹ اور سز طلعت کی بہو کے چیزیں ملنے والا ہزار گز کا بنگلہ بسا ہوا تھا۔ اس دکھ کو دور کرنے کے لئے وہ آنسو بہانے کے ساتھ کوئی ایسی ترکیب سوچ رہی تھیں جس کے ذریعے مشعل کو دوبارہ قابو کر سکیں۔

”بھائی جان ایک دن کے لئے کاروبار کے سلسلے میں کراچی سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے ہمیں۔“ بالآخر ان کے شیطانی دماغ میں ایک شیطانی ترکیب آگئی۔

”کیسا فائدہ ممما! ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ اس کا انداز سرکوشیا نہ تھا۔

”بدھو کے بدھو ہی رہنا تم۔“ رانچہ نے کچھ اس انداز میں کہا کہ جو جو کو ان کا عندیہ جاننے میں دیر نہ لگی۔

”لیکن وہ لفٹ نہیں دیتی۔ میں کس طرح اس کے قریب جاسکتا ہوں؟“

”بس شتم آج سے اس کمبخت کے نخرے..... اب کے وہ وہی کرے گی جو ہم چاہیں گے۔“ وہ جھوم کر کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے لبوں پر از حد مکروہ و گھناؤنی مسکراہٹ تھی۔

”مما..... ممما! ایک بار پھر سوچ لیں۔ اگر ہم کامیاب نہ ہو سکیں تو پھر ہمارا انجام کیا ہوگا؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ تذبذب کا شکار تھا۔

”اسنو پیڈ، مردوہ، مردانگی کا مظاہرہ کرو۔ ایسی منحوس باتیں کر کے میرا موڈ مت بگاڑو پگل انسان، ہر کام کامیابی کی امید لے کر کرنا چاہئے اور تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ مشعل پہلے تمہاری تھی اور تمہارا بھی اس پر حق ہے اور حق کو حاصل کرنا ہی مردانگی ہے۔ پھر اس طرح سے بھی ہم اسے بلیک میل کر کے وہ سب حاصل کر سکتے ہیں جو چاہتے ہیں۔“

وہ بیٹے کو ایسے گھٹیا فعل کے لئے اکسار ہی تھیں جس کا خیال ہی شریف و دیندار ماں کے قریب نہیں چھلک سکتا۔

□●□

موسم نے یکدم ہی کروٹ لی تھی۔

سارے دن سے ہوتی سورج اور بادلوں کی آنکھ بھولی اختتام پذیر ہوئی تھی اور سورج کے غروب ہوتے ہی سیاہ بادل ہر سمت چھا گئے تھے اور لمحوں میں شپ شپ گرتی

بوندوں نے موسلا دھار بارش کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ ہوائیں کسی وحشی دندے کی مانند چنگھاڑتی پھر رہی تھیں۔ آسمان کے گرجے میں بھی زخمی شیروں جیسی غرائیں نمایاں تھیں۔

ایک عرصے بعد اس کے چہرے کو جاندار مسکراہٹ نے منور کیا تھا اور اڑھد آسودگی سے مسکراتا ہوا وہ مشعل کی جانب دیکھ رہا تھا جو اس کے قریب چہرہ جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر آنسو بہہ رہے تھے بے تحاشا اور اس وقت اسے وہ چہرہ سرخ گلاب کی مانند گہرا ہاتھا جو شبنم کے پاکیزہ اوہرنور قطرہوں سے دمک رہا ہو۔

”تمہیں یہی اعتراض تھا کہ میں اس گھر سے بلا اجازت و بغیر اطلاع گئی تھی۔ میرے اس احمقانہ اقدام کو تم نے اپنی ناصحیت کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا ہے لامرد کی ہویا عورت کی اگر برقرار رہے تو گھر ٹوٹ جاتے ہیں، آشیانے بکھر جاتے ہیں، کچھ باقی نہیں رہتا۔ یہ لانا بہت بری چیز ہے..... بہت بری۔“ فسوس، ندامت، پچھتاوا، فحالت ہر احساس اس کے چہرے سے نمایاں تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر بازوؤں کے حلقوں میں قید کر کے بڑی محبت و اپنائیت سے اس کے آنسوؤں کو سینٹا چا ہاتھا۔

لیکن یہ کیا، مشعل کے چہرے پر اس کے ہاتھ ایسے لہرا کر رہ گئے جیسے وہ ہوا کا وجود رکھتی ہو۔ اس کے بازوؤں کے حلقے سے بھی وہ کسی ہوا کے نرم و سبک جھونکے کی مانند نکل گئی تھی۔ وہ متوحش سا اس کے پیچھے بھاگا تھا اور وہ بھیگے چہرے پر پُرسوز مسکراہٹ سجائے لمحہ بہ لمحہ اس سے دور ہو رہی تھی، ہواؤں کے دوش پر اڑتا اس کا وجود کوہیا جاندار احساس نہ رکھتا تھا۔ دم بدم اس کی گرفت سے دور وہ بھاگ رہا تھا۔ بے تحاشہ، پوری قوت سے۔ لیکن وہ ہوا تھی، اس کی دسترس سے دور..... نامعلوم کون سے راستے تھے جو اس کے نیچے آکر روند رہے تھے اور اس مقام پر جہاں بلند و بالا پہاڑ تھے، نیچے گہری کھائیاں، اس جگہ اس نے اسے پکڑنے کے لئے جیسے ہی بازو بڑھائے تھے مشعل کا دوپٹہ اس کے ہاتھ میں آگیا تھا اور وہ اس کے سامنے اندھی گہری کھائیوں کی طرف گرتی گئی اور لمحوں میں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی..... ایسا ہولناک و دلخراش منظر تھا کہ اس کے لبوں سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا تھا۔ اس کا ہاتھ ہوا میں اسی طرح معلق تھا جیسے مشعل کا دوپٹہ موجود ہو۔ اس کا سانس بری طرح چل رہا تھا اور ٹھیک ٹھاک سرد موسم میں وہ پسینے میں شرابور تھا اور دل تھا کہ اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا کوہیا سینڈیوڈ کر باہر نکل جائے گا۔

”تھینکس گا ڈاؤہ سب خواب تھا.....“ وہ بیٹھتا ہوا بڑبڑایا تھا۔ ”لیکن یہ کیسا خواب تھا؟ کچھ حقیقی، کچھ غیر حقیقی..... مشعل نے وہی انداز اپنایا جو مجھے پسند تھا۔ اس نے وہی کیا جو میں اس سے سننا چاہتا تھا پھر وہ کیا تھا؟ اس کا ہوا کے دوش پر اڑنا، کوشش کے باوجود وہ میری دسترس سے دور رہی تھی۔ پہلی بار میرے دل میں اس کے لئے کوئی انگ جا گئی تھی، پہلی بار پورے استحقاق سے میں نے اسے بانہوں میں بھرنا چاہا تھا، اس کے ایک ایک آنسو نے میرے ضمیر کو جھنجھوڑا لایا ہے۔ خواب ہمارے احساسات و خواہشات کا عکس ہوتے ہیں۔ میرے اندر کی دبی ہوئی خواہشوں نے کچھ حقیقت کا رنگ بھرا تھا مگر وہ سب کیا تھا؟ مشعل کا دوپٹہ میرے ہاتھ میں رہ جانا اور مشعل کا کھائی میں گر جانا، یہ سب کیا ہے؟ میرے احساسات اتنے منتشر کیوں ہو رہے ہیں؟ میں مانتا ہوں جب تک وہ میرے ساتھ رہی میں اسے نظر انداز کرتا رہا، اس کے جذبات و محبت کا مضحکہ اڑاتا رہا اور یہ سوچ کر خوش ہوتا رہا کہ اس سے چھٹکارا پا کر بہت خوش و خرم زندگی گزاروں گا..... آہ، مگر.....“

”بعض سوچیں، کچھ تدبیریں، کچھ نظریات، انسان کے ساتھ رشتہ تو رکھتے ہیں مگر وقت آنے پر بے وفا و بے مروت دوستوں کی طرح راستہ بدل لیتے ہیں اور آدی کوتاہ و بے بس کر ڈالتے ہیں۔ میں مشعل سے محبت کا دعویٰ تو نہیں کرتا مگر اعتراض کرتا ہوں کہ میں اس کے بغیر اب رہ نہیں سکتا۔ میں اس کے وجود کا عادی ہو گیا ہوں۔ ایسے ہی جس طرح کوئی نشے کا کہ جان وادار سکتے ہیں مگر اس سے چھٹکارا منظور نہیں۔

وہ میری محبت نہیں ضرورت ہے۔

شاید ضرورت کبھی محبت بھی بن جائے۔

دنیا میں حادثے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی یہ حادثہ ہو جائے گا۔ یہ وقت ممکنات کا وقت ہے، پانی کا مسلسل گرتا قطرہ چنانوں کے سینے میں شگاف کر سکتا ہے تو انسان تو پھر بہت نرم و نازک ہے۔“

وہ ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

سامنے کھڑکی سے باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ بارش دھواں دھار ہو رہی تھی ساتھ بادلوں کی گرج کے ساتھ بجلی کی چمک بنگا ہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اس کے وجہ یہ چہرے پر خطر اور خطر اب کی کیفیت تھی۔ اس کے اندر یحجان آمیز طوفان بچا تھا۔ اس کی انا ذات کے گرد کھڑی اجتناب و احتراز کی دیواریں برف کی طرح پگھلنے لگی تھیں۔ وہ احساس، وہ جذبہ، جس سے وہنا آشنا تھا، لاعلم تھا یا جان بوجھ کر انجان بنا ہوا تھا، اب تمام شدتوں و حقیقتوں کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔

شعور و آگہی کے در دھڑا دھڑا و اہور ہے تھے۔

اس ایک خواب نے اسے اور اک بخشا تھا اور وہ بے کلی و بے چینی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے کئی گلاس پانی کے پی لئے تھے مگر خطر اب تھا کہ کسی طور بھی کم ہونے کی بجائے بڑھ رہا تھا اور وہ اس بے چینی و گھبراہٹ کو کوئی نام نہ دے پایا تو خطرناک موسم کی پرواہ کئے بغیر کار کی چابی لے کر پارکنگ شیڈ کی طرف بڑھ گیا تھا۔



اچانک جس طرح ان کو کار میں گھسیٹا گیا تھا اس افتاد پر وہ سنبھلی بھی نہ تھیں کہ گھسیٹنے والے پر ان کی نگاہ اٹھی تو جھٹکا بھول گئی۔ کار ڈرائیو کرتے عرفان کو دیکھ کر ان پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ جو گھبراہٹ ہے تھے، خوفزدہ ہو رہے تھے کہ اس طرح اغواء کرنے پر ان کے شدید رد عمل کو کس طرح فیس کریں گے۔

ان کی یہ گم صم و خاموش کیفیت ان کے لئے سودمند ثابت ہوئی تھی۔ وہ اسی کیفیت میں انہیں ہوٹل کے کمرے میں لے آئے تھے جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔ انہیں چھوڑ کر عرفان مصلحتاً کچھ وقت کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ منصور کا فی تدبیروں کے بعد فرح کو حواسوں میں لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ فرح نے غصے سے چونکا شروع کر دیا تھا۔

”ٹیک اسٹ ایزی..... ٹیک اسٹ ایزی فرح! پلیز غصہ بعد میں ہونا پہلے میری بات سن لو، پھر چاہے مارو گی بھی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ منصور کا دھیمالہجہ خوشامدانہ و انتہائی تھا۔

”تمہیں ہمت کیسے ہوئی مجھے اس طرح اغواء کر کے لانے کی؟ میں ابھی پولیس کو فون کر کے بلاتی ہوں۔“ وہ شعلہ جوالہ بنی فون کی جانب بڑھی تھیں۔

”پہلے میری بات سن لو، پھر جو چاہے کرتی رہنا۔ حرا کے مفاد کی بات ہے۔“ اسے خونخوار دیکھ کر دانستہ انہوں نے حرا کا نام لیا تھا جس کا رد عمل فوری ہوا تھا۔ ایک جھٹکے سے پلٹ کر کوہیا ہوئی تھیں۔

”خبردار جو میری مظلوم، بہن کا نام اپنی ناپاک زبان سے لیا۔ ہونہ، اس کے دشمن کو ساتھ لئے گھوم رہے ہو اور بات کرتے ہو اس کے مفاد کی۔“

”پلیز ایک موقع دو مجھے کچھ بتانے کا، ایک راز سے پردہ ہٹانے کا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں میری نیت، میرے ارادے نیک ہیں۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہا ہوں کہ میرا ایک ایک لفظ سچائی کے قلم سے تحریر ہے۔ اگر ذرا بھی جھوٹ کہوں تو اسی لمحے میری روح پرواز کر جائے۔“ ان کی آنکھوں میں نمی اور لہجے کی لاجبخت فرح کو موم کر گئی۔

”جلدی کہو جو کچھ بھی کہنا ہے..... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”یہ تو تم جانتی ہو مجھے جوئے کی لت کافی پرانی تھی اور ان دنوں جب حرا کی ڈیوری قریب تھی مجھے کاروبار میں مسلسل نقصان ہو رہا تھا اور ان دنوں مجھ پر ایک پریشر بہت زیادہ تھا، جن سے میں نے ایک سال سے سچاسی لاکھ روپے سود پر حاصل کئے ہوئے تھے، میں کچھ عرصہ ان کو رقم دیتا جا رہا تھا۔ پھر روز بروز بیٹھتے کاروبار اور مسلسل کلب میں ہارنے مجھے اس قدر قحاش کر دیا کہ میرا سکون برباد ہونے لگا اور جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ سنڈکیٹ والوں کی اس دھمکی نے پوری کر دی کہ اگر ان کی رقم فوراً ادا نہ کی گئی تو وہ مجھے مار کر کاروبار پر قبضہ کر لیں گے۔ میں نے تم سے حرا کے اکاؤنٹ استعمال کرنے کا کہا، تم نے سختی سے انکار کر دیا اور مستقل انکار پر ڈٹی رہیں۔ یہاں تمہارا انکار وہاں ان کی دھمکیاں، مجھے اپنی جان بچتی ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی اور ایسے میں، میں خود غرض بن گیا بلکہ شیطان مجھ پر حاوی ہو گیا اور میں نے.....“ اعتراض فوجم کرتے ہوئے ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ چہرہ جھک گیا تھا۔

”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تمہیں اپنے جذبات پر قابو کرکھ کر سننا ہوگا۔ خواہ بعد میں جو حشر کرنا چاہو، میرا کر سکتی ہو۔ ابھی تو پلیز خاموشی سے سننا۔ میں نے انڈیا میں عرفان سے رابطہ کیا اور اس سے سودے بازی کی، منہ ماگی رقم لے کر میں نے حرا کے متعلق انفارمیشن دے دی اور پھر ہم نے بہت گھناؤنا کھیل کھیلا۔ عرفان پاکستان آگیا۔ ہم نے ہسپتال کے تمام عملے کو خرید لیا اور پلان کے مطابق حرا کے مارل کیس کو میز رکیس میں تبدیل کروایا تا کہ اس کی بے ہوشی کے دوران بچہ آسانی سے تبدیل کیا جاسکے اور جس وقت تم نے ہسپتال میں یہ شبہ ظاہر کیا کہ تمہیں عرفان جانا ہوا نظر آیا ہے وہ حقیقت تھی۔ مردہ بچہ اوٹی میں پہنچا کر وہ حرا کے زندہ بچے کو لے گیا تھا۔“

”اوگا ڈ..... اوگا ڈ..... اتنی بڑی سازش، ایسا بدترین گناہ کرنے کے باوجود تم اپنا گناہ گوارہ وجود لئے اسی دھرتی پر موجود ہو؟ ایسے غیر انسانی کام کے باوجود اتنے سکون سے جی رہے ہو؟“ اس انکشاف پر وہ دھل اٹھی تھیں۔ ان کے کانپنے لہجے میں نفرت و حقارت کی چنگاریاں تھیں۔ وہ قہر برساتی نگاہوں سے منصور کو گھور رہی تھیں۔

”ہاں، جی رہا ہوں..... اس لئے کہ یہ زندگی سزا کے طور پر ملی ہے۔ جو گناہ میں نے کئے ان کی لمحہ لمحہ سزا بھگتی ہے۔ وہ رقم لے کر میں یہاں سے ماسکوفر ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا میرے دشمن میرے تعاقب میں ہیں۔ لیٹر پورٹ پر انہوں نے مجھ سے رقم چھین لی اور اتنا تشدد کیا کہ میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ پورے آٹھ سال جانوروں سے بدتر زندگی گزاری ہے۔ کچھ عرصے قبل عرفان حادثاتی طور پر لکرا گیا تھا۔ اس نے میرا علاج معالجہ کروایا، مجھے اس قابل بنایا کہ میں ذاتی طور پر اپنا کوئی بزنس کروں۔ یہ اسی کی مہربانی ہے کہ میں یہاں بیٹھا ہوں ورنہ پاگل خانے میں سرخونچ خچ کر مر چکا ہوتا۔“

”ناسف ہے تمہاری سوچ پر..... اتنا کچھ کرنے کے باوجود زندگی کی مزید خواہش رکھتے ہو تم۔ ذلت کو عزت سمجھنے والے ہو آخر۔“

”تم جو چاہو کہہ سکتی ہو۔ ہر بات، ہر طرز کرنے میں حق بجانب ہو۔ میں حرا کا ہی نہیں تمہارا بھی مجرم ہوں۔ بیوی اور گھر کے سکون و محبت کو چھوڑ کر ٹھوکر مار گیا تھا۔ مجھے وقت کی ٹھوکروں نے آج تک نشانے پر رکھا ہے۔“

”زندگی میں ہی نہیں، مرنے کے بعد بھی تم اسی طرح بے سکون و عذاب میں مبتلا رہو گے۔ تم نے ایسا گناہ کیا ہے جس کو شاید اللہ بھی معاف نہ کرے۔ میرے اعتماد و محبت

کلو تم نے دھوکا دیا ہی ہے، اس پر تو میں تمہیں معاف کرتی ہوں، یہ سوچ کر کہ شاید میرے مقدر کا لکھا تھا یہ۔ اور جس گھر کو اور اپنوں کو ٹھوکر مار کر گئے تھے وہ نہ گھر کا سکون و آسودگی حاصل ہوئی نہ اپنوں کی رفاقت و افتخار۔ لیکن حرا کے ساتھ کی گئی اتنی بھیا نک زیادتی کبھی نہ معاف کروں گی۔“ وہ سخت لہجے میں بولیں۔

”یہ سراسر میراجرم ہے سسر، آپ مجھے سزا دیں۔“ عرفان اندر داخل ہوتا ہوا عاجز اندہ لہجے میں بولا۔

”تم..... تم مجھے اپنی مخوس صورت نہ دکھاؤ۔“ جتنی تمہاری چھری سفید ہے دل تمہارا اتنا ہی سیاہ ہے۔ سیاہ پتھر کا ایک ٹکڑا جس میں احساسات و جذبات بالکل پتھر کی مانند جامد ہو چکے ہیں۔ ظالم، جرم، فرعون، تُو نے میری بہن کو اس کے شریک حیات کے آخری دیدار تک سے محروم رکھا اور پھر بھی تیرے دل کی آگ نہ بجھی تو اسے اس کے بچے کے پہلے اور آخری دیدار سے بھی محروم کر ڈالا۔ منصور کی کوئی اولاد نہیں تھی، وہ بے اولاد تھا، نہیں جانتا تھا کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے؟ کوئی اپنی اولاد کی خاطر سب کچھ وارنے کو تیار کیوں ہو جاتا ہے؟ لیکن تم تو اولاد والے تھے، اس درد کو، اس محبت کو جانتے تھے۔ تمہیں تو اللہ نے جھولی بھر کر اولاد دے رکھی تھی۔ پھر تم نے کس طرح ایک ماں کو اور تمہارے ظلم کی شکار بیوہ عورت کو اس کی اولاد سے محروم کر دیا؟“ انہوں نے آگے بڑھ کر عرفان کا گریبان پکڑ کر سخت طیش میں کئی تھپڑ اس کے چہرے پر لگاتے ہوئے کہا۔

عرفان نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔ نہ ان کے ہاتھوں سے اپنا گریبان آزاد کرو لیا تھا، نہ ان کے چلتے ہاتھوں کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے خود ہی دور ہوئی تھیں۔ جب کہ وہ اسی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا۔

”کاش یہ پتھر مجھے بچپن میں بھی لگ گئے ہوتے تو آج میں قابل فخر انسان ہوتا اور ایسا کچھ نہ ہوتا جس نے کئی زندگیوں کو تباہ کر ڈالا ہے۔“ وہ آہستگی سے کوپا ہوئے تھے۔

”اب کیا چاہتے ہو تم لوگ؟ کیا مقصد ہے تمہارا؟ تباہ و برباد تو ہم ہو گئے ہیں۔ اب کیا کسباتی ہے؟ کون سا پلان تمہیں دوبارہ یہاں لایا ہے؟“ وہ سخت متنفر تھیں۔

”بندہ جیسا کرتا ہے ویسا بھرتا ہے۔ ہم جب گناہ کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں ہمیں کوئی نہیں دیکھ رہا، ہمارے کسی غلط عمل پر ہماری گرفت نہ ہوگی۔ ہم سدا یوں ہی من مانی کرتے رہیں گے اور یہ خوش فہمی ہماری چھٹھڑی بن جاتی ہے اور ہم اپنے ہی لگائے گئے گناہوں کے جال میں خود بچھنس جاتے ہیں۔ میں نے ایک کو دخالی کی تھی۔ قدرت نے مجھے گھر سے تنہی دامن رکھا۔ اس کے بعد میرے خاندان میں کسی کی کواد آبادی نہ ہو سکی۔ میری بہن اپنے خاندان سمیت صفحہ ہستی سے مٹ گئی اور میرا خاندان بانجھ خاندان مشہور ہے۔ دولت کی لالچ میں نے اور میری بہن نے کی تھی اور سزا میرے ساتھ میرا خاندان پارہا ہے۔ ہمارے پاس بہت دولت ہے، بے تحاشا جائیداد ہے اور ہم اس اصل جائیداد سے محروم ہیں جس کو اولاد کی نعمت کہتے ہیں۔ میری نسل کو کوئی چلانے والا نہیں ہوگا۔ میرے خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا، فنا ہو جائے گا۔“ عرفان نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے ایک بار حرامی سے ملوادیں، میں ان سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ وہ جو چاہیں گی میں وہی کروں گا۔ میں تمام دولت ان کے نام لکھنے کو تیار ہوں۔ وہ مجھے صرف ایک بار معاف کر دیں دل سے، سچی معافی۔ مجھے یقین ہے وہ معاف کر دیں گی تو رب بھی مجھے معاف کر دے گا۔ میرے خزاں رسیدہ مچن میں بہار آ جائے گی۔ میرا خاندان آباد ہو جائے گا۔“ وہ ہری طرح گڑگڑا رہا تھا۔

”ایک عورت تو تمہیں معاف کر دے مگر شاید ایک ماں معاف نہ کر سکے۔“

”فرح! تم حرا سے بات کرو، اسے تمام صورت حال بتاؤ، وہ ایک عورت یا ماں بن کر معاف نہ کر سکتی خرم کی بیوہ ہونے کے ناتے سے ضرور معاف کر دے گی۔ خرم کے حوالے سے تو وہ اس خاندان کی تباہی نہ چاہے گی۔“ منصور نے مشورہ دیا تھا۔

”نہیں..... اگر حرا ایسا کرنا بھی چاہے گی تو میں کرنے نہیں دوں گی۔“

”کیوں..... تم اتنی سفاک کب سے بن گئیں؟“

”جب سے میں نے اسے چھپ چھپ کر اپنے بچے کے لئے روتا ہوا دیکھا ہے۔ یہ اچھا انصاف ہے۔ دوسری کی زندگی تباہ و برباد کرنے کے بعد خود بھکاری بن کر آگئے، مطلب پرست لوگ اسی طرح کینگی بدل لیتے ہیں۔“

”اگر میں یہ کہوں حرا کا بچہ زندہ ہے تو پھر کیا کہو گی؟“

”کیا، کیا.....؟ ایسے بے ہودہ مذاق کو میں برداشت نہیں کر سکتی۔“

”یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔ ان کا بچہ زندہ ہے اور اسی شہر میں ہے۔“ عرفان کا لہجہ سچا تھا۔ ساتھ منصور نے بھی تائید کی تھی۔

”یہ..... یہ تمہاری کوئی نئی چال ہے، دھوکا دینے کی نئی سازش۔“

ان پر عجیب سے احساسات نے غلبہ کیا تھا۔ وہ سراسیمہ سی کھڑی ہو کر بولیں۔

”نہیں، یہ جھوٹ، فریب، سازش کچھ نہیں ہے۔ صرف اور صرف حقیقت ہے۔ تم حرا کو راضی کرو، ہم ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“



مرے جانے پر اے جاناں

پریشان تم نہیں ہونا

کبھی چھپ کر نہیں رونا

جدائی زہر ہوتی ہے

مجھے معلوم ہے لیکن

فراق و ہجر کا موسم

یقیناً بیت جائے گا

یقیناً وصل کے لمحے

دوبارہ لوٹ آئیں گے

وہی شامیں، وہی راتیں

وہی قصے، وہی باتیں

وہی پھر داستاں ہوگی

محبت مہرباں ہوگی

محبت مہرباں ہوگی

زندگی یونہی رواں دواں تھی۔ ہر صبح کے بعد شام اور پھر رات آ جاتی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا ماسوائے مشعل کے جو اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر رہ گئی تھی، کسی ہنگامی مجتھے کی مانند جو کبھی ایک عالم کو اپنے گھس کی رعنائیوں سے مسحور کیا کرتی تھی۔ اب اپنے وجود کو ہی فراموش کر بیٹھی تھی۔

وہ تھی اور اس کی تنہائیاں جہاں وہ نقطہ ایک سنگر و بے وفا محبوب کے تصور میں دنیا کو بھلائے بخور رہتی تھی۔

باہر بارش زور و شور سے برس رہی تھی۔

اس کے اندر بھی ایک ساون کب سے رواں تھا۔

جس کا ہر قطرہ، ہر بوند دل میں پیاملن کی آگ سلگائے ہوئے تھا۔

اس کی دید کی پیاس تھی۔

سماعت اس کی آہٹوں کی منتظر تھی اور دل ہر لمحہ اسے محسوس کرتا تھا۔ وہ نگاہوں سے دور ہوا تھا مگر دل ہر سماعت اس کے تصور سے آباد رہا کرتا تھا۔ اس کی یاد تک بکرا اس کے دل میں کسی کانٹے کی طرح چبوست تھی جس سے اٹھنے والی ٹہنیں آنسو بن کر اس کے نینوں سے برتی رہتی تھیں۔

اس وقت جل تھل موسم اسے گزرا ہوا وہ وقت یاد دلارہا تھا جب وہ شاہ ویز کے سنگ تھی۔ اس کی ہزار ہا بے رخی و بے اعتنائیوں کے باوجود وہ اس کے قریب تو تھی۔

کوئی اس کا دروازہ زور زور سے پیٹ رہا تھا۔

اس نے کھڑکی بند کی اور دروازہ کھولا تو سامنے جو جو کھڑا تھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ حیرانگی سے کوپا ہوئی۔

”میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”اس وقت؟ تمہیں معلوم نہیں کیا نام ہو رہا ہے؟“ اس کے لہجے میں ناکواری تھی۔ وہ دروازہ لاک کر کے پلٹنا ہی چاہتی تھی کہ ایک دم ہی جو جو نے اسے دھکا دیا تھا اور اس کے راستے سے ہٹے ہی پھرتی سے اندر آ کر دروازہ لاک کر دیا تھا۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے جو جو؟“ وہ پلٹ کر غرائی تھی۔

”یہ بے ہودگی نہیں، پیار ہے۔“ اس کے لہجے میں خباثت تھی۔

”مطلب کیا ہے تمہارا؟ تم کیوں ایسی بکواس کر رہے ہو؟“

”مطلب ادھر قریب آؤ تو سمجھاؤں۔ ایک غیر مرد اس گھر کی دولت اور تمہارے تن کی دولت پر ہاتھ صاف کر گیا اور ہم مند دیکھتے رہ گئے۔“

”جو جو زبان بند کرو اپنی۔ تم اتنے گھنٹیا اور ذلیل ہو۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تمہیں اس گھر کے آس پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتی۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ ابھی اسی وقت اپنی یہ مکروہ شکل لے کر ہمیشہ کے لئے دفع ہو جاؤ۔“ جو جو کے اس روپ نے اس کے ذہن و دل کے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ وہ غصے و رنج سے تھر تھرا کر رہی تھی۔

”فکرت کرو جان من! ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں گا لیکن اپنا حق وصول کرنے کے بعد۔ جن خواہشوں کو عرصے سے سنبھالے گھوم رہا ہوں اب تو ذرا ان کے سیراب ہونے کا وقت آیا ہے۔“ اس کی بھوکی نگاہیں اس کے سراپے کو چھیدنے لگی تھیں۔

”میرے قریب مت آنا۔“ اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ ہڈیاں انداز میں جھنجکی تھی۔

”تم گھبراؤ ایسے رہی ہو جیسے پہلی بار کسی مرد سے وسط پڑا ہو۔“ پھرے سے مہذب و بے ضرر نظر آنے والا مکمل شیطان کا روپ تھا۔

”گیٹ لاسٹ..... گیٹ لاسٹ.....“ وہ پوری قوت سے جھنجکی تھی۔

”نہیں..... تم مجھ سے نہیں بچ پاؤ گی۔ میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔ مجھ سے اب تمہاری دوری برداشت نہیں ہوگی۔“ اس نے آگے بڑھ کر اس کے بازو تھام کر کہا۔

”چنانچہ..... چنانچہ.....“ اس کا ہاتھ اٹھا تو اختہ چلا گیا۔ وہ غصے سے دیوانی ہو رہی تھی۔

”تم نے کیا سمجھا ہے مجھے..... میں کوئی کال گرل نہیں ہوں جو بہ خوشی تمہاری ہوس کی ناپاک آگ بجھانے کو تیار ہو جائے۔ میں ایک غیرت مند مرد کی بیوی ہوں اور عزت و ارباب کی بیٹی ہوں اور میری ماں بھی شریف اور نیک چلن تھی۔“

”نیک چلن ماں؟..... عزت و ارباب.....؟ بابا..... کیا معزز گھر نہ پایا ہے تم نے۔“ اس کے تھنروں کو نظر انداز کر کے وہ استہزائیہ قہقہے لگانے لگا تھا۔ ”سنو، کان کھول کر سنو تم کتنی نیک چلن ماں کی اولاد ہو..... حسن انکل تمہارے باپ نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی مرحومہ بیوی سے تمہارا کوئی تعلق ہے۔ تم تو وہ گندگی کا ڈھیر ہو جس کو بد چلن عورتیں رات کی تاریکی میں کوڑے کے ڈھیر پر ڈال جاتی ہیں کہ گندگی کی جگہ گندگی ہی ہوتی ہے۔ لیکن تمہاری قسمت اچھی تھی جو حسن انکل تمہیں کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا کر اس محل میں لے آئے اور تمہیں معاشرے میں اپنے نام کی عزت دی یا مقام دیا۔ ورنہ تم خود گناہ کا وجود ہو۔“

”نہیں..... جھوٹ بول رہے ہو تم..... جھوٹے ہو..... میں اپنے پاپا کی بیٹی ہوں۔ میں حسن بیگ کی بیٹی ہوں۔ میری پہچان ہے، میں گم نام نہیں ہوں۔“ اس کے اندر دھماکے ہو رہے تھے۔ یہ کیسا انکشاف تھا کہ جس پر نہ کرنے کے باوجود یقین آ رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جو جو کو گھور رہی تھی۔

”یقین نہیں آ رہا، کل انکل واپس آجائیں گے۔ ان سے معلوم کر لینا۔ وہ کوشش کے باوجود تم سے کچھ نہ چھپا پائیں گے۔ سب بتا دیں گے۔ کم آن، میں نے تمہیں تمہاری حقیقت سے آگاہ کیا ہے۔ اب انعام کے طور پر تم مجھے خوش کر دو۔“ اس نے آگے بڑھ کر اسے اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا۔ مشعل نے زوردار دھکا دے کر اسے گرا ڈالا اور دروازہ کھول کر باہر کی جانب سر پٹ بھاگی تھی۔

وہ نادیدہ مخلوق میں حل رہی تھی۔

ملازم کوئی بھی پکارنے پر اس کی مدد کو نہیں آیا تھا۔ رافعہ انہیں پہلے ہی بہانے سے چھٹی دے چکی تھی۔ جو جو اسے وارننگ دیتا ہوا اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ وہ اندرونی حصے سے نکل کر لان سے ماتحت گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

”واج مین..... واج مین.....“ وہ اس کے قریب جا کر پکار رہی تھی۔

”کوئی بھی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ ہم نے پہلے ہی تمام راستے بند کر دیے ہیں۔ چلو شاباش، اندر آ جاؤ۔ اس ٹھنڈے موسم میں بارش میں بھیکنا اچھا نہیں ہوتا۔“ جو جو اس سے کچھ فاصلے پر رک کر مسکرا کر بولا۔

”میں اپنی جان دے دوں گی مگر تمہارے عزائم کا میاں نہیں ہونے دوں گی۔“

”جو جو! کوئی کام بھی تم سے ڈھنگ سے نہیں ہو سکتا۔ کیوں باہر آنے دیا اس کو..... واج مین آتا ہی ہوگا۔ جلدی کرو، اس کو اندر لے کر جاؤ۔“ رافعہ جو پوشیدہ رہ کر ان کی نگرانی کر رہی تھی، کھیل بگڑنا دیکھ کر باہر نکل آئی تھیں۔

”اوہ..... تو تم بھی اس گھناؤنی سازش میں شریک ہو..... کیسی ماں ہو تم۔“

”بکو اس مت کرو..... شرافت سے اندر آ جاؤ۔“ وہ جھلا کر بولی تھیں۔

”شرافت کا لفظ تم جیسے گھنٹیا لوگوں کے منہ پر چٹنا نہیں ہے۔ میں اندر تمہیں باہر کر کے آؤں گی۔“ اس کا لہجہ ہر قسم کے خوف و ڈر سے مبرا تھا۔

”جو جو! منہ کیا دیکھ رہے ہو، اس کو پکڑ کر اندر لاؤ۔ واج مین آ رہا ہوگا۔“

وہ دانت پیس کر خود بھی اس کی جانب بڑھی تھیں۔ ان دونوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر مشعل گیٹ کی جانب بڑھی تھی اور لاٹ کھول کر باہر کی جانب اندھا دھند بھاگ لی تھی۔ اسے فکر اپنی جان کی نہیں، اپنی عزت کی تھی۔ ان ماں اور بیٹی کی آنکھوں میں نا چتے شیطان کو وہ بخوبی دیکھ چکی تھی۔

شدت سے برقی بارش اور ایسی گرج و چمک میں وہ کبھی کمرے سے نکلنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی جو اب عصمت کی خاطر وہ بے تحاشہ بھاگ رہی تھی۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ وہ پوری قوت سے بھاگ رہی تھی اور سامنے سے اچانک آنے والی کار بھی فل اسپینڈ سے آ رہی تھی۔ رکتے رکتے بھی کار اس سے ٹکرائی تھی اور وہ کار سے ٹکرا کر نیچے سڑک پر بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔

شاہ ویز بے اختیار ری طور پر اس سمت چلا آیا تھا اور اس سمت کا وزن کرتے وقت اس نے ایک لڑکی کو بے تحاشہ بھاگتے ہوئے اسی سمت آتے دیکھا تو کار کو بریک لگایا تھا اور فل اسپینڈ میں ہونے کے باعث ماز بری طرح کرا رہے تھے اور بریک لگتے لگتے بھی لڑکی کا رے ٹکرا کر گر پڑی تھی۔

وہ گھبرا کر باہر نکلا تو سامنے سے بھاگتے ہوئے آتے جو جو اور رافعہ بیگم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ ٹھنکا تھا۔ وہ بھی جو قریب آئے تو شاہ ویز کو پہچان کر اپنی دوڑ لگا دی تھی۔ اس نے جھک کر اسے سیدھا کیا تھا۔

مشعل پر نظر پڑتے ہی وہ بے اوسان ہو گیا اور اس کے بھیگے وجود کو اٹھا کر کار کی عقبی سیٹ پر ڈالا تھا۔ لمحوں کی اس کار روائی میں وہ بھی بارش کے پانی میں شرا بور ہو گیا تھا جس کی اسے کوئی پروا بھی نہ تھی۔

کار فل اسپینڈ سے دوڑاتا ہوا وہ ہسپتال کی جانب گامزن تھا۔ کار کی اسپینڈ سے زیادہ اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ جس صورت حال سے اس کا واسطہ پڑا تھا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا یہ سب کیا ہے؟ ایسی برقی بارش میں مشعل کا اس طرح رات کے اس پہر بھاگنا اور اس کے پیچھے رافعہ اور جو جو کا بھاگ کر آنا اسے پریشانی و تفکرات میں مبتلا کر گیا تھا۔

□●□

حرا کے بچے کے زندہ ہونے کی خبر نے فرح کو اتنا سرور کر دیا تھا کہ وہ ان دونوں سے وعدہ کرائی تھی کہ حرا کو تمام صورت حال بتا کر راضی کریں گی کہ وہ عرفان کو معاف کر دیں۔ عرفان ان کے اس حوصلہ افزا رویے کے بڑے مشکور تھے۔

گھر آ کر تمام معمولات سے فراغت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے حرا کو ان باتوں سے آگاہ کیا تھا جو انہیں عرفان اور منصور سے معلوم ہوئی تھیں۔

حرا پہلے بے یقینی سے ان کی جانب کافی دیر تک دیکھتی رہی تھیں۔ اس دوران ان کے چہرے نے کئی رنگ بدلے تھے۔ پھر وہ غرط جذبات سے مغلوب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”آپ!..... آپ!..... کیا یہ سچ ہے کہ میرا بچہ زندہ ہے؟ آپ! آپ کو یقین ہے، انہوں نے جو کہا وہ سچ ہے؟ کیا اتنے عرصے جس بچے کو میں مردہ تصور کر کے روتی رہی، وہ زندہ ہے، ہنسا مسکراتا سانس لیتا ہوا۔“ ان کے انداز میں دیوانگی درآئی تھی۔

”ہاں..... ہاں..... تمہارا بچہ زندہ ہے، سلامت ہے۔“

”نہیں..... وہ جھوٹ بول رہے ہوں گے۔“

”مجھے چہروں کی شناخت ہے..... جھوٹ و سچ میں جان سکتی ہوں اور مجھے یقین ہے وہ سچ کہہ رہے ہیں، تمہارا بچہ زندہ ہے اور اسی شہر میں ہے۔“

”وہ زندہ ہے، اسی شہر میں ہے تو مجھے لے چلو اس کے پاس۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں، چھو کر یقین کرنا چاہتی ہوں کہ وہ ہے، زندہ ہے، میرا ہے، میرے لئے ہے۔ چلو آپ! ابھی اور اسی وقت۔ مجھے اب صبر نہیں آئے گا۔ اتنے سال اس سے گھڑ کر زندہ تھی۔ اب ایک لمحے کی اس کی جدائی مجھے مار ڈالے گی۔“

فرح نے دزدیدہ نگاہوں سے بہن کی جانب دیکھا تھا جس کی حالت بن جل مچھلی کی مانند تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے بے قراری سے ٹہل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں متا جاگ اٹھی تھی۔

”حرا!..... انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے نرمی سے کہا۔“ میں نے عرفان کو فون کر دیا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ کچھ ٹائم لگے گا۔ دراصل جس کے پاس تمہاری بے بی ہے، ان سے انہیں رابطہ کرنے میں دشواری پیش ہو رہی ہے۔ ان سے کنٹیکٹ ہوتے ہی وہ ہمیں وہاں لے چلیں گے۔“

”میری بے بی..... کیا مطلب آپ!؟ کیا بیٹا نہیں، بیٹی ہے میری؟“ اس کی حیرانگی میں سرت کے رنگ چمک رہے تھے۔

”ہاں، عرفان نے یہی بتایا ہے اور کل میں اس ڈاکٹر سے بھی ملی تھی جس نے تمہارا سرنز کیا تھا۔ اس نے بھی تصدیق کی تھی کہ تمہاری بیٹی ہوئی تھی اور بہت ایمر غنسی میں اس نے تمہارا کیس آپریٹ کیا تھا۔ اسی رات کی فلائٹ سے وہ مزید اسٹڈی کے لئے یورپ چلی گئی تھی۔ اس کی لاعلمی میں اسٹاف نے یہ گیم کھیلا تھا۔“

”پھر وہ کچھ کس کا تھا؟“ حرا کی نگاہوں میں سفید رنگت والا وہ معصوم بچہ را بچہ گھومنے لگا جس کی بند آنکھوں کو اس نے کئی بار چومنا تھا، جس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی سرد ہنڈھیوں کو اپنی برقی آنکھوں سے لگایا تھا۔ اس کی تدفین منصور نے اپنے چند عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ مل کر کی تھی اور تب سے آج تک وہ اسے اپنے تصور میں



اسی طرح دیکھتی آئی تھی۔

سفید چہرہ

بند آنکھیں

بند منہ

اور برف جیسے سرد جسم والے بچے کو وہ اپنا بچہ سمجھتی آئی تھی۔ اس لئے کہ اسے یہی باور کروایا گیا تھا وہ اس کا بچہ ہے جو مردہ پیدا ہوا ہے۔

”وہ تھی کوئی بد نصیب عورت جو مردہ جڑواں بچوں کو جنم دے کر مر گئی تھی اور نرس نے مکاری سے ایک بچے کو تمہارے پہلو میں لٹا کر تمہارا بچہ ظاہر کر دیا تھا۔ تم دونوں ایک ہی تھیٹر میں تھیں اس لئے نہ ہمیں شبہ ہوا اور نہ اس عورت کے لواحقین کو۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا آپلی میں خوش ہوں یا اداس۔ خرم کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی ہو جو میرا رنگ روپ لے کر پیدا ہو۔ ایک مرتبہ عرس کے موقع پر خرم اجمیر شریف گئے تھے اور وہاں یہ دعا مانگ کر آئے تھے کہ ان کو بیٹی کی خوش خبری ملے اور وہ یہ بھول گئے تھے کہ جب بیٹی کی پیدائش کی دعا مانگی جاتی ہے تو اس سے بھی قبل اس کے خوش بخت ہونے کی دعا بھی مانگی جاتی ہے۔ بیٹیاں تو اندھیروں میں اجالا بکھیرتے چہ انگوں کی مانند ہوتی ہیں۔ خوف بیٹیوں کا نہیں ان کے نصیبوں کا ہوتا ہے۔“ وہ بتتے آنسوؤں کے درمیان کہتی جا رہی تھیں۔ فرح کی آنکھیں بھی خشک نہ رہ سکی تھیں اور ابھی اس کی بات جاری تھی کہ فون کی بیل بجنے لگی۔

فرح نے فون اٹھایا تو دوسری طرف عرفان تھا جس نے یہ اطلاع دی کہ وہ اس شخص تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور شام تک وہ ان سے ملاقات کرنے کا اپنا ٹکٹ لے چکے ہیں لیکن وہ وہاں جانے سے قبل حراسے بات کرنا چاہتے ہیں۔ لاؤڈ رآن ہونے کی وجہ سے حرا تمام گفتگو سن چکی تھی۔ بات مکمل کرنے کے بعد ان کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا تھا۔

”ہیلو، حرا اسپیکنگ۔“ اس نے ریسیور پکڑ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

”میں..... میں عرفان بول رہا ہوں۔“ عرفان کے لہجے میں شرمساری وندامتوں کی کپکپاہٹ تھی۔ وہ لہجے کا جاہ و جلال و رعب و دبدبہ راکھ ہو چکا تھا۔ وہ جوانی کا گھمنڈ اور طاقت و غرور و ہلٹی شام کی طرح ڈھل چکا تھا۔ یہ آواز تو کسی ایسے بے بس، لاچار و مایوس کن عمر رسیدہ شخص کی تھی جس کی حیات کی ناؤ دھیرے دھیرے موت کے ساحل کی طرف رواں دواں ہو اور وہ بے بسی سے لمحہ بولچہ قریب آنے والی موت کو دیکھ رہا ہو۔

”میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ..... بلکہ معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں نے جو کیا وہ قابل معافی ہرگز نہیں ہے۔ مگر مجھے یقین ہے آپ مجھے.....“ لفظ اس کا ساتھ دینے سے کتر رہے تھے۔ انک انک کر از حد شرمندگی سے وہ مخرمانہ لہجے میں کوپا اپنے جرم کا اعتراف کر چکا تھا اور ساتھ ہی اس سے معافی کا بھی خواستگار تھا۔ حرا نے اس کی بات قطع کر کے کہا۔

”تمہاری آواز سن کر میرے دل پر لگے زخموں کے مائے نکلے پھر سے اٹھ گئے ہیں۔ جن تکلیف دہ یادوں کو ذہن سے کھرچنے میں اب ایک طویل عرصے بعد کامیاب ہوئی تھی، وہ زخم زخم یا دیں از سر نو ابھر آئی ہیں۔ تم کر کے معافی مانگ لینا بہت سہل ہے مگر تم بہہ کر معاف کر دینا اعلیٰ ظرفوں کا کام ہوتا ہے اور شاید فرح آپلی جیسی اعلیٰ ظرف و بے غرض، بہن کی سنگت میں رہنے کے باعث میں بھی اسی کا کچھ مظاہرہ کر دیتی اگر بیٹی کی بجائے بیٹے کے ساتھ تم نے یہ سلوک کیا ہوتا۔ کیونکہ بیٹے تو پھرے کے ڈھیر پر پل کر بھی با عصمت و با کردار رہتے ہیں مگر بیٹی کے کردار پر کیچڑ کی ایک چھینٹ، گندگی کی ایک بوند، غلاظت کا معمولی سا دھبہ بھی اس کی عصمت کی چادر کو داغدار کر دیتا ہے۔ اگر میری بیٹی کسی ایسے ویسے خاندان کی فردی تو؟ یا درکھنا میں نے تمہیں آج تک بد دعا نہیں دی مگر پھر تم میری بد دعا سے نہیں بچ سکو گے۔ تا حیات میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“ اس کی آواز میں جوش و غضب تھا، منفی سوچوں نے اس پر دھاوا بول دیا تھا۔ جب کہ دوسری طرف وہ بالکل خاموش و ساکت تھا، صرف سانسون کی آواز تھی۔

”تم نے جو اس سے قبل میرے ساتھ کیا میں اس کو دہرائانا نہیں چاہتی، تمہارے ساتھ جو بھی کچھ ہوا یا جو اب تمہاری فیملی کے ساتھ ہو رہا ہے اس میں میری کسی آہ یا بد دعا کا کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ میں دکھ اور پھر دکھوں کے سلسلوں میں اس طرح جکڑی تھی کہ کسی کو دعا یا بدعا دینے کا نہ وقت ملانہ یا د، تمہارے ساتھ جو بھی کچھ ہوا اسے مکافات عمل کہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا صبر و استقلال مفاہمت و استطاعت کا پھل وہاں سے ملتا ہے جو سب کو انصاف دینے والا ہے۔ بے سہاروں و بے کسوں کا انتقام لینے والا ہے۔ اس کی عدالت سے سب کو انصاف ملتا ہے۔ وہ سچا منصف ہے۔ پھر بھی تمہارے دل کی تسلی کے لئے سچے دل سے کہہ رہی ہوں تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا وہ میں تمہیں اللہ کے واسطے معاف کرتی ہوں۔ اگر تم میری وجہ سے کسی بھی آزار میں مبتلا ہو تو میری دعا ہے اللہ تمہیں اس سے آزاد فرمائے مگر اپنی بیٹی کے متعلق کسی بری خبر پر تم مجھ سے کسی معافی کی امید مت رکھنا۔“ اس نے اتنا کہہ کر ریسیور کرڈل پر پٹخ دیا۔

□●□

مشعل کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی۔

رشم کی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ نیند آور انکشن کے زیر اثر وہ بے خبر سو رہی تھی اور وہ اس کے نزدیک کرسی پر بیٹھے ہوئے بہت غور سے اس کے چہرے کے تیکھے نقش کو دیکھ رہا تھا۔ بے جی زریعہ کے ہمراہ لاہور گئی ہوئی تھیں جہاں زریعہ کی تینوں بیٹیوں کے سرالوں کے علاوہ قریبی رشتے دار بھی رہائش پذیر تھے جن سے رنج پر جانے سے قبل وہ ملاقات کے لئے گئی تھیں۔ اب وہاں سے ان کی واپسی دو یا تین ہفتوں میں ممکن نہ تھی۔ ان کی طرف سے وہ مطمئن تھا۔

کبھی کبھی مجھ جیسا مضبوط اعصاب کا مالک انسان بھی جذبات کے بہکاوے پر انحصار کر کے اپنے دل کے ہاتھوں ٹھوکر کھا کر خوار ہو جاتا ہے اور اس بری طرح زمین بوس ہوتا ہے کہ پھر اٹھ بھی نہیں سکتا اور اگر اٹھ جائے تو پٹنے کی سکت نہیں پاتا اور وہیں ٹھہر جاتا ہے..... وہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ سنگین معاملہ میرے ساتھ ہوا ہے۔ میں اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا، اس کا ساتھ اس کی رفاقت مجھے منظور نہ تھی اور اب سب کچھ پلٹ گیا ہے۔ میرے دل نے مجھ سے بغاوت کی، میرے احساسات باغی ہو گئے۔ میں، میں نہ رہا۔ نہ معلوم کس گھڑی کون سی ساعت، کون سا لمحہ مجھ سے بھی بغاوت کر گیا اور میں اس وجود کا شیدائی بن گیا جس سے سخت کبیدہ و متغیر اور از حد بے زار تھا۔ اس کے وجہ پہ چہرے پر ہلا کی بنجید گئی تھی۔ سوچوں کے بھنور میں ڈوبتے ابھرتے اسے بہت سارا وقت بیت گیا تھا۔ نرس مشعل کے ہاتھ میں لگی ڈرپ چیک کرنے آئی تو وہ حواسوں میں لوٹا تھا۔ ڈرپ ختم ہو چکی تھی۔ نرس دوسری ڈرپ لگانے کی تیاری کر رہی تھی، جب اسے خیال آیا کہ گھر پر کال کر کے معلوم کرے کہ کون ہے وہاں۔ انکل تو کاروباری سلسلے میں ایک دو دن کے لئے کراچی سے باہر گئے ہوئے تھے۔ یہ خیال آتے ہی وہ نرس کو وہاں اپنی واپسی تک موجود رہنے کا کہہ کر باہر نکل آیا تھا۔

کورڈ وور میں خاموشی کا راج تھا۔ وہ طویل کورڈ وور عبور کر کے باہر نکل آیا۔ بھگے بھگے لان میں سرد ہوا کے جھونکے نے ہڑھ کر گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ جو اب وہ معمولی سا منتہا ہوا سامنے کینٹین کی طرف ہڑھ گیا جہاں نامٹ ڈیوٹی پر آئے ڈاکٹر، نرسیں اور دیگر عملے کے کچھ افراد چائے کافی سپ کرنے میں مصروف تھے۔

اس نے کافی کا آرڈر دیا اور خود مو بائل پر مشعل ہیلس کے نمبرز پیش کرنا ہوا تنہا کوشے میں بیٹھ گیا تھا۔

دوسری طرف مسلسل بیلز جا رہی تھیں مگر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ دس منٹ گزر چکے تھے۔ کافی سپ کرتے ہوئے اس کی کشادہ پیشانی پر بے شمار تشکراتہ ٹکٹیں نمودار ہو چکی تھیں۔ آخر کار چھٹی کوشش پر دوسری جانب سے کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ وہ چوکیدار تھا۔

”اتنی دیر سے کال ریسیو کیوں کی ہے؟“ وہ سردہری سے کوپا ہوا۔

”صاب! بیگم صاحبہ نے کہا تھا کوئی اندر نہیں جائے گا۔ ام فون کا بار بار آواز سن کر ڈرنا اندر آیا ہے۔“ چوکیدار کی خوفزدہ آواز ابھری۔

”کہاں ہیں بیگم صاحبہ؟“

”وہ گیا صاب.....“

”کب..... کہاں.....؟“ اس نے کافی کا مگ پٹختے ہوئے کہا۔

”کافی دیر ہو گیا صاب جی۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ ساتھ جو جو صاب بھی بہت پریشان تھا۔ ام نے پوچھا کہ وہ کہاں جاتا ہے تو بیگم صاب بولا کہ احمد صاب کا حالت خراب ہے، وہ اس سے ملنے اسپتال جاتا ہے۔“ چوکیدار کی اطلاع نے اسے پریشان کر ڈالا تھا۔ وہ حواس باختہ سا کافی چھوڑ کر باہر لان میں نکل آیا جہاں جگہ جگہ مرکری بلب روشن ہونے کی وجہ سے خاصا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ بارش بند ہو گئی تھی۔ مگر گہرا ابرا بھی موجود تھا۔ درختوں اور پودوں کے پتوں اور پھولوں سے بارش کا پانی قطروں کی صورت میں نیچے گر رہا تھا۔ بھگی ہوا کے جھونکے بوجھل تھے۔ ماحول میں عجیب سی بھگی بھگی پتوں و پھولوں سے پھوٹی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ وہ ان سب سے لاپرواہہ مو بائل کان سے لگائے ہوئے گفتگو تھا۔

”تم نے انہیں جانے کیوں دیا..... کیا لے کر گئے ہیں وہ لوگ؟“

”میں کیسے روک سکتا تھا ان کو۔ وہ بڑے صاب کا بہن ہیں۔ اور سامان تو اپنے ساتھ کافی لے کر گیا ہے۔“ اس بار چوکیدار کا لہجہ بھی الجھا ہوا پریشان تھا۔

”مشعل بی بی کہاں ہیں؟“

”وہ اپنی کسی دوست کی طرف گیا ہے۔ کل تک آئے گا۔“

”یہ تمہیں بیگم صاحبہ نے بتایا ہوگا؟“ اس کا شبہ صحیح ثابت ہوا تھا۔

”جی صاب۔“

”تم ڈیوٹی چھوڑ کر کہاں گئے تھے؟“

”آ..... آ..... آپ کو کیسے معلوم ہوا صاب! ام گیا تھا؟“ چوکیدار بری طرح گھبرایا ہوا تھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

”سوال مت کرو، صرف جواب دو۔ کہاں گئے تھے تم ڈیوٹی چھوڑ کر جب کہ تمہیں معلوم ہے کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں اور تمہیں سختی سے تاکید کر کے گئے تھے کہ لچھ بھر بھی

اپنی ڈیوٹی سے غافل مت ہونا پھر تم کس کی اجازت سے اور کہاں گئے تھے؟“ اس کے سخت ترین لہجے نے چوکیدار کو حواس باختہ کر ڈالا تھا۔ اپنی نوکری جانے کے خیال نے اسے رونے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

”صاب! بیگم صاحبہ نے کہا تھا وہ کسی کو معلوم نہیں ہونے دے گا، اس نے کچھ سامان منگوانے کے لئے بھیجا تھا، ام نہیں جا رہا تھا مگر بیگم صاحبہ نے کہا ام سامان نہیں لا کر دے گا تو وہ بڑے صاب سے شکایت کر کے ام کو نوکری سے نکلوا دے گا۔ ام بہت مجبور ہو کر گیا صاب۔ ام کو معاف کر دو صاب، آئندہ ایسا غلطی نہیں ہوگا۔“ چوکیدار فون پر بھی گھلایا نا شروع ہو گیا تھا۔

”اچھا..... اچھا..... ٹھیک ہے۔ مگر آئندہ ایسا ہوا تو نہ صرف تمہیں نوکری سے نکالا جائے گا بلکہ سزا بھی ملے گی۔ پوری کوٹھی لاک کر دو اور خود ہوشیاری سے رہو۔ بڑے صاحب کے آنے پر ہی گیٹ کھولنا۔“ اس نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

ہوا بند ہو گئی تھی اور بارش دوبارہ سے شروع ہو چکی تھی۔ مشعل بدستور گہری نیند سو رہی تھی۔ نرس اس کے آنے کے بعد جا چکی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو چھو کر بخار کی حدت چیک کی جواب قدرے بہتر محسوس ہوئی۔ وہ اس کا کمبل ٹھیک کر کے سامنے رکھے صوفے پر دراز ہو گیا۔ اس کا ذہن الجھنوں کا شکار تھا۔

رانہہ اور جو جو کی گھلیا ذہنیت کو وہ بخوبی جانتا تھا۔ وہ اپنا مفاد حاصل کرنے کی خاطر کس حد تک جا سکتے ہیں۔ گزشتہ کئی روز سے حسن صاحب بھی اسے بتا رہے تھے کہ رانہہ ان سے بار بار ایک بڑی رقم کا مطالبہ کر رہی ہے لیکن وہ ابھی انفرڈ نہیں کر سکتے کیونکہ کاروبار شدید ترین لاس کے بعد اب دھیرے دھیرے بحران سے نکلنا شروع ہوا ہے اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ ان کے اعتماد کے سرکل سے باہر نکل چکی تھیں یا شاید وہ ان کی نیت کے کھوٹ سے واقف ہو گئے تھے۔ وہ کاروباری اور گھریلو ہر بات سے شاہ ویز کو آگاہ کرتے تھے، ہر مسائل ڈسکس کرتے تھے۔ حقیقی معنوں میں اسے بیٹے کا درجہ دیتے تھے مگر وہ اب بھی ان سے اتنا ہی تکلف برتنا تھا جتنا پہلے۔ ان کے مشورے پر بھی اس نے غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ آپ دیکھ لیں سرائیوں نے رقم نہیں دی تھی۔

چوکیدار کی معلومات کے مطابق رانہہ اور جو جو اپنا سامان لے کر جا چکے تھے۔ یقیناً وہ کسی خوف کے باعث اس طرح گئے ہیں۔ چوکیدار کو سامان کے بہانے وہاں سے بھیجنا پھر تمام ملازمین کو ایک ساتھ چھٹی پر روانہ کرنا اور اس خطرناک موسم میں ان دفنوں کا مشعل کا بھاگ کر تعاقب کرنا یہ تمام کڑیاں بکھری ہوئی تھیں جنہیں جوڑنے میں اس کا ذہن تیزی سے متحرک تھا۔

رات نصف گزر چکی تھی جب وہ ان کڑیوں کو جوڑ پایا اور دل و دماغ میں جیسے آتش فشاں سا پھٹ گیا تھا۔ صورت حال کے ادراک نے اس کی حمیت، اس کی غیرت کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس کی رگ رگ میں لاوا خون بن کر دوڑنے لگا۔ شدید غصہ ابھی اس کے سر آپے میں دوڑ گئی تھی۔ گھٹن و جسن کے بے پایاں احساس نے اسے اس سرد موسم میں کھڑکی کھول کر کھڑے ہونے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

باہر چھپا جوں بینہ برس رہا تھا۔

وہ مٹھیاں بھینچے اندر کے طوفان سے نہر آڑا تھا۔ اسی اثناء میں اس نے مشعل کے معمولی سے کراہنے کی آواز سنی تھی۔ وہ ہرق رفتار سے پلٹا تھا۔ مشعل نے آنکھیں کھولی تھیں اور استعجاب نظر روں سے وہ سب طرف دیکھ رہی تھی اور اپنی طرف بڑھتے شاہ ویز کو دیکھ کر اس کی نگاہیں ٹھہر گئی تھیں۔

حیرانی

بے یقینی

استعجاب

کیا کچھ نہ تھا اس کی آنکھوں میں۔

”ہیلو، کیسی ہو؟“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنائیت سے کویا ہوا تھا۔

وہ جو یک ٹک اس کی صورت تک رہی تھی جیسے دھیمے دھیمے اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں اور آنکھوں میں بڑھتی ہوئی نمی نے آنسوؤں کی صورت اختیار کر لی۔ پھر وہ بے آواز رونے لگی۔ گزرے لمحوں کا جانگسل احساس از سر نو جاگزیں ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹے ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن ہوئے سو ہوئے مگر ساتھ اسے بھی ایسی حقیقت سے روشناس کرا گئے تھے جس کو جان کر وہ خود کو عریاں محسوس کر رہی تھی۔ یہ بات اسے لام سمجھداری سے ہی متحس کئے ہوئے تھی کہ آخر وہ ایسی کیا بات ہے، کیا راز ہے، ایسا کیا عہد ہے جس کو رانہہ اکثر غصے میں بے قابو ہو کر افشا کرنے کی سعی کرتی ہیں اور ہر بار پاپا کا جارحانہ انداز انہیں وہ راز کھولنے نہیں دیتا اور وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ وہ بات اس کی ذات سے تعلق رکھتی ہے لیکن جو انکشاف ہوا تھا اس نے اس کے احساسات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ احساس ہی کس قدر تکلیف دہ تھا کہ وہ اپنے پاپا کی بیٹی نہ تھی، ایک گناہ کا وجود تھی، گندگی کا ڈھیر تھی، اس کا وجود ایک گالی تھا۔ وہ دہرے عذاب میں مبتلا تھی۔ مستزاد سامنے بیٹھے شخص کی قربت۔ وہ بہت بدلا بد لا لگ رہا تھا۔ چہرے پر پھسکی نرم مسکراہٹ نے اس کے تمام نقوش کو روشن کر دیا تھا۔ اس کا ہاتھ تھا سے از حد اپنائیت و توجہ سے وہ اس سے مخاطب تھا۔ اس کا تمام غصہ، جھلاہٹ، لالچلی و تحفہ منفقہ و تھا۔

اس کے انداز سے بے حد اپنائیت و محبت جھلک رہی تھی۔ وہ ان احساسات میں مبتلا نہ ہوتی تو شاہ ویز کی اس وارفتگی و چاہت کو دیکھ کر شاید خوشی سے مرجاتی یا حواس کھو بیٹھتی مگر اس وقت وہ جن کانٹوں بھرے راستوں پر دوڑ رہی تھی وہاں ان سرتوں و شادمانیوں کو محسوس کرنے کی حیات تمام ہو چکی تھیں۔ اس وقت وہ جن احساسات سے دوچار تھی وہ بیان سے باہر تھے۔ شاہ ویز اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھا دوسرے ہاتھ سے آہستگی سے سہلا رہا تھا اور خاموشی سے اسے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے چپ کروانے کی کوشش نہ کی۔ یہ سوچ کر کہ جن حالات سے وہ گزر کر آئی ہے، وہ تمام ڈر و خوف غم و غصہ کے ذریعے بہہ جائے تو اچھا ہے تاکہ وہ ذہنی طور پر پرسکون ہو سکے۔

یہی ہوا تھا۔ خاصی دیر گریہ و زاری کے بعد وہ خاموش ہو گئی تھی۔ شاہ ویز نے اسے پانی پلایا اور حالات دریافت کئے تو وہ سب کچھ بتاتی چلی گئی۔ ماسوائے اپنی ذات کے انکشاف کے علاوہ دلی احساس کے دباؤ کے باعث وہ بتاتے بتاتے رک گئی تھی۔ دل میں یہ خیال جاگزیں ہوا تھا، حقیقت حال جان کر اس نے اسے ٹھکرادیا تو؟ وہ آشیانہ جو ابھی قائم نہیں ہوا ہے آباد ہونے سے قبل ہی اجڑ جائے گا۔ یہ وہ کبھی برداشت نہ کر پائے گی۔

کیا وہ مجھ جیسی لڑکی سے رشتہ استوار رکھ سکے گا؟

وہ اتنا روشن خیال ہو سکتا ہے، سب کچھ جاننے کے باوجود تعلق برقرار رکھے؟

اگر میں اس سے چھپا لیتی ہوں تو جب تک چھپائے رکھ سکتی ہوں؟

وہ دوسو سو کی شکار بنی کچھ ہیں جھکا کر بیٹھی تھی۔

”جو ہوا اسے کسی ڈراؤنے خواب کی مانند بھول جاؤ۔ زندگی میں ایسے نصیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ شکر ہے تم ان لوگوں کی ناپاک خواہشات کا ذریعہ نہ بنیں۔ یہ کامیابی سب سے بڑی کامیابی ہے۔“ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے طمانیت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اسی دم نرس اندر چلی آئی تھی۔ وہ اس کے بالوں سے ہاتھ ہٹا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

نرس نے مکمل ہونے والی ڈرپ ہٹا کر اسٹینڈ کوکونے میں کھسکا دیا تھا۔ اب اسے میڈیسن دے رہی تھی۔

شاہ ویز کمرے سے باہر آگیا۔ اس نے موبائل پر حسن بیگ سے رابطہ کیا تھا کیونکہ رات گزر چکی تھی۔ دھیمی دھیمی پڑنے والی بوندوں میں صبح کا ذب کا دلنواز اجالا بکھرا ہوا تھا۔ ہوا بھی فرحت بخش تھی۔

حسب توقع حسن بیگ نے فوری کال ریسیو کر لی تھی۔ اس نے مختصر اُنہیں تمام حالات بتا کر واپس آنے کو کہا تھا۔

اسے یقین تھا وہ کروڑوں کے نقصان کو بھی خاطر میں نہ لا کر جلد از جلد یہاں پہنچ جائیں گے۔ مشعل سے ان کی محبت کچھ ایسی شدید تھی۔

”سر! آپ کی سزاکابی پی بہت ہائی ہے۔ میں نے ایک بار پھر انہیں نیند کا انکشن لگا دیا ہے تاکہ بی پی کا یول مزید نہ بڑھے۔“ وہ کمرے میں داخل ہوا تو نرس نے اطلاع دی تھی اور چلی گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر مشعل کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا جو بے خبر سو رہی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا جس کراسس سے وہ گزری ہے اس نے اس کے ذہن کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ذہنی خلفشار کا شکار ہے۔

ساری رات کی بے خوابی و بے آرامی سے اس کی طبیعت بھی کسمندی کا شکار ہو گئی تھی۔ اپنے ذہن کو فریش کرنے کے لئے وہ کچھ دیر آرام کی خاطر صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

□●□

حسن بیگ صاحب فرسٹ فلائٹ سے واپس آگئے تھے۔

مشعل ان کی آمد سے کچھ دیر قبل ہی ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی۔ شاہ ویز نے بھی اس کے ساتھ ناشتہ کیا۔ سنڈے کی وجہ سے آفس کی چھٹی تھی۔ ناشتے سے قبل اور دوران ان کی رگبی سی بات چیت ہوئی تھی۔

اس کے بعد مشعل چپ سا دھگ گئی تھی اور وہ اخبار لے کر بیٹھ گیا تھا۔ معائنہ تیز اٹھتے بھاری قدموں کی آوازیں باہر سے ابھری تھیں۔ دروازے کا ہینڈل گھوما تھا اور دوسرے لمحے مشکھر چہرہ لئے حسن بیگ اندر داخل ہوئے اور مشعل کے بیڈ کی طرف بڑھے تھے۔ دوسرے پل مشعل ان کے سینے سے لگی زار و قطار رو رہی تھی۔ بہت مضبوطی سے اس نے انہیں تھام رکھا تھا۔

”پاپا! آپ میرے پاپا ہیں نا؟ ریلی میرے اپنے۔ آپ کی محبت، آپ کا یہ بیارٹا بت کرتا ہے کہ آپ ہی میرے پاپا ہیں، سگے باپ۔ بھلا کوئی غیر آدمی اس طرح کسی کی اولاد کو بلکہ گندگی کے وجود کو اس طرح پیار دے سکتا ہے؟ اپنی محبت و جان لٹا سکتا ہے؟ نہیں..... نہیں ناپا پاپا، غیر، لاوارث بچوں پر ترس تو کھلایا جاسکتا ہے۔ خدا ترسی کے طور پر مالی امداد کی جاسکتی ہے مگر اس طرح اپنی زندگی سے بڑھ کر ایسے بچوں کو سینے سے نہیں لگایا جاسکتا۔ رانہہ آنٹی نے جھوٹ بولا ہے، چال چلی ہے آپ کے اور میرے

درمیان دوری پیدا کرنے کے لئے۔ ہمیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لئے۔ اوہ، میں کتنی بے وقوف ہوں جوان کی باتوں میں آگئی۔“ وہ ان کے سینے سے لگی سوچ سوچ کر رو رہی تھی۔ پھر ایک دم آنے والے خیال سے وہ چونکی تھی۔

”چپ ہو جاؤ میری بیٹی۔ تمہارے یہ آنسو مجھے گھائل کر رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا کہ رانہ اتنی گھٹیا ورڈیل حرکت کرے گی تو میں کسی قیمت پر آپ کو چھوڑ کر نہیں جاتا، ساتھ لے کر جاتا۔“ ان کے لہجے میں بہن کی طرف سے اعتماد و اعتبار کے کئے جانے والے قتل کی تکلیف اور مشعل کے لئے محبت و اپنائیت کی مہک تھی۔

شاہ ویز: انہیں سلام کر کے ایک جانب خاموش بیٹھا تھا۔

”میری اپنی بہن آستین کا سانپ نکلی۔ اس نے ہی مجھے ڈسنا چاہا، میرے اعتماد کا خون کر کے اس نے اپنوں کی اپنائیت و سچائی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرا اعتبار ختم کر دیا۔“ وہ مشعل کو سینے سے متاع حیات کی طرح لگائے شکستہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ان کا لہجہ نرم تھا۔

کافی دیر تک وہ باپ بیٹی ارد گرد سے بیگانہ رہے تھے۔ حسن بیگ کے مو بائل پر ہونے والی تپیل نے ماحول کے سکوت میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

”یس، حسن بیگ ہی بات کر رہا ہوں۔“ انہوں نے مو بائل کان سے لگا کر کہا۔

”آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں فوری طور پر..... لیکن کیوں؟ میں آپ سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی کام کی نوعیت جانتا ہوں کہ آپ کو کیا کام ہے مجھ سے؟“ حسن بیگ کے لہجے میں خاصی الجھن تھی۔ شاہ ویز: اٹھ کر ان کے قریب آگیا تھا۔

”اوکے..... اوکے..... آپ روبرو ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو شام کو میری کوٹھی پر تشریف لے آئیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔“

”پاپا! آپ بھی ہر کسی سے ملاقات کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔“ مشعل کے اعتراض پر وہ پہلی بار مسکرائے تھے۔

”مائی سویٹ ڈائراؤہ ساؤتھ افریقہ کی چند معزز و معتبر شخصیات میں سے ایک ہیں۔ روبرو ملاقات کبھی نہیں ہوئی ان سے مگر ان کے نام سے میں بہ خوبی واقف ہوں۔ ان سے ملنے کے لئے لوگوں کو ہفتوں قبل وقت لینا پڑتا ہے۔ مہم معلوم کیا مجبوری ہے ان کی جو وہ اس طرح ملنے کے لئے اصرار کر رہے ہیں۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شفقت سے کہتا تھا۔

”سرا یہ منصور خرم کل سے کافر کر رہے ہیں اور آپ سے ملنے کے شدید آرزو مند دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ آپ کی واپسی پر فوراً کنٹیکٹ کروادوں گا۔ مگر لگتا ہے انہوں نے کل سے اب تک کا وقت بڑی بے قراری سے گزرا ہے جو انہوں نے بغیر انتظار کئے کال کی ہے۔“

”کیا خیال ہے آپ کا، انہیں ایسا ضروری کیا کام ہو سکتا ہے جس کے لئے وہ اتنی بے قراری بلکہ بے صبری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔“ وہ شاہ ویز سے مخاطب ہوئے۔

”آئی ڈونٹ نوسر! میرا قیاس یہ کہتا ہے یہ بزنس انفر نہیں، پرنٹل انفر ہے کوئی۔ کیونکہ بزنس ڈیلنگ ناک کا پروویسجر دوسرا ہوتا ہے۔“

”ہوں..... یہ گتھی ان سے ملاقات کے بعد ہی سلجھ گئی۔ خاصا سسٹمز کیری ایٹ کر دیا ہے منصور اور خرم صاحب نے۔ بہر کیف شام کو ملاقات ہو رہی ہے ان سے۔ میں ڈاکٹر سے مشعل کو ڈسپانچ کرنے کی بات کرتا ہوں۔ بیٹا! آپ کیسٹ فیل کر رہی ہو؟ اگر تکلیف محسوس ہو رہی ہے تو ہم مزید رک جائیں؟“ شاہ ویز کے بعد وہ مشعل سے مخاطب ہوئے تھے۔

”میں گھر جانا چاہتی ہوں پاپا۔ ڈریسنگ تو وہاں بھی ہو جائے گی۔“

”اوکے۔“ وہ کمرے سے نکل گئے۔ اب کمرے میں وہ تھے اور ان کے درمیان خاموشی حائل تھی۔ وہ پھر سے بیگانگی کے خول میں بند ہو گئے تھے۔ حسن بیگ کی آمد سے قبل مشعل خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی تھی۔ شاہ ویز کا سہارا اس کے لئے تقویت و طمانینت کا باعث تھا۔ اس لئے وہ اسے بغیر کسی احساس کے خود سے قریب پارہی تھی اور پاپا کو دیکھتے ہی اسے بھول گئی تھی۔

شاہ ویز بھی وہ گرجوئی و جذبات سرور بیٹھا تھا جو اس کے اندر طوفان لائے ہوئے تھی۔ وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کے پہل کرنے کے انتظار میں تھے۔ اسی دوران مشعل کی ڈریسنگ چینج کر دی گئی تھی اور اس کا پی پی لیول بھی نارمل تھا۔

”شاہ ویز! آپ بھی گھر چلیں۔“ ہسپتال سے باہر نکل کر حسن بیگ شاہ ویز کے اجازت مانگنے پر کوہا ہوئے۔“

”میں گھر جا کر سونا چاہتا ہوں۔“

”وہاں بھی آپ سو سکتے ہیں۔ کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا آپ کو وہاں۔ تنہا گھر میں رہ کر کیا کریں گے؟ بہن جی تو لاہور گئی ہوئی ہیں۔ پھر شام میں منصور خرم سے ملاقات کے دوران میں چاہتا ہوں آپ میرے ساتھ ہوں۔ بس میں کوئی عذر قبول نہیں کروں گا۔ آپ کو ہمارے ساتھ گھر چلنا ہے۔“ ان کے لہجے میں پیار بھر اکھم تھا۔

اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی۔ برابر میں حسن صاحب براجمان تھے۔ پچھلی سیٹ پر مشعل بیٹھی تھی، سیٹ کی بیک سے ٹیک لگائے۔ اس کے انداز میں بلا کی اندر دنگی و خاموشی تھی۔

شاہ ویز نے مشعل پیلس جانے کے لئے نسبتاً طویل دوسرا راستہ چنا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انہی راستوں سے گزر کر وہ ان تکلیف دہ لمحات کو یاد کر کے ملول ہو کیونکہ اب حساسیت کی انتہا پر کھڑی تھی۔ راستہ حسن بیگ کی گفتگو میں جلد گزر گیا تھا مگر گیٹ سے کار اندر داخل ہوتے ہی اس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار پیدا ہوئے تھے۔ وہ اس کی ایک ایک جنبش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

”پاپا..... پاپا.....“ وہ بے اختیار ان سے لپٹ گئی تھی۔

”یس..... یس پاپا کی جان۔“ انہوں نے محبت سے اسے لپٹا تے ہوئے کہا اور اسی طرح مشعل کو اندر لے آئے تھے۔ شاہ ویز: ان کے پیچھے تھا۔

”پاپا! میں کل یہاں سے بھاگی تھی۔ میرے پیچھے جو جوتا اور جو جو کے پیچھے آنٹی بھی مجھے پکڑنے کے لئے بھاگی تھیں۔“

”بھول جاؤ..... بھول جاؤ ان باتوں کو جو تکلیف دیتی ہیں۔ آئندہ کبھی ان کا نام کوئی نہیں لے گا۔ میں نے ان سے تمام تعلقات ہمیشہ کے لئے توڑ دیے ہیں اور مجھے یقین ہے جو ذلیل حرکت انہوں نے کی ہے اس کے بعد وہ خود کو کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔ آپ بھی سب بھول جاؤ۔“ وہ اسے دلا سہ دے رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے اور وہ ان گزرے لمحوں کو ذہن سے کھرچنے کی سعی کر رہی تھی جو قدم رکھتے ہی کسی فلم کی طرح متحرک ہو گئے تھے۔

ملازمین تمام واپس آگئے تھے اور اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ سب نے اس کے سر پر بندھی پٹی کے بارے میں استفسار کیا تھا اور حسن بیگ نے یہ جواب دیا تھا کہ وہ گرنے کی وجہ سے زخمی ہو گئی ہے۔

دو پہر کو کھانے کے بعد حسن بیگ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے اور ان دونوں کے لئے انہوں نے دوسرا بیڈروم کھلوادیا تھا۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے کمرے میں جا کر وہ پھر کسی ڈپریشن کا شکار ہو جائے۔ شاہ ویز بیڈ پر دراز ہو کر جلد گہری نیند سو گیا تھا۔ مشعل نے ان دونوں کے بیڈرومز میں جانے کے بعد سیف کا جائزہ لیا تو اس کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ وہاں رکھی ڈیز ہلاکھ کی رقم اور زیورات غائب تھے۔ زیورات زیادہ مالیت کے نہیں تھے۔ ہلکی پھلکی جیولری تھی جو وہ شادی سے قبل استعمال کرتی تھی اور رقم بھی گھر کے خرچے کے لئے رکھی گئی تھی۔ حسن بیگ تمام رقم بینک میں رکھنے کے عادی تھے۔ وہ ان کے کمرے میں چلی آئی۔

”مجھے معلوم تھا آپ سوئے نہیں ہوں گے۔“ انہیں سنڈے میگزین کا مطالعہ کرتے دیکھ کر وہ کوہا ہوئی۔

”جب میری بیٹی جاگ رہی ہو تو میں کیسے سو سکتا ہوں؟“ آگے کھسک کر انہوں نے اس کے لئے جگہ بنائی۔

”پاپا! آئی لاکر صاف کر گئی ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔ میں نے پہلے ہی چیک کر لیا تھا۔“

”وہ کہاں گئی ہوں گی؟“

”وہ دونوں یہاں سے دوپٹی بھاگ گئے ہیں اور ایسا ہمیں ڈانچ دینے کے لئے کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح کئی ممالک کی فلائٹس کے ذریعے کسی دور دراز علاقے کی طرف جائے گی تاکہ ہم اسے ڈھونڈ نہ سکیں۔“

”آپ نے کس طرح معلوم کیا؟“ اس نے استعجاب سے دریافت کیا۔

”میں جانتا تھا وہ اب یہاں ایک لحد نہ گزارے گی۔ ایئر پورٹ ریکارڈ سے میں نے معلوم کیا تو کل پہلی فلائٹ سے جانے والوں میں ان کا نام شامل تھا۔ وہ ماں بیٹا فوراً ہی فرار ہو گئے ہیں۔“

”جانتے جانتے بھی ڈھائی تین لاکھ کی چپت لگا گئے ہیں۔“

”کوئی فکر کی بات نہیں، وہ سب آپ کا صدقہ گیا۔“ انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔

”اگر تم چاہو تو انہیں گرفتار کر کے لایا جاسکتا ہے۔ خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں چھپ گئے ہوں۔“

”نہیں پاپا خواہ مخواہ اسکیئنڈل بن جائیں گے اور ہم پریس میں آجائیں گے۔ مہم معلوم کیسی کیسی کہانیاں بنیں گی۔ بہتان تراشے جائیں گے۔ میں آپ کی بے عزتی اور خاندان کی بدنامی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی۔“

”اسی احساس نے مجھے باندھ دیا بیٹا ورنہ رانہ اپنے اس ناہنجار بیٹے کو لے کر پاکستان کی سرحد عبور نہیں کر سکتی تھی۔“

شام تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ شاہ ویز بھی اٹھ کر آگیا تھا۔ وہ لاؤنچ میں آکر بیٹھ گئے تھے۔

کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر سرسبز لان کا دلکش نظارہ صاف نظر آ رہا تھا، بادل چھٹ گئے تھے۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ موسم سرما کی نرم زم دھوپ کی نہری شعاعیں روپ کا سونا لٹا رہی تھیں۔

شاہد پر حسن بیگ کے ساتھ کاروباری معاملے ڈسکس کر رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ کسی طور وہ خود کو بہلانے میں کامیاب ہوئی تو تھی مگر پوری طرح خود کو مطمئن نہ کر پائی تھی۔ رافنہ بیگم طرزیہ انداز اور سچائی اگلتے لہجے کے ہمراہ اس کے سامنے آ جاتیں اور تضحیک بھرے لہجے میں کہتیں۔

”تم بھائی کی اولاد نہیں ہو، تم ایک ناجائز وجود ہو۔ ایسا سیاہ وجود جس کو رات کی تاریکی میں اس کی ماں کچرے کے ڈھیر پر ڈال گئی تھی۔ تم ہمارا خون نہیں ہو، تم بھائی جان کی بیٹی نہیں ہو..... نہیں ہوں ان کی بیٹی۔“ رافنہ کی آواز سرکوشی بن کر ابھرنے لگتی تو وہ بے کل ہوا شتی۔ کبھی خود کو جھٹلاتی تو کبھی رافنہ بیگم کو جھوٹا قرار دینے لگتی۔ اس کا سکون و قرار فنا ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی جسمانی طور پر وہاں موجود ہونے کے باوجود وہ ذہنی طور پر غائب تھی۔

”ہیلو، کیا سوچ رہی ہو؟ کوئی ٹینشن ہے؟“ شاہد پر کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ اس کے قریبی صوفے پر بیٹھا استغفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا، صوفہ خالی تھا۔ پاپا نہ معلوم کس وقت وہاں سے جا چکے تھے۔ کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

”پاپا کہاں گئے؟“

سٹنگ روم میں گئے ہیں اور تم اتنی غائب لذہنی سے بیٹھی ہو کہ تمہیں محسوس ہی نہ ہوا کہ ملازم نے کب اطلاع دی مہمانوں کی آمد کی اور کب پاپا گئے۔ پلیز بتاؤ کیا پر اہلم ہے؟“

”کوئی بات نہیں..... شاید دو اوں کے اثر میں ایسا ہوا ہو۔“

”سر میں تکلیف زیادہ ہو رہی ہے؟“

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ خواہش کے باوجود مسکرائی۔

”آرام کرو، میں سٹنگ روم میں جا رہا ہوں۔“ چند لمحے اسے بغور دیکھنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی اٹھ کر کچن میں چلی آئی جہاں ملازمہ اختر کی کچن صاف کرنے میں مصروف تھی۔

”تیز تیز ہاتھ چلاؤ، چائے کے ساتھ اہتمام کرنا ہے۔ پاپا کے گیسٹ آئے ہیں۔“ وہ فریج کی جانب بڑھتی ہوئی بولی۔

□●□

کمرے میں چھ نفوس براجمان تھے۔

ہر سو دبیز خاموشی تہہ در تہہ چھائی ہوئی تھی۔ وہ جیتے جاگتے وجود اگر سانس کی آمد و رفت سے آزاد ہوتے تو یقیناً کسی مصور کے اعلیٰ شاہکار تسلیم کئے جاتے۔ اس وقت ان میں اور مجسموں میں سانس کا امتیاز تھا۔ سب ہی حیرانی، تعجب و اشتیاق کے مراحل سے نبرد آزما تھے۔ عرفان خرم خود کو حشر کے میدان میں کھڑا محسوس کر رہے تھے جہاں اپنے اچھے اور برے اعمال کی لسٹ خود اپنے منہ سے پڑھ کر سنائی تھی۔ کس قدر کٹھن ہوتا ہے اپنی چالاکیوں، لالچ اور خود غرضی کی داستان سنانا۔ اپنے تعارف کے بعد وہ شرمندگی سے، فحالت سے انک انک کر اپنی آمد کا، اپنی غرض کا مدعا بیان کیا تھا۔

عرق نہ امت میں تر وہ اب خاموش بیٹھے تھے۔ ساتھ ان کے منصور، فرح اور رحامو جو تھیں۔ ان سب میں حسن بیگ کی حالت از حد دگرگوں و ناگفتہ بہ تھی۔

مشعل کو انہوں نے جس طرح چاہا، پرورش کی وہ عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ انہوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ ان کی اپنی اولاد نہیں ہے۔ زندگی کے ان ماہ و سال کے کسی لمحے میں انہیں یہ احساس ہوا ہی نہیں کہ وہ مشعل کے باپ نہیں ہیں۔ ہمیشہ وہ انہیں عزیز سے عزیز تر تین محسوس ہوئی۔ پھر یہ کیسی آندھی اٹھی تھی جس نے لمحوں میں سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔

رشتے کا بچ کی طرح ٹوٹ گئے تھے۔

محبت کے بادبان غائب تھے۔

اپنائیت سراپا ثابت ہوئی تھی۔

جس وجود کو ہمیشہ اپنی ملکیت سمجھا تھا، دل و جان جس پر بچھا ور کئے تھے وہ یکدم پرانی و بیگانی ثابت ہوئی تھی۔

کل تک جو انجانے تھے وہ آج شناسا نکلے تھے اور جو شناخت رکھتے تھے وہ بے شناخت و لا تعلق بنا دیئے تھے۔

ان کی تو دنیا ہی تباہ ہو گئی تھی۔ بہت سائیکین پانی ان کی آنکھوں میں جمع ہو رہا تھا جس کو بڑے کڑے ضبط سے وہ برداشت کئے ہوئے تھے۔

شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔

عرفان خرم نے ان کی ہر بات کا جواب بالکل درست دیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ جب وہ بچی کو کچرے کے ڈھیر پر ڈال رہے تھے تو انہوں نے دور سے آتی کار کی ہیڈ لائٹس دیکھ لی تھیں۔ ان کے پاس اتنا موقع نہیں تھا کہ بھاگ کر وہاں سے جا سکتے تھے اور سامنے آنے کا رسک بھی نہیں لے سکتے تھے۔ اس لئے وہ وہاں رکھے بڑے بڑے کچرے کے ڈمزر کے پیچھے چھپ گئے اور حسن بیگ صاحب کے آنے، مشعل کو اٹھا کر لے جانے کی کارروائی تک وہ وہیں روپوش رہے تھے۔ اور پھر ان کی کار اوجھل ہونے کے بعد وہ وہاں سے نکل آئے تھے اور وہاں انہیں حسن بیگ صاحب کا والد ملا تھا جو ان کی جیب سے گر گیا تھا جس میں رقم کے علاوہ ان کا وزیٹنگ کارڈ موجود تھا اور اس طرح وہ ان سے واقف ہو گئے کہ حسن بیگ بزنس ورلڈ میں ایک معتبر و قابل احترام نام تھا اور جب سے وہ انہیں جانتے تھے وہ وزیٹنگ کارڈ انہوں نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ لیکن اس سے قبل انہوں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ بچی ان کے پاس ہے یا نہیں۔ یا انہوں نے اس بچی کا کیا کیا۔

حسن بیگ صاحب بہت اچھے انسان و اچھے میزبان تھے۔ لوگ ان کی مہمان نوازی کے گرویدہ تھے۔ آج وہ چاہتے تھے اتنے بد اخلاق و بے مروت بن جائیں۔ اس بلا کے بدلہ لحاظ کہ سامنے بیٹھے ان مہمانوں کو (جو ان کے دل کا خون کرنے آئے تھے) دھکے دے کر یہاں سے نکلوا دیں اور ہمیشہ کے لئے ان کے اس گھر میں داخلے پر پابندی لگوادیں۔

ان کی یہ سوچیں صرف دماغ تک محدود تھیں۔ ورنہ درحقیقت وہ ایسا کرنا بھی چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے۔ اس فعل کی اجازت ان کا ضمیر ہرگز نہیں دیتا کہ اخلاقیات کی پاسداری ان کے وجود کا اثاثہ تھی۔ جھٹلا اس لئے نہیں سکتے تھے کہ صورت مشعل سے از حد مشابہہ تھی۔ فرق صرف عمروں کے تضاد کا پیدا کردہ تھا۔ ان خاتون کے چہرے پر گزرے وقت نے سنجیدگی، تمکنت و وقار اور اضمحلال کی کیفیت پیدا کر دی تھی جس میں اس وقت شوق و اشتیاق شدید کی کیفیت طاری تھی اور وہ بے قراری سے بار بار دروازے کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

”حسن صاحب! کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ میں دست دراز کئے آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔“ عرفان کی بھاری آواز نے کمرے کے سکوت میں ارتعاش پیدا کیا۔

”میں کیا کہوں..... میری سمجھ میں نہیں آ رہا، جس تکلیف سے میں گزر رہا ہوں وہ کیفیت لفظوں کے اظہار سے باہر ہے۔ دراصل میری ٹریجڈی اس بد نصیب سوداگر کی سی ہے جو تمام عمر کی کمائی لمحے بھر میں گواڈالے بلکہ میرا دکھ اس دکھ سے بھی بڑا ہے۔ مشعل کو میں نے اپنی بیٹی کی طرح ہی سمجھا اور کسی لمحہ مجھے یہ خیال تک نہ آیا کہ کبھی نہ کبھی وہ مجھے اس طرح اجنبی کر کے چلی جائے گی۔ میں نے اس کی شادی کی، اس وقت بھی مجھے ایسا محسوس نہ ہوا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے، میرے لئے پرانی ہو گئی ہے۔ کیونکہ شاہد پر کی شریک حیات ہونے کے بعد بھی وہ میری بیٹی تھی۔ میری اس سے شناخت ختم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب تو سب رشتے، شناخت، تعلق سب اپنا وجود کھو بیٹھے ہیں۔ آپ کو مجھے کچھ وقت دینا ہوگا، یہ یقین کرنے کے لئے کہ مشعل میری بیٹی نہیں ہے۔“ شدت جذبات سے ان کی آواز بھیگ رہی تھی۔ خود پر قابو پانے کی جستجو میں وہ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔

”ابھی میں خود شاکد ہوں تو بھلا مشعل کو کس طرح یقین دلاؤں گا۔ آپ کو مجھے کچھ وقت دینا ہوگا۔ اتنی جلدی کچھ ممکن نہیں ہے۔“

”میری آج رات کی فلائٹ ہے۔ میں واپس ساؤتھ افریقہ جا رہا ہوں۔ اگر ویزے کا پر اہلم نہ ہوتا تو میں مزید قیام کرنا اور ضرور کرنا مگر میری مجبوری ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔ لیکن مجھے یقین ہے آپ جیسا باضمیر و روشن خیال شخص کسی کی حق تلفی یا دل شکنی نہیں کر سکتا۔ حقدار کو اس کا حق ضرور دیں گے۔ مشعل کا تعلق آپ سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ وہ آپ کی بیٹی ہے اور آپ ہی کی بیٹی رہے گی۔ ہمارے بزرگ کہتے ہیں پیدا کرنے والے سے زیادہ حق پالنے والے کا ہوتا ہے۔ میں اس امر پر بھی اپنے رب کا از حد ممنون ہوں کہ اس نے مشعل کو غلط ہاتھوں میں جانے سے محفوظ رکھا ورنہ میں خود کو کبھی معاف نہ کرتا۔“ عرفان پر بھی سرت ورنج کے احساسات سے رقت طاری تھی۔

”آہ! میں انتظار نہیں کر سکتی۔ خدا کے لئے میری بیٹی کو بولو آئیں، مجھ سے اب صبر نہیں ہو رہا۔“ حرا نے مضطربانہ لہجے میں فرح کا ہاتھ پکڑ کر سرکوشی کی۔

”شش..... کول ڈاؤن، جتنی تڑپ تمہیں ہے، اتنی ہی بے چین میں بھی ہوں اس سے ملنے کے لئے۔ مگر کچھ کنٹرول کرو خود پر، سنبھالو اپنے آپ کو۔ ہم آہستہ آہستہ حسن بیگ صاحب کو ٹریک پر لائیں گے، اس وقت ان کے محسوسات سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم پانے کی خوشی میں مبتلا ہو تو وہ کھونے کے دکھ سے غمگین۔ جس شخص نے تمہاری بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھ کر پالا، اس کی اتنی اعلیٰ تربیت و پرورش کی کیا تم ان کے احترام میں کچھ ضبط و برداشت سے کام نہیں لے سکتیں؟“ فرح نے آہستگی سے سمجھایا۔ وہ ہونٹ کاٹ کر خاموش ہو گئیں۔ اسی اثناء میں باہر سے چیخ کی آواز ابھری تھی۔

وہ سب چونک گئے تھے۔ سب سے پہلے حسن بیگ اور شاہد پر باہر کی طرف لپکے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے عرفان اور منصور اور فرح اور حرا تھیں۔

لاؤنج میں پہنچتے تو سامنے کا منظر دیکھ کر حسن بیگ چکر اکر رہ گئے۔ شاہد پر بڑھ کر انہیں تھام نہ لیتا تو وہ گر چکے ہوتے۔

نیچے قالین پر مشعل بے ترتیب انداز میں گری ہوئی تھی۔ اختر کی اس کے قریب بیٹھی ہوئی اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اسے گرے ہوئے دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ خارج ہوئی تھی۔

□●□

پاس کے رنگ بکھرتے ہوئے دیکھوں نہ کبھی

ہر گھڑی خواب کی تعبیر مقدر ٹھہرے

معجزہ یہ عزمِ دوراں نے دکھایا ہے مجھے



جو ضمیروں کے سوداگر تھے معزز ٹھہرے

عرفان خرم اپنے ضمیر کا بوجھ اتار کر جا چکا تھا۔

منصور کی رہائش بدستور ہوٹل میں تھی۔ وہ ہوٹل روانہ ہو گیا تھا۔ فرح اور حرا مشعل پبلک میں رک گئی تھیں۔

حرا، مشعل کو چھوڑ کر جانے پر کسی طرح راضی نہ تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھی بالکل دیوانوں کی طرح اسے دیکھتی۔ کبھی اس کے بال چومنے لگتی کبھی چہرہ اور کبھی ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر رونے لگتی۔ مشعل ان کی ممتا بھری دیوانگی سے بے خبر نیند آورا نچلکشن کے زیر اثر سو رہی تھی۔

اس نے آخری کے ساتھ مل کر چائے اور دیگر لوازمات تیار کئے تھے اس خیال سے کہ آنے والے مہمان پا پا کے خصوصی مہمان ہیں۔

سماں ٹرائی میں سیٹ کر کے اس نے ملازمہ آخری کے ساتھ سنگ روم میں پہنچایا تھا اور خود اپنا حلیہ درست کرنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ حلیہ درست کر کے اس نے سنگ روم کی طرف قدم بڑھائے تو کھڑکیوں کے ذریعے آتی آوازوں پر اس کے قدم رک گئے۔

اندر انکشافات ہو رہے تھے اور باہر اس کے ذہن میں دھماکے..... بالآخر وہ قاتل بچ سامنے آ ہی گیا تھا، جس نے اس کی ذات کو شش و پنج میں مبتلا کر رکھا تھا، جس سے اس کی شخصیت مسخ ہو گئی تھی۔

وہ بھنور میں ڈوبنے ابھرنے لگی تھی۔ اس کی جگہ ہوں میں پاپا کا چہرہ تھا۔ ان کی رقت آمیز آواز وہ برداشت نہ کر سکی تھی اور بے آواز بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔ اندر بیٹھے لوگوں کو ذرا محسوس نہ ہوا تھا۔ کافی دیر بعد اختر ہی برتن لے جانے کی نیت سے وہاں آئی تو اسے بے ہوش گرے دیکھ کر وہ زور سے چیخی تھی۔

”آپی! آپ دیکھ رہی ہیں نا، یہ ہوہو میری کاپی ہے۔ خرم کہتے تھے، میری خواہش ہے ہمارے ہاں بیٹی ہو اور بالکل تنہا رہی ہیڈ بیہ لے کر پیدا ہو۔ ان کی خواہش پوری ہوئی بھی تو کس انداز میں جب وہ دیکھنے کو موجود ہی نہیں ہیں۔“ حرا مشعل کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آزر دگی سے گویا ہوئی۔

”اب تم رونے مت بیٹھ جانا، جو باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہوں ہم انہیں اللہ کی رضا جان کر صبر کر لیتے ہیں۔ یہ خوشی کا موقع ہے، تمہاری سالوں قبل ڈوبی ہوئی ناؤ بچھرو خوبی کنارے لگ گئی ہے۔ اس موقع پر اللہ کا شکر ادا کرو نہ کہ اس سے شکوے شکایت کر کے شکر گزاری کی بجائے ناشکر اپن کرو۔“ فرح نے اس کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر جھڑکا تھا۔

”میں رو نہیں رہی آپ، یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ احسان مندی و شکر کے آنسو ہیں اور مر جانے والے خوشی و غم ہر موقعوں پر یاد آتے ہیں۔“ کسی بچے کی طرح ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر وہ کویا ہوئیں۔

دروازہ ناک کر کے شاہ ویز اندر آیا تھا۔

”آپ لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ بلا تکلف انشراکام پر کہہ کر منگو سکتی ہیں۔“ وہ مسکرا کر گویا ہوا۔

”یہاں کے ملازم بھی میزبان کی طرح بہت اچھے ہیں۔ انہیں کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ خود ہی سمجھ جاتے ہیں۔ آپ بیٹھو بیٹا۔“ وہ صوفے پر جگہ بناتی ہوئی گویا ہوئیں۔

شاہ وزیر کو ان کے اصرار پر بیٹھنا پڑا۔

اس کی نگاہیں بیڈ پر بھٹک رہی تھیں جہاں وہ مشعل کی دھیرے دھیرے لرزتی پلکوں کو دیکھ کر سمجھ چکا تھا وہ جاگ رہی ہے۔ شاید اسی پل اس کی بے خودی ٹوٹی تھی اور جان کر بھی انجان بن کر اچانک در آنے والے واقعات کو فیس کرنے کی استطاعت سے سمجھوتہ نہ کر رہی تھی۔

اس کے احساسات سے وہ اس وقت مکمل طور پر ہم آہنگ تھا کہ مرد ہو کر وہ ان انکشافات سے فوری طور پر سمجھوتہ نہ کر پایا تھا پھر مشعل تو بے حد کوئل، حساس و نازک جذبات کی ناتواں لڑکی تھی اور اس کی محبت کی ابتداء و انتہا حسن بیگ صاحب کی ذات تھی جنہوں نے اسے اتنا پیار و انتہایت دی کہ وہ ان کو جانے کے لئے ہر جذبے کو

یہی وجہ تھی جو وہ اٹلی ماں کی موجودگی کو کوئی اہمیت و وقعت دے کر کی بجائے احساسات سے عاری بڑی تھی۔

”حرا! کتنی خوش نصیب ہو تم۔ دیکھو اللہ نے تمہیں بچی کے ساتھ ایک ہونہار فخر مانبر دار بیٹا بھی دیا ہے۔ کبھی کبھی بالکل اجنبی اور غیر بھی اتنے قریبی تعلق دار نکل آتے ہیں کہ گمان سے باہر ہوتا ہے۔“

”جی اتفاق سے زندگی انہی رشتوں کا نام ہے۔“ شاہ ویز آہستگی سے گویا ہوا۔

”خوشیوں کی میں سدا سے متلاش رہی ہوں لیکن یہ جب بھی میرے پاس آئی ہیں بہت غلٹ میں آکر لوٹ گئی ہیں۔ میرا دامن ان کو سیٹھنے کے لئے پھیلا ہی رہا ہے۔ مگر آج پہلا بار اتنا نوازی گئی ہوں کہ استاد ادا میں اور آنکھ کسم لگنے لگا ہے۔“ حرا کا یہ ہم آواز سر توں سے لے رہ تھی۔ ان کے جھوٹے اداس دھڑکنے والے آنے والے چہرے پر اس

وقت طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔

ممتاز: کمرنگلوں نے ان کو سڑو تار طرے پہنچا دی تھی۔

”آپ! بالکل درست کہہ رہی ہیں۔ میں سچ مچ از حد خوش قسمت ہوں جو مجھے بیٹی کے ساتھ ساتھ بیٹی کی محبت بھی ملی ہے۔ دراصل داماد بھی تو بیٹا ہی ہوتا ہے۔“

”مٹا کر آس کو بھاڑی، سقا جسے سنگ صاف ہے، ز مشعل کرا، سے مہر پہاڑ تالاب بھی کہ مشعل ان کا رنگ چو نہیں ہے؟“

”جی ہاں، مجھ سے اور بے جی سے انہوں نے کوئی بات نہ چھپائی تھی۔ وہ صاف کو اور صاف نیت انسان ہیں۔ انہوں نے سچائی بتانے کے بعد کہا تھا کہ یہ حقیقت کبھی بھی مشعل کو معلوم نہ ہو۔ وہ سوچ رہے ہوں کہ تم مشعل کی حقیقت سے آگاہ بھی ہو سکتے ہو مگر جو ہم انہوں سے اس کو انکار کر رہے۔“

”جوہو بہت اچھا ہوا۔ میری بیٹی کو میری آغوش نہیں ملی تو کوئی بات نہیں لیکن اس کے وجود پر جہڑھا گندگی و گمراہی کی نشانی کا خول تو ٹوٹ گیا۔ اب اس کا وجود گلی تو نہیں

”تم ہمارے بچے تمہیں مانگ رہا ہے۔ اے خدا! اس کو بھی دیکھو کہ میں نے تم پر کیا کیا، مناجات سے خداداد سہولت مل گئی آج چلتی آ کاسے زحمت جاری ہوئی۔“

جما کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ کیا پرمیشن دیں گے یہاں رات.....“

”ارے بیٹھو تو سہی، فوراً ہی کھڑے ہو گئے۔“ فرح کے لیوں پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔

”آپ! آپ بھی بعض اوقات توحید کرتی ہیں۔ بھلا کیا ضرورت تھی اس طرح کہنے کی؟“

ویسے بھی وہ ان بہنوں میں سے نہیں جن کی خوشیوں و تئناؤں کا مرکز چھوٹی بہنوں کی خوشیوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔

وہ بے اولاد ہیں۔  
 حرا کو انہوں نے ایک نہیں کئی رشتوں سے چاہا تھا۔

جینی، ہنن، بیٹی - ہر رشتہ ان کے سے عزیز و سبیر تھا۔ چھر بودل کے فریب ہوئے ہیں ان کے دکھ اور م سب اپنے ذاتی سسوں ہوئے ہیں۔ کراچی ہنن کے روکن چھر کے  
کو دیکھ کر دگنی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ مشعل آنکھیں بند کئے ان کی باتیں سنتی ہوئی ایک کرب سے گزر رہی تھی۔ اس پر انکشاف در انکشاف کے دروا ہوئے تھے۔

جہاں وہ اس دھڑ سے آشنا ہوئی کی کہ وہ سن بیک صاحب کی بی بی تھیں جے وہیں وہ خود پر سکے دولت امیر انعام سے چھٹکارا پائے پر عجیب سی راحت سوس کر رہی تھی۔ اور کچھ دیر قبل جوشاہ ویز نے انکشاف کیا تھا کہ وہ اس کو حقیقت جان کر قبول کئے ہوئے تھا نہ صرف وہ بلکہ بے جی بھی تو تہہ دل سے ان کی اعلیٰ ظرفی و اعلیٰ انسانیت کی ستائش کرتی تھی۔

”کیا..... کیا..... وہ مجھ سے سچ محبت تو نہیں کرنے لگا ہے؟ بعض لوگوں کے محبت کرنے کے انداز بالکل منفرد ہوتے ہیں۔ بظاہر بے نیاز و بے حس بنے رہتے ہیں۔“

تھی، جو جو نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی، ہمیشہ اس نے مجھے بینک اکاؤنٹ کے طور پر استعمال کیا، جس کی خود غرضیوں کو میں چاہت کی عنایتیں سمجھتی رہی وہ مطلب پرستی

آئی نے جو جو سے اس لئے میری مٹگئی ختم کی تھی کہ ان کی نظر میں، میں نا جائز، اولاد تھی اور شاہ ویز نے سب جان کر بھی مجھے اپنایا۔ اوہ، کتنے احسانات ہیں اس کے مجھ

پر..... مجھے نام دیا، پاپا کے ڈاؤن بزنس کو سہارا دیا، انا چھ کرنے کے باوجود بھی حرفِ شکایت اس کی زبان پر میرے خلاف نہیں آیا۔ میں یہی تھی وہ دولت کے لالچ میں مبتلا ہو کر سب کر رہا ہے۔ کس کس طرح میں نے اس کی تضحیک نہیں کی، کس کس طرح اس کی زندگی ابھرن کی، اب ذرا اس نے بے التفاتی و بیگانگی دکھائی تو

ہزاروں شکلوں و شکایتوں کا جہاں مجھ میں آباد ہے۔“

آنسو روانی سے اس کی بند آنکھوں سے بہنے لگے تھے اور وہ ان پر اختیا رکھ بیٹھی تھی۔ ان آنسوؤں نے حرا کو چڑکا یا تھا۔

”رو رو نہیں، آنکھیں ہلولو میری جان۔ تمہاری ماں کب سے بلکہ ایک مدت سے تمہاری منتظر ہے۔ اب مجھے مزید مڑ پاؤ۔“ انکیوں کے پوروں سے اس کے آنسو

صاف کرتی وہ جذباتی انداز میں بولی تھیں۔

ان کی ہر جنبش میں متناہک مہک مہک مہک تھا۔ ان کے قریب سے وہی مہک آرہی تھی جو اسے اپنے وجود سے آتی تھی۔ وہ اٹھی تھی اور ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی تھی۔ حرا کی آنکھیں پہلے ہی انگلیاں تھیں، بڑی محبت سے وہ اسے بازوؤں میں سیٹے ہوئے تھیں۔

فرح بھی بھگی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے ان کا ملن دیکھ رہی تھیں۔ جہاں لفظ ساتھ چھوڑ جائیں وہاں آنسو بات کرتے ہیں اور یہ آنسو ملن کے آنسو تھے، سرتوں کے آنسو تھے۔

”پاپا میں آپ کی بیٹی ہوں اور آپ کی بیٹی رہوں گی۔ آپ مجھے کبھی خود سے دور محسوس نہیں کریں گے۔“ فجر کی نماز کے بعد وہ ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ان کی سرخ آنکھیں اور الجھے بال اس بات کے غماز تھے کہ وہ ساری رات بے چین رہے ہیں۔

”ہاں مجھے معلوم ہے، میری بیٹی بدل نہیں سکتی۔ رشتے خون کے ہوں یا دل کے، بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا تم سے خون کا رشتہ نہیں۔“

”پلیز..... پلیز پاپا! آپ ایسا کبھی نہیں بولیں گے۔ میرا تعلق، ہر رشتہ آپ سے وابستہ ہے اور وابستہ رہے گا۔ آپ کبھی ایسا نہیں بولیں گے ورنہ میں مر جاؤں گی۔“ وہ ان سے لپٹ کر سسک پڑی۔

”روؤ نہیں..... مجھے بے حد تکلیف ہو رہی ہے۔ جانتی ہوں میں تمہاری آنکھ میں ایک آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ اس کے آنسو صاف کر کے کوپا ہوئے۔

”اور آپ جو رات بھر روتے رہے ہیں پاپا کیا سمجھ رہے تھے میں آپ کو چھوڑ کر اپنی ماں کے ساتھ چلی جاؤں گی؟“

”نہیں مجھے معلوم تھا میری بیٹی مجھے چھوڑ کر جا نہیں سکتی۔“ وہ اسے لے کر صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

”حالانکہ پاپا آپ نے اپنی بیٹی کو بہت پہلے چھوڑ دیا ہے۔“

”ہوں..... یہ بات تو ہے۔ لیکن کیا کریں، بیٹی پر اپنی ہی ہوتی ہے اور داماد اگر شاہ ویز جیسا قیمتی ہیرا ہو تو یہ پر لیا بن رہتا نہیں ہے۔ اس معاملے میں تو آپ میری چوائس کو داد دیں گی نا، بیٹے جو ہمارے مصائب میں ہمارا ساتھ بھاتے ہیں وہی ہمارے سچے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ اس نے اس وقت میرا ساتھ دیا جب اپنے بھی منہ چھپا کر بھاگ گئے تھے۔ میری ہر مشکل، ہر پریشانی کو شہر کیا اور کبھی بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں مشکلات کی ان کنھن گھڑیوں میں تنہا ہوں۔ آج تک وہ میرا بازو بنا ہوا ہے، میرا حوصلہ، میرا سپہا، میرا یقین ہے وہ۔ اتنا فرامبردار، اتنا شکھ میرا بیٹا ہوتا تو وہ بھی نہیں دے سکتا تھا جتنا شاہ ویز نے مجھے دیا ہے۔“ ہمیشہ کی طرح وہ اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔

ایک وقت تھا جب وہ اس کی تعریف و توصیف سے خار کھاتی تھی۔

ان کی شاہ ویز پر نوازشوں سے چڑتی تھی لیکن اب وقت بدل گیا تھا۔ حالات بھی تبدیل ہو چکے تھے۔

سب سے اہم تبدیلی یہ تھی کہ مشعل، مشعل نہ رہی تھی۔

اس کا غرور، طغیانی، اکثر اور نخوت سب بدل گیا تھا۔ وہ سراپا بدل گئی تھی۔ اس کے احساسات، جذبات سب بدل گئے تھے۔

پاپا کی تعریف سے اسے ایسی ہی خوشی ہو رہی تھی جیسے وہ شاہ ویز کی نہیں اس کی تعریف کر رہے ہوں۔

”میں گزشتہ کئی دنوں سے محسوس کر رہا ہوں آپ میں اور شاہ ویز میں کشیدگی چل رہی ہے، شاید کسی غلط فہمی کی بناء پر۔ کیا بات ہے یہ میں نہیں جانتا۔ صرف آپ سے ایک ریکویسٹ ہے میری، شاہ ویز جیسے بیسٹ انسان کو کبھی کھونا مت۔ کھونے والے لوگ بہت کم لوگوں کو دوبارہ مل پاتے ہیں۔ غلطی کسی کی بھی ہو، پہل آپ کر لینا بیٹا، یہ چھوٹی موٹی ناراضگی ازدواجی رشتوں کا حصہ ہوتی ہے۔ اگر انہیں خواہ مخواہ طویل دیا جائے تو کچھ باقی نہیں بچتا۔“

□●□

شاہ ویز کو اچانک بزنس کے کسی مسئلے کے باعث پیرس جانا پڑ گیا اور اس غیبت میں وہ گیا تھا کہ مشعل سے اس کی کوئی بات نہ ہو پائی تھی۔ ادھر مشعل کے شب و روز بدل کر رہ گئے تھے۔

وہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی تھی۔ حرا اسے چھوڑنے پر راضی نہ تھیں اور روز ڈرائیور بھیج کر اسے گھر پر بلا لیا کرتیں۔ وہ دو پہر ان کے ہمراہ گزرتی، شام میں گھر لوٹتی تو حسن بیگ صاحب کو اپنا منتظر پاتی تھی۔

حرا کی محبتوں کا کوئی کنارہ نہیں تھا تو حسن بیگ کی شفقتوں و پیار کی وسعتیں لامحدود تھیں وہ کو باہٹ کر رہ گئی تھی۔

شاہ ویز کو گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اس نے اس دوران کئی مرتبہ کال کی تھی۔ بہت عام سے لہجے میں اس کی خیریت دریافت کرتا، حرا، فرح، حسن بیگ سب سے گفتگو کرتا۔ اس کا عام انداز و معتبر اندر وہ اس کے تمام حوصلوں کو پست کر ڈالتا۔ وہ جو اس سے کچھ ”خاص“ سننے کی تمنا کرتی تھی کچھ حال زار سنانے کو بے قرار تھی اس کی آواز سننے ہی دل کی دھڑکنیں خاص انداز میں مچنے لگتی تھیں۔

انگ انگ عجیب کیفیت سے دوچار ہوئے لگتا تھا۔ مگر دوسری جانب کی بے حسی تمام جذباتوں کو سرد کر ڈالتی تھی۔

اس پر جھنجھلاہٹ و بے زاری حملہ آور ہوتی جا رہی تھی۔ حرا بیگم کے ہاں، نہ حسن بیگ کے ساتھ اس کا دل لگ رہا تھا۔ دو دن سے وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔ حسن صاحب سے کبھی کھانے پر سرسری ہی ملاقات ہو رہی تھی۔ حسن بیگ اس کے مزاج کے تمام موسموں سے آگاہ تھے سو وہ سمجھ گئے تھے وہ آج کل تنہائی چاہ رہی ہے اور حسب عادت انہوں نے اس کی تنہائی میں مداخلت نہ کی تھی۔

حرا جو اس کی عادت و مزاج سے نا آشنا تھیں اس کی دو دن کی غیر حاضری پر وہ بوکھلائی، گھبرائی، پریشان سی وہیں چلی آئیں۔

”السلام علیکم بیگ صاحب!“ ان کی پہلی ٹڈ بھینٹ لاؤنج میں بیٹھے حسن صاحب سے ہوئی تو انہوں نے خاصے تکلف زدہ انداز میں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام، آئیے بیٹھیں۔“ وہ احتراماً کھڑے ہو کر کوپا ہوئے۔

”مشعل کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ میں دو دن سے ڈرائیو کو بھیج رہی ہوں تو وہ اسے بھی واپس بھیج رہی ہیں اور نہ کال اٹینڈ کر رہی ہیں۔ میں نے سوچا دیکھ کر آؤں کیا بات ہے۔“ ان کے انداز میں از حد فکر مندی تھی۔

”الحمد للہ، وہ بالکل خیریت سے ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔ آج کل اس کا موڈ تنہائی چاہ رہا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو میں بھی بالکل ڈسٹرب نہیں کرتا اسے جب تک اس کا موڈ بحال نہ ہو جائے۔“

”لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے..... بیٹو نارمل روئیں نہیں ہے۔“

”وہ بچپن سے کچھ ایب نارملٹی کا شکار رہی ہے۔ شادی سے قبل وہ بہت زیادہ ایسی حرکتیں کرتی تھی۔ اس کے مزاج میں غصہ، ضد، ہٹ دھرمی اور خود سری بہت زیادہ تھی۔ وہ کسی کو کوئی ویلیو دینے کو تیار نہ تھی۔ اب شادی کے کئی ماہ بعد اس کا موڈ خراب ہوا ہے۔“

”کوئی وجہ تو ہوگی؟ آپ نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی؟ آپ کو معلوم کرنا چاہئے تھا۔“

”میں نے کبھی بھی اس کے معاملات میں مداخلت نہیں کی ہے۔ ہمیشہ اسے اس کی مرضی کرنے دی ہے۔ شاید اب میری مداخلت وہ برداشت نہ کر پائے۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر اس کی ناراضگی برداشت نہیں ہوتی اور اسی خوف سے میں نے اسے اس کی مرضی پر چھوڑا ہے۔“

”خرم ہوتے تو وہ بھی اسی طرح اپنی بیٹی پر جان لٹاتے، بیٹی کی خوشی ان کی خوشی ہوتی، دکھ اس کے وہ سارے لے لیتے۔ میری بیٹی خوش نصیب ہے، باپ نہیں ملا مگر محبتیں، شفقتیں اسی انداز میں ملی ہیں۔“ حسن بیگ گفتگو میں مصروف تھے اور حرا کا ذہن سوچوں کی پروازیں بھر رہا تھا۔

”میں مشعل کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں کچھ عرصے کے لئے شہر سے باہر کسی پر نضا مقام پر اگر آپ کی اجازت ہے تو۔“

”آپ لے جاسکتی ہیں۔ شاہ ویز کو آنے میں ایک ماہ کا عرصہ باقی ہے اور تب تک میں چاہتا ہوں، آپ اس کے ساتھ وقت گزاری سکتی ہیں۔ پھر شاہ ویز آجائیں گے تو وہ اپنی میرا مطلب ہے ان کے ساتھ چلی جائے گی۔ پھر شاید وہ مجھے یا آپ کو اتنا ناگوار نہ دے پائے۔“

لازمہ کو کافی لانے کا آرڈر دے کر حسن بیگ صاحب جو گفتگو تھے۔

”اوہ، واقعی مجھے تو یہ یاد ہی نہیں ہے کہ مشعل شادی شدہ ہیں بلکہ ان کے کسی عمل سے ظاہر بھی نہیں ہوتا کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ عجیب غیروں جیسا، اجنبیت بھرا ان کا رویہ ہوتا ہے۔ کئی بار میری موجودگی میں مشعل نے شاہ ویز کی کال ٹرائینڈ کی ہیں اور ان کی گفتگو اتنی مختصر و تکلف زدہ ہوتی ہے کہ میں سمجھتی ہوں اس گفتگو سے بہتر گفتگو اجنبی لوگ آپس میں کر لیتے ہیں۔ معاملہ کیا ہے، مجھے سمجھ نہیں آتا۔“

ان کی گفتگو میں متناہک مخصوص تڑپ، پریشانی، فکر مندی موجود تھی۔ حسن بیگ مبہم سا مسکرا کر رہ گئے۔

”پہلے میں نے سوچا تھا شاید مشعل اس شادی سے خوش نہیں ہے لیکن اس خیال کو ذہن سے رد کر دیا تھا۔ شاہ ویز جیسا خوب رو اور بہترین جیون ساتھی پا کر کون لڑکی ہوگی جو خوش نہیں ہوگی۔ شاید ان کے درمیان تکلف کی دیوار ابھی حائل ہے یا پھر ایسی کوئی بات، ایسا کوئی جواز ضرور ہے جس نے انہیں تکلف کے رشتوں میں مقید کر رکھا ہے۔“

”مجھے بار بار اس امر کا شدت سے احساس ہوا ہے۔ میں ہر ممکن کوشش کے باوجود ماں کا فرض یا ماں جیسی تربیت مشی کو نہ دے سکا۔ یہ سب اسی کمزوری کا زلزلہ ہے۔“

انہوں نے حسب عادت فراخ دلی سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا حالانکہ اس معاملے میں وہ بے قصور تھے۔

”یہاں آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔ اس کی پرورش آپ نے جس طرح کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ہر کوئی آپ جیسا نہیں ہو سکتا۔ یہ میری بیٹی کی خوش بختی ہے۔“ لازمہ کی آمد پر وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

□●□

سردیوں کی شام بڑی اُداس ہوتی ہے، کسی غریب نوعمر بیوہ کی مانند کسی عجیب سوئی سوئی رست پھیل رہی تھی۔

وہ لان میں گم صم، اُداس بیٹھی ہوئی تھی۔ طبیعت میں از حد مضطرب پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر شے سے وہ اکتاتی جا رہی تھی۔

کچھ دن حرا کے پاس اور کچھ دن حسن بیگ کے ہاں گزارتے ہوئے اسے اس روٹین سے سخت وحشت و بوریت محسوس ہونے لگی تھی۔

شاہ ویز کا ایک ماہ کاٹور تین ماہ گزارنے کے باوجود مکمل نہیں ہو رہا تھا۔ ہر ہفتے وہ کسی شہر یا ملک سے کال کرتا تھا۔

کالز اس کی برابری تھیں مگر اس نے کبھی یہ بتانے کی زحمت کو اِرادہ کی تھی کہ اس کی واپسی کب تک متوقع ہے؟ اور وہ ہر بار یہ سوال کرتے کرتے رک جاتی۔ ایک جھجک، ایک حیا اس کا دامن کوپا تھام لیتی تھی اور وہ اسی انتظار میں رہتی کہ وہ اب حال دل سنانے والا ہے کہ ”میں اب تمہاری جدائی کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی بہت سزا دے چکا ہوں۔ میں آ رہا ہوں، مزید جدائیوں کے پل عبور کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔“ لیکن یہ خیال صرف خیال ہی رہتا تھا۔ خیر خیریت سے بات آگے نہ بڑھتی۔ اب اس کا انتظار، اشتعال بن چکا تھا۔

جب انتظار کی غنا میں ٹوٹ جائیں اور ضبط کے حوصلے اپنا تو ازن کھو بیٹھیں تو انتظار، انتظار نہیں رہتا، تمام انگلیں، سر تیں، شوق، دید، وصال، صم ریزہ ریزہ ہو کر آگ بن جاتا ہے

نفرت بن جاتا ہے

غصہ بن جاتا ہے

وہ بھی تخر و اشتعال کی آگ میں بھسم ہو رہی تھی۔

”بیٹا! اتنی ٹھنڈ میں بغیر سویٹر اور شال کے بیٹھی ہیں آپ۔ اس طرح ٹھنڈ لگ جائے گی آپ کو اور بیمار ہو جاؤ گی۔“ فرح اس پر گرم شال ڈالتے ہوئے ملامت سے کوپا ہوئیں۔

”میں..... میں آگ میں جل رہی ہوں..... اس آگ میں برف بھی پانی بن کر بہہ جائے۔“

”کیا ہوا؟..... کیا سوچ رہی ہو..... کوئی پر اِلم ہے؟“ وہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کا خروٹی سفید و سر دہا تھاپے ہاتھوں میں دبا کر بولیں۔

”کوئی پر اِلم نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے جبراً لب کشائی کی۔

”ٹھیک ہو نہیں، گٹنے کی کوشش کر رہی ہو۔“

جواباً وہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

”کیا ہو گیا ہے جان؟“ انہوں نے ہاتھ پھیلا کر اسے سینے سے لگا لیا۔ ”بالکل مردہ دل ہو گئی ہو..... ذرا اپنی شکل دیکھو آئینے میں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں، رنگ زرد اور چہرہ مرجھا کر رہ گیا ہے۔ اس عمر میں آپ کا یہ طبع ہے جب ماں بنو گی تو پھر کیا ہوگا؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس کی آواز کی بے دلی لفظوں کا ساتھ نہ دے رہی تھی۔

”شاہ ویز کب آرہے ہیں؟“ انہوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے استفسار کیا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“

”کیوں..... آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔ آپ ان کی بیوی ہو۔“

”انہوں نے بتایا نہیں؟“

”آپ معلوم کر لیتیں۔“

”میں کیوں معلوم کر لیتی؟“ وہ ان سے علیحدہ ہو کر بیٹھ گئی۔

”تم وائف ہو شاہ ویز کی، حق ہے آپ کو معلوم کرنے کا۔“

”ان کا حق نہیں ہے بتانے کا؟ کیا سارے حقوق، سارے فرائض صرف اور صرف بیوی کے ذمے آتے ہیں؟“ وہ ہری طرح چڑ گئی تھی۔

”نہیں، میاں اور بیوی دونوں ففٹی ففٹی کے پارٹنرز ہوتے ہیں۔ کچھ فرائض بیوی کی ذمہ داری ہوتے ہیں تو کچھ حقوق ادا کرنے کی ذمہ داری میاں یعنی مرد پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ دونوں کی باہمی محبت اور اندر رائیڈنگ سے میر ڈالائف سیٹل رہتی ہے۔ آپس میں جتنی محبت و خلوص ہوگا، رشتہ اتنا ہی مضبوط، پائیدار ہوتا ہے۔ اس رشتے میں دونوں فریق مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔“ حرا اور فرح جو کئی دنوں سے اس کی وجہ سے پریشان تھیں روز بروز اس کی گرتی صحت و خاموشی سے اور دوسری طرف شاہ ویز کا عجیب و بے معنی رویہ انہیں الجھائے ہوئے تھا۔ اکثر کالز پر باتیں کرتے ہوئے غیر محسوس انداز میں انہوں نے اسے بھی ٹٹولنے کریدنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور اندازہ لگایا تھا ان کے درمیان کوئی بات، کوئی رنجش، کوئی اختلاف ہے ضرور۔ شاید ان کا کوئی مسئلہ ہے اور دونوں ان مسئلوں کو چھپائے اس طرح بن باس کاٹ رہے ہیں۔

اب اس الجھن کی گرہیں ہلکی ہلکی ڈھیلی پڑنا شروع ہوئی تھیں اور فرح اس الجھی ڈوری کے اصل سرے کو تھامنے کا ارادہ کر چکی تھیں۔

”پلیز آئی! مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں..... میں نہ معلوم کیا اول فول بک چکی ہوں، جو ہو رہا ہے میرا نصیب ہے۔ اس میں کسی کا کوئی دوش نہیں ہے۔“ اس کے انداز میں مضطرب ہی مضطرب تھا جو بے دھیانی میں منہ سے نکل چکا تھا اسی پر نادم تھی وہ۔

”کتنی فسوس کی بات ہے..... بلکہ شدید دکھ کی، ہم آپ کو اپنے آپ میں سے ایک سمجھتے رہے اور آپ نے ہمیں آپن واحد میں عرش سے فرش پر لا پٹھا۔ کتنی اجنبیت، کس قدر رکھائی ہے آپ کے لیے میں۔ ہم سے اپنی پر اِلمر شیئر کرنے کے بجائے آپ دامن بچا رہی ہیں۔ اس طرح جیسے ہم آپ کے کچھ لگتے ہی نہیں ہیں۔“ حرا نے کہا جو نہ معلوم کس وقت ان کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ مشعل کے بیگانہ رویے پر تڑپ کر کوپا ہوئیں۔ وہ دونوں میں چونک کر چلی تھیں۔

”مما! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کیوں ایسی باتوں کو اہمیت دے رہی ہیں؟ خدا کے لئے آپ برامت مانیں۔“ وہ بے اختیار آگے بڑھ کر ان سے پٹ گئی۔ اس کے انداز میں اتنی بے ساختگی و اپنائیت تھی کہ حرا کے اندر طمانیت تہہ در تہہ اترنے لگی۔

”میں اور آپ آپ کے لئے ایک جذبہ، ایک احساس رکھتے ہیں۔ آئندہ ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کیجئے گا۔ ہاں اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ آپ کے اور شاہ ویز کے درمیان بیگانگی اول روز سے ہی نظر آگئی تھی جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مزید واضح ہوتی گئی اور آپ کے بن بتائے ہی ہم بہت کچھ سمجھ چکے ہیں۔ بہر حال اندازے، اندازے ہی ہوتے ہیں ضروری نہیں حقیقت سے ہمیشہ قریب تر ہوں، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے آنکھیں جو دیکھتی ہیں وہ صرف دکھاوا ہوتا ہے۔ شاہ ویز ہمیں عزیز سی مگر لاما داس وقت تک عزیز و قابل احترام رہتے ہیں جب تک بیلیوں کی سرتیں و محبتیں ان سے وابستہ رہتی ہیں وگرنہ ان میں اور کھولے سکوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ آپ بلا کسی جھجک و خوف کے بتاؤ کہ اصل معاملہ کیا ہے؟“

ان دونوں نے مل کر اس کی ہمت بندھائی، اسے حوصلہ و سہارا دیا تو وہ کچھ بھی نہ چھپا سکی۔ شاہ ویز سے پہلی ملاقات سے آخر تک سب بتاتی چلی گئی۔ اور وہ دونوں دم بخود سی بن رہی تھیں۔

”مجھے اعتراف ہے اپنی ہر غلطی، ہر لغزش کا۔ میں نے اسے بہت بے عزت کیا، الزامات لگائے، برا بھلا کہا۔ اس کی زندگی ایک عرصے تک جہنم بنا کر رکھی لیکن یہ سب اس وقت ہوا جب مجھے اچھے برے، دوست دشمن کی پہچان نہیں تھی۔ میرے شعور نے آگہی کے دروازے کئے تھے، دانش مندی اور سمجھ بوجھ مٹقل تھی۔ میں نے جو کچھ کیا وہ نادانستگی و بے وقوفی میں کیا تھا۔ اور جب میرا شعور بیدار ہوا، اور اک نے بند نفل توڑنے میں نے اپنی غلطی ماننے میں کوئی لمحہ نہ لگایا، پوری صداقت و کشادہ دلی سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا۔ لڑکی ہونے کے باوجود اظہار محبت میں خود پہل کی۔ ہر وہ فعل چھوڑا جس سے اسے نفرت تھی۔ ہر وہ عمل اپنایا جس کو وہ پسند کرتا تھا، سراہتا تھا۔ اس کی خاطر میں نے خود کو سرتا پابدل لیا۔

اپنی انا، خود داری، نسوانیت کو جھکا ڈالا، ریزہ ریزہ کر دیا اور خود کو مٹا کر کیا پایا؟

انتظار، انتظار، انتظار..... جس کی اذیت سے دم گھٹنے لگا ہے۔“

”کیا تم شاہ ویز سے دستبرداری قبول کر لو گی؟“ فرح کا سوال تھا یا خنجر جو سیدھا دل میں پست ہو ا تھا اور وہ درد سے بلبل اٹھی تھی۔

”میری اتنی کٹھن ریا دستوں کا یہ صلہ ہے؟“

”جہاں تم نے اتنی اذیتیں سہی ہیں وہاں ایک اور سہی۔ شاہ ویز کو کہو وہ واپس آجائے۔“ حرا کا لہجہ مصالحت آمیز تھا۔

”پھر وہی بات؟ ہر بار میں ہی کیوں جھکوں؟“

”اس لئے کہ محبت اور انا ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔“

”مما! میں اب اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔“

”نہیں..... آپ اسے کہو گی جلد واپس آنے کا، اسے سامنے بٹھا کر معاملہ سلجھایا جائے گا۔ آخر ہر کام، ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ شادی کو دس ماہ ہو چکے ہیں اور یہاں وہی پہلا کا پہلا دن ہے۔“ حرا کا انداز جتنی تھا۔

راست کو شاہ ویز کا فون آیا تو وہ اس وقت تک مشعل کے سر پر سوار ہیں جب تک اس نے اسے واپس آنے کا کہا نہیں۔

”کیا کہا..... ذرا دوبارہ دہرانا؟“ دوسری جانب سے التجائیہ انداز میں اصرار ہوا۔

”آ..... آپ..... واپس..... آجائیں۔“ وہ مزید بوکھلا گئی تھی۔ جواباً اس سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ وہ حرا کو ریسور پکڑا کر چلی گئی۔

”مشتعل! شاہویر کو واپسی میں نا تم لگے گا۔ کام تو کمپلیٹ ہو چکا ہے، وہ کچھ تفریح کی خاطر وہاں رک گئے ہیں۔ بے جی سے کل رابطہ ہوا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں انہیں واپسی میں دو ہفتے لگیں گے۔ حج کے بعد وہ اپنے کسی عزیز کے ہاں ریاض چلے گئے ہیں اور میں چاہتا ہوں آپ ان کی آمد سے قبل وہاں جا کر گھر کی صفائی وغیرہ کروائیں بلکہ پورے گھر کی سیٹنگ ہی چھیچ کر دیں۔ ایک سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے، انہوں نے گھر میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ ان کی آمد سے قبل جھجنگ ہو جائے تو بہتر ہے۔“ وہ رات حرا کے ہاں سے گھر آگئی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد حسن بیگ نے اس گھر کی چابی دیتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔

”او کے پاپا!“ اس نے چابی تھامتے ہوئے کہا۔

”چلیں، میں آپ کو وہاں ڈراپ کرنا ہوا جاؤں گا اور آفس جا کر ڈرائیور کو واپس بھیج دوں گا۔ جولا نا چاہو شاپنگ کر لینا۔“

گھر میں قدم رکھتے ہی ماضی کی اذیتیں ایک ایک کر کے کچوکے لگانے لگی تھیں۔ وہ شدید بوجھل پن و پڑمردگی محسوس کرنے لگی تھی۔

یادیں خوشگوار ہوں تو طبیعت کو ازسرنو تازہ و سرور کر دیتی ہیں۔ چونکہ اراپنی فیملی کے ساتھ وہاں رہ رہا تھا اور باقی ملازم چھٹی پر تھے۔ وہ لاؤنج میں آکر صوفے پر بیٹھ گئی اور بیک سے سرٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ رفتہ رفتہ اس کے اندر ایک احساس اترنے لگا۔

سکون، سرور، راحت کا احساس بے خود کئے ہوئے تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا اپنا گھر کیا ہوتا ہے؟

خود کی شناخت کیسا اعتماد و وقیر بخشش ہے۔ وہ کئی ماہ پہلے اپنی شناخت کھوٹی تھی۔ ایک بھکتی ہوئی روح بن گئی تھی۔ ایک ایسے پنچھی کی طرح جو اپنے آشیانے کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کی تمام رنجیدگی، خاموشی و بیزاریت کسی گرد کی طرح صاف ہو گئی تھی۔ وہ خود کو بالکل ہلکا پھلکا، معطر معطر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور بھرپور انگڑائی لے کر کھڑی ہو گئی۔

”یہ معمولی سے فرنیچر اور عام سے درو دیوار والے گھر نے مجھ پر کیا سحر پھونکا ہے..... میں جو گزشتہ کئی دنوں سے خود کو بالکل مردہ محسوس کر رہی تھی یکدم ہی کو یا نئی روح میرے اندر پھونک دی گئی ہے۔ کیا وہ یہاں آنے کے لئے بے قرار و پریشان تھا جو یہاں لمحوں میں میرے اندر توانائی و سرتوں کے آبشار بہنے لگے ہیں۔ پاپا کے عالیشان گھر، ماما کی خوبصورت سنگت میں کہیں بھی ایسی طمانیت و سرت محسوس نہ ہوتی تھی جیسے انوکھے احساسات سے یہاں آکر دوچار ہوئی ہوں۔ میرا الشعور بہت پہلے نامعلوم کب اس تعلق کو قبول کر چکا تھا جس کا احساس مجھے یہاں آکر ہوا ہے۔“ وہ ہر چیز کا جائزہ لیتی ہوئی حیرانی سے سوچ رہی تھی۔ اس دوران چونکہ ارا کی بیوی گل رخ سلام کر گئی تھی۔

کمرؤں کے قالین، پردے سب میلے ہو رہے تھے۔ بعض کمرؤں کی کھراکیم چھیچ کرنے کی ضرورت تھی۔ پھر اس نے طویل لسٹ بنالی تھی۔ کھراکیم ایک ہفتے میں چھیچ ہو گئی تھی۔ لان کو نئے سرے سے سنوارا گیا تھا۔ تمام پرانی چیزیں ملازموں میں اس نے بانٹ دی تھیں۔ پھر اس نے پردوں، قالین، کراکری اور دوسرے آرائشی سامان کی خریداری شروع کر دی۔ یہاں حسن بیگ نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اسے رقم بغیر مانگے مل جاتی تھی۔ ڈرائیور اور چونکہ ارا کی بیوی کے ہمراہ وہ خرید و فروخت میں مصروف تھی اور تیزی سے گھر کی حالت بدلتی جا رہی تھی۔ وہ عام سا گھر اس کی محنت اور زبردست جمالیاتی حس کے باعث اب شاندار محل نظر آنے لگا تھا۔ سب جگہ کی آرائش و زیبائش اس نے ازحد اہتمام و احتیاط سے کروائی تھی اور خصوصاً بے جی اور شاہویر کے بیڈرومز کے اہتمام میں ازحد احتیاط برتی تھی۔

بے جی کے بیڈروم کی کھراکیم آف وائٹ میں کروائی تھی اور اس کی مناسبت سے فرنیچر رکھا تھا اور آرائش کروائی تھی۔ ان کے فرنیچر میں ایک خوبصورت چونکہ کا اضافہ تھا جس پر اس نے بھاری سرخ شیمیل کی جائے نماز بچھائی تھی۔ جائے نماز پر خانہ کعبہ کی پُر نور تصویر آویزاں تھی۔ سب سے زیادہ محنت اس نے شاہویر کے بیڈروم پر کی تھی اور ہلکے رنگوں کا استعمال کیا تھا جو شاہویر کی طبیعت سے میچ کرتے تھے۔ ڈرائنگ روم اور لاؤنج میں شوخ رنگوں کا استعمال کیا تھا اور اسی نسبت سے ڈیکوریشن بھی کی گئی تھی۔ سارا گھر سنور گیا تھا۔ فرش سے چھت تک ہر چیز چم چم کر رہی تھی۔ ہر کمرے میں خوبصورت پھول گلدانوں میں مسکرا رہے تھے۔

سردی شدید ہو گئی تھی۔

وہ اب تھک گئی تھی۔ دس دنوں میں اس نے دن رات محنت کی تھی۔ ایک ولولہ، ایک عزم اسے ہمہ وقت تروتازہ رکھتا تھا۔ تھکن اس کے قریب بھی نہ پہنچتی تھی۔

اب جبکہ وہ اپنی خواہشوں کو عملی شکل دے چکی تھی، اس کی محنت اور کوششیں بار آور ثابت ہوئیں تو ایک دم سے تھکن و سستی اس پر سوار ہو چکی تھی۔ ڈرائیور کو اس نے واپس بھیج دیا تھا۔ اس کا آج یہیں رکنے کا ارادہ تھا۔

سردیوں کی شامیں بوجھل ہوتی ہیں۔ اندھیرا جلد اتر آتا ہے۔

اس روز بھی موسم ابر آلود تھا۔ سراسیمہ ہی رات کا گمان ہو رہا تھا۔ اس نے تمام کھڑکیوں، دروازوں کو لاک کیا اور کھانا کھا کر شاہویر کے بیڈروم میں چلی آئی۔ ہیٹر آن کر کے بیڈ پر دراز ہو گئی۔

رات

سردی

تنہائی

اس کے اندر کوئی ہولے ہولے سسکتے لگا۔

ممانے کہا تھا تم اسے لوٹ آنے کا کہو وہ لوٹ آئے گا اور اس کے دل میں بھی تو یہی خوش فہمی جاگزیں تھی مگر خوش فہمی محض خوش فہمی رہی تھی۔ اس ستم گر کی یاد موتیوں کی صورت آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر دائیں بائیں بکھرنے لگی تھی۔ اس کے لبوں سے آہ نکلتی تھی۔

تیری الفت میں صنم

دل نے بہت درد سہے اور ہم چپ ہی رہے

بہت عرصے قبل ریڈیو پر سنا ہوا گیت اسے اپنے حسب حال ہی لگا تھا اور وہ پوری طرح اندر وہ ہو گئی تھی۔

غم ہمیں ٹوٹ گیا، ہائے دل ٹوٹ گیا

پھر بھی آنسو نہ بہے اور ہم چپ ہی رہے

وہ بے چین ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

تیری الفت میں صنم دل نے بہت درد سہے

تیری الفت میں صنم دل نے بہت درد سہے

وہ اٹھ کر کمرے میں ٹپٹنے لگی۔

کمرے کی ایک ایک چیز کو یا اس کے ساتھ اٹک بار ہو رہی تھی۔ ہر ایک کوشش سے تنہائی و اداسی ٹپک رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے یہاں ٹھہرنے کا ارادہ غلط کیا ہے۔ یہاں کی تنہائی، خاموشی کسی آسیب کی طرح اس پر حاوی ہو رہی تھی۔

ہرگز راتالحد اسے وحشت زدہ کر رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی وہ پہلی مرتبہ اس طرح تنہا نہیں رہی ہے۔ اکثر و بیشتر پاپا کے برنس ٹورز کے باعث وہ پاپا کے ہاں کئی ہفتوں تنہا رہی تھی اور کبھی بھی تنہائی یا وحشت کا شکار نہ ہوتی تھی جس کا سابقہ اسے یہاں پڑا تھا۔ شاید وہ پاپا کا گھر تھا اور یہ ”بیبا“ کا۔ وہاں وہ ہر طریقے سے رہنے کی عادی تھی اور یہاں وہ متناعر صدمہ بھی رہی تھی شاہویر ساتھ تھا۔ کوکہ ان کے درمیان خوشگوار دوستانہ تعلقات ہرگز نہ تھے مگر پھر بھی شاہویر نے ایک ہی بیڈروم میں سونے کو ترجیح دی تھی۔ اور لاشعوری طور پر وہ اس کے وجود کی عادی ہو چکی تھی۔ اب اس کمرے میں وہ ازحد بے چینی و بے کلی محسوس کر رہی تھی اور اس نے سوچا زیادہ وقت نہیں ہوا ہے، وہ واپس پاپا کے ہاں چلی جائے۔ وہاں کم از کم تنہائی کا جان لیوا احساس تو نہ ہوگا۔ ویسے بھی روزانہ صبح آتی تھی اور کام کروا کر رات تک لوٹ جاتی تھی۔ نہ معلوم آج کیا ہوا تھا اسے جو وہ یہاں رکنے کی بیوقوفی کر بیٹھی تھی۔

ابھی وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا بھی نہ پائی تھی کہ ایک دم لائٹ چلی گئی اور ہر سو گہرا اندھیرا پھیل گیا۔

وہ جہاں تھی وہیں تھم گئی۔ کچھ دیر تک لائٹ نہ آئی تو اٹھ کر موم بتی تلاش کرنے لگی۔ کام کی مصروفیت کے باعث نارنج بھی چارج نہ کر سکی تھی جو اس وقت فیل تھی۔

موم بتی اور لائٹر اسے دراز سے مل گئے تھے۔ اس نے کارنر پر آویزاں کینڈل اسٹینڈ پر ایک ساتھ کئی موم بتیاں جلا کر رکھ دیں۔ دیواروں پر موم بتیوں کے سائے لرزاں تھے۔ اندھیرا اور روشنی ایک دوسرے کے سنگ محو رقص تھے۔ تنہائی پہلے ہی اسے مکمل کئے ہوئے تھی، اب یہ نئی افتاد سے سرا سیمہ کئے ہوئے تھی۔ موم بتی کا پورا پیکٹ جلا نے کے باوجود روشنی نا کافی لگ رہی تھی اور اس کی پر چھائی کے ساتھ کمرے کی ہر شے کی پر چھائیاں نمایاں ہو کر دیواروں پر ڈراؤنی شکلیں بنا رہی تھیں۔

خوف سے اس کا نازک دل دھڑک دھڑک جا رہا تھا۔ کافی دیر بعد جب خوف میں کمی واقع ہوئی تو اس نے کینڈل اسٹینڈ سے ایک موم بتی نکالی اور ٹیبل پر شاہویر کا نام لکھنے لگی۔

کانچ کی ٹیبل کی شفاف سطح پر سرخ موم سے جگہ جگہ ایک ہی نام لکھا تھا۔

شاہویر

شاہویر

شاہویر

اس نے شفاف ہتھیلی پھیلائی اور اس پر بھی لکھ دیا۔ اُف گرم گرم قطرہ اس کی نازک ہتھیلی پر گرنا تو جان ہی نکل گئی۔

لیکن اس اذیت میں بھی ایک انوکھی لذت پنہاں تھی۔



وہ جنونی انداز میں جھٹلی جلاتی گئی، جلاتی رہی۔ جب اچانک..... بالکل اچانک دروازہ کھلا اور موسمِ بقی سمیت لرز کر چونک اٹھی تو اس کے ہاتھ میں کانپی اور وہ اس طرح کھڑی ہو گئی جیسے اس نے دروازے میں کوئی بھوت کھڑا دیکھ لیا ہو۔

ایک بار

دو بار

تین بار

اس نے استعجابیہ انداز میں پلکیں جھپکائی تھیں۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ٹکلی باندھے ادھر دیکھ رہی تھی۔  
دروازے پر شاہوین کھڑا تھا۔

ہاں، شاہوین..... وہی شاہوین جو اس کی دھڑکنوں میں بسا تھا جس کو اس نے جھٹلی پر جمایا تھا، خیالوں میں سجایا تھا۔ اس کو اپنی بصارت پر دھوکے کا گمان ہو رہا تھا۔  
”ممکن ہے، یہ فریب ہو، خیال ہو، دھوکا ہو، خواب ہو، کوئی اور ہو۔ مگر نہیں، وہ شاہوین ہی تھا جو دروازے کے پتھوں بچ کھڑا اوالہانہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ براؤن کوٹ سوٹ میں وہ پہلے سے بھی زیادہ صحت مند اور چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی، چہرے پر سرخی تھی۔ رنگ کھل کر اور صاف ہو گیا تھا۔ ہونٹوں پر دلاؤین مسکان تھی۔ وہ ایک دوسرے کی جانب سحر زدہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔ شاہوین کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔

مشعل کی آنکھوں میں وحشت تھی، خواب سے بیدار ہوجانے کی سراپیمگی تھی۔ ہاتھ میں موم بقی تھر تھرا رہی تھی۔

جلتا موم اس کی جھٹلی میں جمع ہونے لگا تھا۔ دوپٹہ کندھوں سے ڈھلک کر کلائی پر گر گیا تھا۔ وہ ابھی تک یقین و بے یقینی کے دورا ہے پر کھڑی تھی جب موم بقی ختم ہو گئی، پگھلا موم ایک شعلے کی طرح بھڑکا اور شعلے نے اس کے دوپٹے کو لپیٹ میں لے لیا جو جھٹلی پر سرک آیا تھا۔

”ارے..... ارے..... آپ نے دوپٹہ جلا لیا۔“ وہ چیخا ہوا اس کی طرف لپکا اور دوپٹہ کھینچ کر نیچے پھینکا پھر اپنے بھاری بوٹ مار مار کر دوپٹے کی آگ بجھائی تھی۔

دوپٹے کی آگ تمہیں نظر آگئی۔ میں جوتن من جلائے بیٹھی ہوں، میری سر تیں، میری خواہشیں، میری انا، میرا وقار جس میں سب جل کر خاکستر ہو گیا، وہ کچھ تمہیں نظر نہیں آتا.....؟

”اوہ..... ہو..... یہ کیا ہو گیا ہے..... یہ گرم گرم موم ہاتھ جلا رہا ہے۔“

شاہوین نے دوپٹے کی آگ بجھا کر اس کی طرف دیکھا پھر قریب آ کر اس کا لرزنا ہاتھ تھام لیا۔ اسی وقت لائٹ آگئی۔ تمام روشنیاں جل اٹھیں۔ کمرہ جگمگانے لگا۔ ہر طرف چمکا چمک رہی تھی۔

اس نے ان موم بتیوں کی جانب دیکھا جولا لٹ آنے کے باعث ہوا کی زد میں پھڑ پھڑا رہی تھیں اور بہت حقیر لگ رہی تھیں۔ بے تحاشہ روشنیوں نے ان کی حیثیت زیر و کردی تھی۔ اس وقت وہ بھی تو ان موم بتیوں کی طرح شاہوین کے سامنے بالکل حقیر و کمزور لگ رہی تھی۔ شاہوین نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا جس کی جھٹلی پر چھالوں کی صورت میں شاہوین لکھا ہوا تھا۔

اس کی نگاہ جھٹلی سے ہٹ کر ٹیبل کے شیشے پر پڑی تھی جہاں سرخ موی قطرے جگہ جگہ اس کے نام میں ڈھلے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہ پلٹ کر آئی تو مشعل کے چہرے پر ٹھہر گئی۔ اس کا چہرہ کھلی کتاب کی مانند تھا جس کا ہر لفظ محبت کی روشنائی سے تحریر تھا۔ اس کے چہرے پر بچ تھا۔

اس نے بھی اپنی سلگتی آنکھیں اس کی آنکھوں میں الجھا دیں۔ وہ اب کوئی حجاب، کوئی ملال درمیان میں رکھنا نہ چاہتی تھی..... مگر ابھی شاید اس کی مناجات قبولیت کے درجے پر فائز نہ ہوئی تھیں جو اسی دم دروازہ ناک کر کے شاہوین کا چہرہ کو لپک اندر آ گیا۔

”سر! میں جا رہا ہوں..... آپ کا سامان ملازم سے اندر رکھا دیا ہے۔“

مشعل کو سلام کر کے وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔ سہیل کو دیکھتے ہی شاہوین نے مشعل کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور قدرے پرے ہٹ گیا تھا۔

”آپ صبح شام یہاں فون کر کے میرا دماغ کھاتے ہیں اور یہ اطلاع مجھ سے کیوں چھپائی۔ میں ڈنکا اہتمام تو کر لیتی۔ میں نے دوپہر کے بچے ہوئے کھانے سے ڈنکنا کھا۔ اب کچھ تیار بھی نہیں ہے۔“ وہ سہیل پر اپنی جھال اتارنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”آئی ایم سوسوری میڈم! اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ کچھ دیر قبل سرنے مو بائل کے ذریعے اطلاع دی کہ یہ ایئر پورٹ پر موجود ہیں، جا کر ریسو کروں۔ سو میں جا کر انہیں لے آیا۔ سارا حساب کتاب انہی سے دریافت کریں۔“ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

”اگر میں بتا کر آتا تو تم میرا اتنا شاندار استقبال کس طرح کرتیں؟“ اس کی آنکھوں میں اتنی شکایت دیکھ کر وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں ان لمحوں میں بہت بڑی خوشی سے فیض یاب ہوا ہوں۔“

مشعل کی شکایت از خود رفع ہو گئی تھی۔ وہ اس سے نگاہ جدا کر آگے بڑھ گئی۔

”ڈنکنا فکر مت کرو..... میں کر کے آیا ہوں۔ ہاں اگر کافی مل جائے تو عنایت ہوگی۔“ اس کا انداز شکفتہ و شوخ تھا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی کچن میں چلی آئی اور بڑی چاہ سے اس کے لئے کافی بنانے لگی تھی۔

اس کے لب خود بخود مسکرانے لگے تھے۔

روم روم سرشاری و سرمستی کی کیفیت میں جھومنے لگا تھا۔

دل سرکوشیاں کر رہا تھا۔

وہ آگیا ہے

تیرے من کا میت!

تیرے خوابوں کی تعبیر

تیرے من کی مراد

وہ من ہی من میں سرت سے جھومتی ہوئی چھوٹی ٹڑے میں دوگ کافی کے لئے کرو ہاں چلی آئی۔ سارا کمرہ اس کے پرفیوم کی دھڑیرب مہک سے مہکا ہوا تھا۔ وہ بیڈ پر مکینوں کے سہارے دراز تھا۔

اس نے کوٹ اتار دیا تھا۔ آف و ہائٹ شرٹ کے چند اوپری بٹن کھلے تھے۔ گریبان کی اوٹ سے سیاہ بال نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں ہلکی سرخ ہو رہی تھیں۔ بال کچھ بکھر گئے اور ان بکھرے بالوں میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا، ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔

اس کا خوشی سے لرزنا دل اپنے بخت پر نازاں و فرحان تھا۔ اس نے چپکے سے ایک نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی۔ گلابی اور سیاہ کاشن کے کروشے کے دیدہ زیب ورک والے سوٹ میں وہ بالکل عام علیے میں تھی۔

چہرہ ہر آرائش سے ہر امر جھاپا ہوا۔

بال سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں لپیٹے ہوئے تھے جن سے کئی لٹیں نکل کر اس کے چہرے پر ناگوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔

اس کی غیر موجودگی میں وہ بنا سنورنا بھول چکی تھی اور گھر کی سیٹنگ کی تیاریوں کے دوران تو وہ خود سے زیادہ غافل ہو گئی تھی۔

کافی پینے کے دوران ان کے درمیان مکمل خاموشی رہی تھی۔

وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں مست۔

وہ خالی نگ لے کر کچن میں آئی تو کچھ صفائی کرنے میں ماتم لگ گیا تھا اور وہ کمرے میں گئی تھی۔ وہ اسی طرح نیم دراز سو رہا تھا۔ پاؤں میں بوٹ اسی طرح تھے اور چہرہ دروازے کی سمت کو یا وہ اس کا انتظار کرتے کرتے نیند کی آغوش میں پھنچ چکا تھا۔ وہ دبے قدموں سے چلتی ہوئی اس کی سمت چلی آئی اور پیاسی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”تمہاری ہونے کے لئے میں نے ہر قربانی دی ہے اور دیکھو..... آج تمہارے نام سے میرے ارد گرد کتنے ستارے روشن ہو گئے ہیں۔ تم کتنے مختلف ہو عام مردوں سے۔ بالکل منفرد و منفرد اور ظالم بھی۔ تمہارے جیسے مرد کو ظالم ہونا بھی چاہئے۔

جو شخص اپنے آپ پر ظلم کر سکتا ہے، اپنے نفس پر جبر کر سکتا ہے، تمہارا یہ ظلم..... ظلم نہیں مہربانی ہوگی مجھ پر.....

میں کل پتھر تھی..... آج ہیرا ہوں۔

وہ جھک کر بوٹ کے اسٹریپ کھولنے لگی۔

”ارے، یہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ فوراً ہی بیدار ہو گیا تھا۔

”میں جوتے اتار رہی ہوں، آپ تھک گئے ہیں۔ آرام سے سو جائیں۔“

”نوجھینکس۔ میں اٹھ ہی رہا تھا۔ دراصل کئی راتوں سے سویا نہیں ہوں ٹھیک طرح سے اس لئے ذرا سا آرام ملتے ہی نیند نے غلبہ پا لیا۔“ اس نے اٹھ کر جوتے اور جرابیں اتاریں اور ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ مشعل مستعدی سے اس دوران نائٹ سوٹ وہاں لٹکا آئی تھی۔ وہ ڈریس پہنچ کر کے آیا تو سیدھا بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے کوبیا ہوا۔

”میں سو رہا ہوں..... صبح جب تک خود نہ اٹھوں مجھے جگایے گا نہیں۔ بہت دن بعد سکون کی نیند آرہی ہے۔“ اس نے بیڈ پر لیٹ کر کمرل اوڑھتے ہوئے کہا اور چہرے تک لپیٹ کر کروٹ لے لی تھی۔ مشعل نے اٹھ کر لائٹس آف کر دیں اور نائٹ بلب جلا کر باہر نکل آئی۔ کچھ دیر قبل وہ غشی ہشاش بشاش تھی، ایک دم ہی اداس و دلگیر نظر آنے لگی تھی۔ پہلی بار اس کا والہانہ انداز اور محبت و چاہت چھلکاتی نگاہوں میں اپنا عکس دیکھا تھا۔

اپنا آپ دیکھا تھا اور سمجھی تھی اس کی خطائیں معاف ہو چکی ہیں، اس کی سزا ختم کی جا چکی ہے۔ وہ صرف اس کی خاطر آیا ہے، اس کے لئے آیا ہے۔ لیکن وہ سب محض دل کی خوش فہمیاں و سن کے بہلاوے ثابت ہوئے تھے۔ ہجر و فراق اس کے لئے بے معنی تھے۔

وہ مسافر کی مانند آیا تھا اور گھر کو سرائے سمجھ کر بے خبر سو گیا تھا۔

”شاید جیتے جی اس کٹھور کا پیار نہ پا سکے گی۔ اسی طرح تڑپتی ہوئی، سلگتی ہوئی مر جائے گی اور اس سنگدل کو تیری قبر پر پھول رکھنے کی بھی توفیق نہ ہوگی۔“ اس نے آزر دگی سے سوچا اور اس کا لایا ہوا سامان اسٹور روم میں رکھنے لگی۔



حرائے خاموش نگاہوں سے فرح کی جانب دیکھا جن کے چہرے پر غصہ و تناؤ سرخی بن کر چھایا ہوا تھا۔ پیشانی پر شکنیں اور بگڑے تیروں نے ان کی نرم و نازک شخصیت کو خالصا بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

درمیانی صوفے پر منصور بر اجماع تھے اور ان کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی چٹائی پانے والے مجرم کا ہوتا ہے۔ اداس، دلگرفتہ و اندر دہ۔

”تم..... مجھے معاف کرنے پر بالکل تیار نہیں ہو؟“ ان کی دھیمی آواز بے جان تھی۔

”خطاؤں کو، جھاؤں کو یا ربا ربا معاف کرنے والی فرح اسی وقت مر گئی تھی جب تم مجھے اپنی غرض پوری نہ ہونے پر دھتکار کے گئے تھے۔ مشکل سے ہی سہی، میں نے خود کو بدل لیا ہے۔ پہلے میں خود کو کمزور سمجھتی تھی اب میری بہادری پر لوگوں کو رشک آتا ہے۔ پہلے میں سہاروں کی محتاج تھی اب خود سہارا ہوں، محافظ ہوں، چٹان ہوں۔ اب مجھ سے بیوی کے نام پر کسی کی غلامی نہیں ہو سکتی، نہ کسی کی کنیر بن سکتی ہوں نہ آیا۔“

”پلیئر گزشتہ باتوں کو بھول جاؤ۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ مجھے میری زیادتیوں کی سزا مل چکی ہے۔ میں تمہیں ٹھکرا کر گیا تھا اور جواباً قدرت نے مجھے ایسی ٹھوکر ماری، ایک ہی ٹھوکر نے مجھے اوقات یا دلا دی۔“ منصور کی دھیمی احتجاجی آواز میں پچھتاوؤں کی لرزش تھی۔

”جو مردنا حق عورت کو آزمائش میں ڈالتے ہیں وہ قدرت کی طرف سے خود آزمائے جاتے ہیں۔ تم مرد لوگ کیا سمجھتے ہو اللہ صرف تمہارا ہے؟ وہ صرف تمہارا ہی ساتھ دے گا؟ جائز و ناجائز ہر کام میں اس کی رضا تمہیں حاصل رہے گی۔ تم جب چاہو گے ٹھکرا دو گے، جب چاہو گے اپنا لو گے اور عورت.....“

”پلیئر آپلی! چھوڑیں، بات ختم کریں۔ دو لہا بھائی کو اپنی غلطیوں کا احساس ہے۔ وہ معافی بھی مانگ رہے ہیں۔ اب آپ کو ناراضگی ختم کر دینی چاہئے۔“

حرا کو دماغ ملت کر پڑی تھی۔ لیکن فرح کسی طوفان کی طرح پھری ہوئی تھیں جنہیں قابو کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

”نہیں کر سکتی میں معاف..... کس طرح معاف کر دوں؟ زندگی شدید غم و خوف میں گزار کر اب جینے کا حوصلہ ہوا ہے تو پھر کمزور ہونے کا وقت آگیا؟ میں سب کچھ کر سکتی ہوں مگر اپنی ذات کی نفی ہرگز کوارا نہیں۔“

وہ اٹھ کر تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئیں۔

”میں آخری سانس تک منتظر رہوں گا۔ فرح کو باور کرادینا۔“ منصور مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے چلے گئے تھے۔

”آپ کو اپنا رویہ بدلنا ہوگا آپلی! رنجشیں ہر رشتے میں ہو جاتی ہیں۔ لوگ جیتے جی ایک دوسرے کو مردہ تصور کر کے تعلقات توڑ دیتے ہیں، کیا کچھ نہیں ہوتا ناراضگیوں کے دوران مگر پھر جب غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں، رنجشیں محبت میں، ناراضگیاں قربانوں میں بدل جاتی ہیں تو سب ایک ہو جاتے ہیں اور ایک ہونا بھی پڑتا ہے۔ معاشرے میں وہی لوگ عزت و تحفظ پاتے ہیں جو مضبوط رشتے اور معتبر شجرہ رکھتے ہوں۔“ منصور کے جانے کے بعد و فرح کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

”حرا..... حرا! تم نہیں جانتیں کسی کو معاف کر دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔“

”اوہ ہو..... یہ کیا آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں۔“ وہ دکھ بھرے انداز میں مسکرائی۔

”اوہ..... سوری..... سوری حرا! میری جان۔“ انہوں نے بڑھ کر اسے لپٹا تے ہوئے شرمندگی سے کہا۔

”اس شخص نے آکر میرا دماغ گھما دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا بک رہی ہوں۔“

”آپ نے مجھ سے کہا تھا معاف کر دینے والا، بدلہ لینے والے سے زیادہ افضل ہوتا ہے آپلی، آپ بھی انہیں معاف کر دیں۔ آپ کا بدلہ تو خود اللہ میاں نے لے لیا۔ جاتے وقت کتنا ظلمہ، غرور، گھمنڈ تھا ان میں۔ اب واپسی میں تمام کشتیاں جلا کر آئے ہیں۔ پہلے انہوں نے آپ کو نوکرائی بنا کر رکھا تھا، اب مہارانی بنا کر رکھیں گے یہ میرا دعویٰ ہے۔ آپ کو انہیں معاف کرنا ہی ہوگا۔ میری خاطر ہی سہی۔“ حرا کے لہجے میں اپنائیت کا مان و فخر تھا۔

”منصور نے میرے ساتھ ہی نہیں تمہارے ساتھ بھی بہت زیادتی کی ہے..... کیا تم معاف کر سکتی ہو اس کو؟“ ان کے دل کی بات لیوں پر آگئی تھی۔

”انہوں نے مجھ سے معافی مانگ لی تھی اور میں نے تمہارے دل سے انہیں معاف بھی کر دیا تھا اور کیسے نہ کرتی۔ جو کچھ ہوا اس میں میرے نصیب کا دوش تھا۔ پھر ان کا رویہ میرے ساتھ ہمیشہ بڑے بھائیوں جیسا رہا ہے۔ میرے دل میں ان کے لئے کل بھی احترام تھا آج بھی میں ان کی از حد عزت کرتی ہوں۔“

”کل شاہوین سے ملنے چل رہی ہونا؟“ انہوں نے سرعت سے موضوع چھینچ کیا تھا۔

”ہاں ضرور چلیں گے۔ لیکن ہم نے زیادتی نہیں کی مشعل سے ان کی آمد کا چھپا کر حالانکہ ہم سب ہی واقف تھے۔ مشعل کو معلوم ہوگا تو وہ غما ہوگی۔“

”جو خوشی اسے شاہوین کو دیکھ کر ہوئی ہوگی وہ کنفرم ہونے کے بعد ٹھوڑی ہوتی۔ حسن صاحب تو راضی نہ تھے، بڑی مشکل سے راضی کیا تھا میں نے انہیں مشعل کو کچھ نہ بتانے اور وہاں چھوڑنے پر۔“ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”شاہوین کی والدہ فرانی ڈے کو آ رہی ہیں۔ ان کے لئے بھی شاپنگ کرنی ہے۔ شادی میں ہماری طرف سے انہیں کچھ نہیں ملا تھا۔ مگر اب ہم کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ شاہوین اور مشعل کے لئے شاپنگ مکمل ہوگئی فرانی ڈے سے قبل ان کی شاپنگ بھی مکمل کرنا ہے۔“

”جی میڈم! مجھے سب یاد ہے اور آپ چالاکی سے موضوع بدلنے کی کوشش نہ کریں۔ میں منصور بھائی کو فون کرنے جا رہی ہوں کہ آجائیں، گھر کے دروازے تو پہلے ہی وا تھے اب دل کے دروازے بھی کھل گئے ہیں۔“ حرا نے ہنستے ہوئے فون اسٹینڈ کی طرف قدم بڑھایا تھا۔

”حرا بات سنو۔ بات سنو، ابھی نہیں، رکھو۔“ فرح نے بوکھلا کر اسے روکنا چاہا تھا۔ حرا نے پھرتی سے نمبر پیش کر ڈالے تھے۔



سامان رکھنے کے بعد وہ کمرے میں نہیں گئی۔ لاؤنج میں بچھے سرمی کارپٹ پر رکھے کشتے کے سہارے بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے نیند غائب تھی تو دل سے سکون و قرار بھی رخصت ہو چکا تھا۔ سوچوں کا اثر دھما تھا جو اسے بے دم کئے دے رہا تھا اور وہ ان سوچوں سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی جس نے اس کے نرم و نازک دل پر خراشیں ڈال دی تھیں، خواہشوں اور تنہاؤں کو بولہ بان کر ڈالا تھا اور اس کی روح کو سلگنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

سوچوں سے دامن نہ چھڑا پائی تھی کہ آنسو بن بلائے مہمانوں کی طرح وارد ہونے لگے تھے۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی، سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن کسی پر بھی اس کا اختیار نہ رہا تھا۔ جب دل پر بھی بس نہ چلنا تھا تو پھر ہر جذبہ خود سر ہوتا چلا گیا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر یہ پروگرام چلنا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ سامنے سینے پر ہاتھ باندھے نائٹ سوٹ میں بال بکھرے شاہوین کھڑا انجیدگی سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”آپ..... کسی چیز کی ضرورت ہے؟“ وہ خفیف سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں..... تمہاری۔“

”سک..... کیا مطلب؟“ اس کے اندر ہلچل ہوئی تھی

”تم نے پانی نہیں رکھا تھا۔ مجھے عادت ہے پانی پینے کی۔“ اس کی آنکھیں کچھ اور کہہ رہی تھیں، لہجہ کچھ اور۔ اس کی نگاہوں کی زبان پر اسے اعتبار نہیں تھا۔ وہ دوپٹے سے چہرہ صاف کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم نے کہا تھا واپس آ جاؤ اور میں واپس آ گیا۔ تم مجھے وہاں چھوڑ کر یہاں میرے آنے کا سوگ منارہی ہو۔ میں خوش تھا کہ میری مہینوں کی در بدری نے کام تو دکھایا۔ میرے نصیبوں پر جی برف پگھل گئی ہے۔ میری زندگی میں بھی کیف و نشاط کی بہاریں و رانی ہیں مگر لگتا ہے تم ابھی تک مجھے قبول نہ کر پائی ہو اور مجھے محبت کا احساس کھینچ کر لایا ہے۔ جذبہ دل سے مجبور ہو کر میں آیا ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ میں اپنے پیچھے سب دروازے بند کر کے آیا ہوں۔ صرف وفا کا دروازہ کھلا ہے۔ چاہت کا نگر آبا د کرنے کی خاطر، محبت کا جہاں بسانے کی خاطر، میں بہت تھک گیا ہوں۔ آج آخری بار اپنی انا، خودداری و خودداری کو ریزہ ریزہ کر کے ان کرچیوں پر چل کر آیا ہوں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ اقرار وفا، اظہار محبت کر رہا تھا۔

اس کے لہجے میں سچائی تھی، اس کی آنکھوں میں سچائی تھی، اس کی باتوں میں سچائی تھی۔ وہ سہرا سچائی بنا ہوا تھا۔

”مجھے اس طرح بے یقین نظروں سے نہیں دیکھو۔“ وہ اس کے قریب چلا آیا تھا۔ اس کے ساکت و صامت کھڑے وجود کو بڑے استحقاق سے بازوؤں میں لیتے ہوئے دوبارہ کوپا ہوا تھا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا مجھ جیسے فولادی حوصلے اور چٹانی جذبات رکھنے والے شخص کو تم یوں موم کی طرح پگھلا دوگی۔ تم سے دور رہ کر یہ جانا کہ تمہاری قربت کے بغیر زندگی ممکن نہیں ہے۔ میرے پاس نہ ہوتے ہوئے بھی تم میرے پاس ہوتی تھیں..... ہاں، میں ہوتے ہوئے بھی موجود نہ تھا۔ تم مجھے مجھ سے جدا کر لے

گئیں۔ میرے پاس کچھ نہ چھوڑا۔ مجھے دل کی بے ایمانی اور اپنی دیوانگی کا احساس ہوا تو پہلے تو یقین نہیں آیا کہ میں ایک پاگل سی، نٹ کھٹ، بدتمیز لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو سکتا ہوں جس کی پرچھائیں سے بھی چہنچھی اس کا اسیر ہو سکتا ہوں۔ خود کو آزمانے کے لئے اپنے جذبوں کی آزمائش کے لئے میں از خود اتنا نام لگا کر آگیا۔ جب مجھے اپنے جذبوں کی صداقت پر یقین کامل ہو گیا تو احساس ہوا میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں، قدم قدم پر تمہاری خودداری، انا، انسانیت کی توہین کی ہے۔ تم نے خود کو بدل لیا، اس سانچے میں ڈھل گئیں میں نے جس میں ڈھالنا چاہا۔ یہ ثبوت تھا تمہاری محبت کا، بے لوث، بے غرض، بے انتہا چاہت کا جس نے مجھ جیسے گھمنڈی، خود پسند، بلکہ ٹیڑھے مرد کو جھکنے پر مجبور کر ڈالا۔“ وہ دھیمے سے ہنسا تھا۔ کتنی خوبصورت تھی اس کی ہنسی۔ مٹھرو تسخّر سے پاک، معطر و نکھری ہوئی۔ مشعل کے ہر سو رنگ، روشنی اور خوشبوؤں کی بارش ہونے لگی۔ کچھ دیر قبل اس کے سرو بیگانے رویوں پر رو رہی تھی اور اب اس کے مہکتے بازوؤں کے حصار میں اسے ڈھیروں شرم آ رہی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آتا آپ بدل سکتے ہیں۔ شاید یہ بھی کوئی ستارے کا نیا انداز ہو آپ کا اور بعد میں مجھ پر ہنسنے اور مضحکہ اڑانے کا موقع مل جائے۔“ مشعل کے ذہن میں برق رفتاری سے خیال آیا تھا اور وہ کسمسا کر اس کے بازوؤں سے نکل آئی تھی۔

”تمہاری محبت نے مجھے بدل دیا ہے۔ میں تمہارے بغیر کچھ نہیں ہوں۔ اگر تم مجھے فون پر واپس لوٹ آنے کا نہ کہتیں تو میرا بھرم ٹوٹ جاتا، میرا مان بکھر جاتا اور خواہ عمر تمام ہو جاتی میں لوٹ کر آنے والا نہیں تھا۔ تمہارے بلاوے کو، تمہاری محبت کے اظہار سے مشروط سمجھا تھا۔ تم نہ بلاتیں تو مطلب تمہاری نفرت کا اظہار تھا، تمہارے بلاوے نے تمام راہیں ہموار کر ڈالی ہیں۔

”مجھے یقین نہیں آتا..... آپ اور مجھ سے محبت..... بیبا ممکن بات ہے۔“

”مجھے معلوم تھا تم اتنی آسانی سے مجھ پر یقین نہیں کرو گی۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا اور اسے بھی کھینچ کر اپنے قریب زبردستی بٹھایا تھا۔

”محبّتوں میں خطائیں تو ہو ہی جاتی ہیں

محبّتوں کا تقاضا ہے درگزر کرنا“

وہ شوخی سے گنگنایا تھا۔

”تم نے رو کر حال زار کہا اور میں ہنس ہنس کر تمہیں روداد عشق سناؤں گا۔ میں یہ نہیں کہوں گا تم مجھے پہلی نظر میں اچھی لگیں اور میں تم پر فدا ہو بیٹھا۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ پہلی نظر کا معاملہ ہرگز نہ تھا۔ تم تو دیر دیر سے، آہستہ آہستہ اس فنسے کی مانند میرے رگ و پے میں اترتی گئیں جس سے چھٹکارا نا حیات ناممکن ہوتا ہے۔ انسان زندگی کو داؤ پر لگانے کو تیار رہتا ہے مگر اس سے برطرفی ممکن نہیں ہوتی۔ میرا اور تمہارا تعلق بھی کچھ ایسا ہی ہے۔“ اس کی آواز سرکوشی بن گئی تھی۔ چہرے پر نئی و دلکش روشنی تھی۔ اس کی قربت سے اس کی الفت سے وہ تجلجک رہی تھی، سمٹ رہی تھی۔ وہ حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

”تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی ہر گھڑی ہر ساعت بڑی کنھن آزمائشوں سے گزرا ہوں۔ اپنے آپ کو بڑی مشکلوں سے قابو کیا ہے۔ کئی مرتبہ تمہارے حُسن کی تجلیوں نے میرا صبر و قرار ڈال دیا ہے مگر ہر بار اپنے لازوال جذبے کی سچائی کو دیکھنے کے لئے خود پر جبر و ستم کرتا رہا۔ یہ محسوس کرنے کے لئے کہ دونوں طرف محبت کا رنگ ایک سا ہے یا نہیں۔ اگر محبت ضرورت یا ہوس بن جائے تو اس میں پاکیزگی نہیں رہتی۔ محبت ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے۔ یہ سمندر نہیں جو چڑھے اور اتر جائے نہ ہی پھول ہے جو صبح کھلے اور شام کو مرنے لگا جائے۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ شدید سے شدید تر ہو جانے والا جذبہ ہے۔

میں تمہیں ہمیشہ اپنے دل کے قریب دیکھنا چاہتا ہوں۔ نا حیات، آخری سانس تک۔ یہ تمہاری قربانیوں کا صلہ ہے جو آج ہم ایک ہیں۔ میں تمہیں اسی صورت میں دیکھ رہا ہوں جس میں دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ اب تم پہلے سے زیادہ خوبصورت اور دلکش ہو گئی ہو۔ اتنی کہ دل کہتا ہے، سنو کہ اب گلاب دیں گے گلاب لیں گے، محبتوں میں کوئی خسارہ نہیں چلے گا۔“ وہ اس کے کانپنے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگا کر جذباتی لہجے میں بولا۔

مشعل کی آنکھوں سے پھر آنسوؤں نے لگے تھے مگر یہ آنسو درد کے نہیں تھے، تڑپ کے نہیں تھے، دکھ کے نہیں تھے۔

یہ آنسو سرت و کامرانی کے آنسو تھے۔

فتح مندی و تشکر کے آنسو تھے۔

”بس..... بہت قیمتی آنسو ضائع کر چکی ہو۔ اب کبھی یہ خزانہ لاتے نہ دیکھوں۔“ اس نے بڑے پریم سے اس کے آنسو صاف کئے تھے۔

”فریائی ڈے کو بے جی، خالد زریبہ، اصغر اور فریحہ بھابھی واپس آ رہی ہیں ان کے آنے کے کچھ عرصے بعد ہم ورلڈ ٹور پر چلیں گے، ایک ایک پل، ایک ایک ساعت، ایک ایک لمحے سے سرت و زندگی کشید کریں گے۔ مثنیٰ بے رخی و بے اعتنائی کی اذیت تمہیں دی ہے سب کا ازالہ کر دوں گا۔“ اس کا انداز پوری شدت لئے ہوئے تھا۔ وہ کسمسا کر اس کے بازوؤں سے نکل آئی اور دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کے اس انداز پر شاہ وزیر کے سرت سے چمکتے چہرے پر یکدم ہی تاریک سایہ پھرا گیا تھا۔ وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگا۔

”کیا تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟“ کچھ توقف کے بعد وہ کوپا ہوا۔

”یہ بات نہیں ہے..... مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بہت عرصے قبل میں ایسی تکلیف دہ باتوں کو بھول چکی تھی۔ ایک مسئلہ ہے جس نے مجھے از حد فکر مند و پریشان کر رکھا ہے۔“

”کیا ہوا ہے..... جو بھی پرالہم ہے مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔“

”پہلے مجھے پاپا کی تنہائی کی فکر تھی۔ اب میں دوصوں میں تقسیم ہو گئی ہوں، پاپا اور ماما۔ پاپا تنہا ہیں اور ماما بھی فی الحال تو فرح آنٹی کی موجودگی کی وجہ سے تنہا تو نہیں ہیں مگر کل وہ بھی تنہا ہو جائیں گی۔ کیونکہ منصور اکل ساؤتھ افریقہ میں سیٹل ہو چکے ہیں۔ ان کا بزنس وہاں کامیابی سے چل رہا ہے۔ وہ یہاں صرف فرح آنٹی کو منانے کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔ ان کی کالز اکثر آتی رہتی ہیں۔ کوکہ ابھی آنٹی کی ناراضگی دور نہیں ہوئی ہے لیکن کب تک؟ بہت جلد ان کو ہتھیار ڈالنے ہوں گے۔ عورت مرد سے رشتہ توڑ سکتی ہے مگر بیوی خاوند کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ان کی منزل وہی ہیں۔ پھر وہ ان کے ساتھ چلی جائیں گی اور ساتھ ماما کو بھی لے کر جانا چاہیں گی کیونکہ تنہا وہ کسی صورت انہیں نہیں چھوڑ کر جائیں گی اور میں ماما کی طبیعت کو اچھی طرح جان چکی ہوں۔ وہ جس قدر کیوٹ ہیں اتنی ہی خوددار و غیور ہیں۔ وہ ان کے ساتھ کبھی نہیں جائیں گی اور نہ ہی اس بات پر راضی ہوں گی کہ ہمارے ساتھ رہنے لگیں اور اس طرح رشتوں میں تو ازن نہیں رہے گا اور بہت سوچنے کے بعد میں نے یہ ترکیب سوچی ہے۔“

وہ کچھ تجلجک کر چپ ہو گئی تھی۔

”ہاں، ہاں..... کہو، رک کیوں گئیں؟“ وہ ہمدن کوش تھا۔

”میں نے سوچا ہے کہ پاپا بھی تنہا ہیں اور ماما بھی تنہا ہیں کیوں نہ انہیں..... میرا مطلب ہے ان کی میرج ہو جائے تو ان کی تنہائی دور ہو جائے گی۔ دونوں کو ایک دوسرے کا سہارا مل جائے گا۔ آنٹی بھی سکون سے منصور اکل کے ساتھ رہ سکیں گی۔ اور سب سے بہتر یہ ہوگا کہ میں بے فکر ہو جاؤں گی۔ ورنہ ان دونوں کا خیال مجھے سرتوں میں رنجیدہ رکھے گا۔ اور میں چاہنے کے باوجود خوش نہ رہ پاؤں گی۔“ اپنی بات کہہ کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

”گڈ، ویری گڈ، فکسٹک آئیڈیا ہے۔ پھر وہ دونوں ہی اوور اتچ نہیں لگتے۔ ان کا کپل سویر اور ونڈر فل ہوگا۔“ اس نے کھلے دل سے اس کی تجویز کو سراہا تو اس کے چہرے پر بڑی انوکھی روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آ کر ہر جوش لہجے میں چکی۔

”میرا آئیڈیا اچھا ہے نا..... اس طرح ہم سب کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ ہمارا خاندان ایک ہو جائے گا۔“

”یہ پراپوزل لے کر کون جائے گا؟“

”میں پاپا کو راضی کر لوں گی۔ مجھے یقین ہے وہ کچھ نام لیں گے مگر میں اپنے طریقے سے انہیں رضامند کر کے ہی رہوں گی اور آپ آنٹی کو پہلے ساتھ ملائیں، پھر دونوں مل کر ماما کو راضی کریں۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔“ وہ از حد خوش تھی۔

”اوکے..... سمجھو یہ کام ہو گیا۔ تمہارا میکہ ایک گھر میں سمٹ گیا ہے۔ ان کی تنہائیاں قریبوں میں بدل جائیں گی۔ اب مجھ غریب کی تنہائی کا بھی خیال کرو۔ تمہیں سب کی فکر ہے، مجھ پر تمہاری نگاہ نہیں جاتی؟ مجھ پر رحم نہیں آتا؟“

اس نے شوخی سے کہتے ہوئے مشعل کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ اس نے شرما کر گردن جھکا دی تھی۔